مارچ 2020













خط وکتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

سالگرہ نمبر



کرن کتاب

مستقل سلسلے

رسالہ رجسٹرڈ ہے



آسیہ مرزا

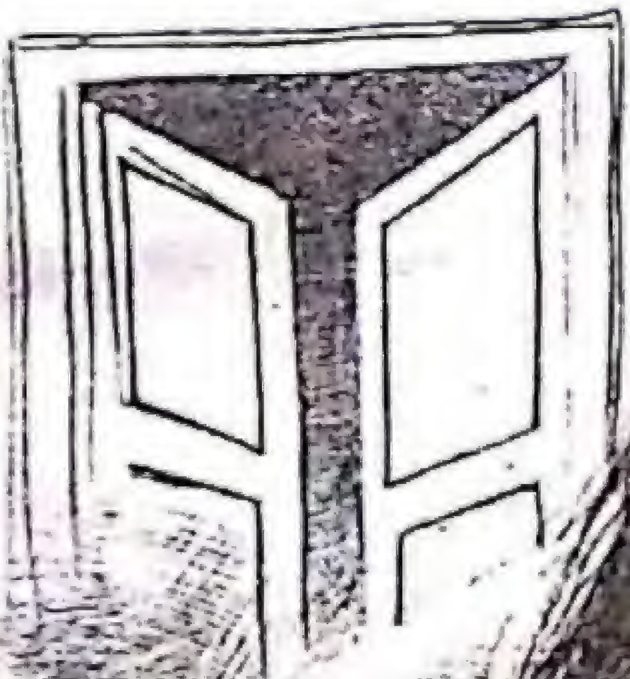
میرے ہم نفس میرے ہم نوا

حیات علی کی تین بیٹیاں تھیں ۔ یہ ایک متوسط گھرانہ تھا ۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا ۔ راحیلہ بیگم کے سگھڑاپے کا منہ بولتا ثبوت ۔ اولاد کی تربیت میں کہیں کوئی کسر نہ رکھی تھی ۔ نیلوفر تو تھی ہی ماں کی طرح صابر وشاکر اور ارسلہ نے اس کا لقب قانع آپا رکھ دیا تھا ۔ اریبہ چھوٹی فرسٹ ائیر کی طالبہ تھی ۔ بس پڑھائی اور موبائل گیمز سے دلچسپی تھی مگر اماں کا دردسر تو ارسلہ تھی ۔

نیلوفر کی منگنی جہاں ہوئی تھی وہ لوگ بہت لالچی تھے اور آئے دن کوئی نہ کوئی مطالبہ کرتے رہتے تھے ۔ ارسلہ کو اس کی خالہ کا بیٹا سکندر پسند کرتا ہے لیکن غربت کی وجہ سے ارسلہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی ۔

مہوش جیلانی اور اکبر جیلانی کے دو بچے ہیں ، رومی اور آبص ۔ آبص ایک حادثہ کی وجہ سے اپنی زندگی سے بے زار ہے ۔

پانچویں قسط





اسے آبص نے چاہتا ہے کال کی تھی کہ ماں اس کے گھر آئیں گی اس کا رشتہ لے کر۔

''آئی ہوپ ..... واپس آؤں گا تو مجھے ہوائیں یہ خوش خبری دیں گی کہ تم میرے نام لکھ دی گئی ہو۔ تمہاری ہتھیلی پر میرا نام لکھا ہوا ہونا چاہیے نادی! تاکہ ہر کسی کو دکھائی دے کہ تم آبص جیلانی کی ہو۔''

اس کی بات پر اس کا دل خوش نہیں ہوا تھا مگر وہ ہنس دی تھی۔ یہ الگ بات کہ اسے خود بھی اپنی ہنسی بڑی کھوکھلی اور بے جان محسوس ہوئی تھی۔

وہ دراصل اسے بتانا تو چاہ رہی تھی کہ اس کی ماں مہوش کی کال آ ہی چکی تھی جس میں سانپ کی پھنکاریں تھیں۔ اب وہ آ کر شاید مزید زہر اگلنا چاہ رہی تھیں۔ اس نے موبائل سرہانے رکھ دیا اور کروٹ بدل کر گزرے واقعات پر غور اور آنے والے لمحات کے بارے میں سوچنے لگی۔ مایوسی پر مایوسی چہاروں طرف سے اڈتی دکھائی دے رہی تھی۔

آبص کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب اس نے بھی دیکھ رکھے تھے مگر محبت کو عزت پر حاوی نہیں کیا تھا یا لاشعور میں رد کیے جانے کا خوف بسا ہوا تھا جو کھل کر خوش ہونے دیتا تھا نہ آبص سے محبت کرنے دیتا تھا۔

''کیا بات ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔ آج تو دن بھر بستر پر پڑی دکھائی دے رہی ہو۔ شام ہونے کو آئی ہے۔'' امی کوئی تیسری بار اس کے کمرے میں آئیں تو اسے اسی پوزیشن میں لیٹے دیکھ کر ان سے رہا نہ گیا۔ ''کوچنگ نہیں جاؤ گی۔''

''نہیں۔'' اس نے کروٹ بدلے بدلے جواب دیا۔

''کیا بات ہے نادی! پریشان لگ رہی ہو۔ کوچنگ سینٹر میں کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔ صبا سے کھٹ پٹ تو نہیں ہوئی۔'' امی اندازے لگانے لگیں۔

''کاش! ان میں سے ہی کوئی ایک بات ہو گئی ہوتی۔'' اس کی آنکھوں میں ریت چبھنے لگی۔

''اچھا چلو، اٹھو۔ چائے پی لو، میں نے بنائی ہے۔''

''جی اٹھتی ہوں۔'' اس نے ایک ہلکی سانس کھینچ کر کروٹ بدلی اور ماں کی طرف دیکھا پھر ہلکے سے مسکرا دی۔

''سنو، کس کی کال آئی تھی کل۔ تم کس سے بات کر رہی تھیں۔ مہوش جیلانی تھیں کوئی۔'' امی کمرے کا پھیلاوا سمیٹتے ہوئے اچانک یاد آنے پر پوچھنے لگیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

''کیا ہوا؟'' امی اس کی غیر معمولی خاموشی پر چونکیں پھر کچھ سوچ کر اس کے پاس ہی مسہری پر آ کر بیٹھ گئیں۔

''یہ مہوش جیلانی کہیں آبص کی امی تو نہیں۔''

''جی۔'' وہ نظریں چرا گئی۔

''لو ..... پھر تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ بات کرائی تھی میری۔ کیا کہہ رہی تھیں؟''

''یوں ہی مجھ سے بات کرنے کی غرض سے کی تھی کال۔'' وہ پیر لٹکا کر سلیپرز پہننے لگی پھر دھیرے سے بولی۔

''وہ ہمارے گھر آئیں گی امی۔ میرا رشتہ لے کر اپنے بیٹے کا۔ میرا مطلب ہے آبص کا۔''

امی دم بخود رہ گئیں۔ دوسرے پل ان کے چہرے پر خوشی کے رنگ جھلکے۔

''یہ تو خوشی کی خبر ہے۔ کب آئیں گی۔''

''شاید آج ہی .....''

''ارے، تم اب بتا رہی ہو۔'' امی جیسے بوکھلا سی گئیں۔ ''نادی تم بھی نا، بالکل بے پروا لڑکی ہو۔ اب بتا رہی

ہو۔ اتنے بڑے اونچے لوگ ہیں، ان کی خاطر مدارت تو کرنی ہوگی نا۔ گھر میں تو کوئی چیز نہیں ہے ایسی جوان کے آگے رکھ سکوں۔ ارے لڑکی! صبح ہی بتا دیتیں۔ بازار گئی تھی لے آتی' خیر چلو۔ ابھی صغریٰ کو بھیج کر کچھ منگوا لیتی ہوں۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" وہ دوپٹا مسہری سے اٹھا کر کندھے پر ڈال کر روم سے نکل گئی۔

خوشی کے بجائے عجیب خوف کی لپٹیں دل سے اٹھ رہی تھیں۔ مہوش کا پھنکارتا لہجہ بار بار اس کی سماعت میں گونج رہا تھا۔

"تو تم ہو نادیہ شاہ، جس نے میرے بیٹے کو اپنی مٹھی میں قید کرلیا ہے۔ سنتے تو یہ آئے تھے کہ دیو پری کو قید کرلیتا ہے۔ مگر اب دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ایک چڑیل نے شہزادے کو قید کرلیا ہے۔ ارے ارے، میں مذاق کررہی ہوں۔ ابھی تمہیں دیکھا کہاں ہے۔ چڑیل تو مذاقاً کہہ رہی ہوں۔ ظاہر ہے میرا بیٹا شہزادے جیسا ہے وہ شہزادی سے کم تو اس نے اپنے لیے نہیں چنی ہوگی۔ اس کی نظریں اوپر ہی جاسکتی ہیں۔ نیچے دیکھنے کا تو وہ عادی ہی نہیں ہے۔ اوکے پھر ملتے ہیں۔ بہت جلد۔"

یہ لفظ، لفظ نہیں تھے کوئی انگارے تھے جو کانوں کو جھلسا گئے تھے تب سے اس کی ساری ہنسی، ساری امنگیں راکھ ہوگئی تھیں۔

امی کی بوکھلاہٹ اور مستعدی سے ہونے والی تیاریاں وہ چپ چاپ دیکھے جارہی تھی۔ خوش فہمی کی چادر کا ٹانکا تو ادھڑ ہی چکا تھا خدا جانے اب وہ آکر کون سی چادر تار تار کرنے والی تھیں۔

"ارے نادیہ، یہ سموسے اور رول دیکھو کم تو نہیں لگ رہے۔ ساتھ میں دہی بھلے بھی ہیں۔ میٹھے میں گلاب جامن اور برفی منگوالی ہے۔ چائے رکھوں یا کولڈ ڈرنک امی کی کنٹری کچن سے جاری تھی۔

وہ جھنجلا سی گئی۔

"چائے اور کولڈ ڈرنک دونوں ہی رکھ لیں۔ بلکہ کوئی تیسرا آپشن ہو وہ بھی رکھ لیں۔ کوئی کمی نہ رہ جائے ان کی شان میں، کبھی کھایا جو نہیں ہوگا آپ ہی کھلائیں گی۔"

"ارے۔" امی نے کچن سے جھانکا۔ "اتنا غصہ کیوں کررہی ہو۔ اچھا چلو نہیں پوچھتی تم سے میں۔ جاؤ جلدی سے تیار ہوجاؤ۔" سادہ سی امی، یہی اخذ کرسکتی تھیں۔ وہ کمرے میں جا گھسی۔

کچھ دیر گزری تھی کہ داخلی دروازے پر دستک ہونے لگی۔

"لگتا ہے مہمان آگئے۔" امی جلدی سے دوپٹا سر پر اوڑھ کر دروازے کھولنے لگیں۔ خوب صورت موڈرن ادھیڑ عمر کی خاتون کو دیکھ کر امی کو پہچاننے میں دیر نہ لگی کہ وہی مہوش جیلانی ہوسکتی تھیں۔

جدید تراش کی کرتی ٹراؤزر میں، مہنگے پرس کے ساتھ، کٹے بالوں کی پونی بنائے استحقاق سے اندر داخل ہوتے ہوئے گردن ادھر ادھر کرکے گھر کا جائزہ لینے لگیں پھر نظریں امی پر جماتے ہوئے بولیں۔

"مجھے مہوش جیلانی کہتے ہیں۔ آبص کی مدر۔"

"جی جی، پہچان گئی میں۔ آیئے آیئے۔"

"لگتا ہے میرے آنے کی اطلاع مل چکی ہے آپ کو۔ آبص نے دے دی ہوگی آپ کی صاحبزادی کو۔"

"جی۔ مگر مجھے تو کوئی گھنٹہ بھر پہلے ہی نادیہ نے بتایا تھا آپ کے آنے کا۔ بس کچھ بوکھلا سی گئی۔ خیر آیئے اندر آیئے۔"

امی کی سادگی ایسے موقعوں پر ہمیشہ عروج پر پہنچ جاتی تھی۔

نادیہ نے آنے والی کو اس کے اٹھتے قدموں سے ہی جان لیا تھا کہ غرور اور تکبر سے اس تعلق کو ہمیشہ کے

لیے توڑنے آئی ہیں۔ جوڑنے ہرگز نہیں۔ آبص نے اسے پہلے ہی بتایا تھا کہ اس کی ماں اس رشتے پر راضی نہیں ہیں مگر ہو جائیں گی۔ وہ منا لے گا۔ اور اب مہوش جیلانی سے بات کر کے اور اسے دیکھ کر اسے پکا یقین ہو گیا تھا کہ وہ راضی ہو کر نہیں آئی تھیں۔ بلکہ اپنی ہار کا انتقام لینے آئی تھیں۔

"کہاں بیٹھوں۔" انھوں نے بظاہر امی کو مسکرا کر دیکھا اور ادھر ادھر نظریں دوڑائیں، سراسر تضحیک آمیز انداز تھا۔

دو کمروں کا صاف ستھرا چمکتا ہوا گھر جس میں سادہ سا فرنیچر ڈلا ہوا تھا۔ دونوں کمروں سے منسلک کھلی جگہ کو بیٹھک بنایا تھا جہاں کم قیمت کے دو صوفے رکھے تھے ایک طرف فلور کشن تھے۔ کھڑکیوں پر سادہ سے پردے اور فرش پر کم قیمت کا مگر صاف ستھرا کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ اپنے طور پر امی نے گھر کو اچھا خاصا ڈیکوریٹ کر رکھا تھا مگر مہوش جیلانی کے شایانِ شان تو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا اور یہی بات انہیں بوکھلائے دے رہی تھی۔

"تو تم ہو نادیہ شاہ۔" مہوش نے اپنے سامنے باادب بیٹھی نادیہ شاہ کے پرکشش چہرے پر نگاہیں جما دیں۔

"آپ لوگ باتیں کریں میں ذرا چائے دیکھ لوں۔" امی وہاں سے اٹھ گئیں۔ امی کے اٹھتے ہی مہوش کے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ یک دم سکڑ گئی۔ نگاہوں میں تضحیک اور زہر صاف دکھائی دینے لگا۔

"آبص نے کیا بتایا تھا تم کو میرے آنے کے بارے میں۔" وہ دو لمحے توقف کے بعد گویا زہر اگلتے لہجے میں پھنکاریں۔

"یہی کہ آپ آنا چاہ رہی ہیں اور آئیں گی۔" وہ ان کے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے تحمل سے بولی۔

"اچھا۔ یہ نہیں کہا کہ آنا تو نہیں چاہتی ہیں مگر بحالت مجبور ہو کر آنا پڑے گا۔"

"نہیں، اس نے یہ نہیں کہا۔ مگر میں جانتی ہوں کہ آپ کو بحالت مجبوری آنا پڑا ہے۔"

"سمجھ دار معلوم ہوتی ہو۔" وہ مسکرائیں عجیب چبھن تھی مسکراہٹ میں۔ "پھر تو یہ بھی جانتی ہو گی کہ میں آبص کے لیے کم از کم تم کو پسند نہیں کر سکتی۔ وہ تو جوان ہے، جذباتی اور نادان ہے...... ہر چمکتی شے کو سونا سمجھ لینے والی عمر سے گزر رہا ہے مگر جب جذبات میں ٹھہراؤ آئے گا تو پھر نفع و نقصان کا اندازہ ہو گا اسے۔ اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہوں گی کہ میرے بچے کی جھولی میں نقصان ہی نقصان آئے۔"

"بالکل۔" وہ تائیدی انداز میں سر ہلانے لگی۔ "ایک سمجھ دار ماں کو ضرور سوچنا چاہیے کہ اس کی اولاد کی جھولی میں ہرگز نقصان نہ آئے۔ اسے بچانا چاہیے ہر ممکنہ نقصان سے۔" وہ یہ کہتے ہوئے پہلی بار کھل کر مسکرائی اور مہوش جیلانی کو ترحم بھری نظروں سے دیکھا۔ "آپ جیسی عورت کو جھکنا کبھی نہیں چاہیے۔ ایک بات کہوں میڈم، میری ماں بھی مجھے نقصان سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں گی۔"

مہوش جواباً اسے گھورنے لگیں انہیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح کا لہجہ اپنائے گی۔

"سنو لڑکی۔ نقصان تمہیں پہنچ سکتا ہے اگر تم آبص کی زندگی سے نہ نکلیں تو۔ اسے تم سیدھا سیدھا میری دھمکی سمجھو۔" وہ یک دم اپنے اصل مقصد پر آ گئیں۔ "میں کسی صورت آبص کی شادی تم سے نہیں ہونے دوں گی۔ تم لاکھ اسے اپنا دیوانہ بنا لو۔ یہ دیوانگی ریت کی دیوار بنا کر گرا دوں گی۔ مجھے مہوش جیلانی کہتے ہیں۔"

"آپ کیا چاہتی ہیں اور یہ سب یہاں آ کر مجھے بتانے کے بجائے اپنے بیٹے کو بتاتیں تو زیادہ بہتر ہوتا۔" وہ بھی تحمل کا لبادہ اتار بیٹھی اور بھڑک کر بولی۔ عزتِ نفس پر مار پر مار پڑ رہی تھی۔

"اسے یہ مت کہو گی بلکہ یہ کہو گی کہ تم اس سے شادی نہیں کر سکتیں، اس سے بے وفائی کر رہی ہو۔ اسے محض دھوکا دے رہی تھیں۔

"آپ ہوش میں تو ہیں۔ میں آبص کو یہ سب کیوں کہوں گی۔" نادیہ شاہ کے اعصاب بری طرح جلس گئے۔ "آپ ماں ہیں اس کی، اپنا حق استعمال کریں اور منع کر دیں کہ میں نے نادیہ شاہ کو ریجیکٹ کر دیا ہے۔"

"کچن سے لوازمات کی ٹرے اٹھا کر باہر آتے ہوئے امی کے قدم وہیں تھم گئے۔" منظر ہی ایسا تھا۔

"تم مجھے اتنا احمق سمجھتی ہو۔ مجھے ہی اسے یہ سب کہنا ہوتا اور اسے میرا کہا ماننا ہوتا تو میں یہاں آنے کی زحمت کر لیتی...... یہ اذیت اٹھاتی!"

"تو آپ چاہتی ہیں آپ کے اس جھوٹے اور گھناؤنے کھیل میں حصہ بن جاؤں۔ سوری۔ مجھے نہ جھوٹ بولنے کی عادت ہے نہ دھوکا دینے کی۔" نادیہ شاہ جھٹکے سے صوفے سے اٹھ گئی۔ "یہ کام آپ زیادہ عمدگی سے کر سکیں گی آپ کے پاس سو طریقے ہوں گے۔" وہ سرخ چہرہ لیے جانے کو پلٹی۔

مہوش نے بڑے صبر سے اس کی باتیں سنیں اور پھر امی کی طرف دیکھا جنہوں نے لوازمات سے بھری ٹرے ڈھیلے ہاتھوں سے درمیانی میز پر رکھنے کے بجائے سائیڈ پر رکھی ٹرالی پر ہی رکھ دی تھی۔

"مجھے لگتا ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، کس بات سے۔" امی نے نادیہ کو کمرے کی طرف جاتے دیکھا اور مہوش سے بولیں۔

"آرام سے ہم بیٹھ کر افہام تفہیم سے بات کر لیتے ہیں۔"

کوئی غلط فہمیاں نہیں ہیں۔ آپ بیٹی سے کہیے کہ وہ اپنے دل سے خوش فہمیاں نکال دے آبص سے شادی کے خواب نہ دیکھے۔"

نادیہ نے یکدم رخ موڑ کر مہوش جیلانی کو دیکھا اور دل سے امڈتی غصے کی لہر کو بمشکل روکا۔

"یہ...... آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" ادھر امی ششدرہ رہ گئیں۔ "نہیں...... نہیں...... نادیہ نے آبص سے شادی کی کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔ آبص نے خود ہی یہ خواہش ظاہر کی تھی۔" امی کا انداز دفاعیہ تھا۔

"ہاں...... وہ کیوں کہے گی۔ اس نے تو جال پھیلا دیا تھا جس میں میرا معصوم بچہ پھنس گیا اب وہ اسے پھڑ پھڑاتا دیکھ رہی ہوگی۔ یوں بھی وہ اچھی طرح جانتی ہے شادی کی بات تو مرد ہی کرتا ہے اور اس نے......"

"پلیز آگے ایک لفظ بھی نہ بولیے گا۔" امی یک دم طیش میں آ گئیں۔

نادیہ نے کمرے کے دروازے پر کھڑے امی کو حیرت سے دیکھا۔ اتنے غصے میں اس نے آج سے پہلے کبھی امی کو نہ دیکھا تھا۔ فرط غم اور غصے سے ان کا چہرہ تپ رہا تھا، جسم لرز سا گیا تھا۔

"اس سے پہلے کہ میں آپ کی شان میں کوئی گستاخی کر بیٹھوں۔ بہتر ہوگا آپ یہاں سے تشریف لے جائیے۔"

مہوش اپنا تیر نشانے پر بیٹھا دیکھ کر بے حد پرسکون انداز میں مسکرائیں۔

"چلی تو جاؤں گی مگر یہ بات طے کر کے جاؤں گی کہ آپ کی صاحبزادی آبص کی زندگی سے از خود نکل جائے گی اور آپ خود آبص سے یہ کہیں گی کہ آپ نے اپنی بیٹی کا نکاح اپنے کسی ہوتے سوتے سے کر کے اسے رخصت کر دیا۔"

"ہمیں آبص سے کچھ کہنے کی نہ سننے کی اب ضرورت نہیں رہی۔ آپ جایئے یہاں سے۔" امی دبنگ لہجے میں بولیں۔

"ضرورت تو ہے محترمہ!" مہوش جھٹکے سے صوفے سے اٹھیں۔

"معاملہ ایسے ختم نہیں ہوگا۔ اچھا ٹھہریے۔ میرا خیال ہے اس طرح بات بن جائے۔" انہوں نے کچھ سوچ کر اپنے قیمتی پرس سے چیک بک نکال کر امی کے آگے کر دی۔ "کتنی رقم لیں گی۔ جان چھوڑنے کی۔"

امی کا چہرہ احساس تذلیل سے لال ہو گیا۔ان کی آنکھوں میں دھواں سا بھرنے لگا۔

''برائے مہربانی، آپ یہاں سے چلی جایئے اور یہ رقم کسی مدرسے یا یتیم خانے میں جمع کرا دیجیے اپنے بیٹے کا صدقہ سمجھ کر۔ جایئے۔ ہم عزت دار لوگ ہیں۔ میری بیٹی محبت کو عزت پر ہزار بار قربان کرسکتی ہے۔'' انہوں نے ناگواری سے چیک بک کو دیکھا۔

''میرا خیال ہے مجھے دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔'' مہوش کے لبوں کی سلگتی مسکراہٹ پھر غائب ہو چکی تھی۔ان کی آنکھوں میں شعلوں کی لپک دکھائی دینے لگی۔''آپ کا بیٹا غالباً تیرہ چودہ سال کا ہے نا۔اسکول بھی جاتا ہوگا۔خدانا خواستہ حادثے کا شکار ہو جائے تو بہت دکھ ہوگا آپ کو۔''

''کیا مطلب۔آپ کا؟'' امی نے خوف زدہ نظروں سے مہوش جیلانی کو دیکھا۔نادیہ بھی تڑپ کر کمرے سے نکلی۔

''ارے۔آپ تو ابھی سے ڈر گئیں۔ میں تو بس ممکنہ خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ ہونے کو تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جوان بیٹی پر کوئی انگلی اٹھ جائے۔ ذرا سی غفلت ہو جائے۔تو آپ منہ چھپاتی پھریں گی۔عزت کے لالے پڑ جائیں گے۔''

''آپ، دھمکی دے رہی ہیں امی کو۔'' وہ بری طرح چیخی۔

''ہاں، دھمکی ہی سمجھ لو۔'' مہوش جیلانی پھنکاریں۔ پھر امی کے نزدیک آ کر تنفر سے بولیں۔'' فٹافٹ اس کی شادی کر کے اسے رخصت کیجیے ایک ہفتہ دو ہفتے کے اندر اندر، اگر رشتہ نہیں ملتا تو اپنا گھر بدل ڈالیے۔یوں بھی کرائے کا ہی ہوگا زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی۔سارے رابطے ٹوٹ جانے چاہئیں آبص سے۔اب میں چلتی ہوں۔'' وہ پلٹ کر گھر سے نکل گئیں۔مگر اپنے پیچھے ایسی آگ دہکا کر گئی تھیں جس سے ماں بیٹی کا پور پور جل رہا تھا۔

امی نے بے نور نظروں سے اس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں۔

اسی دن سے ڈرتی تھی۔محبت نامحرم سے ہو تو عزت دار لڑکیوں کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔عورت کو مجروح پرندہ بنا کر رکھ دیتی ہے۔اڑنے کی خواہش اور نہ اڑ سکنے کی بے بسی عمر بھر رلاتی ہے۔اللہ کے بنائے قانون میں راحت ہے۔تحفظ ہے۔جہاں کوتاہی ہوئی تکلیف شروع۔من پسند نامحرم کا ہاتھ پکڑ لینے سے منزل نہیں مل جایا کرتی، راستوں کی فقط گرد ملتی ہے۔صاف کرتے رہو اور تڑپتے رہو۔

وہ اہانت کے احساس سے چور چور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ایسی بے بسی ایسی ذلت کا تو تصور بھی نہ کیا تھا۔ایسا لگ رہا تھا بہت اونچائی سے گری ہو۔پتھریلی زمین پر۔

امی کی سسکیاں اس کے کانوں سے ٹکرانے لگیں۔

''خدا اسے سمجھے۔چار پیسوں کا ایسا غرور کہ کسی کی عزت کو روند کر چلی جاؤ۔دیکھ لینا ترسے گی یہ عورت اپنے بیٹے کی خوشی دیکھنے کو۔''

''نہیں نہیں امی خدارا ایسا نہ کہیے۔'' امی کی بددعائیں اس کا کلیجہ پھاڑنے لگیں۔کہیں کوئی آہ بددعا آبص کو نہ لگ جائے۔

امی کی سسکیاں، ان کا تڑپنا، بے بس چیخیں بددعاؤں کی صورت نکل رہی تھیں۔

☆☆☆

کچھ حادثوں سے گر گئے محسن زمین پر
ہم رشکِ آسمان تھے ابھی کل کی بات ہے

UUNOVELS.COM

نصیر کاکا اس کے لیے گرم گرم چائے بنا لائے تھے وہ ابھی آفس سے لوٹا تھا لہٰذا کپڑے بدل کر یونہی ستانے بیڈ پر بیٹھ کر چائے کی چسکیاں بھرنے لگا۔

"گھر میں آج اتنی خاموشی کیوں ہے۔ روبی اور مما کہاں ہیں۔ کہیں گئی ہیں کیا؟" اس نے کمرے سے نکلتے نصیر کاکا سے پوچھا۔

نصیر کاکا نے گویا اس کی تھکن کو بڑھا ہی دیا اس کا سارا سکون غارت ہو کر رہ گیا جب انہوں نے بتایا کہ بڑی بی بی روبی بی بی اور اکبر صاحب اس کی ہونے والی سسرال گئے ہیں اس کا رشتہ پکا کرنے۔

وہ دم بخود رہ گیا اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ مہوش یہ قدم اٹھالیں گی۔

اس کی خاموشی پر نصیر کاکا کو افسوس اور غلطی کا احساس ہوا کہ انہوں نے بتا کر شاید جلد بازی کا مظاہرہ کر ڈالا۔

"آ۔۔۔آپ آرام کرلیں۔ تھکن اتار لیں۔ بی بی بس آتی ہی ہوں گی۔"

"تھکن تو آپ نے بڑھا دی نصیر کاکا۔" اس نے چائے کا کپ ایک طرف رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں جلن اور لہو میں کھولن سی ہونے لگی۔

"اللہ خیر کرے گا آپ فکر نہ کریں۔" وہ گھبرا کر کمرے سے نکل گئے۔

اس نے خود کو بیڈ پر گرا لیا اور سختی آنکھیں میچ لیں۔

"یہ کیا کردیا مما نے۔" اس نے شدید ترین بے بسی سے خود کو گزرتا محسوس کیا۔ پھر سگریٹ سلگا کر کتنی دیر سگریٹ پھونکتا رہا۔ کمرا گہرے دھوئیں سے بھر گیا مگر اسے تو اپنے اندر اس سے بھی زیادہ دھواں بھرا ہوا محسوس ہو رہا تھا جسے نکلنے کو راستہ نہ مل رہا تھا۔

وہ بیڈ سے اترا اور اسٹک کے سہارے چلتا ہوا کھڑکی پر آ کر باہر نیم اندھیرے کو گھورنے لگا۔ اسے لگا مہوش نے اس کے اندر سے جینے کی جو موہوم سی خواہش رہ گئی تھی وہ بھی ختم کردی ہو۔ دل میں بے نام سا سناٹا پھیلنے لگا تھا۔ سکون تو تھا ہی نہیں اب وحشت بھی نہ رہی ہو۔ جیسے اعصاب منجمد ہو گئے ہوں۔ ساری سوچیں ختم ہو گئی ہوں۔ دل بے نور ہو چکا ہو۔ اس نے جھک کر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی اور دوبارہ بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد روبی بے حد پر جوش انداز میں اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور اپنے تئیں بہت بڑی خوش خبری سنانے لگی کہ وہ لوگ ارسلہ کو اس کے نام کی انگوٹھی پہنا آئے ہیں۔

مہوش کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا تھا۔ پیچھے اکبر جیلانی چلے آرہے تھے۔

"بھئی مان گئے تمہاری مما کو۔ کمال کی عورت ہے اقرار کروا کے دم لیا۔ میں تو حیران رہ گیا کس طرح سب کو شیشے میں اتار لیا، داد تو بنتی ہے۔"

"میرے بیٹے میں بھی کس بات کی کمی ہے۔ انکار کر ہی نہیں سکتے تھے۔ آبص جیسا لڑکا چراغ ڈھونڈنے سے نہ ملے انہیں۔"

مہوش آبص پر صدقے واری جاتے ہوئے بولیں اور ڈبا کھول کر گلاب جامن اٹھا کر آبص کی طرف بڑھایا جسے آبص نے نرمی سے ایک طرف ہٹا دیا۔ اس کے چہرے پر کوئی خوشی، حیرت یا اشتیاق دکھائی نہ دے رہا تھا۔ ایک گمبھیر سناٹا سا تھا۔

"میری زندگی کا فیصلہ میری مرضی میری رضا کے بغیر کردیا۔ ایٹ لیسٹ مجھے بتا کر ہی جاتیں۔" اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے تمہیں ڈائمنڈ کی وہ رنگ دکھائی تھی اور کہا تھا کہ میں یہ رنگ ارسلہ کو پہنا کر ہی

آؤں گی اس وقت تمہیں کوئی آبجیکشن (اعتراض) نہیں تھا۔ تم نے کہا بھی تھا کہ تم ایک فرماں بردار بیٹے رہو گے۔ کہا تھا نا۔" مہوش اسے اس کی کہی ہوئی بات یاد دلانے لگیں۔ وہ مغموم انداز میں ہنس دیا۔

"ہاں کہا تھا۔" اس نے متاسفانہ نظروں سے مہوش کو دیکھا۔

"کتنی عجیب بات ہے اس وقت بھی نہ میرے لہجے میں رضامندی تھی نہ خوشی کی کوئی رمق اور آپ ماں ہو کر یہ رنگ نہ پہچان پائیں۔ میں حیران ہوں۔ آپ جان کر نظر انداز کر رہی ہیں مام، کیوں۔ کیوں آپ مجھے بھی اور آنے والی کو امتحان میں ڈال رہی ہیں؟"

"ایسا نہیں ہے میری جان!" مہوش تڑپ کر اس کے نزدیک آ بیٹھیں۔

"میں تمہیں اس فضول بے وفا لڑکی کے لیے تڑپتے سسکتے نہیں دیکھ سکتی۔ تم میرے اکلوتے بیٹے ہو۔ تمہیں یوں برباد ہونے کے لیے کیسے چھوڑ دوں۔"

"اوکے۔" وہ یک دم ان کا ہاتھ جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔" جو آپ کو کرنا تھا کر لیا۔ مگر یاد رکھیے گا میں ایک بار پھر ہرا رہا ہوں۔ مجھے جہاں تک اپنا رول پلے کرنا ہو گا کروں گا۔ باقی ساری ریسپانسیبلیٹی (ذمہ داری) آپ کی ہو گی۔" وہ دبے دبے لہجے میں بھڑکا۔ اس کے لہجے میں اتنی تلخی تھی کہ مہوش کو لگا تلخی بھرا کوئی جام الٹ گیا ہو۔

اکبر جیلانی نے مہوش کو دیکھا۔ انہیں پورا یقین تھا وہ یہاں بھی معاملہ سنبھال لیں گی۔ وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گئے۔

پگلے، تم ارسلہ سے ملو گے...... اس کو دیکھو گے تو تمہارے زخم خود ہی مندمل ہونے لگیں گے۔ شی از ویری پریٹی۔ (وہ بہت حسین ہے)

"آپ جانتی ہیں اچھی طرح حسن میری ڈیمانڈ نہیں ہے۔"

"اوکے۔" مگر آبص، میں تمہارے لیے، بہتر سوچوں گی۔ تمہاری دشمن نہیں ہوں......"

"ہاں دوست سمجھتا تھا میں بھی۔"

"میں آج بھی تمہاری دوست ہوں۔" انہوں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھنا چاہا وہ بدک سا گیا۔ وہ شدید انتشار کا شکار تھا۔

"بلیوی۔ وہ تم سے کوئی ڈیمانڈ (مطالبہ) نہیں کرے گی۔"

"کیسی ڈیمانڈ؟" اس نے تعجب سے مہوش کو دیکھا پھر استہزائیہ آمیز انداز میں سر کو جنبش دی۔" یہ کیسے ممکن ہے ایک لڑکی جو شادی کر کے ایک اجنبی کی محرم بننے جا رہی ہو، اسے چاہنے اور چاہے جانے کی طلب نہ ہو گی۔ اسے شوہر کا بھروسا۔ اعتماد نہیں چاہیے ہو گا...... کون سی ایسی لڑکی ہو گی جسے محبت کی طلب نہ ہو گی۔"

"سویٹ ہارٹ۔ وہ ایک چھوٹے سے گھر کی لڑکی ہے جہاں اعلا تو کیا بنیادی ضرورتوں کا بھی فقدان ہے۔ اس کے اونچے خواب ہیں۔ اونچے گھرانے کی بہو بننے کے۔ اور یہ اس کی فطری خواہش ہے جو ایسی کوئی غلط بھی نہیں ہے۔ جس نے جو شے دیکھی نہ ہو اس کی طلب فطری بات ہے۔ ہماری یہ کوٹھی اس کے خوابوں کا محل ہے جہاں وہ بہت خوش رہے گی۔"

مہوش کی یہ باتیں اسے مزید الجھا رہی تھیں۔ وہ حیران تھا۔ دل تو یہ بھی چاہ رہا تھا کہ ماں کی عقل اور فراست کو داد دے۔

"تو آپ سودا کر کے آئی ہیں۔" اس کا دل کبیدہ سا ہونے لگا۔ وہ اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں چلا آیا۔

اس کی ماں نے اس کے ظاہری باتنی عیب پر دولت کا غلاف چڑھا کر پیش کیا تھا۔ پتا نہیں کیسا سودا کر کے آئی تھیں اور وہ سوچ سوچ کر حیران تھا کہ نادیہ شاہ بھی تو ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی جہاں بنیادی سہولتوں

کا فقدان تھا۔ مگر اس نے تو محلوں کے خواب نہ دیکھے تھے۔ اس نے تو دولت کی چاہ نہ کی تھی۔ وہ تو چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش مند تھی۔ محبت کی طلب گار تھی۔

محبت تو روح ہے یہ نکال دی جائے تو جسم کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے۔ اس کی قیمت کیا بنتی ہے۔

مہوش نے ڈھیر ساری مٹھائی ملازموں میں تقسیم کروادی تمام عزیز و اقارب میں بھی بھجوادی تھی۔ اکبر جیلانی خاصے خوف زدہ سے تھے۔ مگر مہوش کا اعتماد دیکھ کر بظاہر باہمت دکھائی دے رہے تھے۔

''دھواں نکل جائے تو اچھا ہوتا ہے۔ پرسکون ہو جائے گا۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔''

''وہ کوئی بے مول نہیں ہے کہ میں اسے حالات کے دھارے پر چھوڑ دوں گی کہ وہ کمرے میں بند اس کے دو ٹکے کی لڑکی کی یادوں میں سلگ سلگ کر ختم ہو جائے۔ اسے ایک بھرپور زندگی گزارنی ہے۔ اس کوٹھی میں اس کی نسلیں چلانی ہیں۔

اور آبص بھی جانتا تھا یہ زہر تو اسے پینا ہی پڑے گا وہ مجنوں بن کر صحرا کی خاک نہیں چھان سکتا تھا۔ سو چپ رہا اور یہی چپ مہوش کے لیے غنیمت تھی۔

☆☆☆

گر دعا بھی کوئی چیز ہے تو دعا کے حوالے کیا
جا تجھے آج سے ہم نے اپنے خدا کے حوالے کیا
اس طرح ہم نے تیری محبت زمانے کے ہاتھوں میں دی
جس طرح گل نے خوشبو کو بادصبا کے حوالے کیا

نیلوفر کچھ دیر تو کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر اس کے سامنے بنی سیمنٹ کی کنی پر آ کر بیٹھ گئی۔ مگر وہ یونہی کیاری پر بیٹھا کیاری سے چھوٹے چھوٹے کنکر اٹھا اٹھا کر دیوار پر مار رہا تھا۔

ایک، دو، تین، چار، چوتھے پتھر پر نیلوفر نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے اس عمل سے روک دیا۔

''یہ کنکر تمہیں دیوار پر نہیں ارسلہ کے سر پر مارنے چاہیے تھے۔ بزدلوں کی طرح اٹھ کر وہاں سے آ گئے الٹا اسے مبارک باد بھی دے ڈالی۔''

''تو کیا کرتا۔'' اس نے گردن موڑ کر نیلوفر کو دیکھا۔

''اس کی انگلی سے انگوٹھی اتار کر اس کے منہ پر کھینچ مارتے۔''

''اچھا......'' وہ ہلکے سے ہنسا۔ ''ایسا تو اس وقت کرتا جب اس نے بھی مجھ سے محبت کا دعوا کیا ہوتا۔ اس نے کوئی دھوکا تو نہیں دیا۔ اس نے کب مجھ سے محبت کی تھی۔ ورنہ انگوٹھی تو کیا خود اسے اٹھا کر دیوار پر دے مارتا۔''

وہ ہاتھ جھاڑ کر کیاری سے اٹھ گیا۔ ''سچ کہوں نیلوفر۔ اس نے بھی میرے جذبوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ پلٹ کر میرے منہ پر ہی مارا ہے۔ اس نے اپنے خوابوں کو اپنی خواہشوں کو دبا کر دل میں چھپا کر نہیں رکھا انہیں بے لگام رکھا، سرپٹ گھوڑے کی طرح دوڑتے دکھائی دیے۔ میں ہی بس اس کے پیچھے بھاگے جا رہا تھا۔'' وہ افسردگی سے کہہ رہا تھا۔ نیلوفر نے ہلکی سی سانس کھینچی۔

''اگر ایسا ہے تو پھر سوگ کس بات کا منا رہے ہو۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''اب اتنی ظالم تو نہ بنو۔'' وہ تڑپ کر رہ گیا۔ ''دل ٹوٹا ہے یار، یکطرفہ سفر تھا تو کیا ہوا سفر تو کیا تھا نا۔ منزل تک نہ پہنچے کا قلق اپنی جگہ۔

''تم کب تک یہ قلق لے کر بیٹھو گے۔ بالکل بھی اچھے نہیں لگتے یوں منہ لٹکائے۔'' نیلوفر ہنسی۔ مگر اس کی ہنسی

میں اداسی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔
''چلو آج کے بعد نہیں لٹکاؤں گا۔ یہ بتاؤ تیاریاں کیسی جارہی ہیں۔''
''کہاں۔ تم آؤ تو کام ہوں۔ بیسیوں کام پڑے ہیں۔''
''ذرا یہ تو بتاؤ تم مجھے سمجھانے آئی تھیں یا انتقام کا جذبہ بھڑکانے۔'' وہ اسے چھیڑنے لگا۔ پھر اس کے گھورنے پر ہنس پڑا۔ ''ارے بابا۔ ابھی کہہ رہی تھیں نا انگوٹھی اتار کر اس کے منہ پر کیوں نہیں کھینچ ماری۔ بزدلوں کی طرح وہاں سے چلا آیا، وغیرہ وغیرہ۔''
''ہاں۔ یہ بھی کہنے آئی تھی مگر تم نے تو ٹھنڈا ہی کر دیا۔ یکطرفہ والی بات کر کے۔'' نیلوفر نے سادگی سے تسلیم کر لیا۔ ''ویسے ایک اور کام سے بھی آئی تھی۔'' وہ اٹھ کر اس کے نزدیک آئی پھر دوپٹے کا پلو اٹھا کر احتیاط سے اس کی گرہ کھولنے لگی۔
''ایک میرا ضروری کام تھا تم سے۔ چپ چاپ کر دو۔'' وہ گرہ کھول کر سونے کی بالی کی جوڑی اور سونے کی ایک انگوٹھی نکال کر سکندر کے آگے کرتے ہوئے بولی۔
''اسے بیچ دو۔''
''کیا مطلب...... اسے بیچ دو......!'' سکندر نے حیرت سے اس کی ہتھیلی پر چمکتی بالیوں اور انگوٹھی کو دیکھا اور نیلوفر کو گھورا۔ ''اسے بیچنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟''
''سو ضرورتیں ہوتی ہیں سکندر! یہ کیا سوال ہے۔ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔''
''کتنے؟'' سکندر کا لہجہ سنجیدگی کے ساتھ خفگی میں ڈھل گیا۔
''ارے بھئی، جو بھی ملیں اس کے۔ اب یہ میرے کس کام کی۔'' نیلوفر اس کی خفگی نظر انداز کر گئی۔
''اسے رکھو۔'' سکندر نے یک دم ترشی سے کہتے ہوئے دونوں چیزیں اس کی ہتھیلی پر دوبارہ رکھ دیں۔ ''اور سنو، آئندہ اس طرح کے فضول اور احمقانہ کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پیسے چاہئیں ہیں تو......''
''ہاں، بہت ہیں تمہارے پاس۔'' وہ بھی جواباً ناراضی سے اس کی بات کاٹ گئی۔
''بالکل۔ بولو کتنے چاہئیں؟''
''نہیں سکندر! تم پہلے ہی ہماری اتنی مالی مدد کر چکے ہو۔ اب مزید شرمندہ مت کرو۔ دیکھو پلیز: مجھے اپنی پرسنل کچھ چیزیں لینی ہیں۔'' وہ اسے قائل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ''اور یہ کی بھی کچھ چھوٹی موٹی چیزیں ہیں، اب ابا سے مانگتے ہوئے شرم آتی ہے اور پھر یہ میرے کام کی بھی نہیں ہیں۔ مجھے خوشی ہوگی میں بڑی بہن ہو کر بیا کی چھوٹی موٹی خواہشات پوری کر سکوں۔''
سکندر بڑے تحمل سے اس کی بات سن رہا تھا۔ نہ ٹوکا، نہ خفا ہوا، نہ تسلسل توڑا۔
''تم پہلے ہی ہمارے لیے اتنا کچھ کر چکے ہو۔ بھائی کہتے ہی نہیں ہو، بھائی بن کر دکھا بھی دیا ہے تم نے سکندر! اب پلیز۔ مجھے سر اٹھانے کے لیے تھوڑی سی جگہ رہنے دو۔'' احساس تشکر سے اس کی پلکیں بھیگنے لگیں۔ اس کی آواز بھرا گئی۔
''جب بھائی ہوں نا تو پھر سر اٹھا کر کھڑی رہو میرے سامنے۔'' سکندر نے نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔
''بلکہ تن کر کھڑی رہو۔ سچ کہتا ہوں' سر اٹھا کر کھڑی رہنا ساری عمر۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اس کی مٹھی بند کر دی۔
نیلوفر کی گداز ہتھیلی کی بند مٹھی میں انگوٹھی اور بالیاں گم ہو گئیں۔ آنسو بے آواز پلکوں کی باڑھ توڑ کر

رخساروں پر بہہ نکلے۔
''ارے۔'' سکندر نے جوں ہی ہاتھ آگے کیا، نیلوفر پیچھے ہوگئی اور اس کا ہاتھ اپنی چہرے سے دور کرلیا۔
''نہیں۔ مجھے رونے دو سکندر! آج رونے دو۔ جی بھر کر رونے دو۔ جی کا غبار نکالنے دو۔ پھر نہیں روؤں گی۔ سچ کہوں یہ آنسو اپنی کم مائیگی کے احساس سے نہیں نکل رہے بلکہ ارسلہ کی بدنصیبی پر امڈ رہے ہیں۔ اس نے پایا کیا ہے یہ تو خبر نہیں، خدا جانے مگر جو کھو دیا ہے وہ بہت زیادہ ہے۔''
''خدا نہ کرے نیلو!'' سکندر جیسے تڑپ کر رہ گیا۔ ''خدا اسے بہت ساری خوشیاں دے۔ اسے کسی امتحان سے نہ گزارے۔''
نیلو دل گرفتگی سے مسکرانے لگی اور آنسو پونچھ کر ڈھیلے ہاتھوں سے بالیاں اور انگوٹھی دوپٹے کے پلو میں باندھتے ہوئے بولی۔
''خدا کرے تمہاری یہ دعائیں ان دیواروں کے پار تک پہنچ جائیں جو وہ کھڑی کر رہی ہے۔''
سکندر نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔
نیلوفر سر ہلا کر ہنسی۔ عجیب دل دوز ہنسی تھی۔
''جو دیواریں انسان خود اپنے ہاتھوں سے کھڑی کرتا ہے نا اپنے اردگرد، اس سے دعائیں بھی ٹکرا کر واپس لوٹ جاتی ہیں۔ اس سے تو بہتر ہے بددعائیں دے دو اسے سکندر! شاید وہ لگ جائیں اور تمہارا کام بن جائے۔ اس کمینی کا رشتہ وہاں ہوتے ہوتے رہ جائے۔'' وہ یہ کہہ کر رکی نہیں، نہ پلٹ کر سکندر کے دھواں ہوتے چہرہ کو دیکھا۔ بس گیٹ عبور کر گئی تھی۔
سکندر کے اعصاب پر یہ حملہ بے حد شدید تھا۔ وہ ٹراؤزر کی جیبوں سے ہاتھ نکال کر ڈھیلے انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ یوں جیسے بہت تھکا ہوا، اس کرسی تک بامشکل پہنچا ہو اور چلنے کا یارا نہ ہو۔
روح کی تھکن بڑی اذیت آمیز ہوتی ہے۔ نہیں اترتی چاہے کتنی نیندیں پوری کرلو، کتنا آرام کرلو۔ یہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔
''یہ نیلو کو بھی بڑے پتھر مارنے آ گئے ہیں۔'' وہ افسردگی سے ہنسا۔ ''پاگل نیلو...... کم فہم نیلو...... اسے کیا پتا محبت کرنے والے بددعائیں بھی پھولوں کی طرح جھولی میں بھر لیں گے مگر بددعائیں دیتے نہیں ہیں۔ یہ تو محبت کی توہین ہے۔''

☆☆☆

ڈور بیل بجی تو ارسلہ کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے سنبھل کر کھڑکی میں جھانکا۔ اریبہ داخلی دروازہ کھولنے جا رہی تھی۔ اس نے جلدی سے سر اندر کر کے پردہ گرا لیا اور آئینے کے سامنے جا کر میک اپ کا آخری ٹچ دینے لگی۔ لپ اسٹک کا آخری ٹچ ہونٹوں پر پھیرا، پرس اٹھایا اور دوپٹا اچھی طرح کندھے پر پھیلا کر باہر نکلنے سے پہلے دروازے پر رک گئی۔ اماں روی کو دیکھ کر حیران بھی تھیں اور بوکھلائی ہوئی بھی دکھائی دے رہی تھیں۔
''ارے بیٹا! تم...... آؤ آؤ...... بیٹھو۔'' اماں تخت کی چادر درست کر کے بچھانے لگیں۔
''نہیں آنٹی! بیٹھنے کا بالکل ٹائم نہیں ہے۔ بس ارسلہ کو لینے آئی ہوں۔'' وہ بولی پھر ابا کے کمرے سے نکلتی نیلوفر کو سلام کر کے بولی۔
''کیسی ہیں آپ؟''
''وعلیکم السلام! ٹھیک ہوں۔ خیریت تو ہے ارسلہ کو لینے...... کیا مطلب؟'' اماں کے منہ کی بات نیلوفر نے پوچھ ڈالی۔

"ارے......آپ کو نہیں پتا۔" وہ چونکی۔ تعجب سے اماں کے چہرے پر پھیلے سوال کو دیکھا۔ "ارسلہ نے بتایا نہیں شاید آپ کو۔" پھر ہنس کر بولی۔ "لگتا ہے مما کی بھی کال نہیں آئی آپ کو۔"

"نہیں۔ تمہاری اماں کی تو کوئی کال نہیں آئی۔ خیر تم بیٹھو تو سہی۔" اماں اخلاقاً کرسی اس کو پیش کرنے لگیں۔

"دراصل، میں ارسلہ کو اپنے ہمراہ شاپنگ پر ساتھ لے جانے آئی ہوں۔ مما کا خیال ہے کہ نکاح کا جوڑا ارسلہ کی پسند کا ہی ہونا چاہیے۔ پہننا بھی تو اسی کو ہے نا۔" وہ کہنے لگی۔ اماں اور نیلوفر کو تو سن کر حیرت کا اچھا خاصا جھٹکا لگا۔

"نکاح کا جوڑا...... کک...... کیا مطلب؟"

"مما آپ کو کال کریں گی آنٹی! دراصل ہم منگنی کے بجائے نکاح کا ارادہ رکھتے ہیں۔ نیلو آپا کی شادی کی ساتھ آبص بھائی ار ارسلہ کا نکاح بھی ہو جائے گا۔ ارے آپ پریشان نہ ہوں، پاپا نے کہا ہے وہ انکل سے خود بات کریں گے اور ماما بھی آپ کو کال کریں گی۔ آپ تو بہت پریشان ہو گئیں۔ پلیز ارسلہ کو بلا دیجیے نا۔"

رومی اماں کو حیرت سے بت بنے دیکھ کر سٹپٹا رہی تھی۔ نیلوفر الگ اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اماں کچھ کہنے کی پوزیشن میں آئیں تو ارسلہ کمرے سے نکلی اور رومی سے لپٹ گئی۔

"آپ تیار ہیں۔" رومی اسے دیکھتے ہی بولی۔

"ہاں، میں تیار ہوں۔" وہ مسکرائی۔

نیلوفر نے اماں کو دیکھا جو گم صم سی تھیں یا شاید اس حیرت کے جھٹکوں کو سنبھال کر کچھ کہنے کو الفاظ ڈھونڈ رہی تھیں۔ انہوں نے ارسلہ کی اتنی جرأت پر غور ہی نہ کیا تھا جو رومی سے پہلے ہی پروگرام بنا چکی تھی اور تیار شیار ہو کر کمرے سے نکلی تھی رومی کے ہمراہ جانے کو۔ گویا اسے اماں کی اجازت کی ضرورت نہ تھی۔

اماں کا تخت پر رکھا موبائل بجنے لگا تو اماں جیسے ہوش میں آئیں۔

"لگتا ہے ماما کی کال ہو گی۔ او کے آنٹی! آپ ان سے بات کر کے تسلی کر لیجیے، میں ارسلہ کو لے کر جا رہی ہوں۔ آئیں۔" اس نے ارسلہ کی طرف دیکھا۔ ارسلہ نے یوں ہی نیلوفر پر ایک نظر ڈالی پھر یک دم نظریں چرا کر رومی کے ہمراہ گھر سے نکل گئی...... ادھر اماں مہوش سے باتوں میں مصروف تھیں۔

نیلوفر کو ارسلہ کی اس غیر ذمہ دارانہ اور جرأت مندانہ حرکت پر جی بھر کر غصہ آیا۔

"آپا! یہ نکاح کی کیا کہانی ہے۔ ابھی تو منگنی بھی نہیں ہوئی۔ ہم تو آبص بھائی سے ملے بھی نہیں ہیں۔"

اریبہ ہمیشہ کی طرح سوالیہ نشان بن کر نیلوفر کے سر پر کھڑی ہو گئی۔

نیلوفر متاسفانہ سی سانس بھر کر رہ گئی۔

"چھوڑو۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ بے چارے اماں ابا......"

"اگر دیکھا جائے تو ارسلہ آپا لکی ہیں جو چاہا، پا لیا انہوں نے......اور ابا اماں بھی مان گئے۔"

"تمہیں کوئی اور کام نہیں ہے جو فضول باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو۔ بس دعا کرو، جو ہو رہا ہے اس میں اللہ خیر اور بھلائی ڈال دے۔ اس سر پھری لڑکی کو عقل دے دے۔"

نیلوفر اٹھ کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ یوں ہی اماں پر ایک نظر ڈالی جو نہایت شائستگی سے مہوش سے گفت و شنید میں مصروف تھیں۔ لہجے میں ہی نہیں ان کا پورا وجود ہی گویا ان کی ہر بات کی تائید کر رہا تھا۔ وہ چپ چاپ باورچی خانے کا پھیلاوا سمیٹنے لگی۔

ارسلہ، رومی کی گاڑی میں آ کر بیٹھی تو فرنٹ سیٹ پر بیٹھے آبص کو دیکھ کر اس کا دل حیرت اور خوشی سے کچھ اور تیز دھڑکنے لگا۔

''یہ آبص بھائی ہیں۔'' رومی دبی زبان میں تعارف کراتے ہوئے بولی۔ اس نے دیکھا، سنجیدگی سے بیٹھا ہوا شخص کسی شہزادے کی آن بان لیے ہوئے تھا۔ ارسلہ رومی سے نظریں بچا کر اسے دیکھنے لگی۔

یہ تو تصویر سے کہیں زیادہ چارمنگ، ڈشنگ ہے۔ وہ عین پچھلی سیٹ پر اس کے پیچھے ہی بیٹھی تھی۔ گاڑی کسی رواں پانی کی طرح سڑک پر بہنے لگی تھی اور اس سے کہیں زیادہ اس کا دل اس شہزادے کی جانب بہہ رہا تھا۔

آج تو رومی کی گاڑی بھی کچھ انوکھی انوکھی دل نشیں سی محسوس ہو رہی تھی۔ بند شیشوں کے اندر اے سی کی خنک ریز ہوائیں اور اس میں آبص کی موجودگی کا احساس ایک خواب ناک ماحول بنا رہا تھا۔ اسے تو لگ رہا تھا وہ حسین خواب دیکھ رہی ہو۔ اس نے کن انکھیوں سے جب جب آبص کو دیکھا مگر سوائے اس کی اٹھی ہوئی گردن اور چمکتے بالوں کو کچھ نہ دکھائی دیا۔ جانے راستہ کیسے کٹ گیا، اسے خبر ہی نہ ہوئی۔ شاپنگ مال کے پارکنگ میں گاڑی رکی تو رومی نیچے اتر گئی۔ لامحالہ اسے بھی اترنا تھا۔ گاڑی ریورس ہو کر پارکنگ سے نکلنے لگی۔ ارسلہ کا دل بجھ سا گیا۔

''کیا یہ ہمارے ساتھ نہیں آئیں گے۔'' اس سے رہا نہ گیا۔

''ارے کہاں۔ انہیں لیڈیز شاپنگ کا کوئی تجربہ نہیں بلکہ سرے سے پسند ہی نہیں ہے۔''

رومی کے ہمراہ وہ لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی توجہ آبص سے ہٹ کر شاپنگ مال کی جانب ہو چکی تھی۔ اتنے بڑے مال میں پہلی بار آئی تھی، بڑی بڑی روشنیوں سے نہائے بوتیکس اس کی توجہ کا مرکز تھے۔ وہ خوش گوار حیرت سمیٹے، پاگلوں کی طرح دیکھے جا رہی تھی۔ رومی جب اس کا ہاتھ پکڑ کر برانڈڈ ڈریس پسند کرانے لگی تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کس شے پر ہاتھ رکھے، کس کو رد کرے۔ اسے تو ہر چیز پسند آ رہی تھی۔ جب وہ دونوں لہنگا دیکھنے لگیں اور جیسے ہی پرائس کا معلوم ہوا ''دو لاکھ'' اسے لگا وہ بے ہوش ہی نہ ہو جائے۔

ہائے۔ یہ کپڑے لاکھوں کے بھی ہوتے ہیں اور ہوتے تو ہوں گے مگر میرے لیے کبھی اتنی مہنگی شاپنگ بھی ہوگی۔ یہ میں نے سوچا نہیں تھا۔

رومی جس چیز پر ہاتھ رکھ کر پوچھتی۔ ''یہ کیسا ہے...... پسند ہے آپ کو......'' وہ سر ہلا دیتی۔

''کمال ہے۔ یہ کیا بات ہوئی۔ آپ کی اپنی بھی تو کوئی چوائس ہوگی۔'' رومی ہنسنے لگی۔

''مجھے تو سب کچھ اچھا لگ رہا ہے۔ تمہاری چوائس بھی لاجواب ہے اور پھر مجھے اتنا آئیڈیا بھی تو نہیں ہے۔ کبھی اتنے بڑے شاپنگ مال میں آ کر شاپنگ جو نہیں کی۔'' وہ خفت کے احساس کے ساتھ بولی۔

مہوش جیلانی بھی آ گئی تھیں۔ دونوں ماں بیٹی کھل کر شاپنگ کر رہی تھیں۔ کپڑے، جیولری، سینڈل، پرس...... جانے کیا کچھ خریدتی رہیں اور وہ حیرت کے مارے مرتے مرتے بچی۔

یا اللہ! یہ پیسہ کہاں سے آتا ہے لوگوں کے پاس۔ ایسا کوئی درخت میرے گھر پر بھی لگ جاتا۔ مہینے کے آخر میں تو اماں ڈبوں اور باورچی خانے کے کیبنٹس کو کھنگال کر روپے ڈھونڈتیں۔ ابا چند ہزار کی تنخواہ اماں کے ہاتھ پر یوں رکھتے گویا بلینک چیک رکھ رہے ہوں اور اماں کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح دمک جاتا۔ جیسے یہ سارے پیسے ان کی ذاتی شاپنگ پر خرچ ہونے تھے۔ بے چاری اماں کبھی جو اف کی ہو۔ یہاں تو یہ عالم کہ بڑی بڑی نوٹوں کی گڈیوں کو چٹکیوں میں اڑا جا رہا تھا۔

☆☆☆

اماں ابا کی منتظر تھیں۔ جوں ہی ابا آئیں وہ انہیں ساری روداد سنا دیں۔ شام سے سینے پر بوجھ دھرے بیٹھی

تھیں۔ یہ نکاح والی بات ہضم نہ ہو رہی تھی۔ اس پر ارسلہ کا شاپنگ پر چلے جانا اور اتنی ڈھیر ساری شاپنگ کا احوال۔ ابا آئے تو وہ انہیں کھانا دیتے ہوئے ہی ساری بات بتانے لگیں۔ مگر ابا کے چہرے پر پھیلا اطمینان قابل دید تھا۔ وہ مسکرائے۔

''نیک بخت! یہ الجھن نہیں ہے۔ ساری فکریں اب ایک طرف ڈال دو، یہ واہمے اندیشے نکال دو۔ یوں سمجھو ہم کو اللہ کی طرف سے مدد ملی ہے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''ارے بہت اچھے لوگ ہیں۔ اکبر جیلانی اور ان کے خاندان کی ساری انکوائری نکلوالی میں نے۔ بڑی تعریفیں سننے کو ملی ہیں اور خود اکبر جیلانی مجھے اپنے آفس لے کر گئے تھے آج۔ ملاقات کی اور اتنی عزت دی کہ بتا نہیں سکتا۔''

''اچھا، تب ہی کہوں لیٹ ہو گئے اور بڑے خوش بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا باتیں ہوئیں، کیسا ہے آفس؟''

''ارے آفس کو چھوڑو۔ باتیں کیا ہوئیں یہ پوچھو۔ بس یوں سمجھو ہماری ارسلہ کے بخت جاگ گئے ہیں اور ہماری لاٹری نکل آئی ہے۔''

''اب کھل کر بات بھی کریں۔ پہیلیاں نہ بجھوائیں۔'' اماں تنک گئیں۔

''اللہ نے میری دعا سن لی۔ نیلوفر کی شادی کے خرچے کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اکبر جیلانی نے یہ کہہ کر مشکل آسان کر دی کہ ارسلہ کا نکاح، کھانا ان کی طرف سے ہوگا۔ یعنی نیلوفر کی شادی اور ارسلہ کے نکاح کی ساری دعوت کا خرچا اکبر جیلانی خود کریں گے۔ بھئی وہ اپنے شایان شان کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی طرف سے بیٹے کے نکاح میں بڑے بڑے کاروباری لوگ شرکت کریں گے تو بھلا ہماری کیا اوقات کہ ہم اتنی بڑی اور ان کے شایان شان دعوت کر سکیں گے۔ یوں وہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے تو پہلے انکار بھی کیا مگر انہوں نے بہت زور دیا اور کہا کہ ان کے تمام جاننے والوں میں ان کی عزت ہے۔ ہم پر وہ کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے۔'' ابا نے بات ختم کر کے اماں کی طرف تائید چاہنے والی نظروں سے دیکھا۔ مگر اماں کے چہرے پر خوشی اور بے یقینی کے ساتھ فکرمندی بھی جھلک رہی تھی۔

''بات تو خوشی کی ہے۔'' اماں نے سر ہلایا۔ ان کے انداز میں تائید تھی۔ بات تو دہری خوشی کی تھی، ایک عزت کو سنبھالا بھی مل جاتا اور دوسرا ارسلہ کی خواہش کی کشتی کو کنارہ بھی مل رہا تھا۔ مگر واہمہ اپنی جگہ......

''اب کیا اندیشہ ہے تمہیں؟'' ابا نے مسہری پر آ کر بیٹھتے ہوئے اماں کے گم صم وجود کو دیکھا جو سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

''اندیشہ تو نہیں رہا مگر میں کہتی ہوں تحقیق تو کرنی چاہیے۔ آپ ان سے مل تو لیں۔ آخر بیٹی دے رہے ہیں، عمر بھر کی کمائی دے رہے ہیں، کوئی کھیل تھوڑا ہی ہے۔''

''ارے تو میں نے کب انکار کیا ہے۔ ملنا تو ہے ہی۔''

''بس تو پھر...... آپ ایک دن رکھ لیں، آپ ان سے ملاقات کا اور سکندر اور فیاض بھائی کو بھی ساتھ لے جائیے گا۔ تسلی ہو جائے تو اچھا ہے۔''

''ہاں ہاں۔ کل بات کرتا ہوں اکبر جیلانی سے۔ تم فکرمند مت ہو، اللہ سے اچھی امید رکھو۔ بہتر ہی کرے گا۔'' ابا مسہری پر لیٹ گئے۔

''چائے نہیں پئیں گے۔'' اماں چیزیں سمیٹنے لگیں۔

"نہیں۔ نیند آرہی ہے، چائے سے ختم ہوجائے گی۔" ابا نے آنکھیں موند لیں۔ نیلوفر نے برتن سمیٹتے ہوئے ابا کی طرف یوں ہی دیکھا۔ اسے آج ابا کے چہرے پر پہلی بار اطمینان دکھائی دے رہا تھا۔ اسے یاد تھا جب سے اس کا رشتہ طے ہوا تھا، اس وقت سے لے کر اب تک وہ ہزار فکروں میں جکڑے دکھائی دیے تھے۔

"خدا کرے ابا کی یہ خوشی اور اطمینان سدا قائم رہے۔" وہ کمرے سے نکل گئی اور بڑے روم کی طرف دیکھا جہاں ارسلہ اریبہ کو شاپنگ کا احوال سنا رہی تھی۔ اریبہ کی حالت ارسلہ سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔

"آپ کی تو سچ مچ لاٹری نکل آئی ہے آپا! ابا ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔"

"ہیں...... ابا نے کہا تھا یہ کہ لاٹری نکل آئی ہے ارسلہ کی۔" ارسلہ نے حیرت سے اریبہ کو گھورا۔

"یہ نہیں کہا کہ ارسلہ کی...... مقصد یہ تھا کہ بہت خوش ہیں ابا بھی۔"

"ہوں...... یہ تو ہے۔ خوش کیوں نہ ہوں گے۔ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ ایسا داماد ملے گا اور یوں چٹکیوں میں ابا کے سارے مالی مسئلے حل ہوجائیں گے۔ مجھے داد دو بیٹا! میں ضد نہ پکڑتی اس رشتے پر تو ہاتھ میں آنا تھا کچھ۔ وہ پھٹیچر بائیک والا سکندر ہی ملنا تھا۔ محبت...... بس محبت کو صبح و شام پانی میں گھول کر پیتی رہتی اور اوپر سے رومانس کا تھوڑا سا تڑکا لگا دیتا۔" وہ چیزیں سمیٹنے لگی۔ اریبہ ہنسنے لگی اس کے ایسے انداز پر۔

"محبت بھی مقدر والوں کو ملتی ہے۔" نیلوفر الماری میں کپڑے رکھنے آئی تھی، اس کے آخری جملے پر بول پڑی۔ "یہ خزانے بھی کسی کسی کے ہاتھ لگتے ہیں۔"

"تو کیا آبص محبت نہیں دے گا، یہ طے ہے کیا۔" وہ ابرو اچکا کر نیلوفر کو دیکھنے لگی پھر سر کو خفیف سی استہزائیہ انداز میں جنبش دی۔ "کنگلوں سے ہی محبت ملتی ہے، امیر زادے محبت نہیں کرتے کیا۔ ان کے دل نہیں ہوتے یا دل کی جگہ بھی سکے فٹ ہوتے ہیں۔"

"خدا کرے تمہیں بہت محبت اور عزت ملے۔ بات بس یہ ہے کہ...... تمہیں قدر ہونی چاہیے محبت کی۔ بہت سے راستے آسان ہوجاتے ہیں اگر یہ ساتھ ہو تو......"

"ہنہہ...... میں نے تو محبت سے نہیں دیکھا راستے آسان ہوتے۔ مسائل ختم ہوتے۔" اس کا انداز نیلوفر کا مذاق اڑانے والا تھا۔ اریبہ چپکے سے کمرے سے نکل گئی۔

"مسائل بے شک ختم نہیں ہوجاتے۔ راستے آسان لگنے لگتے ہیں۔ مسائل کی تکالیف محسوس نہیں ہوتی۔"

"تمہیں نہیں ہوتی ہوگی۔" وہ نیلوفر کے نزدیک آکر بدتمیزی سے بولی۔ "تکلیف تو تکلیف ہے، وہ تو ہو کر رہتی ہے۔ اصل میں محبت نے تم آپا مسائل کو بھی خوشی اور مسرت کے کول پے سمجھ کر کھاتی رہتا مگر پلیز میرا دماغ مت کھاؤ۔ یہ محبت وحبت کا فلسفہ میرے سر سے گزر جاتا ہے۔ میری تھنکنگ (سوچ) بھی نیلو آپا پیاری تمہاری تھنکنگ سے ملتی تو میں ابھی تک سکندر اعظم کا طوق گلے میں ڈال نہ چکی ہوتی۔"

نیلوفر کا چہرہ احساس تذلیل سے تپ سا گیا۔ اس نے رخ موڑ کر الماری کھولی اور دھلے ہوئے تہ کیے کپڑے قرینے سے رکھنے لگی۔ اس سے بحث کرنا بلکہ اچھی بات کرنا ہی فضول تھا۔ وہ محبت کو ہی طوق سمجھتی تھی۔ محبت نبھانے والے کو قیدی۔ نیلوفر نے کمرے سے نکلتے نکلتے اس پر نظر ڈالی۔ وہ نہایت اطمینان سے مسہری پر لیٹ کر موبائل میں گم ہوچکی تھی۔

☆☆☆

"آپ کی پسند کی داد دینے کو دل چاہتا ہے مگر آپ کی بے رحمی پر افسوس کرنے کو دل کرتا ہے۔" کھانے کی میز پر آبص دل گرفتگی سے کہہ رہا تھا جس میں دبا دبا غصہ بھی تھا۔ مہوش کو اپنی تذلیل کا ہلکا سا احساس ہوا۔

"بے رحمی کی کیا بات ہے۔" وہ ذرا سی تنک گئیں اور تیکھے چتون سے بیٹے کو دیکھا جو بددلی سے مسکرا کر رہ گیا تھا۔

"دیکھ رہے ہیں آپ۔ یہ مجھے بے رحم کہہ رہا ہے، کیا بے رحمی کی ہے میں نے۔" وہ اکبر جیلانی سے الجھ پڑیں۔

"بے رحمی سے بڑھ کر کوئی اور لفظ ہو تو وہ ہی کہوں گا۔ ایک سیدھے سادے گھرانے کے جذبات سے کھیل رہی ہیں آپ۔ انہیں دولت کی چمک دمک سے مرعوب کر کے کمزور کر رہی ہیں۔" وہ پر ملال نظروں سے مہوش کو دیکھتے ہوئے بولا۔

مہوش سے نوالہ نہ کھایا گیا۔ انہوں نے نوالہ پلیٹ میں رکھ دیا اور چہرے پر انتہائی دکھ اور ملال بھرتے ہوئے بولیں۔

"میں یہ سب تمہارے لیے کر رہی ہوں۔ تمہاری خوشی کے لیے۔"

"میری خوشی کا یہاں کیا سوال......" وہ استہزائیہ ہنسا۔

"یہ بات تم ابھی نہیں کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد سمجھو گے۔ ابھی فقط تم جذباتی ہو رہے ہو اور دوسری بات میں ان لوگوں کو نہ مرعوب کر رہی ہوں، نہ کمزور بلکہ عزت دے رہی ہوں۔ سر پر بٹھا رہی ہوں۔ تم کہہ رہے ہو میں بے رحم ہوں۔"

"اگر ان لوگوں کو سچائی اور اس حقیقت کا علم ہو جائے تو کیا وہ یہ رشتہ ایکسپٹ (قبول) کر لیتے۔"

"ہاں تب بھی کر لیتے۔" مہوش کا لہجہ پر اعتماد تھا۔ "ان کے لیے یہ کافی ہے کہ ان کی بیٹی ایک اونچے گھرانے میں بیاہ کر جا رہی ہے اور خود ارسلہ کا تو یہ خواب ہے ایک امیر کبیر آدمی سے شادی کرنے کا۔ وہ بارہا ردمی سے اس خواہش کا اظہار کر چکی ہے بلکہ اپنے کزن کا رشتہ بھی ریجیکٹ کر چکی ہے۔ اس لیے کہ وہ مڈل کلاس ہے۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ تم اور تمہارا ماضی کیا ہے۔ نہ یہ لنگ اس کے لیے معنی رکھے گا۔"

"بہت خوب۔" آبص کے دل سے غصے کا کوئی ابال سا اٹھا۔ جسے دباتے ہوئے وہ تلخ ہو گیا اور اپنی وہیل چیئر جھٹکے سے ڈائننگ ٹیبل سے دور ہٹالی۔ "ٹھیک ہے پھر۔ ایسی لڑکی سے شادی تو کی جا سکتی ہے مگر محبت نہیں۔" وہ نیپکن پلیٹ پر پھینک کر وہاں سے چلا گیا۔

اکبر جیلانی نے تشویش سے اسے جاتا دیکھا پھر مہوش کو دیکھا۔ جواباً مہوش نے تسلی آمیز انداز میں نگاہوں کو جنبش دی۔

"کچھ نامناسب سی بات ہے یہ تو۔ عزت ہی نہ خراب ہو کر رہ جائے۔" انہوں نے بھی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"آپ کیوں فکر کر رہے ہیں۔ شادی ایک بار ہو جانے دیجیے اکبر! سب نارمل ہوتا چلا جائے گا۔ محبت بھی ہو جائے گی۔ اب دنیا میں لاکھوں لوگ ارینج میرج (طے شدہ شادی) کرتے ہیں تو شادی تو پہلے کرتے ہیں نا، محبت بعد میں ہو جاتی ہے۔"

مہوش نے تسلی بھرے لہجے اور جملوں سے ان کے اعصاب سنبھالنے کی کوشش کی جو آبص کے لہجے اور جملوں سے بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ اس کا انداز، لب و لہجہ جانے کیا جتانا اور سمجھانا چاہ رہا تھا۔ وہ حقیقتاً الجھ گئے تھے پھر اضطرابی انداز میں سگریٹ سلگا کر صوفے پر جا کر بیٹھ گئے۔

☆☆☆

اماں ارسلہ کے ہمراہ بازار سے لوٹیں، وہ نیلوفر کے سسرال والوں کے لیے پہناوٴنی میں دینے کے لیے

جوڑے لینے گئی تھیں۔ نیلوفر تو بازار جانے سے ہی بدک گئی تھی۔ وہ ارسلہ کو پکڑ کر لے گئیں۔ ایک تو اس میں اعتماد بھی تھا، دوسرا اس کی پسند بھی اچھی تھی۔ جوڑے مناسب داموں میں بہت اچھے مل گئے تھے۔ اماں مطمئن تھیں مگر لوٹیں تو ایک بری خبر دونوں کی منتظر تھی۔ نیلوفر نے بتایا کہ ارسلہ کی ساس یعنی مہوش جیلانی کا فون آیا تھا، انہوں نے بتایا کہ آبص کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ معمولی چوٹیں آئی ہیں، بس پیر کے مسلز پھٹ گئے ہیں۔ ہفتہ دو ہفتہ ریسٹ کرنے سے ٹھیک ہو جائے گا۔ اماں فوراً ہی شاپرز ایک طرف پھینک کر موبائل اٹھا کر مہوش کو کال کرنے لگیں۔ ادھر ارسلہ بے قرار ہوئی، اسے اپنا نکاح کھٹائی میں پڑتا محسوس ہوا۔

"لگتا ہے آپی! تمہاری ہی نظر لگ گئی۔ جب سے انہیں دیکھا تھا شہزادہ شہزادہ کیے جا رہی تھیں۔" اریبہ اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر چھیڑنے لگی۔

"کوئی بچہ ہے جو نظر لگ گئی۔ تم بھی نا بس......" اسے ہنسی آ گئی مگر پھر ماحول کی نزاکت کا خیال کر کے مسکراہٹ چھپا گئی۔

"بچے کو ہی نظر لگتی ہے، کیا بڑے کو نہیں لگ سکتی۔"

"کم از کم اتنے بڑے کو تو نہیں لگ سکتی۔" اس نے اریبہ کی پیٹھ پر ایک دھموکا رسید کر دیا۔ وہ دھموکا لگا کر ہنسنے لگی۔

"یہ ہنسنے کا مقام نہیں ہے، پریشانی ہو رہی ہے مجھے۔ بیا! نکاح کا معاملہ ٹل نہ جائے۔" وہ دھیرے سے بولی۔

اریبہ نے اسے گھورا۔

"بس اس بات کی فکر ہے۔"

"اوہو۔ لاؤ موبائل دو اپنا۔ میں روی سے بات کرتی ہوں۔ پوچھوں ذرا...... میرا تو بیلنس ہی ختم ہو گیا ہے۔" وہ اریبہ کے موبائل کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔

"اوہو۔ روی کو کیوں، ڈائریکٹ آبص بھائی کو ہی کر ڈالیں۔ ہو سکتا ہے وہ بے چارے آپ کی کال کے ہی منتظر ہوں۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ......

انتظار یار بھی لطف کمال ہے
نظریں کتاب پر اور سوچیں جناب پر

سوری "نظریں ٹانگ پر اور سوچیں جناب پر۔" وہ یہ کہتے ہوئے حفظ ماتقدم دور ہٹ گئی۔

"شرم تو آتی نہیں ہے تمہیں۔ اس پچویشن پر بندہ دل جوئی کرتا ہے، تسلی کے پھاہے رکھتا ہے۔"

"تو آپ کو نکاح کی فکر ہے، آبص بھائی کے پیر کی نہیں۔" وہ بھی باز نہیں آئی اور موبائل اس کی طرف بڑھاتے بڑھاتے پھر ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے بولی۔ "ہو جائے گا نکاح تسلی رکھیے۔ مہوش آنٹی نے بتایا ہے چوٹ معمولی ہے اور آبص بھائی بے چارے تو نکاح کے روز لنگڑاتے اسٹک پکڑے ہوئے بھی پہنچ جائیں گے۔ آپ کو دیکھ لیا ہے انہوں نے۔"

"تم بس بکتی جانا اول فول۔ اب ریکارڈ مت لگا دینا میرا کہ مجھے نکاح کی فکر تھی، آبص کے ٹانگ کی نہیں۔" اس نے اس کے ہاتھ سے موبائل لے کر ایک ہاتھ جڑنا بھی چاہا وہ لپک کر دور رہٹی۔ نشانہ خطا ہو گیا۔

سکندر کمرے میں داخل ہوا تھا، اریبہ اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی پھر ہنسی روک کر بولی۔

"لیجیے، سکندر بھائی بھی آ گئے۔ آپ کا کام تو سمجھیں ہو گیا۔"

"تم دفع ہوتی ہو یا نہیں۔" وہ سکندر کو دیکھ کر سنبھل گئی۔ موبائل پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"سکندر بھائی! آپی کو آبس بھائی سے ذرا ملوانے لے جایئے۔ آپی کو چین نہیں پڑے گا تب تک جب تک عیادت نہ کر آئیں گی۔"

"اریبہ۔" ارسلہ نے اسے آنکھیں دکھائیں تو وہ کمرے سے بھاگ گئی۔

"کمینی بے پوری۔ ایویں بکواس کر رہی ہے۔" وہ خفیف سی ہو کر رہ گئی اور موبائل ایک طرف رکھ دیا۔ پھر سکندر کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"بڑے دنوں بعد انٹری ماری ہے۔" وہ ایک طرف ہو گئی، سکندر کمرے کے اندر آ گیا۔

"خالہ جان نے بلایا تھا۔ تمہارے منگیتر کی عیادت کو جانا تھا خالو جان کو لے کر۔"

وہ چونکی۔

"بڑی تیزی دکھائی امی نے۔ تم جاؤ گے کیا ابا کو لے کر؟"

"ہاں جانا تھا مگر اب نہیں۔"

"تھا ــــ مطلب!"

"مطلب یہ کہ ابھی تمہارے سسرال سے تمہارے سسر کا فون آیا ہے کہ ہم زحمت نہ کریں۔ دو چار روز میں وہ تمہاری پوری فیملی کو اپنے گھر پر انوائٹ کر رہے ہیں۔ آبس نے اس تکلفات کے لیے روک دیا ہے خالو جان کو۔ خیر میں تو یوں بھی آ رہا تھا یہ سب چیزیں دینے۔" اس نے شاپرز کمرے میں داخل ہوتی نیلوفر کی طرف بڑھا دیے۔

"یہ کیا ہے؟" ارسلہ نے تعجب سے شاپرز کی طرف نظریں دوڑائیں۔ تجسس آنکھوں سے ٹپکا۔

"امی نے اریبہ کے لیے کچھ شاپنگ کر رکھی تھی۔ کہہ رہی تھیں نیلو کی شادی کے لیے اریبہ کے لیے کچھ جوڑے خریدے ہیں۔ مایوں، مہندی وغیرہ کے لیے، یہی دینے آیا تھا۔" وہ قدرے سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ اریبہ تو سنتے ہی لپک کر آئی۔

"ہائے، خالہ کتنی اچھی ہیں۔ کتنا خیال ہے انہیں میرا۔" ارسلہ سے پہلے اس نے نیلوفر کے ہاتھ پر جھپٹا مار کر شاپرز اڑا لیے۔

سکندر اریبہ کی بے قراری اور اس معصومانہ خوشی پر مسکرا دیا اور رخ موڑ کر یونہی نیلوفر کی طرف دیکھا جو ممنون نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملنے پر سکندر ہلکے سے مسکرا دیا۔

"چائے وائے پلاؤ گی یا یونہی چلا جاؤں۔" پھر ارسلہ پر اچٹتی نظر ڈال کر بولا۔ "اس لڑکی سے تو امید نہیں ہے۔"

"ہاں تم بیٹھو۔ ابھی بنا دیتی ہوں۔" نیلوفر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ سکندر کمرے سے نکل صحن میں رکھے تخت پر آ کر بیٹھ گیا اور کیاری میں لگے پودوں کو یونہی غیر دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

"تم زنانہ شاپنگ کب سے کرنے لگے ہو۔" کچھ دیر بعد ارسلہ کمر پر ہاتھ رکھے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ سکندر نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ اس کی نظروں سے نظر ملاتے ہوئے بولی۔ "خالہ بھلا کب جاتی ہیں مارکیٹ۔ انہیں تو نہ فیشن کا علم ہے، نہ اریبہ کے ناپ کا۔ وہ تو خود شاپنگ سے کتراتی ہیں۔ سب تم لائے ہو ہے نا۔" پھر طنز سے ہنس کر بولی۔ "ہاں بھئی اس گھر کا سارا بوجھ جو تم نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے، سربراہ ہو، ہیرو ہو۔"

"بکومت ارسلہ! ہر بات کو تلخی اور طنز پر مت لے کر جایا کرو۔ وہ چھوٹی بہنوں کی طرح ہے۔ اگر لے بھی آیا ہوں تو کیا ہو گیا اس میں۔" وہ بھڑک گیا۔

''تو ٹکے کی چوٹ پر دو ناں۔ یہ کہہ کر کہ میں لایا ہوں۔ خالہ کو بیساکھی کیوں بناتے ہو۔''

''تمہارا مسئلہ کیا ہے آخر۔'' سکندر تپ کر رہ گیا۔

''شکل نہ دکھاؤں تب مصیبت، شکل دکھاؤں تو مصیبت۔ ذمہ داری نہ اٹھاؤں تو طعنے، ذمہ داری نبھاؤں تو طنز۔ تم...... تم اپنی زندگی میں اور ملنے والی خوشی میں بس بدمست رہو، اپنی خوشیوں تک محدود رہو تو بہتر ہے۔''

''اوہ ہو بہت جلن ہو رہی ہے میری خوشی دیکھ کر۔'' وہ تو جیسے لڑنے پر آمادہ نظر آنے لگی۔ پتا نہیں کیا چیز اسے چبھ رہی تھی، اریبہ کا اتنا خیال رکھنا یا پھر اس کا نظر انداز کرنا۔

سکندر نے اپنا غصہ دبا لیا اور فقط اسے سلگتی نظروں سے دیکھا اور تخت سے اٹھ کر جانے لگا تو وہ بولی۔

''جا کہاں رہے ہو؟''

''تو کیا کروں۔ تمہاری فضول بکواس سنوں یہاں بیٹھ کر۔ تمہاری خوشی میں بھنگڑے ڈالوں۔ بھنگڑے بھی ڈال لوں گا، وقت آنے دو۔''

''خیر اتنی بڑی آزمائش میں تمہیں نہیں ڈالوں گی۔'' وہ ہنسی۔

''ارسلہ...... گاڈ سیک۔'' وہ مزید کچھ کہتا اماں اس طرف آتی نظر آئیں۔ ارسلہ اس پر ایک گھورتی نگاہ ڈال کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

ادھر اریبہ اتنے خوب صورت جوڑے دیکھ کر خوشی سے جیسے فوت ہو رہی تھی۔ سکندر کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔

''اللہ! کتنے اچھے ہیں سکندر بھائی۔ کتنا خیال رکھنے والے اور مہربان ہیں۔''

''اچھا بس بس بہت ہو گیا۔ تعریفوں کے دریا بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سمیٹو یہ سب اور نکلو یہاں سے۔ پہلے ہی میرا سر دکھ رہا ہے۔ تھوڑا آرام کروں گی۔'' وہ یک دم اسے جھاڑ گئی۔

''ہنہ...... تم بھی نیلوفر کی طرح ان دو ٹکے کی چیزوں پر ہی دل خوش کر لیا کرو۔'' اس کے لہجے میں کاٹ تھی۔

اریبہ کو اس کا انداز لہجہ بہت ہی برا لگا۔ وہ کپڑے تہ کر کے شاپر میں ڈالتے ہوئے بولی۔

''میں ان کپڑوں پر مر نہیں رہی ہوں۔ میں تو بس سکندر بھائی کی محبت کو سراہ رہی ہوں۔''

''ایں...... محبت کیا مطلب محبت......'' وہ یک دم اچھلی۔ جیسے مسہری پر کرنٹ دوڑ رہا ہو...... اور کچھ ایسی نظروں سے اریبہ کو گھورا کہ وہ بے چاری گڑبڑا کر رہ گئی۔

''میرا مطلب ہے اتنا خیال ہے انہیں ہم سب کا۔'' وہ شاپر اٹھا کر جلدی سے کمرے سے نکل بھاگی۔

''ہنہ...... چند ہزار کا خرچا کر کے موصوف ہیرو بن رہا ہے۔ ادھر میرا سسرال پوری شادی کا خرچ اٹھا رہا ہے، احسان تو یہ ہوا۔ نیلو کی عزت بن جائے گی سسرال میں، ایسی شاندار دعوت خواب میں بھی نہ اٹینڈ کی ہو گی کنگلوں نے۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی مسہری پر دراز ہو گئی اور آنکھوں پر بازو دھر لیا۔ یک دم خیال کی رو آبص اور اس کے ایکسیڈنٹ کی طرف دوڑ گئی۔

''مجھے کال تو کرنی چاہیے۔ بیا کہتی تو ٹھیک ہے، روحی کو نہیں آبص سے ڈائریکٹ بات کرنی چاہیے۔ کیا پتا وہ واقعی منتظر ہو میری کال کا...... ہائے پر نمبر تو نہیں ہے میرے پاس۔ روحی سے مانگتے اچھا نہیں لگتا۔ سکندر سے کہوں پر نہیں اسے تو اب منہ ہی نہیں لگانا۔'' وہ سوچوں کے تانے بانے بننے لگی۔

☆☆☆

آبص کو اسٹک کے سہارے چلتے دیکھ کر ابا بے چارے دکھی ہو گئے۔ تسلیاں دینے لگے کہ ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ چپ کی مہر لگائے پورا وقت بیٹھا رہا۔

خیات علی کے پورے گھر کو جیلانی ہاؤس میں مہوش نے مدعو کیا تھا۔ سوائے ارسلہ کے سب ہی آئے تھے۔ آنا تو وہ بھی چاہ رہی تھی، روحی نے چلنے کو کہا تو وہ پٹ سے تیار ہو گئی۔ مگر اماں کی پھٹکار پر اتنا سا منہ لے کر بیٹھ گئی۔

''شرم تو نام کو نہیں ہے کم بخت میں۔ اب تو بڑے گھر کی بہو بننے جا رہی ہے، خدا خیر کرے۔''

اسے اب اماں کی پھٹکار اور صلواتوں پر غصہ نہیں آتا تھا۔ بلکہ ہنسی آتی تھی۔ بات بے بات ہنسی۔

''نکاح کی تاریخ اگر آگے کرنی ہے تو کر دیں۔ ہم نیلو کے سسرال والوں سے کہہ دیں گے۔'' ابا جاتے جاتے اوپری دل سے کہنے لگے۔

''ارے نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہفتہ بھر کی بات ہے۔ بہتر ہو جائے گا۔ آپ لوگ تیاری رکھیں...... نکاح تو اسی تاریخ پر ہوگا۔''

مہوش جلدی سے بولیں اور انہیں دروازے تک چھوڑنے آئیں۔ ابا بے چارے اکبر جیلانی اور مہوش کی طرف سے ملنے والی اس عزت پر نہال ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد مہوش لیونگ روم میں آئیں جہاں آبص صوفے پر بیٹھا تھا۔ مہوش کو اندر آتے دیکھا تو اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

''اتنا بڑا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی بلکہ دھوکا دینے کی۔ اس کا انجام کیا ہو سکتا ہے کچھ سوچا ہے آپ نے۔'' وہ گویا بھرا بیٹھا تھا۔ ''آپ میری زندگی کو اور بھی مشکل بنا رہی ہیں۔ جھوٹ اور دھوکے پر قائم ہونے والے رشتے دیرپا نہیں ہوتے۔ ریت کی طرح بکھر جاتے ہیں۔''

''تم سنبھالو گے تو سنبھل جائے گا۔ نباہ کرو گے تو گھر بن جائے گا۔ وہ ایک اچھی لڑکی ہے، تمہیں اس سے کوئی خطرہ نہیں۔ یوں بھی اس کے خواب ہم پورے کر رہے ہیں۔ یہ اس کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ اس نے تو سوچا تک نہ ہوگا کہ یوں اس کے دل کی مراد پوری ہو جائے گی۔ بیٹھے بٹھائے ایک اونچے گھرانے کی بہو بن جائے گی۔ ایک اتنے پیارے لڑکے کی بیوی بنے گی۔'' مہوش کو اپنے اس کارنامے پر فخر تھا کسی طرح کی شرمندگی یا ندامت نہ تھی۔

''ایک نادیہ شاہ کو قبول کر لیتیں تو اتنے پاپڑ نہ بیلنے پڑتے۔'' اس نے تاسف سے ہلکی سانس بھری۔

''کر تو لیا تھا قبول۔ اب وہی دغا دے گئی تمہیں۔ اس میں میرا کیا قصور۔ میں تو تمہارے لیے ہر حد سے بھی گزر جانے کو تیار تھی۔ اس کی ماں کے پیر تک پکڑ لیے تھے۔ اپنی انا، اپنی ایگو کچھ بھی تو نہیں دیکھا تھا۔'' مہوش اس کا ہاتھ پکڑ کر دل گرفتگی سے کہنے لگیں۔ ''تم بے وقوف ہو اس کے دھوکے کو سینے پر تمغہ کی طرح سجائے بیٹھے ہو۔''

جواباً اس نے عجیب نظروں سے مہوش کو دیکھا اور صوفے سے اٹھ گیا۔

''پتا نہیں کیوں باوجود اس کے ساری باتیں دل قبول نہیں کرتا۔ سچ بھی ہوں تو یقین کرنے کو دل نہیں کرتا۔''

''شک کرتے ہو مجھ پر۔''

''نہیں، بس یقین کرنے کو دل نہیں کرتا کہا ناں......''

''تو یقین کر لو آبص! اسی میں بھلائی ہے تمہارے لیے۔''

''اوکے جب یقین آجائے گا تو قسم کھا کر کہتا ہوں نادیہ شاہ کو بھول جاؤں گا۔ زندگی آپ کی مرضی اور خواہش کے مطابق گزارنے لگوں گا۔ بس یقین تو آنے دیں۔'' اس کا لہجہ نرم مگر بھنچا بھنچا تھا وہ لیونگ روم

سے باہر جانے لگا۔

"آبص۔" مہوش نے تڑپ کر اسے پکارا۔ وہ رک گیا مگر پلٹا نہیں۔ مہوش خود چلتی اس کے نزدیک آئیں اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے لجاجت سے بولیں۔

"کچھ بھی ہو اب میری اور جیلانی خاندان کی عزت کی ڈور تمہارے ہاتھ میں تھما دی ہے میں نے۔ اسے سنبھالنا پڑے گا تم کو۔ ورنہ اپنی ماں کو عمر بھر سر جھکا ہوا دیکھو گے۔"

وہ شدید بے بسی محسوس کر کے رہ گیا۔

"او کے۔ شیکسپیئر کے بقول دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب اداکار۔ سو میں بھی اپنا کردار نباہ لوں گا۔ مگر ایک بات مانتا ہوں میں خود کو آپ جتنا بلند پائے کا اداکار تسلیم نہیں کرتا۔ آپ کے سامنے طفل مکتب ہی ہوں۔" وہ نرمی سے ان کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا کر لیونگ روم سے باہر نکل گیا۔

مہوش کے لیے یہ اچھا خاصا دھچکا ہی تھا، ہمیشہ دھیمے لہجے میں بولنے والا۔ صاف ستھری سادہ سی زبان استعمال کرنے والا اتنی ترشی اور کڑواہٹ انڈیل گیا تھا۔ انہیں اپنا پورا وجود کڑوا کڑوا محسوس ہونے لگا۔ تاہم وہ تحمل سے سہہ گئیں۔ جو بویا تھا وہ کاٹنا تو تھا۔ انہیں اب بھی پورا یقین تھا۔ ارسلہ جیسی حسین لڑکی کو پا کر آبص نادیہ شاہ جیسی عام سی لڑکی کو بھول بھال جائے گا۔

☆☆☆

حیات علی کا گھر بھی برقی قمقموں سے سجنے لگا تھا۔ سجاوٹ کا سارا کام سکندر اپنی نگرانی میں کروا رہا تھا۔ اماں تو اس کے واری صدقے جا رہی تھیں۔

"بیٹے سے بڑھ کر تم نے حق ادا کر دیا سکندر۔" وہ آبدیدہ سی ہو گئیں۔

"بیٹا ہوں تو اپنا فرض ادا کر رہا ہوں اور یوں بھی آپ کا آدھے سے زیادہ مسئلہ تو ارسلہ کے سسرال والوں نے حل کر دیا۔ شاندار دعوت کا انتظام کر کے۔"

"ہاں بس خدا کا شکر ہے۔ پتا نہیں کس کی دعا کام آ گئی۔"

"میری اپنی دعا اماں...... کسی کی کیوں؟" وہ چادر اوڑھے اس طرف آتے ہوئے گویا ہوئی۔

"ارے تم پارلر نہیں گئیں اب تک۔" اماں چونکیں۔ کل اس کا نکاح تھا اور پارلر میں آج مہندی لگوانے اور کچھ اور سروس کے لیے پارلر جانا تھا۔

"نیلو کو تو ابھی تمہارے ابا چھوڑ آئے ہیں۔"

"اماں نیلو جس پارلر گئی ہے میں تو وہاں جانے سے رہی۔" وہ اترائی۔ "میرے سسرال والوں نے بہت بڑے اور مشہور پارلر کا اپائنٹمنٹ لیا ہوا ہے۔ ابھی روحی آئے گی مجھے پک کرنے۔"

سکندر نے وائر لپیٹتے ہوئے اس پر یونہی ایک نگاہ ڈالی۔ ایک مبہم سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی تھی۔ وہ تخت پر جا کر بیٹھ گئی جہاں اماں نے سکندر کے لیے چائے رکھی تھی۔ وہ مگ اٹھا کر اطمینان سے پینے لگی۔

"چلو ٹھیک ہے تم جانے لگو تو مجھے بتا کر جانا۔ میں ذرا تمہارے ابا کے کپڑے دیکھ لوں۔ ڈرائی کلین سے آ گئے یا نہیں۔" اماں سر ہلا کر ابا کے روم میں جا گھسیں۔ انہیں ابا کی اکلوتی نئی نکور واسکٹ کی فکر رہتی تھی۔

"سنو...... تم بھی ذرا ڈریس اپ ہو کر آنا۔ بڑے لوگوں کی دعوت ہے۔" وہ چائے کی چسکیاں بھرتے ہوئے سکندر سے بولی۔ جو الیکٹریشن کو ہدایتیں دے رہا تھا۔ اس کی بات پر ذرا سا گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"اچھے خاصے اسمارٹ اور ڈیشنگ ہو تم بھی۔ کچھ اور سنوار لو گے تو میرا مان بھی بڑھے گا کہ ایسا اسمارٹ کزن ہے میرا بھی۔"

"شرم کرو۔ مان میکے سے ہوتا ہے کزنز کے اسمارٹ ہونے اور ڈشنگ ہونے سے نہیں۔"
"خیر میں تو یونہی ایک بات کر رہی تھی، مرضی ہے تمہاری۔" وہ کھسیا کر برا مان گئی۔
"یوں بھی...... شادی نیلو کی ہو رہی ہے۔ اس کی عزت اور خوشی کے لیے میں الٹا بھی لٹک سکتا ہوں۔" وہ تپ کر بولا اور وائر اٹھا کر ایک طرف جانے لگا۔ وہ بلبلا کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوگئی۔ برے چتون سے گھورتے ہوئے بولی۔
"نیلوفر کی خوشی اور عزت کے لیے الٹا لٹک سکتے ہو۔ اور میری خوشی کے لیے۔ میں کچھ نہیں لگتی تمہاری۔"
اس کا انداز پھاڑ کھانے والا تھا۔
سکندر کو بھی اپنے اعصاب ایک پل تو چٹختے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ کیا پتا تا کتنی مشکل سے اپنے دل پر کنٹرول حاصل کیا تھا۔ اپنی شکست کے اس اندوہ ناک حادثے پر سے کس طرح گزرا تھا۔ کیسے اپنے اضمحلال کو چھپائے چھپائے پھر رہا تھا۔ صبر اور ضبط کی چادر کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا کہ یہ لڑکی پھر اس چادر کا ٹانکا ٹانکا ادھیڑنے کو تیار نظر آ رہی تھی۔ کیوں وہ اتنی بے رحم تھی۔ وہ پھر اسی آگ میں خود کو جلتا محسوس کرنے لگا۔
"تمہاری خوشی......" اس نے لب بھینچ کر اسے گھورا پھر وائر کا پورا رول غصے سے ایک طرف پھینکتے ہوئے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔
"تمہارے لیے اپنی ساری تمناؤں کو دبالیا۔ جذبوں کا گلا گھونٹ لیا۔ مار دیا خود کو اور مرگیا۔ یہ قربانی کافی نہیں ہے۔" وہ اتنے زور سے چلایا کہ وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔ اتنے شدید ردعمل کا اسے اندازہ نہیں تھا۔
پتا نہیں وہ واقعی بے حس، بے رحم تھی۔ اسے زچ کر کے لطف لیتی تھی یا ہر وقت خود کو مطمئن کرنے اپنی اہمیت کو جتانے کے چکر میں رہتی تھی۔
یک دم گاڑی کا ہارن بجنے لگا تو اس نے ہلکی سانس بھر کر دروازے کی طرف دیکھا پھر ایک طرف ہوتے ہوئے بولا۔
"جاؤ تمہاری نند آ گئی ہے تمہیں لینے۔"
ارسلہ نے فقط ایک نظر اس پر ڈالی جس میں ترشی تلخی بھری تھی پھر پلٹنے لگی۔
"سنو۔" وہ دھیرے سے بولا۔
"کوشش کرو جو خوشیاں تمہیں مل رہی ہیں ان میں مست اور خوش رہو۔ دوسروں کی ناآسودگیوں کا مذاق مت بناؤ۔ جذبوں سے کھیلنا بند کردو۔"
ہارن تیز اور مسلسل بجنے لگا تو وہ جواباً کچھ کہے بنا جلدی سے پلٹ کر گیٹ سے باہر نکل گئی۔ جاتے جاتے دروازہ دھاڑ سے بند کر گئی تھی۔ صحن میں یکلخت ویرانی اور سناٹا اتر آیا۔ سکندر کو تو کچھ ایسا ہی لگنے لگا۔ طوفان کے بعد بکھر جانے والا اجڑا اجڑا سناٹا وحشت ناک خاموشی، اعصاب کو منجمد کر دینے والی ویرانی۔ باقی رہ گئی تھی۔
وہ تخت پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر دھیرے دھیرے کش لینے لگا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سالگرہ نمبر



عندلیب زہرا

یہ آٹھ مارچ



صبح کا آغاز ہو چکا تھا۔ حسب معمول ہنگامہ آرائی، چیزوں کی اٹھا پٹخ، چیزوں کا پھیلاوا...... کہیں ساس کی بڑبڑ، کہیں بچوں کا ریں ریں کرنا...... ایسے میں جو بات ماحول میں خوش گوار تاثر پیدا کر رہی تھی، وہ تھی مارننگ شو کی خوش ادا...... خوش رو میزبان اور اس کے پس منظر میں بجتی دھیمی خوش کن موسیقی......

"آٹھ مارچ کا دن...... عورتوں کے حقوق کا دن...... وہ حقوق جو مردوں نے انہیں دینے ہیں۔ وہ مقام جو مردوں نے تسلیم کرنا ہے۔"

میزبان کی شعلہ بیانی عروج پر تھی۔ صدف پورے انہماک سے یہ باتیں سن رہی تھی۔ ہاتھ میں چائے کا مگ تھامے دھیان میزبان کی ڈریسنگ پر تھا۔

☆☆☆

"امی! اظفر کی ماما نے جینا دوبھر کر رکھا ہے۔ کھانے پینے پر نظر رکھتی ہیں۔ میرے نوالے گنتی ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ میں گھر کی بہو ہوں۔" مہرین بھرائی آواز میں شکوہ کناں تھی۔ "جان بوجھ کر کھانے پینے کی اشیاء چھپا دیتی ہیں۔ چاول کھانے پر پابندی، دودھ پینے پر اعتراض۔" شکوؤں کے ساتھ آنسوؤں کی برسات شروع تھی۔

نفیسہ بیگم دوپٹے کو منہ پر رکھ کر پھپھک کر رودیں۔

"ہائے میری لاڈوں پلی بیٹی۔" وہ سسکیاں بھر رہی تھیں۔ "اس لیے تو بیٹیوں کے نصیبوں سے ڈر لگتا ہے۔" دونوں ماں بیٹی اپنے دکھوں پر آنسو بہا رہی تھیں۔

آٹھ مارچ کا سورج اداسی سے اپنی کرنیں بکھیر رہا تھا۔

☆☆☆

"آج آپی آ رہی ہیں...... لنچ پر اہتمام کر لینا۔ رضا بھائی ساتھ ہوں گے۔" ناشتا جلدی جلدی ختم کرتے ہوئے دانیال نے سحرش کو ہدایات دینی جاری رکھیں یا دوسرے الفاظ میں حکم صادر کیا۔

"افوہ۔" سحرش دل ہی دل میں کراہ کر رہ گئی۔

"جی بہتر۔" اس نے اوپری مسکراہٹ کے ساتھ تابعداری سے سر ہلایا۔ جانتی تھی کہ آپی کی آمد کو کوئی نہیں روک سکتا۔

اسے اپنی اکلوتی نند کی آمد پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ شکایت تھی تو بس یہ کہ آپی کسی بات سے خوش نہیں ہوتی تھیں۔

یہ کیوں ہے؟ وہ کیوں ہے؟ چکن کڑاہی کیوں ہے...... چکن بریانی کیوں نہیں ہے؟ اور افسوس والی بات یہ تھی کہ جب سحرش کو میکے جانا ہوتا، نجانے انہیں الہام ہوتا تھا یا خواب میں اشارے ملتے تھے، سو وہ پورے ٹبر سمیت آدھمکتیں اور سحر دل مسوس کر رہ جاتی تھی۔

آج بھی اس کی بہنوں نے میکے آنے کا پروگرام ترتیب دیا تھا۔

"عرصہ ہوا اکٹھے مل کر نہیں بیٹھیں ہم بہنیں۔" سب بہنوں کا یہی موقف تھا۔

اس نے دانیال کی مصروفیت کا عذر پیش کیا۔

"آج آٹھ مارچ ہے۔ عورتوں کے حقوق کا عالمی دن...... تم بھی اپنے حق، روانگی میکا اور بیٹھک ہمراہ ماں بہنوں کے لیے کھڑی ہو جاؤ۔" زویا کو کالج سے تحریریں کرنے کا شوق تھا، اسے بھی بس موقع چاہیے تھا۔ اب بھی میز پر ہاتھ مار کر جوش سے بولی اور سب ہنس پڑے۔

سحرش کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"امی انتظار کر رہی ہوں گی۔" اس نے افسردگی سے سوچا اور ایک نظر کلینڈر پر ڈالی، گھڑی کو دیکھا۔ وقت کم اور مقابلہ سخت کے مصداق وہ کچن میں گھس گئی۔

کلینڈر پر آٹھ تاریخ استہزائیہ مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

کمرے میں معنی خیز خاموشی تھی۔ تمام لوازمات ان چھوئے پڑے تھے۔ مدیحہ تمام تر تیاری کے باوجود کنفیوزسی سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ رشتے والی بوا کے توسط سے آنے والا یہ تیسرا رشتہ تھا۔

"میرا بیٹا اٹھارہ گریڈ کا افسر ہے۔ دوسرا اپنا کاروبار کرتا ہے۔"

لڑکے کی ماں کی رعونت بھری آواز گونج رہی تھی۔ شاید گھر کی حالت سے مکینوں کی مالی حالت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ سو یہ لہجہ انہیں اختیار کرنا ہی تھا۔ جس سے ان کی سوچ کا اظہار ہو سکے، آخر تھوڑی دیر بعد آنے والے چلے گئے۔

"لڑکی کا قد چھوٹا ہے۔" بوا کو اپنے انکار کا سبب بتا کر لڑکے کی ماں بہنیں چلتی بنیں۔

"رنگ کالا ہے۔ قد چھوٹا ہے۔ کم صورت ہے۔ صاف کہہ دیں کہ لڑکی والے غریب ہیں۔ اللہ کی بنائی ہوئی مخلوق میں نقص کیوں نکالتے ہیں۔" مدیحہ بار بار کی پریڈ سے تنگ آئی ہوئی تھی۔ آج بھی مہمانوں کے نخرے دیکھ کر اس کی برداشت ختم ہو گئی تھی۔

تعلیم، سلیقے، شکل صورت میں کوئی کمی نہ تھی۔ کمی تھی تو نصیب میں یا لوگوں کی بصیرت میں۔ سو اپنی تذلیل پر آج وہ تھک کر ٹوٹ چکی تھی۔

"امی! لڑکیوں کو ان...... ان عورتوں کے ہاتھوں مسترد ہونے سے کیوں گزرنا پڑتا ہے۔" اس کی کاجل بھری آنکھوں میں ان گنت شکوے تھے اور ٹوٹتے خوابوں کی کرچیاں...... آج تو امی بھی پریشان تھیں۔ پے در پے انکار نے انہیں بھی مایوس کر دیا تھا۔ سو تسلی بھی نہ دے سکیں۔

آٹھ مارچ کی تاریخ کا دن چپکے چپکے اپنا سفر طے کر رہا تھا۔

☆☆☆

حنا کی گھبراہٹ بجا تھی۔ جاب کا آغاز کیے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ پہلا تجربہ تھا۔ سو غلطیاں بھی ہو جاتی تھیں۔ لیکن اوسان تب خطا ہو جاتے تھے، جب مسز شائستہ سینئر ہونے کا فائدہ اٹھاتیں اور سارے اسٹاف کے سامنے ایسے ڈانٹ دیتیں۔ جاب مجبوری تھی، سو وہ سہنے پر مجبور تھی......

آج بھی یہی ہوا تھا۔ اس کی ڈیوٹی ہائی اسکول میں لگی تھی۔ معلوم نہیں کیسے وہ فراموش کر بیٹھی۔ سو مسز شائستہ کو تو موقع مل گیا تھا۔

"یہ جونیئرز کو اپنے تجربات سے مستفید نہیں کرتیں بلکہ احساس برتری میں مبتلا ہیں۔" مسز عالیہ نے ہمدردی سے حنا کو دیکھا۔ جس کا چہرہ پھیکا اور آنکھوں میں بے رنگ پانی تھا، وہ سر جھکائے رجسٹر پر کام کرتی رہی۔

"یار! آج آٹھ مارچ ہے۔ صبح سے خواتین کے حقوق کے پروگرامز نشر ہو رہے ہیں۔" دو کولیگز آپس میں ڈسکشن کر رہی تھیں۔

"آٹھ مارچ۔" حنا نے طنزاً زیر لب کہا اور ادھورا کام مکمل کرنے لگی۔

☆☆☆

"مجھے اپنے شوہر سے شکوہ نہیں ہے۔ مجھے اپنی سہیلی سے شکایت ہے، جس نے میری پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے۔ کیا اسے علم نہیں تھا کہ میرے تین بچے ہیں۔ ہنستا بستا گھر ہے...... اور مجھے حسن سے بے پناہ محبت ہے۔ شاید انہیں بھی تھی......" شمع اینٹی ڈپریشن کی گولیاں کھاتے ہوئے خود کلامی کر رہی تھی۔

آٹھ مارچ کے اجالے کی کرنیں خاموشی سے اس کے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئیں اور اداسی کے ساتھ سارے کمرے میں بکھر گئیں۔

☆☆☆

صدف کو مارننگ شو دیکھنا بہت پسند تھا۔ میزبان کے ملبوسات ہیئر اسٹائل، جیولری، میک اپ...... وہ کافی اپ ڈیٹ ہو جاتی تھی۔

"بی بی جی۔" اچانک جمیلہ کی آواز پر چونکی۔

"یہ وقت ہے تمہارے آنے کا؟" وہ جھنجلا گئی مگر یک دم وہ چونک اٹھی۔

"ارے تمہیں کیا ہے؟" چہرہ نیلو نیل تھا۔ الجھے بال۔

"بس باجی! میری بری قسمت۔" وہ پھپھک کے رو پڑی۔

"میری ساس اور جٹھانی بہانا بنا کر مجھے اپنے گھر والے سے مار پڑواتی ہیں کہ میں اپنی تن...... خواہ...... میکے دے آتی ہوں۔" صدف دم بہ خود تھی۔

"یہ تو سیدھا سیدھا پولیس کیس ہے...... میں تمہارے شوہر کو اندر کرواتی ہوں۔" صدف نے موبائل اٹھایا۔

"نہیں جی...... آج ساس نے مارا ہے۔ گھر والے نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔" کم عمر جمیلہ کے چہرے پر چھائیاں اور آنکھوں کے حلقے اس کی جسمانی حالت کے گواہ تھے۔

کم خوراکی...... کام کا بوجھ...... گھٹن...... دباؤ...... بچوں کی پے در پے پیدائش......

صدف نے اسے پیسے دیے، دوا دی، چائے بنا کر لائی اور کام سے چھٹی دے دی۔

جمیلہ بھی سکون سے کارپٹ پر بیٹھ کر سڑپ سڑپ چائے پینے لگی۔ ٹاک شو اختتام پر تھا۔ میزبان اختتامی کلمات ادا کر رہی تھی۔

"اگر مرد عورت کے حقوق تسلیم کر لے تو یقیناً عورت مضبوطی سے کھڑی ہو سکتی ہے۔ حکومت ایسے بل منظور کرے جو مردوں کو ظلم کرنے سے باز رکھے۔ آٹھ مارچ تجدید عہد کا دن ہے۔"

"مردوں کا ظلم۔"

جمیلہ اور صدف کی سوچ اس نکتے پر رہی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور سر جھٹک کر استہزائیہ مسکرا دیں۔ اس ایک مسکراہٹ میں اتنا افسوس، دکھ، شکوے رقم تھے۔ اپنی ہی جنس سے متعلق الفاظ کم ہو گئے تھے۔

آٹھ مارچ کا سورج طنزاً مسکرایا...... کلینڈر پر لکھی تاریخ نے آنکھ ماری اور خاموشی اختیار کر لی......

عورتوں کے عالمی دن کا اختتام ہوا چاہتا تھا۔

☆☆

سالگرہ نمبر



مکمل ناول

میمونہ صدف

زندگی یہ سفر میں ہے

ہسپتال کے کاریڈور میں بیٹھی ماں کی آنکھیں آنسو بہا بہا کر اب خشک ہونے کو تھیں۔ مزید رونے کی اس میں اب سکت تھی نہ ہمت۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے اس بت کے لب ہولے سے دعا کے لیے لرز رہے تھے، باقی سارا وجود ساکت تھا۔ اس کا ایک ایک عضو دعا بنا اکلوتی اولاد کو مانگ رہا تھا۔

"وہ ٹھیک ہو جائے گی۔" اس کے کاندھے پہ کسی کے ہاتھ کا دباؤ پڑا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بھی ایمرجنسی میں پڑی اپنی بیٹی کی زندگی کے بارے میں وہ اتنا ہی بے یقین ہے جتنا کہ وہ تھی۔

"اس نے ایسا کیوں کیا؟" اکلوتی اولاد کا دکھ کیسے رلاتا ہے وہ اب سمجھ رہے تھے۔

سامنے سے آتے ڈاکٹر واسطی کو دیکھتے ہی وہ دونوں ان کی طرف بڑھے۔

"اسٹمک (معدہ) واش کر کے ہم نے اسے روم میں شفٹ کر دیا ہے۔ جلد ہی ہوش میں آجائے گی۔ زری بیٹا۔ ویسے تو یہ پولیس کیس ہے لیکن میں نے تمہاری وجہ سے بات دبا دی ہے۔" ڈاکٹر واسطی اس کے ابو کے کزن تھے اور یہ انہی کا ہسپتال تھا۔ کسی بھی قسم کی بدنامی سے بچنے کے لیے وہ اسے یہاں لے کر آئے تھے۔ زرتاشیہ بھی وہیں ایک عرصہ کام کرتی رہی تھی۔

"شکر گزاری کے لیے الفاظ کم ہیں اس لیے شکریہ ادا نہیں کروں گی۔ کیا اب ہم اس سے مل سکتے ہیں؟" وہ اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے بے چین تھی۔

"تم دونوں اندر جا سکتے ہو لیکن ابھی وہ مینٹلی اسٹیبل نہیں ہے تو اس سے ایسی ویسی کوئی بات مت کرنا۔ کوشش کرو کہ وہ ریلیکس رہے۔"

دونوں اب اس کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں وہ موجود تھی۔

ایک رات میں ہی وہ لاغر اور بے حد کمزور دکھائی دے رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ دونوں بازوؤں پہ ڈرپ لگی ہوئی تھی اور وہ بے ہوش ایک طرف ڈھلکے سر سے سفید چادر پہ سفید چہرہ لیے لیٹی تھی۔ اسے دیکھتے ہی دونوں کو جیسے قرار آ گیا تھا۔ وہ وہیں ایک طرف صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔ زرتاشیہ اس کا ہاتھ تھامے ہی کھڑی رہی۔ خاموشی سے آنسو بہاتے وہ اس کے ہاتھوں کو وقفے وقفے سے چومتے اپنا سارا غرور چور چور ہوتے دیکھ چکی تھی۔

"کچھ کھا لو زری۔ تم نے رات سے کچھ نہیں کھایا۔" دانیال نے ڈسپوزیبل گلاس میں جوس اور سینڈوچ کا پیک اس کی طرف بڑھایا۔

"بس ایک بار یہ ہوش میں آجائے تو میں سب کھا لوں گی۔" وہ اسی طرح اس کا ہاتھ تھامے کھڑی رہی۔

"بیمار کو سنبھالنے کے لیے تیمار دار کو تندرست رہنا پڑتا ہے۔ کچھ کھالو اور ریسٹ کرلو۔" وہ اس کی بات مان کر اب صوفے پہ بیٹھی سینڈوچ نگل رہی تھی۔ پیٹ کا شکم بھرتے ہی نیند کا غلبہ طاری ہو گیا۔ وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے سو گئی تو دانیال نے ایک طرف رکھی چادر اس پہ اوڑھا دی تھی اور خود وہ زوہا کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"میں جا رہی ہوں پاپا۔ زندگی اب مزید نہیں جی جاتی مجھ سے۔ مر جاؤں گی تو معاف تو آپ مجھے کر ہی دیں گے پھر بھی ان تمام دکھوں کے لیے بہت شرمندہ ہوں جو میں نے آپ کو دیے۔ یقین جانیے اگر خدا نے اختیار دیا ہوتا تو زوہا کبھی دانیال امجد کے ہاں پیدا نہ ہوتی۔" خودکشی سے پہلے چھوڑ کر گیا اس کا مختصر سا نوٹ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا تھی۔

وہ رات اس کے کمرے میں اس کو گڈ نائٹ بولنے گیا تھا کہ یہ اس کی ہمیشہ سے عادت رہی تھی۔ تبھی اس نے زوہا کو خلاف معمول پہلے سے سوتا پا کر اس کی نبض دیکھی تھی۔ اس کی مٹھی میں خواب آور گولیاں تھیں اور پاس میں ایک نوٹ پڑا تھا۔ سیکنڈ کا سواں حصہ بھی اس نے سوچ بچار میں ضائع کیے بنا اسے اٹھا کر گاڑی کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ اسے اٹھا کر گاڑی کی طرف لے جاتے ہوئے ہی اس نے چلا کر زرتاشہ کو سب سمجھانے کی کوشش کی تھی جو اب اس کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے چلاتے ہوئے پوچھ رہی تھی کہ وہ اسے کہاں لے کر جا رہا ہے۔ گاڑی کو بھگاتے ہوئے دونوں نے راستے میں ہی اسے ڈاکٹر واسطی کے ہسپتال لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

زوہا کے پلکیں جھپکنے تک وہ خاموشی سے کھڑا اسے دیکھتا رہا تھا۔ آنکھیں کھولنے پہ سامنے موجود باپ اور اردگرد ہسپتال کے ماحول کو دیکھ کر اسے یاد آگیا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیوں ہے۔ اس نے باپ کی جانب سے رخ پھیر لیا تھا۔ وہ ان سے کچھ بھی پوچھنا نہیں چاہتی تھی۔ نہ وہ ان کے کسی بھی سوال کا جواب دینا چاہتی تھی۔ اسے افسوس تھا کہ وہ بچالی گئی ہے۔ افسوس تھا کہ کیوں بچالی گئی ہے۔

"کوئی کمی تھی ہماری طرف سے، ہماری محبت یا تربیت میں تو کہتیں ہم سے......" وہ استاد دھیما بولا تھا کہ بہ مشکل اسے سنائی دیا تھا۔ آنکھ سے آنسو گر کر سفید تکیے میں جذب ہوا تھا۔

"ہم نے کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تمہاری تربیت میں۔ جس شے پہ تم نے ہاتھ رکھا، پوری کی۔ جس بات کو منہ سے نکالا، وہ مان کر دی۔ صرف اس لیے کہ تم ہماری اکلوتی اولاد ہو، ہم بہت چاہتے ہیں تمہیں۔ بدلے میں تم یہ سب کرو گی ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔" دکھ ہی دکھ تھا۔

"ایسے مت کہیں پاپا۔" وہ تڑپ اٹھی تھی اور اس سے کہیں زیادہ شرمندہ۔ باپ کا جھکا سر دیکھ کر بیٹیوں کو شرمندہ ہی ہونا چاہیے۔

"تو پھر کیا کہوں؟ یہ کہوں کہ ہم بہت خوش ہیں جو کچھ تم نے کیا یا یہ کہوں کہ جس بیٹی کو میں دعاؤں میں مانگتا رہا، آج اس نے اسی دعا کو بددعا کر ڈالا۔" وہ یہ نہیں کہنا چاہتا تھا مگر وہ یہی کہہ رہا تھا۔

"کچھ بھی مت کہیں پلیز۔ نہ مجھ سے کچھ پوچھیں۔ میرے پاس کچھ بھی کہنے اور بتانے کو نہیں ہے پاپا۔"

"بتانا تو تمہیں پڑے گا کہ یہ سب کیوں کیا......؟" ایک گہری سانس لے کر اس نے اس کا ہاتھ تھامتے نرمی سے کہا۔ اس کے ہاتھ کا لمس اور لہجے کی نرمی نے اسے بری طرح پگھلا دیا تھا۔

"اس نے مجھے چھوڑ دیا پاپا۔ اتنے سال کے ساتھ کے بعد اس نے یوں چھوڑ دیا جیسے اپنایا ہی نہیں تھا کبھی۔" وہ سمجھتا تھا وہ کس کی بات کر رہی ہے۔ رافع کمال سے اس کا رشتہ ان دونوں نے اس کی پسند سے ہی کیا تھا۔ نہ صرف اس کی بلکہ رافع کی مرضی سے بھی۔

"وہ کہتا ہے کہ وہ اپنی ایک کلاس فیلو کو پسند کرنے لگ گیا ہے۔ پسند بھی نہیں، وہ محبت کرنے لگ گیا ہے۔ پسند تو میں تھی اس کی۔ پسند کے بنا رہا جا سکتا ہے، محبت کے بنا نہیں رہا جا سکتا۔" یہ سب

بتاتے بری طرح رو رہی تھی۔

"مجھے یقین نہیں آتا پاپا کہ وہ میرے ساتھ ایسے کر سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے، جس سے اس کا فیوچر سیکیور ہو جائے۔" وہ رو رہی تھی اور دانیال رو بھی نہیں سکتا تھا۔ "مجھے ایسے لگتا ہے جیسے کسی نے اس پہ جادو کر دیا ہے۔ نہیں، بلکہ کسی نے مجھے ہی بددعا دی ہے۔"

دانیال کو ایک جھٹکا لگا۔

"خوشیاں برباد ہو جانے کی بددعا۔ محبت چھن جانے کی بددعا۔ جیسے کسی نے کہا ہو کہ زوہا تم لمبی زندگی جیو اور اس زندگی میں تمہیں کبھی کچھ نہ ملے۔"

دانیال کے لیے وہاں کھڑا رہنا دوبھر ہو گیا تھا۔ اس کا ہاتھ چھوڑ کر وہ الٹے قدموں کمرے سے باہر نکلا تھا۔

بددعا...... بددعا...... بددعا...... ہر شے بددعا کے نام سے گونج اٹھی تھی۔ ہر شے اس پہ بددعا کا نام لے کر ہنس رہی تھی۔ اس کے لیے سانس لینا مشکل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

وہ اسکول سے گھر آیا تو اس نے چھت تک جاتی سیڑھیوں پہ ایک روئی بسورتی، بکھرے بالوں والی لڑکی کو بیٹھے دیکھا تھا جو ہاتھ میں ٹشو تھامے بار بار اس سے اپنی آنکھیں پونچھتی تھی۔ متورم آنکھوں میں برسوں کا حزن و ملال کندہ تھا، جیسے وہ ایک مدت سے اسی ایک کام میں مشغول ہو۔ روتے اور بس روتے رہے ہیں۔

اس نے ذرا کی ذرا کاندھے پہ اسکول بیگ لٹکائے اس لڑکے کو دلچسپی سے اپنی جانب دیکھتا پا کر رخ بدل لیا تھا لیکن اپنا مشغلہ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ بھی کاندھے اچکا کر اندر چلا گیا تھا۔ انجان لوگوں کو وہ کم ہی مخاطب کرتا تھا۔

"امی یہ باہر کون ویپنگ گرل ہے۔؟" بیگ اتار کر اس نے ایک طرف پھینکا اور گلے میں موجود ٹائی اتار کر صوفے پہ اچھالی۔

"وہ تمہارے کامران ماموں کی بیٹی ہذئی ہے۔ میرے ساتھ رینالے سے آئی ہے۔ اب وہ یہیں رہے گی۔ اسی گھر میں، میری بیٹی بن کر۔" اس نے ساری بات سنتے ہوئے منہ بنایا تھا۔

"تو وہ رو کیوں رہی ہے۔؟"

"تمہارے کامران ماموں کی ڈیتھ سے ڈسٹرب ہے بیٹا۔ پھر اس کی ماں بھی نہیں رہی۔" وہ خود اپنے رشتے کے بھائی کو یاد کر کے آبدیدہ ہو گئی تھیں۔ اس نے بیزاریت سے ماں کو دیکھا۔ ماں کی ایسی جذباتیت سے اسے چڑ چڑھتی تھی۔

"کیوں کیا اس کی ماں بھی مر گئی ہے؟" ٹیبل پہ رکھی فروٹ باسکٹ سے سیب اٹھا کر اس نے اس پہ اپنے دانت گاڑھے اور بے رحمی سے پوچھا۔

"اللہ نہ کرے۔ اس کی ماں زندہ ہے لیکن اب وہ اسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتی۔"

"اور آپ اسے یہاں اٹھا لائیں۔ کیونکہ آپ نے گھر میں یتیم خانہ کھولنے کا ٹھیکا لیا ہوا ہے۔" وہ اتنا ہی روڈ تھا۔ بنا کسی کا لحاظ کیے وہ بول جاتا تھا پھر سامنے اس کی ماں ہی کیوں نہ ہو۔

"تم اتنے سخت دل کیوں ہو دانی؟" بیٹے کے منہ سے ایسے جملے سننا انہیں ہمیشہ سے ہی دکھی کرتا تھا۔ نہ وہ ایسی تھیں نہ ہی ان کے شوہر امجد سجان...... نجانے وہ کس پہ گیا تھا۔

"اور آپ اتنی نرم دل کیوں ہیں ممی؟ جہاں کوئی غریب مسکین دیکھا نہیں اسے اٹھا کر گھر لانے میں جلدی کرتی ہیں۔ پہلے بھی آپ اس دانش کو اٹھا لائی تھیں وہ تو شکر ہے کہ اس کی چوری پکڑی گئی اور اسے اس گھر سے نکال دیا گیا ورنہ آپ کا وہ 'مسکین بچہ' کتنی تباہیاں مچا چکا ہوتا۔ اور اب یہ نیا پیس آپ اٹھا لائی ہیں۔ دیکھیں یہ کتنے دن میں اپنے رنگ ڈھنگ دکھاتی ہے۔" سر جھٹک کر وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔

ثریا افسوس سے سر ہلاتیں اس کا بیگ اور ٹائی اٹھا کر اسی کے پیچھے اس کے کمرے میں لائی تھیں۔

"تم اس سے طریقے سے پیش آنا۔ کچھ بھی الٹا

سید حامت کہنا...... دانش کی بات اور تھی اور ہدیٰ کی اور ہے۔ وہ ہمارے گاؤں کا لڑکا تھا، دور پار کا رشتے دار...... یہ میرے کزن کی بیٹی ہے، اس کزن کی جس نے تمہارے بابا کی تب مدد کی جب وہ اپنا سب کچھ زلزلے میں گنوا چکے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہم مہاجر ہیں اور وہ انصار جو اپنا سب ہمیں دینے پہ آمادہ ہو گئے۔ اب وہ نہیں رہے تو ان کی اکلوتی بیٹی ہماری ذمہ داری ہے۔" وہ نرمی سے اپنے اکھڑ بیٹے کو سمجھا رہی تھیں۔ جواب بیڈ پہ جوتوں سمیت لیٹا مزے سے سیب کھاتا ساری بات یوں سن رہا تھا کہ جیسے اسے اس سب میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اس کی ماں دیواروں سے باتیں کرنے کی عادت میں مبتلا ہو۔

"ماموں کامران کی شان میں آپ کے سارے قصیدے مجھے ازبر ہیں ممی۔ مزید ان کی کوئی کہانی سننے میں کم از کم میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں۔ اس لڑکی کو گھر لانے سے پہلے کیا آپ نے بابا سے پوچھا......؟" پھر اپنے اس قدر احمقانہ سوال پہ اسے خود ہی ہنسی آ گئی۔

"ہاں وہ کیوں آپ کو منع کرنے لگے آخر کامران ماموں کے احسانوں کی داستان انھیں بھی تو ازبر ہے۔"

"میں صرف تمہیں یہ کہنے آئی ہوں کہ اپنے کسی بھی رویے سے اس معصوم بچی کا دل مت دکھانا۔ وہ پہلے ہی بہت دکھی ہے۔"

"اپنی اولاد کے سوا ساری دنیا کے بچے بچیاں آپ کو معصوم لگتے ہیں۔" وہ شرارت سے ہنس دیا۔ ثریا نے تاسف سے سر ہلایا تو وہ تھوڑے ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

"اوکے نا۔ نہیں کرتا اس کے ساتھ کچھ برا۔ اب آپ اس کی فکر میں اتنا مت گھلیں اور مجھے لنچ بنا دیں پلیز۔" ثریا کو اب کچھ اطمینان نصیب ہوا تھا۔ وہ الماری سے اس کے کپڑے نکال کر بیڈ پہ رکھنے کے بعد باہر آ گئی تھیں۔

کامران ثریا کے ماموں زاد تھے اور امجد سبحان کے قریبی دوست بھی۔ ابھی چار ماہ قبل ان کی روڈ ایکسیڈنٹ میں وفات ہوئی تھی۔ ان کی وفات کے بعد ان کی بیگم مہرین اپنی عدت پوری کر کے اپنے میکے چلی گئی تھیں جہاں ان کے بھائی نے ان کا دوسرا نکاح پڑھوانے کا انتظام کر رکھا تھا کہ وہ اب بہن اور اس کی بیٹی کا خرچا نہیں اٹھا سکتے تھے۔ مہرین بہ مشکل اس نکاح پہ مانی تھیں لیکن ان کے دوسرے میاں ہدیٰ کو اپنے ساتھ رکھنے پہ آمادہ نہ تھے۔ پرائی بچی کی ذمہ داری کون اٹھاتا ہے بھلا......؟ مہرین کے بھائی بھابھی بھی ہدیٰ سے کسی طرح جان چھڑانے کے چکر میں تھے۔ تبھی مہرین نے ثریا کو کال کر کے منت کی تھی کہ وہ ہدیٰ کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ وہ وقتاً فوقتاً اس سے ملنے آتی رہیں گی۔ ثریا احسان فراموش نہ تھیں کہ کامران کے احسانات کو بھول جاتیں اسی لیے فوراً اپنے شوہر امجد سے پوچھنے لگیں۔

"آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا امجد؟"

"جس گھر میں کسی یتیم کی پرورش کی جائے، فرشتے تو اس گھر کی سلامتی کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ فرشتوں کی دعائیں لینا کسے برا لگ سکتا ہے؟" ثریا کی آنکھیں بھر آ گئی تھیں۔ وہ فوراً ہدیٰ کو ڈرائیور کے ساتھ جا کر لے آئی تھیں۔ بیٹی تو کوئی تھی نہیں، ایسے میں ہدیٰ کا مقام اس گھر میں بیٹی جیسا ہی تھا۔ دونوں میاں بیوی دل اور مزاج کے بہت نرم تھے لیکن ان کی اکلوتی اولاد ان پہ نہ گئی تھی۔

دانیال امجد سدا کا منہ پھٹ، بدلحاظ اور اکڑو تھا۔ اس کی اپنے کزنز میں سے کسی سے بھی نہیں بنتی تھی۔ نہ وہ کسی کو اپنے آگے کچھ سمجھتا تھا۔ اسی لیے ثریا کو لگتا تھا کہ وہ ہدیٰ کے ساتھ بھی ایسی ہی بے مروتی دکھائے گا۔ تبھی وہ اس کے آتے ہی اسے سمجھانے کھڑی ہوئی تھیں۔ لیکن اب اس کے یقین دلانے پہ انھیں تھوڑی تسلی ہوئی تھی کہ وہ ہدیٰ سے اچھے سے نہ سہی لیکن بری طرح پیش بھی نہیں آئے گا۔

☆☆☆

"اتنا رونے کے بعد تم کتنا پانی پیتی ہو کہ مزید

آنسو بہانے کے لیے تمہارے اندر مزید پانی موجود ہوتا ہے؟''

رات کھانے پہ وہ ڈائننگ ٹیبل پہ سر جھکائے کھانا کھاتی رہی تھی۔ ثریا نے اسے کافی کچھ پیش کیا تھا جو اس نے چپ چاپ کھالیا تھا، بنا کسی چوں وچرا کے۔ کھانے کے بعد وہ باہر لان میں چلی آئی تھی اور اب جب دانیال باہر آیا تھا تو اسے اپنے من پسند کام یعنی رونے میں گم پایا تھا۔

اس نے سر اٹھا کر دانیال کی طرف دیکھا اور بنا جواب دیے پھر سے سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھوں میں ہنوز نمی تھی۔

''کس کلاس میں پڑھتی ہو؟'' وہ سامنے والی کرسی گھسیٹ کر اس پہ بیٹھ گیا۔ یہ اس کی عادت کے خلاف تھا کہ وہ کسی سے ایسے بیٹھ کر گفتگو کرے وہ بھی کسی ایسے سے جو اس کی کسی بات کا جواب دینے سے انکاری ہو۔ نجانے اس کے ذہن میں کیا سمائی تھی جو وہ اس سے بات کرنے بیٹھ گیا تھا۔

''سیونتھ میں۔'' ایک سوں کی آواز کے ساتھ اس نے جواب دیا تو آواز اتنی مدھم اور آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی کہ وہ بہ مشکل سن پایا تھا۔ لیکن بہر حال اس نے سن لیا تھا۔ اپنے قد کاٹھ اور جسمانی ساخت سے وہ کہیں سے بھی سیونتھ کلاس کی نہیں لگتی تھی۔

''اتنی بچی تو نہیں ہو تو پھر یہ صبح سے رونا دھونا کیوں ڈالا ہوا ہے؟'' وہ بے رحمی سے جیسے اس کا مذاق اڑاتے کہہ رہا تھا۔ اس کی بات کے رد عمل کے طور پہ وہ پھر سے رونے لگ گئی اور اب پہلے سے کہیں زیادہ تیزی سے آنسو بہا رہی تھی۔ دانیال یک دم بدحواس ہو گیا۔

''ارے یار۔ پھر سے رونا۔ اب کیا تم ساری رات یہیں بیٹھ کر روتی رہو گی؟'' وہ اکتا سا گیا تھا۔

''بس کر دو اب۔ دیکھو اب تم روتی رہو گی تو ممی کو لگے گا کہ یہ میں ہوں جو تمہیں رلاتا ہوں اور وہ میرا کھانا پینا اور میری پاکٹ منی بند کر دیں گی۔'' وہ ایسی مسکین صورت بنائے کہہ رہا تھا کہ ہدیٰ یکدم سنجیدہ سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کا رونا بھی تھم گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے اس گھر کے کسی مکین کو کوئی نقصان پہنچے۔

''لیکن میں نے تو پھپھو کو نہیں کہا کہ میں آپ کی وجہ سے رو رہی ہوں۔ وہ جانتی ہیں کہ میں کیوں رو رہی ہوں۔'' ایسا کہتے وہ دانیال کو بڑی معصوم لگی تھی۔ شاید ہی اس نے اس سے زیادہ معصوم چہرہ پہلے کبھی دیکھا ہو تبھی اسے اس لڑکی میں دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔

''اچھا تو مجھے بھی بتا دو کہ کیوں رو رہی ہو؟ گھر یاد آرہا ہوگا؟'' وہ اب قدرے دوستانہ انداز اپنائے ہوئے تھا۔ ہدیٰ نے سر نفی میں ہلایا۔

''اچھا تو اپنی امی کی شادی کی وجہ سے؟'' ہدیٰ کی آنکھوں سے آنسو پھر سے بہہ نکلے۔

''تم مجھے اپنے رونے کی وجہ بتا سکتی ہو...... میں تمہیں سنوں گا۔ چاہو تو مجھے دوست بنا لو اور سب کہہ دو۔ دیکھو سب کہہ دینے سے انسان کے دل پہ دھرا بوجھ کم ہو جاتا ہے، اندر رکھنے سے تو گھٹن بڑھنے لگتی ہے۔'' ہدیٰ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ اس سے دوستی کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات خود بخود اس کے منہ سے نکلی تھی اور وہ اس پہ حیران بھی تھا۔

''لڑکے لڑکیوں کی دوستی نہیں ہوا کرتی۔'' اس کا فلک شگاف قہقہہ بس چھوٹنے کو تھا۔ شکر تھا کہ وہ اس کی مسکراہٹ دبانے کو دیکھ نہ سکی ورنہ پھر اسی شد و مد سے رونے لگتی کہ وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔

''ہاں ٹھیک ہے لیکن ہم کزنز بھی تو ہیں اور اب تو ہمیں ایک گھر میں رہنا ہے تو دوستی کرنے میں کیا حرج ہے۔ مجھے بھی کوئی باتیں کرنے والا مل جائے گا اور تمہیں بھی...... بولو کیا بنو گی میری دوست؟''

ہدیٰ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر سر ہاں میں ہلا دیا۔

''لیکن پہلے تمہیں مجھے بتانا ہوگا کہ اتنے دریا اور سمندر بہا دینے کے پیچھے کیا وجہ ہے......؟''

''ماما نے شادی کر لی لیکن وہ مجھے تو ساتھ لے جاتیں...... مجھے کیسے چھوڑ دیا......؟ میں ان کی اکلوتی بیٹی تھی، کیا اتنا آسان تھا مجھے چھوڑنا......؟ کیا میں اتنی

بری تھی کہ انھیں ایک پل کو بھی میرا خیال نہیں آیا......؟ وہ امجد انکل کے بچوں کی ماما بن گئی ہیں اور اپنی بیٹی انھوں نے یہاں رہنے کے لیے بھیج دی۔ اللہ نے تو مجھ سے ابو کو چھینا تھا، انھوں نے خود مجھ سے میری ماں کو چھین لیا۔" وہ روتے ہوئے یہ سب کہہ رہی تھی۔

دانیال نے اس سے پہلے بھی کسی کو تسلی نہیں دی تھی، نہ اسے تسلی دینا آتی تھی۔ اس لیے وہ کچھ دیر خاموشی سے یہی سوچتا رہا کہ وہ کیا کہے۔ پھر اس نے خود کو بولتے پایا۔

"تم بری نہیں ہو بس تمہارا وقت برا ہے۔ اور جب وقت برا ہوتا ہے نا تو سب کچھ برا کر دیتا ہے۔ لیکن یہ وقت بھی اچھا ہو جائے گا...... تمہاری ماما مجبور تھیں اس لیے انہوں نے شادی کر لی۔ زندگی میں کبھی نہ کبھی تم ان کی مجبوری کو سمجھ ہی لوگی۔ تمہیں وہ ساتھ نہیں لے جا سکیں کیونکہ ان کے دوسرے شوہر اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ انھیں کچھ وقت گزرنے کے بعد اجازت دے دیں اور وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔ لیکن اس سب میں وقت لگے گا۔ چیزیں سیٹل ہونے میں ہمیشہ وقت لگتا ہے ہدیٰ۔ سب ایک دم سے ہماری مرضی کا نہیں ہو جاتا۔ تب تک انھوں نے تمہیں امی اور بابا جیسے محفوظ ہاتھوں میں دیا ہے جو کبھی تمہارا برا نہیں کر سکتے۔ یہ تو انھوں نے اچھا کیا نا؟" ہدیٰ اس کی بات پہ یوں ایمان لے آئی جیسے وہ کسی آسمانی صحیفے سے سب پڑھ کر سنا رہا ہو۔

دانیال کو یقین ہی نہیں آیا کہ وہ اتنا لمبا بھاشن بھی دے سکتا ہے۔ ایسا کرتے اس کا دل کیا وہ خود کو کاندھے پہ ایک تھپکی تو ضرور ہی دے۔ کیونکہ یہ سب کہنا اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ اسے خود بھی اپنے آپ پہ حیرت ہو رہی تھی۔

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ میں شاید ماما کے بارے میں بدگمان ہو رہی ہوں۔ مجھے کچھ وقت دینا چاہیے انہیں۔ وہ مجھ سے ہمیشہ ہی بہت پیار کرتی رہی ہیں، اب کیسے مجھے بھول سکتی ہیں۔" وہ اپنے آنسو ہتھیلی کی پشت سے صاف کر رہی تھی۔ یہ تو ایک معجزہ ہوا تھا کہ دانیال کی باتوں سے وہ چپ ہو گئی تھی۔

"تو اب تم نہیں روؤگی۔" ہدیٰ نے سر اثبات میں ہلایا۔

"اب اندر جاؤ اور ڈھیر سارا پانی پیو تا کہ تمہیں اتنے آنسو بہانے پہ ڈی ہائیڈریشن نہ ہو جائے۔" اپنی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے وہ اندر کی جانب اس سے پہلے ہی بڑھ چکا تھا۔

یہ ان کی دوستی کا آغاز تھا۔

☆☆☆

ثریا کے لیے یہ سب حیران کن تھا کہ دانیال بھی کسی سے ایسے دوستی کر سکتا ہے۔ ہدیٰ میں انہوں نے دانیال کی وجہ سے ایک مثبت تبدیلی دیکھی تھی کہ وہ اب رونے اور اداس ہونے کے بجائے اپنا زیادہ وقت کسی کام میں مصروف ہو کر گزارتی تھی۔

اس نے گھر کے بیشتر کاموں کی ذمہ داری خود بخود اپنے اوپر لے لی تھی۔ وہ عام لڑکیوں کے مقابل ایک ذمہ دار اور میچور لڑکی تھی جسے گھر کے کام کاج کرنا یا تو اچھا لگتا تھا یا وہ ثریا کے احسان کا بدلہ اس صورت میں چکانا چاہتی تھی کہ اب اگر وہ اس گھر میں رہنے آ ہی گئی ہے تو اس کے کاموں میں ثریا کی مدد بھی کرے۔

دانیال اس کا کافی خیال رکھتا تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے مسائل حل کرنے میں اس کی مدد کیا کرتا تھا۔ اس سے چھوٹے چھوٹے سوالات پوچھتا رہتا تھا تا کہ وہ اپنا ماضی بھول کر حال میں جینا شروع کرے۔ جو بھی زندگی میں ہوا اسے بھول کر نئے سرے سے مسکرائے۔ وہ ایسا نہیں تھا، وہ کسی کے ساتھ بھی ایسا نہیں تھا لیکن وہ ہدیٰ کے ساتھ ایسا ہی ہو گیا تھا۔ کیوں......؟ یہ وہ خود بھی سمجھ نہیں پاتا تھا بس اسے اس لڑکی میں کچھ خاص دکھائی دیتا تھا جو وہ خود کو اس کا خیال رکھنے سے روک نہیں پاتا تھا۔

اسے دانیال کے اسکول میں ہی امجد کے تعلقات کی وجہ سے داخلہ مل گیا تھا۔ دانیال او لیولز کر رہا تھا اور وہ سیونتھ کلاس میں تھی۔ دونوں ڈرائیور کے

UUNOVELS.COM

ساتھ اکٹھے جاتے تھے مگر واپسی پہ دانیال نے اکیڈمی جانا ہوتا تھا اور وہ سیدھا گھر آ جاتی تھی۔ گھر آ کر وہ پہلے اپنا ہوم ورک کرتی پھر گھر کے بکھرے کام سمیٹتی اور باقی وقت ثریا کے ساتھ باتوں اور کاموں میں گزار دیتی۔ بیٹی کی جو کمی ثریا کو ہمیشہ سے محسوس ہوتی تھی اچانک دور ہو گئی تھی۔

"خوب قابو کر لیا ہے اس نے آپ کو ممی۔" دانیال مسکرا کر ماں سے زیادہ اسے چھیڑ رہا تھا جو ان کے برابر بیٹھی شام کی چائے اور اپنے ہاتھوں سے بنائے کوکیز کھا رہی تھی۔ ثریا نے اس کے ہاتھوں کے بنائے کوکیز کی تعریف کی تو خوشی سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔

"مجھے تو بیٹھے بٹھائے بیٹی مل گئی۔" ثریا نے پیار سے اس کا ہاتھ تھپکا۔ دانیال سر ہلاتے ہنس دیا۔

"چلیں اچھا ہے آپ کا دل بھی لگا رہتا ہے ورنہ تو آپ مجھ سے ہی شکایت کرتی رہتی تھیں کہ میں گھر پہ نہیں ٹکتا۔"

"اب مجھے شکایت کی کیا ضرورت۔ ہدیٰ ہے نا میرے پاس۔"

"کہیں کسی روز یہ مت کہہ دینا کہ اب مجھے دانیال کی بھی کیا ضرورت۔"

"بکو مت۔" دانیال نے سر خم کیا کہ جو حکم آپ کا۔

"ویسے ایک بات ہے۔ ہدیٰ کے آنے سے تم پہ بھی خاصی مثبت اثرات مرتب ہوئے ہیں۔" ثریا محسوس کر سکتی تھیں کہ کسی سے نہ گھلنے ملنے والا ان کا بیٹا اس لڑکی سے خلاف توقع خاصا گھل مل گیا تھا۔

"ہدیٰ جو ہوئی یہ۔ اس کا سایہ جس کسی پہ بھی پڑ جائے اسے ہدایت مل ہی جاتی ہے۔ اب میرا بیڑا پار لگ ہی گیا سمجھیں۔" معصوم سی صورت بنائے وہ کہہ گیا اور ہدیٰ اس کی اس بات پہ جیسے چونک سی گئی۔ ثریا کے لب مسکرا اٹھے۔

"تمہیں ہدایت مل جائے میرے لیے اس سے بڑی کوئی بات نہیں۔"

"جی بالکل۔ سمجھ سکتا ہوں میں کہ کتنا نا خلف بیٹا ہوں میں آپ کا۔ ہدایت کے رستے سے کہیں دور کھڑا..... دو نیک روحوں کی اولاد ایک بری روح بلکہ بدروح۔" وہ ان ماں بیٹے کی آپس کی نوک جھوک پہ غور کیے بنا دانیال کی کہی باتوں میں ہی گم ہو کر رہ گئی تھی۔

اس نے زندگی میں کبھی کزنز اور وہ بھی لڑکوں سے دوستی نہیں کی تھی۔ دانیال اس کی زندگی میں آنے والا پہلا لڑکا تھا جو اس کا دوست تھا۔ اس پہ اس کی ایسی توجہ اور ہمدردی ہدیٰ کا دل عجیب لے پہ دھڑکا۔ وہ ہر روز نئے حوالے سے سوچنے لگی تھی۔ اسے اپنے جذبات کی خود ہی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور جتنی آ رہی تھی، وہ یہی تھی کہ وہ دوست سے کچھ بڑھ کر اس کے لیے ہوتا جا رہا تھا۔

"وہ تمہیں صرف دوست سمجھتا ہے ہدیٰ بی بی۔ اتنے بڑے خواب مت دیکھو۔ ٹوٹے تو تم جڑ نہیں سکو گی۔" خود کو سرزنش کرتی وہ اسی کے بارے میں سوچنے میں پھر سے محو ہو گئی تھی۔

☆☆☆

دانیال او لیولز کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہدیٰ بھی او لیولز کرے لیکن ہدیٰ نے تو سنتے ہی صاف انکار کر دیا تھا۔

"میں اتنا دماغ نہیں کھپا سکتی نہ ہی میں اتنی ذہین ہوں۔ میں سادہ میٹرک ہی کرنا چاہتی ہوں۔ میرے لیے یہی بہت ہے۔"

دانیال نے اس بات پہ خاموشی اختیار کر لی تھی لیکن اب وہ چاہتا تھا کہ اگر وہ میٹرک ہی کرنا چاہتی ہے تو شاندار انداز سے کرے۔ اسی لیے وہ چاہتا تھا کہ وہ بھی اکیڈمی جوائن کر لے اس طرح وہ زیادہ بہتر طور سے پڑھ سکے گی لیکن اس نے از خود ہی منع کر دیا تھا۔

"میں اسکول اور اکیڈمی اکٹھے نہیں مینج کر سکتی۔ اسکول کی پڑھائی ہی کافی ہے میرے لیے۔"

"لیکن اس سے تم زیادہ اچھا پڑھ پاؤ گی۔ اکیڈمی میں بہت زیادہ کونسیپٹ کلیئر ہوتے ہیں۔ تم بہت زبردست رزلٹ لاؤ گی دیکھنا۔"

"مجھے لگتا ہے اس سے میں کچھ بھی نہیں پڑھ سکوں گی۔ میں ایک طرف ہی دھیان دے دوں تو

بڑی بات ہے۔ ایسے دو جگہوں پہ پڑھنے سے میں تھک جاؤں گی اور کچھ بھی نہیں کر پاؤں گی۔"

"تم اتنی نازک نہیں ہو کہ اتنی جلدی تھک جاؤ۔"

"مجھے مجبور مت کرو دانی۔ میں نہیں جانا چاہتی تو بس نہیں جانا چاہتی اکیڈمی۔"

اس کی بات پہ اس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا تھا۔

دانیال کے لیے پڑھائی اور کیریر بنانا جینے مرنے جیسا تھا۔ وہ پڑھائی کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھتا تھا اور ہدیٰ سے پڑھائی کے معاملے میں ایسی غفلت اور لاپروائی اس سے برداشت نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ اسے بھی اپنی طرح اچھے گریڈز لیتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے پہلے بھی غور کیا تھا کہ وہ پڑھائی لکھائی سے زیادہ گھریلو کام کاج اور آرٹ ورک میں دلچسپی رکھتی ہے۔ یہ بات دانیال کو پسند نہیں تھی کہ وہ پڑھائی پہ کم اور دیگر سرگرمیوں میں زیادہ دلچسپی لے لیکن وہ اس معاملے میں اسے اس کے حال پہ چھوڑ دینا چاہتا تھا البتہ وہ اپنی برہمی کا احساس اس سے کم مخاطب ہو کر کر رہا تھا جو جلد ہی ہدیٰ نے محسوس کر لیا تھا۔

☆☆☆

اسکول سے آنے کے بعد وہ سونے کے بجائے اپنے کمرے میں بیٹھی کچھ نہ کچھ بناتی رہتی تھی۔ گھر کی بہت سی بیکار اشیاء جو پھینکنے لائق ہوتیں اسے وہ پھر سے اپنی مہارت اور ہنر کے ذریعے کسی قابل استعمال شے میں ڈھال لیتی۔

"یہ لکڑی کا ڈبا بیکار ہے، پھینک دو۔" ثریا نے اٹھا کر ایک طرف کیا تو اسی کو اٹھا کر اس نے دیوار گیر چوکھٹے کی شکل میں ڈھال لیا جس میں اب چند کتابیں اور گلدان سجے تھے۔

"یہ بوتلیں کباڑ والے کو دے دینا۔" چند دن بعد ہدیٰ کی ذرا سی محنت سے وہ انہیں باہر صحن میں چھوٹے چھوٹے سجاوٹی گملوں کی صورت دکھائی دیں۔

"یہ اونی سویٹر پرانے ہو گئے، کسی کو دے دوں گی۔" انھی اونی سویٹر کو ادھیڑ کر ہدیٰ نے ایک چھوٹا سا فلور میٹ بنا لیا تو ثریا حیران رہ گئیں۔

"تم میں بہت صلاحیت ہے ہدیٰ۔ تم بیکار سے بیکار شے کو سونا کر دیتی ہو۔" وہ سراہے بنا نہ رہ سکیں تو وہ مسکرا دی۔

"لیکن میں خود کو تو سونا نہیں کر سکی، شاید میں بیکار سے بھی زیادہ بیکار ہوں گی۔" وہ بس ایک سوچ تھی جسے اس نے سوچتے ہی جھٹک دیا تھا۔

"تم نے دیکھا دانی ہدیٰ نے اتنا کچھ بنا کر اس گھر کو کیسے بدل دیا ہے۔" وہ انہیں چائے کا کپ پیش کر رہی تھی۔ دانیال وہیں لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ ان دنوں امتحانات کی وجہ سے وہ گھر میں کم اور کمبائنڈ اسٹڈی کے لیے دوستوں کی طرف زیادہ پایا جاتا تھا۔ اب بھی وہ اپنا بیگ تیار کیے کسی کتاب میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ بائیک کی چابی وہیں میز پہ دھری تھی جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ نکلنے ہی والا ہے۔

"دیکھا ہے کہ کیسے یہ اپنا وقت برباد کرتی ہے۔" اس کے لہجے میں طنز نہیں تھا لیکن برہمی نمایاں تھی۔ ثریا کو یک دم ہدیٰ کی آنکھوں میں اداسی دکھائی دی۔

"برباد کیوں؟ اتنی کارآمد اشیاء تو بناتی ہے۔"

"یہ تمام اشیاء بازار میں بھی دستیاب ہیں۔ اس کے نہ بنانے سے ہمارا گھر ایک بڑی دولت سے محروم نہیں رہ جائے گا۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ یہ اپنا وقت پڑھائی پہ لگا کر کسی قابل بن جائے۔" وہ اپنی کتاب پہ سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھتا کہہ رہا تھا۔ ان دنوں اس کے پاس وقت نہیں ہوتا تھا کہ وہ گھر پہ ماں باپ کے ساتھ یا اس کے ساتھ گزارے۔ ابھی بھی وہ کتاب بیگ میں ڈال کر بیگ بند کر رہا تھا۔

"یہ بھی قابلیت ہے بیٹا۔" وہ دل سے کہہ رہی تھیں لیکن ہدیٰ کا دل جیسے ٹوٹ گیا تھا۔

"جو اس دور میں کسی قابل نہیں۔" ایک بے رحم تبصرہ کر کے اور اچٹتی نگاہ اس پہ ڈال کر وہ جا چکا تھا۔ ہدیٰ اٹھنے لگی تو ثریا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"یونہی چڑا ہوا ہے۔ ورنہ یہ خود تمہیں بتاتا کہ تم کتنی قابل ہو۔"

ہدیٰ تکلفاً مسکرا دی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ثریا اس کا دل رکھنے کے لیے ایسا کہہ رہی ہیں۔ ان کا ہاتھ تھپکا اور چلی گئی۔

"کاش تم میرے اس بیٹے کو بھی سونا بنا دو ہدیٰ۔" اسے جاتا دیکھ کر اس کی کمر پہ جھولتی چوٹی کو دیکھتے وہ سوچ رہی تھیں۔ اس سوچ نے انہیں ایک نئے انداز سے سوچنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

☆☆☆

"تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟" وہ امتحانوں سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس نے ثریا کے سامنے اپنے دوستوں کے ہمراہ کاغان ناران جانے کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ وہ اس کے کمرے میں آئی تو دانیال اپنا سامان پیک کر رہا تھا۔ اس نے کل رات کو دوستوں کے ساتھ نکل جانا تھا اور دو ہفتے بعد لوٹنا تھا۔ وہ اتنا انتظار کرتی رہی تھی کہ اس کے امتحانات ختم ہوں تو وہ اس سے دوٹوک بات کرے، اب مزید دو ہفتے انتظار نہیں کر سکتی تھی۔

"بات کرتا تو ہوں اور کیسے بات کروں؟" وہ بیگ میں کپڑے تہ کر کے ڈال رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھے بنا ہی اس نے جواب دیا۔

"ضرورتاً بات کرتے ہو۔ ورنہ تو شاید مجھے بلانا بھی گوارا نہ کرو۔"

"میں ایسا ہی ہوں۔" اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ وہ ایسا ہی تھا لیکن وہ یہ غلط کہہ رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ایسا تھا۔ اس کے لیے تو وہ پچھلے ایک سال سے ایک مہربان دوست جیسا تھا جو اب کچھ عرصے سے بدل سا گیا تھا۔

"تم مجھ سے اس لیے خفا ہو کہ میں نے تمہارے کہنے پہ اکیڈمی جوائن نہیں کی؟"

"یہ تمہاری زندگی، تمہارا فیصلہ ہے۔ مجھے اس سے کیا؟" وہ اب بھی اجنبیت برتتے ہوئے تھا۔

ہدیٰ کو رونا آنے لگا۔

"تم میرے بیسٹ فرینڈ ہو، تمہارا ناراض ہونا میں افورڈ نہیں کر سکتی۔"

"لیکن تم میری جسٹ فرینڈ ہو اس لیے مجھے اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ اتنے دوستوں میں کوئی ایک آدھ فرینڈ مجھ سے چھوٹ بھی جائے تو......" ایسے بے رحم جملے نے اس کا وجود کاٹ دیا تھا۔ آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ مان ٹوٹ گیا تھا۔

"ایسے مت کہو دانی۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھے اچھی جگہ دیکھنا چاہتے ہو لیکن میں کیا کروں کہ میرا پڑھائی میں اتنا دل نہیں لگتا۔ میں سب کی طرح سقراط بقراط نہیں بننا چاہتی۔" وہ ہاتھوں کی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ اس کے بہتے آنسو بھی اس بار دانیال کو نرم نہ کر سکے تھے۔

"جو کسی مقام پہ نہیں پہنچ پاتے نا ہدیٰ بی بی! دنیا انہیں ٹھکرا کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ سقراط بقراط نہ سہی اتنا تو بن جاؤ کہ سب تمہیں سر اٹھا کر دیکھیں۔" لہجے کی سختی رویے کی سختی سے جا ملی تھی۔

"مجھے دنیا کی نظروں میں نہیں آنا۔ میں وہ کرنا چاہتی ہوں جس سے مجھے خوشی ملتی ہو اور میں جو کام کر رہی ہوں اسی میں خوشی محسوس کرتی ہوں۔ بھلے دنیا مجھے نہ دیکھے مجھے فرق نہیں پڑتا دانی۔ لیکن مجھے اس سے فرق پڑ رہا ہے کہ تم مجھے نہیں دیکھ رہے۔"

"بہت جلد تمہیں پتا چل جائے گا کہ تم نے خود کو بری طرح برباد کیا ہے لیکن اس وقت، وقت آگے بڑھ چکا ہو گا اور یاد رکھنا کہ جو وقت کے ساتھ چلنا نہیں جانتے، وقت کی چال نہیں سمجھتے، وہ پیچھے رہ جاتے ہیں، تنہا پڑ جاتے ہیں۔"

ہدیٰ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر عجیب سے لہجے میں بولی۔

"تمہاری سوچ اتنی میٹیریلسٹک کیوں ہے دانی؟ تم ہر چیز کو حتیٰ کہ خود سے جڑے رشتوں کو بھی اسٹیٹس اور مادیت کی بنیاد پہ کیوں دیکھتے ہو؟"

"کیونکہ میں پریکٹیکل ہوں اور اس دور میں میرے جیسا ہونا بھی چاہیے...... مجھے لوگوں کو میڈل بنا کر گلے میں لٹکانے کا کوئی شوق نہیں۔ اس کام کے لیے ڈگریاں ہوتی ہیں، میڈلز ہوتے ہیں، رتبے

نہیں ......تم دیکھنا کہ میں زندگی میں کتنا کامیاب رہوں گا اس سوچ کے ساتھ۔" وہ دوٹوک کہتا اب پھر سے اپنے کپڑے رکھنے لگ گیا۔ مطلب وہ اس سے مزید بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ہدیٰ اب چپ چاپ اس کے کمرے سے نکل آئی تھی۔ اس کا دل یک دم بوجھل ہو گیا تھا۔ نجانے کیوں دانیال دن بدن اسے دور ہوتا دکھائی دے رہا تھا جوں جوں وہ زندگی میں آگے بڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

"دانی کو پڑھائی کا بہت جنون ہے نا پھپھو؟"

وہ لاؤنج میں رکھی اس ریک کی صفائی کر رہی تھی جس میں اوپر سے نیچے اس کی شیلڈز ہی شیلڈز تھیں۔

"بہت زیادہ...... وہ اپنی پڑھائی اور مستقبل کو لے کر جتنا جنونی ہے شاید ہی اور کسی معاملے میں ہو۔"

ایک فخریہ نظر انھوں نے دانیال کی شیلڈز پہ ڈالی تھی۔ ان کے بیٹے کی ایک یہی بات ان کا سر فخر سے بلند کر دیتی تھی کہ وہ ہمیشہ اپنی کلاس اور اسکول کا ٹاپر رہا تھا۔ باقی وہ بھلے ان کی مرضی کا نہ ڈھل سکا ہو لیکن اس معاملے میں اس نے کبھی انھیں مایوس نہیں کیا تھا۔

"لیکن ہر کوئی ایسا نہیں ہوتا اسے سمجھنا چاہیے۔"

وہ برے دل سے کہہ رہی تھی ثریا محسوس کر گئی تھیں۔

"کوئی بات ہوئی ہے؟"

"وہ مجھے بھی اپنے جیسا دیکھنا چاہتا ہے لیکن میں کیا کروں کہ مجھے پڑھنے کا جنون کی حد تک تو کیا، شوق ہی نہیں ہے۔ میں نے ہمیشہ بس پاسنگ مارکس کے لیے پڑھا ہے۔ لیکن وہ اس بات کو نہیں سمجھتا۔ اسی لیے مجھ سے خفا ہے شاید۔"

"ایسا نہیں ہے بیٹا۔ بس وہ تمہیں بھی کسی اچھے مقام پہ دیکھنا چاہتا ہے۔"

ہدیٰ نے ان سے بحث نہیں کی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کی حاصل کردہ شیلڈز صاف کر کے رکھتی جا رہی تھی کہ اچانک اس کے ہاتھ سے ایک ٹوٹ کر زمین پہ گر گئی۔ لاؤنج چھناکے کی آواز سے گونجا اور پھر ہر شے پہ خاموشی چھا گئی۔ اس کا سانس اٹک گیا تو ثریا کی روح کانپ گئی۔ تبھی دروازے سے اندر آتے دانیال نے زمین پہ کرچی کرچی پڑی اپنی شیلڈ کو دیکھا تھا اور ہدیٰ نے اندر آتے دانیال کو۔

"وہ...... آئی...... ایم ...... سو......" وہ اٹک اٹک کر کہہ ہی رہی تھی کہ غصے کی تمازت سے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ وہ پوری قوت سے چلایا۔

"شٹ اپ یو ایڈیٹ۔ جسٹ شٹ اپ۔"

ہدیٰ ساکن اور ثریا حیران تھیں۔

"میری اتنی قیمتی شیلڈ تم نے یوں تباہ کر دی۔"

وہ زمین پہ پڑی کرچیوں کو دیکھتے پاگل ہی ہو گیا تھا۔

"خود تو ساری زندگی کبھی فرسٹ آئی نہیں ہو گی اسی لیے تمہیں کیا احساس کہ تم نے میرا کتنا بڑا نقصان کیا ہے ہدیٰ کامران۔ یہ جو تمغے، میڈل اور شیلڈز ہوتی ہیں نا یہ انسان کی عمر بھر کی ریاضت اور کمائی ہوتی ہیں۔ سالوں کی محنت...... لیکن تم جیسے کوڑھ مغز یہ کہاں سمجھ سکتے ہیں جو مارے باندھے کتابیں اٹھاتے ہیں، جن کے پاس شیلڈز اور میڈلز کے نام پہ کچھ نہیں ہوتا۔ بس دوسروں کی کامیابیوں پہ تالیاں بجانے دنیا میں آتے ہیں۔" اس نے ہدیٰ کی آنکھوں میں آئی نمی کو دیکھا تک نہ تھا بس چلا رہا تھا۔

"دل تو کر رہا کہ......" اس کا ہاتھ ہوا میں بلند ہوا اور ہدیٰ کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ۔

"دانی......" ثریا نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ روکا اور ہدیٰ اندر کمرے میں بھاگ گئی۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا......؟ اس نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ غلطی سے ہاتھ سے چھوٹ گئی لیکن تم نے تو آج ساری حدیں ہی پار کر دی ہیں۔" ثریا کو جتنا افسوس ہوتا کم تھا۔ شاید اسے بھی اپنا ہاتھ اٹھانے پہ پچھتاوا تھا کہ مزید کچھ نہیں بولا۔ بس غصے کو قابو کرنے کے لیے وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

ثریا کے خاموش ہونے پہ اس نے ایک نظر ان پہ ڈالی اور پاس پڑی کرسی کو لات مارتے، میز پہ پڑا گلدان گراتے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

شام کی چائے تو کیا رات کے کھانے پہ بھی

ہدیٰ کمرے سے باہر نہیں آئی تھی۔ثریا نے دروازہ بھی بجایا تھا لیکن اس نے اندر سے ہی کہہ بھیجا تھا کہ اسے بھوک نہیں ہے۔تبھی کھانے کی میز پہ امجد نے پوچھا تھا۔

"ہدیٰ آج کدھر ہے؟" ثریا نے اک اچٹتی سی نگاہ دانیال پہ ڈالی تھی۔اب وہ کیا تفصیلات بتاتیں۔

"اس کی طبیعت نہیں ٹھیک۔کھانا اپنے کمرے میں کھائے گی۔" وہ صبح والے واقعے کا تذکرہ امجد کے سامنے گول کرگئی تھیں۔

"تم نے کب نکلنا ہے؟"

"بس کھانا کھا کر نکل رہا ہوں۔" وہ بددلی سے کھانا کھا رہا تھا۔

ثریا کو لگا تھا کہ جانے سے قبل وہ ہدیٰ کے پاس جائے گا۔اپنے رویے کی معافی نہ سہی لیکن اسے منانے کی کوشش تو کرے گا۔انھیں غلط لگا تھا۔وہ ان سے مل کر چلا گیا تھا۔ہدیٰ سے ملنے کا تردد اس نے نہیں کیا تھا۔

اگلی صبح ہدیٰ اپنے کمرے سے نکلی تھی۔وہ ان سے بات کرتے بالکل نارمل تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ثریا شرمندگی سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھیں۔دانیال نے حرکت ہی ایسی کی تھی۔کچھ بھی ہوجاتا وہ اس پہ ہاتھ نہ اٹھاتا بس۔

"بیٹا کل جو کچھ بھی ہوا......" وہ دانیال کی طرف سے خود معذرت کرنا چاہ رہی تھیں لیکن ہدیٰ نے ان کی بات بیچ میں ہی ٹوک دی۔

"پھپھو آج کھانے میں کیا بننا ہے......؟" وہ کچن میں مصروف سے انداز میں ان کی جانب دیکھے بنا ہی پوچھ رہی تھی۔

"کچھ بھی بنا دو اپنی پسند کا۔جب سے تم نے کچن سنبھالا ہے میری تو اس دردسری سے جان چھوٹ گئی کہ آج کیا پکانا ہے۔" ہدیٰ ایک مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ کیبنٹ کھول کر کھڑی ہوگئی۔

"وہ میں دال......"

"میرے خیال سے مسور کی بھگار والی دال اور ابلے چاول بنا لیتی ہوں۔" ثریا سمجھ گئی تھیں کہ وہ اس ٹاپک پہ بات نہیں کرنا چاہ رہی اسی لیے پھر مزید نہیں چھیڑا۔

"جیسے تمہاری مرضی بیٹا۔" اتنا کہہ کر وہ کچن سے نکل گئیں۔ہدیٰ نے ان کے جاتے ہی اپنی آنکھوں کو نم ہوتے پایا تھا پھر سختی سے خود کو رونے سے باز رکھا کہ کل پوری رات وہ یہی تو کرتی رہی تھی۔اب اور نہیں۔مزید نہیں۔ہم زندگی میں بیشتر وقت انہی لوگوں کے لیے روتے گزارتے ہیں جنھیں ہماری تکلیف کی پروا بھی نہیں ہوتی۔

☆☆☆

دو ہفتے کا کہہ کر وہ تین دن بعد ہی واپس آگیا تھا۔ثریا یوں اس کے اچانک لوٹنے پہ حیران تھیں۔

"بس دل نہیں لگا وہاں۔" وہ نجانے کیوں اکتایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

"جب یہاں کسی کا دل دکھا کر گئے تھے تو وہاں دل لگ بھی کیسے سکتا تھا۔"

وہ خاموش رہا تھا۔بات تھی بھی یہی کہ جب سے وہ یہاں سے گیا تھا ہدیٰ کے بارے میں ہی سوچتا رہا تھا۔نجانے کیسے اس نے اتنا ڈھیر غصہ اس پہ اتار دیا تھا،کیسے اس پہ ہاتھ اٹھا لیا تھا۔اسی لیے وہ دوستوں کو وہیں چھوڑ کر واپس آگیا تھا۔

"وہ کہاں ہے؟" ایک نظر سارے گھر پہ ڈال کر وہ ان سے پوچھ رہا تھا۔

"پیچھے صحن میں بیٹھی کارڈ بورڈ سے شو ریک بنا رہی ہے......چلے جاؤ......لیکن یہ مت کہنا کہ حساب لینے آئے ہو،بس سچ بتا دینا کہ معذرت کرنے آئے ہو۔"

وہ اپنا سارا سامان وہیں چھوڑ کر سیدھا اس کے پاس گیا تھا۔وہ منہمک سی اپنے کام میں لگی تھی۔اردگرد ڈھیر سارا سامان بکھرائے دنیا جہاں سے بے خبر۔

"اتنی مصروف ہو کہ میرے آنے کا پتا تک نہیں چلا۔" وہ وہیں ایک طرف بیٹھ گیا۔وہ واقعی چونکی تھی کہ اتنی جلدی وہ واپس کیسے آگیا۔وہ اس کی حیرت بھانپ گیا تھا۔

"تمہیں دکھی کر کے گیا تھا تو خود بھی بے چین رہا اسی لیے بھاگا آ گیا کہ تمہیں منا سکوں۔" اس شخص کو وہ جتنا جانتی تھی اتنا ہی اس سے انجان تھی۔ عجیب بھول بھلیوں سا تھا وہ۔

وہ چپ چاپ اپنا کام کرتی رہی۔ لیکن ہاتھ پہلے سے سست ہو چلے تھے کہ دھیان بٹ گیا تھا۔

"اس دن جو بھی ہوا......"

"اس دن جو بھی ہوا مجھے میری اوقات پتا چل گئی دانیال صاحب۔ آپ نے جو بھی کہا ٹھیک کہا۔ میں اسی قابل تھی اور جو جس قابل ہوتا ہے اسے بتا دینا اچھا ہوتا ہے۔ آپ نے بھی بتا دیا، اچھا کیا۔" اس کی بات کاٹ کر وہ ترشی سے بولی۔

"میں غصے میں تھا.... تم جانتی ہو کہ میری پڑھائی، میرا کیریئر میرے لیے کیا ہے۔ اس طرح اپنی شیلڈ کو ٹوٹا دیکھ کر مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور......"

"اور آپ نے مجھے توڑ دیا۔" وہ اب کی بار اس کی جانب دیکھ کر کہہ رہی تھی۔ دکھ سے، تکلیف سے۔

"میں بہت شرمندہ ہوں۔ معافی مانگتا ہوں۔"

وہ حقیقتاً شرمسار تھا یہ اس کے لہجے سے عیاں تھا۔

"جو ٹوٹ جاتا ہے وہ جڑ نہیں پاتا۔ جیسے وہ شیلڈ اور جیسے میرا دل۔" آواز بھرا گئی تھی۔

"اپنے دوست کو معاف کر دو۔" ہاتھ باندھنے کی کسر ہی باقی تھی اب۔

"اتنے ڈھیر دوستوں میں کوئی ایک دوست روٹھ بھی جائے تو فرق نہیں پڑا کرتا۔" وہ اٹھ کر اندر چلی گئی تھی اور دانیال اسے بس جاتا دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ اب معمول کے سارے کام کرتی تھی ایک سوائے دانیال سے بات کرنے کے۔ دانیال نے بھی اسے منانے کی پھر سے کوشش نہیں کی تھی۔ ایک چھت تلے دو دوست، دو اجنبی بن چکے تھے۔ دانیال کو فرق نہیں پڑتا تھا لیکن ہدیٰ کو پڑ رہا تھا۔ وہ کئی بار کن انکھیوں سے اسے دیکھتی، اس کے چہرے پہ ندامت کو کھوجتی۔ اگر وہ نادم تھا تو اسے منا کیوں نہیں رہا تھا؟ ایک بار پھر سے اس کے پاس آ کر منانے کی کوشش تو کرتا، اب کی بار وہ مان جاتی۔ دانیال کے ڈھیروں دوستوں میں سے ایک روٹھا تھا لیکن اس کا تو وہ واحد دوست تھا وہ۔ اسے فرق پڑ رہا تھا، بہت فرق پڑ رہا تھا۔

انہی دنوں دانیال کے انٹری ٹیسٹ کا رزلٹ آ گیا تھا۔ میڈیکل میں اس کا ایڈمیشن نہیں ہوا تھا۔

"تم سیلف فنانس پہ داخلہ لے لو بیٹا لیکن ایسے دل چھوٹا مت کرو۔" ثریا اسے تسلی دے رہی تھیں۔

"بابا اتنے امیر نہیں ہیں کہ میرا سیلف فنانس پہ داخلہ کروا سکیں۔ جانتی بھی ہیں کتنی فیس ہوتی ہے.....؟ میرا باپ خود کو بیچ بھی آئے نا ممی تو بھی نہیں بھر سکتا میری فیس..... میں اسی لیے اتنی محنت کرتا تھا کہ اپنے بل بوتے پہ کچھ بن سکوں۔ بابا کا چھوٹا سا بزنس ہے کوئی کروڑوں کا نہیں کہ وہ مجھے سیلف فنانس پہ ڈاکٹر بنا دیں گے۔ اب میں بھی ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔" وہ دنیا کے ساتھ ساتھ خود پہ بھی برہم تھا اور یہ برہمی اس کی آنکھوں، لہجے اور ہر شے سے عیاں تھی۔ بڑھی شیو اور متورم آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ رات بھر سو نہیں سکا۔

"زندگی اسی پہ تمام نہیں ہو جاتی دانی۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر پیار سے بولیں تو اپنا ہاتھ سختی سے کھینچ کر وہ سختی سے چلایا۔

"میرے لیے زندگی اسی پہ ختم ہو گئی ہے ممی۔ میں نے کوئی ہزاروں سپنے نہیں دیکھے تھے بس ایک ہی دیکھا تھا..... بس ایک ہی اور وہ بھی پورا نہیں ہو سکا۔"

تبھی ہدیٰ اندر داخل ہوئی تھی۔ امجد ثریا کو بلا رہے تھے وہ یہی بتانے آئی تھی کہ دانیال اسے دیکھ کر کہہ اٹھا۔

"اس کی بددعا لگی ہے مجھے۔ اس کا دل توڑا تھا نا میں نے۔ اسی کی سزا مل رہی ہے مجھے۔ اس نے معاف جو نہیں کیا مجھے اب تک۔ اب دیکھیں کیسی سزا دی ہے نا مجھے اللہ نے۔ اس نے ایک شیلڈ توڑی تو میں اتنا چلایا اس پہ...... ہاتھ تک اٹھا لیا۔ اللہ نے مجھے سزا سنا دی کہ اب ساری زندگی چلاؤ، روتے رہو

نہیں ملے گا تمہیں وہ جو تم چاہتے ہو۔ دیکھیں مجھے کیسا تھپڑ مارا ہے اللہ نے ممی۔ خود ہاتھ نہیں اٹھایا مجھ پہ اس نے، اللہ سے کہا ہے کہ اس پہ سے ہاتھ اٹھا لیں۔'' وہ ماں کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔ ہدیٰ نے اس سے قبل اسے ایسا نہیں دیکھا تھا۔ ایسے روتے ہوئے بچوں کی طرح نہیں دیکھا تھا۔ وہ بالکل شاکڈ رہ گئی تھی۔ ثریا اسے چپ کرا رہی تھیں۔ ہدیٰ کمرے سے نکل گئی تھی لیکن وہ رات اس نے جاگ کر، آنکھوں کو بھگوتے گزاری تھی۔

''ہدیٰ کی زندگی میں یہ ہی کتنے رشتے دانی کہ وہ اپنے گنتی کے چند رشتوں کو بھی بددعا کی مار مار ڈالے۔''

☆☆☆

اگلی صبح وہ فجر کی نماز کے بعد باہر صحن میں چہل قدمی کے لیے نکلی تو اسے دانیال وہاں سیڑھیوں پہ بیٹھا دکھائی دیا تھا۔ ہوا میں خنکی خاصی تھی جس کے باعث ہدیٰ نے شال اوڑھ رکھی تھی لیکن وہ وہاں ہاف سلیوز ٹی شرٹ اور پینٹ میں بیٹھا آسمان کو تک رہا تھا۔ اس پل وہ ہدیٰ کو دنیا سے ہارا ہوا شخص لگا تھا جس کے چہرے کی چمک اور ارادے کی مضبوطی ایک شکست سے ہی ہار گئی ہوں۔ ہدیٰ بے اختیار ہی اس کی جانب بڑھی تھی۔

''ٹھنڈ بڑھ گئی ہے۔ اس طرح یہاں بیٹھنے سے تمہاری طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔'' وہ اس کے سامنے کھڑی تھی، اس سے مخاطب تھی لیکن اس نے ایک نظر بھی اسے نہیں دیکھا۔

''تمہیں اگر یہ لگتا ہے کہ میں نے تمہیں کوئی بددعا دی ہے کہ تمہارا ایڈمیشن نہیں ہو سکا تو تمہیں غلط لگتا ہے دانی۔'' وہ اب کی بار اس سے نیچے کی ایک سیڑھی پہ بیٹھ گئی تھی۔ ''میں کبھی تمہیں بددعا نہیں دے سکتی۔ تم میری زندگی میں تب آئے جب مجھے دوست کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ مجھے تب حوصلہ دیا جب میں بالکل ٹوٹ چکی تھی۔ ماما نے مجھ سے ایک دو بار کے علاوہ کبھی رابطہ نہیں کیا لیکن میں اب بھی تمہاری دی ہوئی اس تسلی کی وجہ سے ان کی منتظر ہوں کہ وہ وقت آنے پہ مجھے یہاں سے لے جائیں گی۔ میں اپنی زندگی میں اگر دوبارہ جینے کی کوشش کر سکی ہوں تو تمہاری وجہ سے دانی..... اتنے احسان ہیں مجھ پہ تمہارے..... اور جن کے احسان ہوا کرتے ہیں انہیں دعا دیتے ہیں، بددعا نہیں۔ ہدیٰ سب کچھ ہو سکتی ہے مگر احسان فراموش نہیں ہو سکتی۔'' اس کے ہاتھ گود میں دھرے تھے اور وہ ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہی تھی۔

''کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ ہم کسی انسان کا دل دکھاتے ہیں تو بدلہ وہ انسان نہیں، اللہ ہم سے لیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ تمہارا بدلہ اللہ نے مجھ سے لیا ہے۔ لیکن دیکھو تو سہی کہ کہاں آ کر لیا ہے۔'' اس کی آواز میں حسرت تھی۔ ہدیٰ نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ بنجر آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''تم ڈاکٹر نہیں بن سکے تو کیا ہوا تم بہت کچھ اور بن سکتے ہو۔ زندگی ختم نہیں ہوئی، جا رہی ہے۔ حالات ہمیشہ ہماری مرضی کے نہیں ہوا کرتے دانی۔ حالات ناموافق ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم ہار گئے ہیں۔ ہمیں انہی ناموافق حالات میں جینا ہوتا ہے۔ حالات ہمارے بس میں نہ سہی، ارادے ہمارے بس میں ہیں۔ ایک ارادہ ٹوٹا ہے، دوسرا کر لو۔ ناکامی ہمیشہ کامیابی کی نوید لاتی ہے۔ ایک ناکامی ہوئی ہے، سو کامیابیاں منتظر ہیں۔''

''ڈاکٹر تو میں ضرور بنوں گا۔ ایم بی بی ایس نہ سہی، پی ایچ ڈی ہی سہی۔ دانیال کے نام کے ساتھ ڈاکٹر ضرور لگے گا۔'' وہ ایک پل میں مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ ہدیٰ مسکرا دی تھی۔

''ڈاکٹر دانیال امجد۔'' اس کی بات پہ وہ پھیکا سا مسکرا دیا تھا۔

☆☆☆

اس نے آگے بڑھنے کا تہیہ کرتے ہوئے آگے ایڈمیشن لے لیا تھا۔ اب وہ بائیو سائنسز میں بی ایس کر رہا تھا۔ دونوں کی دوستی پھر سے پہلے سی ہو گئی تھی۔ ہدیٰ دل سے سب بھلا چکی تھی اور دانیال بھی

اپنی فیلڈ میں محنت کر رہا تھا۔ اس کا ارادہ پی ایچ ڈی کے لیے باہر جانے کا تھا وہ بھی اسکالرشپ پہ اسی لیے وہ دن رات ایک کیے ہوئے تھا۔

''اتنے برے پیپرز ہوئے ہیں کہ بس سمجھو فیل ہوتے ہوتے بچوں گی اور اگر ایگزامنر نے کچھ ہاتھ کھینچ لیا تو شاید فیل ہو بھی جاؤں۔'' منہ بسورے وہ کارپٹ پہ بیٹھی، ایک ہاتھ میں پاپ کارن کا باؤل تھامے دوسرے ہاتھ سے میگزین کی ورق گردانی کرتے کہہ رہی تھی۔

''بڑے فخر کی بات ہے نا جیسے جواتنے مزے سے بیٹھی ہو، کھا بھی رہی ہو، میگزین پڑھ رہی ہو۔'' اسے شرم دلانے کی ادنیٰ سی کوشش تھی یہ۔ لیکن وہ شرمندہ ہونے کے بجائے میگزین ایک طرف رکھ کر ڈھٹائی سے اب اس کی طرف دیکھتے کہہ رہی تھی۔

''تو کیا کروں اب۔ چھت سے کود جاؤں، گلے میں پھندا ڈال کر پنکھے سے لٹک جاؤں یا نیند کی گولیاں پھانک لوں۔ اب ہوگئے برے تو ہوگئے نا۔ کیا کروں اب......؟ ساری زندگی ماتم مناتی رہوں......؟ ویسے بھی پڑھائی اتنی اہم نہیں ہے میرے لیے کہ اسے دل کا روگ بنا لوں۔ اب عین پیپرز میں مجھے ٹائیفائیڈ ہوگیا جس کی وجہ سے آتا ہوا بھی جاتا رہا تو میرا کیا قصور اس میں۔'' پاپ کارن کا باؤل بھی ایک طرف رکھ دیا گیا تھا۔

''مطلب فیل ہی سمجھا جائے تمہیں۔'' اس نے گھور کر ہدیٰ کو دیکھا۔

''ابھی مت سمجھو۔ کچھ مہینے ٹھہر جاؤ۔ رزلٹ آنے دو۔ پھر دیکھتے ہیں۔'' دانیال نے تاسف سے اس کی ڈھٹائی پہ سر ہلایا۔

''تم تو یوں افسوس کر رہے ہو جیسے میں نے ٹاپ کرنا تھا۔ ویسے کون سا تم بورڈ میں ٹاپ کرتے رہے ہو۔'' وہ اٹھ کر ہیٹر کے سامنے جا کر بیٹھ گئی تھی۔

''میں نے بورڈ میں بھلے ٹاپ نہ کیا ہو لیکن لیولز میں اے ضرور لیا ہے۔ اور اب میں جس یونیورسٹی میں ہوں نا وہاں جانا ایک خواب ہوتا ہے ہر کسی کے لیے۔ تم تو اس یونیورسٹی کے آس پاس بھی نہیں پھٹک سکتیں جو تمہارے حالات ہیں۔''

وہ قائداعظم یونیورسٹی میں میرٹ پہ سلیکٹ ہوا تھا اور وہ جانتی تھی کہ اس یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہر ایرے غیرے کو نہیں ملتا۔

''اچھا تو کیا ہوگیا؟ اس یونیورسٹی میں نہ سہی، کسی اور میں چلی جاؤں گی۔'' ہاتھ سینکتے اس نے آپس میں ملتے مزے سے کہا۔

''مجھے تمہارے حالات کسی یونیورسٹی میں جانے کے نہیں لگ رہے۔'' اپنی کتابیں سمیٹتے ہوئے وہ اب اپنے کمرے میں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

''نہ بھی گئی تو افسوس نہیں ہوگا مجھے۔ کسی کالج سے ہی ماسٹرز کر لوں گی۔ ویسے بھی کون سا مجھے جاب کرنا ہے۔'' وہ کمال لاپروائی سے بولی تو دانیال نے مڑ کر اسے تاسف سے دیکھا۔

''آج کل کمپٹیشن کا زمانہ ہے بی بی۔ کالج سے ماسٹرز والوں کو کوئی منہ لگانا پسند نہیں کرتا۔ پتا نہیں کس دنیا میں رہتی ہو تم۔'' ہدیٰ کا منہ اس کے اس جملے سے اتر سا گیا تھا۔

''میں تو اپنی ہی دنیا میں رہتی ہوں دانی جہاں بس ہم ہیں۔ مجھے دنیا سے کیا لینا؟ دینا مجھے تو بس تم سے غرض ہے۔ کیا تم بھی مجھے منہ نہیں لگاؤ گے۔'' وہ منہ میں بڑبڑائی تھی۔ مڑ کر دیکھا تو وہ کب کا جا چکا تھا۔ دل اب دوستی کی جگہ محبت کو دے چکا تھا اور پکی پکی دے چکا تھا۔

☆☆☆

ایم ایس میں اس نے اپنی کلاس میں ٹاپ کیا تھا اور جس اسکالرشپ کے لیے اس نے اپلائی کیا تھا وہ اسے مل گیا تھا سو وہ پی ایچ ڈی کے لیے انگلینڈ جا رہا تھا۔

''جانے سے پہلے اس کا کچھ انتظام تو ہونا ہی چاہیے کیا پتا وہاں سے کوئی گوری اپنے ساتھ لے آیا تو۔'' وہ یونہی اسے چھیڑتے ثریا سے کہہ رہی تھی۔

''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔'' ایک ذومعنی

مسکراہٹ ان کے لبوں کو چھو گئی اور انھوں نے دانیال کے ساتھ ہدیٰ کو دیکھا لیکن کسی اور ہی نظر سے۔

"اگر آپ یہی سوچ رہی ہیں تو بہت ہی اچھی سوچ ہے آپ کی۔ پھر بابا سے بات کریں آپ۔" دانیال کچھ خوشی سے کہہ رہا تھا۔ ثریا مسکرا دیں۔

"مطلب کوئی نظر میں ہے؟" انھوں نے کہا دانیال سے تھا لیکن دیکھا ہدیٰ کو، جس کے چہرے پہ ایک رنگ سا آ کر ٹھہر گیا تھا۔ محبت کا رنگ اور وہ اسے بخوبی پہچانتی تھیں۔

"نظر میں بھی ہے اور دل میں بھی....."

ثریا نے اسے ایسے مسکراتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دیکھا تو انھوں نے اس سے پہلے ہدیٰ کو بھی ایسے نہیں تھا جس کے کان کی لوئیں سرخ پڑ رہی تھیں اور لب کپکپا رہے تھے۔

"ممی میں بہت دن سے آپ سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن سوچا تھا کہ جانے سے پہلے کروں گا۔ اب جبکہ میں کچھ عرصے تک جا رہا ہوں تو بات کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ اپنی سب سے اچھی دوست سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

ہدیٰ کی تو مارے شرم کے گردن ہی جھک گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اٹھ کر بھاگ جائے یا بیٹھی رہے۔ وہ ایسے اسی کے سامنے یہ ذکر چھیڑ دے گا اسے اندازہ نہیں تھا۔ بلکہ اس نے تو یہ تک نہیں سوچا تھا کہ وہ اس کے بارے میں ویسا ہی سوچتا ہے جیسے کہ وہ۔

"سب سے اچھی دوست کا نام بھی تو پتا چلے؟" ثریا بھی بہت خوش تھیں اور ان کے لہجے سے یہ خوشی پھوٹ رہی تھی۔ ہدیٰ ان کی بہو بن جائے یہ ارمان تو انھیں برسوں سے تھا۔ اب دانیال اپنے منہ سے کہنے جا رہا تھا تو وہ کم از کم منگنی کیے بنا اسے جانے نہیں دیں گی۔

"زرتاشیہ۔ وہ مجھے فیس بک پہ ملی تھی اور ہم پچھلے تین سال سے دوست ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا اور ثریا کے ساتھ ہدیٰ بھی جیسے برف کی بن گئی تھی۔ وجود کیسے کیل بن کر زمین میں گڑھ جاتا ہے، آج پتا چلا تھا۔

"وہ ڈاکٹر ہے ممی اور میں نے ہمیشہ سے سوچا تھا کہ میں جس سے بھی شادی کروں گا وہ ڈاکٹر ہی ہو گی۔" ثریا جواب تک ساکت سی بیٹھی تھیں انھوں نے ہدیٰ کو دیکھا جو بے یقینی سے دانیال کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ بابا سے بات کریں۔ پلیز انھیں منائیں۔ میں جانے سے پہلے زرتاشیہ کے ہاتھ میں اپنے نام کی انگوٹھی پہنانا چاہتا ہوں۔" اس کی آنکھوں کا پانی اب ثریا کو صاف دکھائی دے رہا تھا جو پلکوں پہ آ کر ٹھہر گیا تھا۔ اگر بہہ نکلتا تو اس کا بھرم ٹوٹ جاتا۔

"آپ بات کریں گی نا ممی؟"

اس نے ثریا کا ہاتھ بے تابی سے تھاما تو انھوں نے نظریں ہدیٰ پہ سے ہٹا کر دانیال کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ تبھی وہ اٹھ کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگی تھی۔ اسے ایسے جاتے صرف ثریا نے دیکھا تھا۔ دانیال کے لیے تو وہ جیسے اب وہاں تھی ہی نہیں۔ وہ موبائل اٹھائے یقیناً زرتاشیہ کو میسج کرنے میں لگ گیا تھا۔ ثریا کا دل یہ سب سوچ کر ہی ڈوب گیا۔

☆☆☆

اس نے مہرین کو کال کی تھی۔ پہلی بار، خود سے ورنہ اس سے پہلے وہ ہی کبھی کبھار کال کر کے اس کا حال پوچھ لیا کرتیں...... کچھ اپنی مجبوریوں کا بتا کر رکھ دیا کرتی تھیں۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا ہدیٰ تم نے خود مجھے کال کی ہے۔" خوشی واقعی ان کی آواز سے عیاں تھی۔ ہدیٰ کو کچھ ہمت ملی تھی۔ وہ رکھائی سے بات کرتیں تو شاید وہ اتنی آسانی سے وہ سب نہ کہہ سکتی جو وہ کہنا چاہتی تھی۔

"میں آپ کے پاس آنا چاہتی ہوں ماما۔" اس کی بات سن کر وہ لمحے بھر کو خاموش ہوئی تھیں۔

"کیا وہاں میرے لیے کوئی جگہ ہے......؟ یا

اب تک آپ اس جگہ کو بنانے کی کوشش ہی کر رہی ہیں......؟" یہ سب کہتے اسے یکدم رونا آ گیا تھا لیکن وہ خود پہ آنسو بہائے بنا ہی قابو پا چکی تھی۔

"ایسے کیوں کہہ رہی ہو بیٹی......؟ کچھ ہوا ہے کیا وہاں......؟" وہ پریشان ہو گئی تھیں۔

"ضروری ہے کہ یہ لوگ مجھے دھکے دے کر نکالیں گے تو ہی میں یہاں سے نکلوں۔ میں باعزت طریقے سے یہاں سے خود ہی جانا چاہتی ہوں۔ آپ بتائیں کہ میں وہاں آ سکتی ہوں یا نہیں......؟"

وہ انھیں کیا بتاتی کہ کیا ہوا ہے یہاں؟ اتنی دوستی تو اس کی ماں سے اب رہی ہی کہاں تھی جو وہ انھیں اپنی زندگی کے اتنے بڑے دکھ، اتنے اہم راز میں شامل کرتی۔ انھیں یہ کیسے بتاتی کہ ایک بھرم، ایک دل، ایک رشتہ، ایک خواب ٹوٹا ہے۔ ان کی بیٹی ٹوٹی ہے، بڑی کامران۔

"ہاں......آ جاؤ...... میں تمہارا کمرہ سیٹ کروا دیتی ہوں۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہی تھیں۔ شاید اب تک وہ اس گھر میں اپنی اتنی جگہ نہیں بنا پائی تھیں کہ اسے لے جاسکیں۔

"میں ایک دو دن تک پہنچ جاؤں گی۔" اس نے کچھ بھی سنے بنا فون رکھ دیا تھا۔

اپنا سر گود میں گرائے وہ رو دی تھی۔ دانیال امجد نے یہ کیا کر دیا تھا، کیوں کر دیا تھا؟ ایک یہی گھر تو اس کا آسرا تھا، اس نے یہ بھی اس سے چھیننے کا سامان کر دیا تھا۔

"تم سے شکوہ بھی نہیں کر سکتی دانی کیونکہ تمہارے لیے تو بس میں دوست تھی نا۔ ڈھیروں دوستوں میں سے ایک نالائق سی دوست...... تم بھلا مجھ سے شادی کر بھی کیسے سکتے تھے...... میں کیوں نہیں سمجھ سکی کہ جو انسان اپنے کیریئر کے لیے اتنا پاگل ہے وہ میرے لیے کیسے پاگل ہو سکتا ہے......؟ جو اپنی پڑھائی کو لے کر جنونی ہے، وہ میرے جیسی کے لیے کیسے جنونی ہو سکتا ہے......؟ میں کتنی پاگل تھی نادانی...... مجھے کیوں سمجھ میں نہیں آئی اتنی سامنے کی بات...... تم ٹھیک کہتے تھے دانی کہ آج کل کمپٹیشن کا دور ہے اور دیکھو اس دور میں، میری محبت کہیں پیچھے رہ گئی اور ایک ایسی لڑکی بازی لے گئی جس کے ساتھ سے تم ایک شاندار زندگی گزار سکتے ہو۔ تم ٹھیک کہتے تھے دانی کہ جو وقت کے ساتھ نہیں چلتا، وقت اسے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ وقت نے مجھے پیچھے چھوڑ دیا۔ دنیا والے مجھے دیکھنا پسند نہیں کرتے اور تم دنیا میں ہی تو شامل تھے۔" آنسو اب کی طرح اس کی بات نہیں مانتے تھے، بالکل نہیں رکھتے تھے، اس کا بھرم نہیں رکھتے تھے۔

سنو! اے موم کی گڑیا
اب اس دور کے اندر
کوئی مجنوں نہیں بنتا
کوئی رانجھا نہیں ہوتا
قدم دو، چار چلنے سے
سفر سانجھا نہیں ہوتا
تو ان بے کار سوچوں پہ
سنو!
رونے کا ڈر کیسا
جسے پایا نہیں تم نے
اسے کھونے کا ڈر کیسا؟

☆☆☆

"پھپھو میں ماما کے پاس جانا چاہتی ہوں۔" اگلی صبح وہ ان کے کمرے میں آئی تھی اور ان کے سامنے کھڑے بڑی ہمت جتا کر بس اتنا ہی کہا تھا۔

ثریا اس کی بات پہ گنگ رہ گئی تھیں۔ وہ اس سے اس درجہ ردعمل کی توقع نہیں کر رہی تھیں۔ انہیں پتا تھا کہ وہ روئے گی، دکھی ہو گی لیکن وہ یہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کر لے گی یہ انھوں نے نہیں سوچا تھا۔

"کیا میں ماں نہیں بن سکی یا کوئی اور کمی رہ گئی جو تم نے یہ فیصلہ لیا ہے؟" اس کا ہاتھ نرمی سے تھام کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"کوئی کمی نہیں۔ مجھے جانا تو تھا ہی نا پھپھو۔

آج یا کل تو بس وہ وقت آ گیا ہے۔"
وہ سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھنے سے اجتناب کر رہی تھی کہ وہ کہیں اس کی نظروں کی عبارت ہی نہ پڑھ ڈالیں۔ وہ اس کے لیے ماں جیسی تھیں، اس کے دل کا حال جان لیا کرتی تھیں اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ جس بات کو وہ دل میں دفن کیے جانا چاہتی ہے ان کے سامنے کھل جائے۔ اور وہ خود نہیں جانتی تھی کہ وہ تو کب سے یہ بات، یہ راز جانتی ہیں۔
"تم دانیال کی وجہ سے جانا چاہتی ہو تو وہ تو پہلے سے ہی جا رہا ہے یہاں سے۔"
"میں بھلا اس کی وجہ سے کیوں جاؤں گی؟"
یوں لگا تھا جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔
"میں سب جانتی ہوں۔ مجھے تھوڑا وقت دو میں سب ٹھیک کر دوں گی ہدیٰ۔" وہ کچھ دیر انھیں دیکھتی رہی پھر ان سے لپٹ گئی۔
"ہم کچھ نہیں کر سکتے پھپھو۔ ہم کسی سے اپنا آپ زبردستی پسند نہیں کروا سکتے۔"
"وہ تمہیں بہت پسند کرتا ہے بیٹا۔ بس پاگل ہے۔ سمجھتا نہیں ہے۔" ثریا پہ اسے جی بھر کر پیار آیا تھا۔ کتنی معصوم تھیں وہ۔
"وہ مجھے پسند کرتا ہے، محبت نہیں کرتا۔ نہ کبھی کر سکتا ہے۔ میں دوست ہوں، بیوی نہیں بن سکتی۔ مجھے وہی رہنے دیں جس میں میرے لیے عزت ہے۔ اسی عزت کو اوڑھے مجھے یہاں سے جانے دیں۔ کوئی ایسا موقع مت پیدا کریں کہ میں اپنی عزت اپنی نظروں میں ہی کھو دوں۔"
"تم نے میرا نہیں سوچا۔ اپنے انکل کا نہیں سوچا......؟ ہم کیا کریں گے اگر تم چلی جاؤ گی......؟ ہم کتنے اکیلے ہو جائیں گے تمہارے جانے سے۔ دانیال تو یوں بھی کم ہی گھر پہ ہوتا تھا۔ ہمارا دل تو تم سے لگا رہتا تھا۔ گھر تو بیٹیوں سے پر رونق ہوا کرتے ہیں ہدیٰ اور تم بیٹی ہی تو ہو۔" وہ رو دی تھیں۔
"مجھے مت روکیں۔ ایسی باتیں کر کے مجھے کمزور مت کریں۔ میرا یہاں رہنا مشکل ہے اب۔ میں یہاں رہی تو رہتے سہتے بھرم بھی ٹوٹ جائیں گے۔" ثریا بس روتی ہی رہی تھیں اور وہ انھیں روتا چھوڑ کر اٹھ آئی تھی۔
"تم کہاں جا رہی ہو؟" وہ اس کا اٹیچی کیس دیکھ کر کچھ حیران ہوا تھا۔ ثریا متورم نگاہیں لیے بس خاموش بیٹھی تھیں۔ وہ اپنا سارا سامان ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں رکھوا رہی تھی۔
"ماما کے پاس جا رہی ہوں۔" بنا تاثر کے اس نے اپنے لہجے کو بنا لیا تھا۔
دانیال جی بھر کر حیران ہوا تھا۔ یوں اچانک اس نے کیسے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
"تم کہیں نہیں جا رہیں ہدیٰ کامران۔ اب جبکہ میں جا رہا ہوں تو تم میرے ماں باپ کو اکیلا چھوڑ کر جانا چاہتی ہو۔ ایسی خود غرض تو تم کبھی نہیں تھیں۔ پھر ایسی کیسے ہو گئی ہو......؟" وہ کچھ سختی سے اپنا حق جتاتے اسے احساس دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے اس کا اٹیچی لینے کے لیے اس نے ہاتھ آگے کیا تو ہدیٰ نے اپنی گرفت مزید مضبوط کر لی۔
"ماما اب مجھے اپنے پاس رکھنا چاہتی ہیں۔"
"اور تم ان کے پاس جانا چاہتی ہو ممی اور بابا کو چھوڑ کر...... ہے نا......؟" ہدیٰ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ دانیال نے سر جھٹکا تھا۔
"سراسر جھوٹ۔ تم ممی کے بغیر، اس گھر کے بغیر رہ ہی نہیں سکتیں۔ میں مان ہی نہیں سکتا کہ اب تم اس گھر کے، اس گھر کے لوگوں کے بنا رہ پاؤ گی۔" رہ تو وہ اس کے بغیر بھی نہیں سکتی تھی لیکن اسے اب رہنا تھا۔
"جن چیزوں اور لوگوں کے بنا ہم نہیں رہ سکتے ہمیں کبھی نہ کبھی ان کے بنا رہنا پڑتا ہے۔ میں بھی رہ لوں گی۔" اپنے لہجے کو مضبوط بناتے اس نے کہا تھا۔
"سیلفش لڑکی۔ تم ایسی نکلو گی میں سوچ نہیں سکتا تھا۔" اسے یک دم غصہ آ گیا تھا۔ ہدیٰ کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تو اس نے سر جھکا لیا۔ وہ اس

پانی کو کم از کم اس کے سامنے بہانا نہیں چاہتی تھی۔ ثریا مزید برداشت نہ کرسکیں۔

''اپنی زبان کو قابو میں رکھو دانی۔ یہ اس کی زندگی ہے۔ تم کون ہوتے ہو اسے روکنے والے......؟ کیا ہم میں سے کسی نے تمہیں روکا کہ تم زرتاشیہ سے شادی مت کرو......؟''

''زرتاشیہ کہاں سے بیچ میں آ گئی؟'' وہ ناسمجھی سے ماں کی طرف گھوما۔

''وہی آئی ہے بیچ میں۔ وہ نہ آئی ہوتی تو یہ کہیں نہ جاتی۔'' وہ چلائی تھیں۔ ہدیٰ نے آگے بڑھ کر ان کا بازو تھام کر انھیں روکا تھا۔

''پھپھو پلیز۔'' وہ کیا کہنے جارہی تھیں۔ ہدیٰ ڈر گئی تھی۔

''او پلیز ممی۔ آپ اس کا نام کیوں لے رہی ہیں، اس کا اس معاملے سے کیا لینا دینا؟''

''سارا لینا دینا اسی کا ہے۔ وہی ہے جس کی وجہ سے یہ جارہی ہے۔'' وہ غصے سے کہہ رہی تھیں۔ ہدیٰ نے ان کا ہاتھ تھاما۔

''پھپھو خاموش ہوجائیں۔ خدا کے لیے کچھ مت کہیں۔'' وہ تڑپ اٹھی تھی۔

''مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔'' دانیال حیرت سے منت کرتی ہدیٰ اور غصے سے بے قابو ہوتی ماں کو دیکھ رہا تھا۔

''کیوں چپ رہوں میں۔ نہیں رہوں گی چپ۔ ہمیشہ یہ اپنی مرضی کرتا رہا۔ کبھی کسی کا نہیں سوچا۔ اس نے سوچا کیا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ تم کیا چاہتی ہو؟''

''خدا کے لیے پھپھو۔'' وہ ہاتھ جوڑے رو دی تھی۔ دانیال حیران سا کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ثریا کہے جا رہی تھیں۔

''میں اور اس کے بابا کتنا چاہتے تھے کہ اس گھر کی، ہماری بہو تم بنو۔ تم کتنا چاہتی تھیں ہم سب کو، اس کو۔ مگر اس نے کچھ نہ سوچا۔ کیونکہ اسے تو اپنا کیریئر عزیز ہے۔ اسے تو ڈاکٹر بیوی چاہیے تا کہ سب کے سامنے فخر سے چل سکے۔ سر اٹھا کر اس کا تعارف کروا سکے۔ اسے بھلا تمہاری محبت کہاں دکھائی دینا تھی جو سادہ سی بی اے پاس لڑکی ہے۔ نہ اسے کبھی تمہاری صلاحیتیں دکھائی دیں نہ تمہارا خلوص و محبت۔'' ہدیٰ کا سر جھک گیا تھا۔ اسے لگا تھا کہ بیچ بازار میں کسی نے اسے برہنہ کر دیا ہو۔ اس کے سر سے چادر اتار ڈالی ہو۔ اس کا بھرم ٹوٹ گیا تھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ممی......؟ میں اور ہدیٰ......؟ نو وے۔''

''کیوں ہدیٰ کیوں نہیں......؟ کیونکہ وہ کم پڑھی لکھی ہے......؟ اس کے پاس ڈگریوں کے ڈھیر نہیں ہیں اس لیے......؟'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بے خوفی سے سوال کررہی تھیں۔ ہدیٰ وہیں ایک طرف سر جھکائے، آنسو چھپائے یوں کھڑی تھی کہ آج اس پل اس کی زندگی کی حیثیت اس پہ واضح ہونے جارہی تھی۔

''ہاں اسی لیے کہ یہ میرے ساتھ موو نہیں کر سکتی۔ جس اسپیڈ سے میں زندگی گزارنے کا قائل ہوں یہ کبھی اس سے چل ہی نہیں سکتی۔ میری اس کی سوچ نہیں ملتی، پسند نہیں ملتی، خیالات نہیں ملتے۔ میں بہت پریکٹیکل ہوں اور یہ اپنی دنیا، اپنی ہی سوچ سے نہیں نکلتی۔ اس نے کوئی اور ہی جہاں بنا رکھا ہے جہاں بس خواب ہی خواب ہیں، حقیقت کا دور دور تک تعلق نہیں۔ یہ جیسی ہے اسے اپنے جیسا انسان ہی سوٹ کرے گا۔ میں اور یہ ٹوٹلی مس میچ ہیں۔ میری بیوی تو میری طرح کوئی لائق فائق اور ذہین عورت ہونی چاہیے اور سوری ٹو سے یہ کہیں سے بھی ایسی نہیں ہے۔ آپ نے سوچا بھی کیسے کہ یہ میری لائف پارٹنر بن سکتی ہے۔ اتنی عام لڑکی بھلا دانیال امجد کی لائف پارٹنر......ٹھیک ہے کہ میں نے اتنے سال اس سے دوستی کیے رکھی، اس کی اتنی پروا کی، خیال رکھا۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اب میں اس سے شادی بھی کرلوں گا۔ دوستی اور شادی میں بہت فرق ہے ممی۔ میں اپنی زندگی اس کی ہمدردی میں تباہ نہیں

UUNOVELS.COM

کر سکتا۔"

"دانیال۔" ثریا تو اس کی چرب زبانی پہ ششدر ہی رہ گئی تھیں۔

"اتنے سنگ دل اور بے مروت ہو تم، میں نے نہیں سوچا تھا۔"

"سچ کہہ رہا ہوں۔ کبھی کبھار سچ کہہ دینا چاہیے، اچھا ہوتا ہے۔ یہ بھی میری آئیڈیل نہیں تھی، میری کیا یہ کسی بھی ذہین اور پڑھے لکھے لڑکے کی آئیڈیل نہیں ہو سکتی۔" اس کے اس سچ نے اس کا کیسا تماشا بنا دیا تھا کاش کہ وہ جان سکتا۔ اسے اپنی نظروں میں ہی گرا دیا تھا۔

وہ سوچتی تھی کہ وہ منہ پھٹ ہے لیکن آج اسے لگا تھا کہ وہ منہ پھٹ ہونے کے ساتھ ظالم بھی ہے۔ وہ بدلحاظ ہے لیکن اب اسے سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ سفاک ہے۔ اس نے کس بری طرح سے آج اس کا دل توڑا تھا۔ اب جبکہ وہ جا ہی رہی تھی تو جاتے جاتے کچھ بھرم ہی رکھ لیتا اس کا لیکن وہ جب بولنے پہ آتا تھا تو بس اگلے کو کسی قابل چھوڑتا ہی کہاں تھا۔ ہدیٰ کا دل چاہا کہ اسی پل زمین کھلے اور وہ اس میں دھنس جائے۔ کسی کو دکھائی نہ دے۔ لیکن ایسا بھلا کہاں ہونا تھا۔ ایسا بھلا کہاں ہوتا ہے۔ ہمیں ہمارے حصے کی رسوائی سہنے کے بعد سب کے درمیان کھڑے رہ کر سب کا سامنا کرنا ہی ہوتا ہے۔

وہ کچھ کہے بنا ہی تیزی سے باہر کی طرف بڑھ گئی۔ ثریا اسے پکارتی اس کے پیچھے آئی تھیں۔

"ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ مجھے یہ ذکر نہیں چھیڑنا چاہیے تھا۔ میری غلطی کہ میں اپنے بیٹے کو سمجھ نہ سکی کہ وہ اس حد تک بدزبان اور بدلحاظ ہو گا۔" وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھیں۔ ہدیٰ نے ان کے جڑے ہاتھ تھام کر کھول دیے۔

"وہ سچ کہتا ہے پھپھو۔ بس سچ کبھی کبھار تماچا بن کر لگتا ہے۔" اس کی آنکھیں آنسوؤں کو مزید روک نہیں پائی تھیں۔ ثریا نے اسے آگے بڑھ کر گلے لگا لیا تھا۔ دونوں کے آنسو اکٹھے بہہ رہے تھے۔ تذلیل کے، جدائی کے۔

"چلتی ہوں۔"

"پھر کب آؤ گی؟" وہ روتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

"کیا مجھے پھر آنا چاہیے؟"

ثریا بس اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ اس نے گالوں کو رگڑ کر صاف کیا اور تیزی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ پیچھے مڑ کر اب وہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی کہ کہیں کوئی اور پتھر لگنا باقی نہ ہو۔

☆☆☆

دانیال ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور بیٹے کی خوشی پوری کرنے کے لیے وہ دونوں زرتاشہ کے ہاں اس کا رشتہ لے کر گئے تھے۔ زرتاشہ کو دیکھ کر ثریا کو بے حد مایوسی ہوئی تھی لیکن کیا کر سکتی تھیں کہ وہ ان کے بیٹے کی پسند تھی۔ دانیال کے جانے سے پہلے ان دونوں کی منگنی کر دی گئی تھی۔ شادی دانیال کے آنے تک مؤخر تھی۔

"تم یہ مت سمجھنا کہ میں اس سب سے خوش ہوں۔ تم نے ہدیٰ کے ساتھ تو جو کچھ کیا اس کے لیے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔" ثریا اس کے جاتے ہوئے رو رہی تھیں۔

"میرے جانے پہ بھی آپ کو میرے بجائے ہدیٰ کا ہی خیال ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آپ اس کی نہیں میری ماں ہیں۔" وہ جاتے ہوئے خود شکوہ کر کے اور انہیں دکھی کر کے گیا تھا۔

باہر سے جب بھی اس کا فون آتا ثریا کی آواز اسے پہلے سے کہیں زیادہ نحیف سنائی دیتی۔

"تم واپس کب آؤ گے دانی......؟" اس بار اس کی کال آنے پہ وہ اسے بہت بیمار لگ رہی تھیں۔

"ابھی مجھے یہاں آئے وقت ہی کتنا ہوا ہے ممی اور آپ واپس آنے کی بات کر رہی ہیں۔ ابھی بہت وقت ہے۔"

"لیکن مجھے ایسے لگتا ہے کہ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں دانی۔ ہدیٰ

کے معاملے میں میرا دل تم سے اب بھی خفا ہے۔ اسے اس گھر میں جس عزت سے لائی تھی، اس سے کہیں زیادہ بے عزت کر کے نکالا ہے اور ایسا تم نے کیا ہے۔ ہم گناہ گار ہیں اور یہ گناہ مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ جس دن تم بڑی سے اپنی کی گئی زیادتی کی معافی مانگ لو گے تو سمجھنا میں نے بھی تمہیں معاف کر دیا۔" وہ کھانستے ہوئے بہت رک رک کر مدھم آواز میں اسے کہہ رہی تھیں۔

"می کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی ہیں آپ؟" اس نے انہیں ٹالتے بات بدل دی تھی لیکن اگلی صبح اسے بابا کی کال آئی تھی۔ ثریا اس دنیا میں نہیں رہی تھیں۔

وہ می کے جنازے کے دوسرے دن پہنچ پایا تھا پاکستان۔ اسے اب اپنی ماں کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

"وہ می کے جنازے پہ نہیں آئی......؟" اس نے امجد سے پوچھا تھا۔

"مہرین آئی تھی...... اس کا فون آیا تھا مجھے...... بہت رو رہی تھی۔" اسے غصہ آیا تھا کہ جس لڑکی کو یاد کر کے اس کی ماں ایسے تڑپتی تھی وہ ان کی آخری بار صورت تک دیکھنے نہیں آئی۔

"بہت احسان فراموش ہے۔ می نے کتنا کیا اس کے ساتھ لیکن وہ می کے جنازے تک میں شریک نہیں ہوئی۔"

"اس کی شادی ہو چکی ہے دانی اور اس کے شوہر نے اسے یہاں آنے کی اجازت نہیں دی۔" امجد نے اس کی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوشش کی تھی۔

"شادی ہو گئی ہے؟" اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

"ابھی اسے گئے سات ماہ ہی تو ہوئے تھے کہ اس نے شادی بھی کر لی اور کسی کو بتایا تک نہیں۔"

"جس جگہ شادی ہوئی ہے وہ ایسی نہیں کہ وہ خوشی سے بتاتی۔" بابا می کے بعد بہت کمزور لگ رہے تھے۔

"کس سے ہوئی ہے اس کی شادی......؟"

نجانے کیوں وہ پوچھے بنا رہ نہیں سکا تھا۔

"مہرین کے سسرالی رشتے دار ہیں کوئی۔"

"مہرین مامی کون سا بہت اچھی جگہ گئی تھیں جو اسے بھی اسی خاندان میں پھنسا دیا۔" اس نے نخوت سے سر جھٹکا۔

امجد نے اسے جتاتی نظروں سے دیکھا جیسے کہتے ہوں کہ اتنی فکر ہے تو تم کر لیتے۔ بھلا اس گھر سے زیادہ اچھی جگہ کوئی ہو سکتی تھی اس کے لیے۔ دانیال ان کی نظروں سے الجھن محسوس کرتا اٹھ کر چلا گیا تھا۔

☆☆☆

اس کے جانے سے امجد بھی تنہا ہو گئے تھے۔ وہ زرتاشہ سے بھی کہتا بھی کہ بابا کی طرف کچھ دیر کے لیے چلی جایا کرے، ان کا حال احوال پوچھ لیا کرے تو وہ صاف منع کر دیتی۔

"میں ان کی ہونے والی بہو ہوں، ابھی ہوئی نہیں ہوں جو منہ اٹھا کر یوں ملنے چلی جاؤں۔ ویسے بھی تمہارے فادر تمہاری ذمہ داری ہیں دانیال، میری نہیں۔" دانیال نے اسے کہنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ پریکٹیکل تھی۔ کبھی یہی خوبی اسے بہت بھاتی تھی جواب بری لگ رہی تھی۔

"پاکستان کا چکر کب لگے گا تمہارا......؟" اس دن اس نے امجد کو کال کی تو وہ بہت خاموش تھے۔

"چھٹیوں میں تو دوستوں کے ساتھ تھوڑا گھومنے کا پلان ہے۔" امجد کی خاموشی سن کر ایک سیکنڈ میں تہیہ کر چکا تھا کہ وہ چھٹیاں ہوتے ہی سیدھا پاکستان جائے گا۔ بابا اسے ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ وہ ماں کو بے خبری اور لاپروائی میں کھو چکا تھا، باپ کو اسی بے خبری میں کھونا نہیں چاہتا تھا۔

"لیکن میں جلد آ جاؤں گا آپ بے فکر رہیں۔" کبھی بابا سے بات کرتے اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ پی ایچ ڈی چھوڑ کر واپس چلا جائے۔ لیکن پھر پریکٹیکل ہو کر وہ اس خیال کو رد کر دیتا۔ اسے اپنے مستقبل کو تابناک بنانا تھا اور ایسے احمقانہ فیصلے اس کی

زندگی تباہ کر سکتے تھے۔
"ہدیٰ کو طلاق ہو گئی ہے۔" امجد کی آواز میں صدیوں کی تھکاوٹ در آئی تھی۔ دانیال چند لمحے کے لیے بالکل خاموش ہو کر رہ گیا تھا۔
"کیا کہوں اب میں؟" اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے، کیا پوچھے۔ اچانک عجیب سا گلٹ محسوس ہونے لگا تھا۔
"مہرین کہہ رہی تھی کہ وہ اس پہ تشدد کرتا تھا اور وہ ان دنوں ایک ری ہیبی لیٹیشن سنٹر میں ہے۔"
"واٹ۔" وہ اس بار شاکڈ رہ گیا تھا۔ یہ سب کچھ تو اس کے وہم و گمان بھی نہیں تھا جو بابا اسے بتا رہے تھے۔
"اس کی ذہنی حالت کمزور ہو چکی ہے۔" اسے لگا تھا بابا رو دیں گے۔
"اس کا علاج چل رہا ہے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ جلد ہی وہ صحت یاب ہو جائے گی۔ لیکن اسے بہت نگہداشت کی ضرورت ہے۔" دانیال سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ وہ بس سن رہا تھا۔
"میں سوچتا ہوں دانی کہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر وہ کہاں جائے گی اور کون اس کی نگہداشت کرے گا......؟" امجد نے بنا خدا حافظ کہے فون کاٹ دیا تھا۔ دانیال سر تھامے وہیں بیٹھا رہ گیا تھا۔
"کیا ہو جاتا اگر تم ہدیٰ سے شادی کر لیتے؟ اس لڑکی کو سہارے کی ضرورت تھی اور ہم سے بہتر کوئی سہارا اس کے لیے تھا ہی نہیں۔ اس گھر سے محفوظ اس کے لیے کوئی پناہ گاہ نہیں تھی۔ یہاں سے گئی تو سمجھو بس اب وہ گئی ہی گئی۔" امی کی کہی بات اسے یاد آ رہی تھی۔ جو بھی تھا وہ اتنا ظالم نہیں تھا کہ اس کا ایسا حال سن کر بے حس بنا رہتا۔
اس پوری رات وہ سو نہیں سکا تھا اور اگلی صبح اس نے پاکستان جانے کے لیے ٹکٹ کروا لیا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے مختصر سے سامان کے ہمراہ مہرین کے ہاں پہنچی تھی جہاں اسے ویلکم کرنے والا کوئی موجود نہیں تھا۔ دروازہ مہرین کے دوسرے شوہر کی بیٹی نے کھولا تھا اور بڑی رکھائی سے بتایا تھا۔
"امی گھر میں نہیں ہیں۔ تم اپنا سامان اٹھاؤ اور اوپر چھت والے کمرے میں لے جاؤ۔ نیچے ایکسٹرا جگہ نہیں ہے۔"
وہ ایکسٹرا تھی وہاں تبھی اسے ایکسٹرا جگہ ہی بھیجا گیا تھا۔ وہ اپنا سامان اٹھا کر چھت پہ آ گئی تھی۔ یہاں ایک اسٹور نما کمرہ تھا جہاں ایک چارپائی اس کے لیے بچھائی گئی تھی۔ اب سے یہ اس کا کمرہ تھا۔ اسے ہنسی آئی تھی کہ ماما نے اس کے لیے یہ کمرہ سیٹ کروایا تھا اور پھر اسے رونا آ گیا تھا کہ اپنی اس گھر میں جگہ وہ تعین کر چکی تھی۔
نجانے کتنے دن اسے یہاں پناہ مل پائے گی۔ مل پائے گی بھی یا نہیں۔ اس نے یہاں آ کر غلطی کی تھی۔ لیکن اب وہ ثریا کے ہاں بھی کیسے رہ سکتی تھی۔ کیا اس کی عزت نفس یہ گوارا کرتی۔ وہ خود ہی اپنی سوچ پہ ہنس دی۔
"یتیم اور بے آسرا لوگوں کی کوئی عزت نفس نہیں ہوا کرتی ہدیٰ بی بی۔ بہتر ہوتا کہ تم اسے اٹھا کر اب تک پھینک چکی ہوتیں تو منہ اٹھا کر یہاں نہ آتیں۔"
شام تک وہ اسی طرح ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھی رہی تھی۔ مختصر سی چھت پہ اس نے کئی بار گھوم کر دیکھ لیا تھا۔ وہیں ایک طرف لگے نلکے سے پانی پی کر پیاس بھی بجھالی تھی لیکن اب اسے زوروں کی بھوک لگی تھی۔ شام کو مہرین آئی تھیں اور آتے ہی اسے گلے لگا لیا تھا۔
"میری جان۔"
"اس جان سے پچھلے آٹھ سالوں میں دو بار ملی ہیں آپ۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے پھسل گیا تھا۔
"کیا کروں بیٹا۔ میں اس گھر میں بہت مجبور ہوں۔" ہدیٰ خاموش رہی تھی۔ ان کی مجبوریوں کا ذکر پچھلے سات سالوں میں ایک جیسا رہا تھا، نہ کم نہ زیادہ۔

"اچھا کیا جو یہاں آ گئی۔ میں بھی یہی چاہتی تھی کہ تم میرے پاس آ کر رہو۔"

"آپ کتنا چاہتی تھیں وہ تو اس کمرے سے نظر آ رہا ہے۔" مہرین کے چہرے پہ ایک سایہ سا لہرا گیا۔

"تم اپنا دل بڑا رکھنا۔ کوئی کچھ بھی کہے تم بھول جانا، درگزر کرنا..... آہستہ آہستہ تمہاری جگہ بھی اس گھر میں بن جائے گی۔"

"اتنے سالوں میں آپ کی نہیں بن پائی تو میری کیسے بن پائے گی.....؟" مہرین کے پاس خاموشی کے علاوہ کوئی جواب نہ تھا۔

☆☆☆

اتنی مشکل تو اسے ثریا کے ہاں جگہ بنانے میں نہیں پیش آئی تھی جتنی یہاں آ رہی تھی۔ کوئی اس سے سارا دن بات نہیں کرتا تھا، وہ جہاں جاتی وہاں سے سب اٹھ جاتے تھے۔ مہرین کے شوہر گھر پہ کم ہی ہوا کرتے تھے۔ جب بھی وہ ہوتے مہرین اسے اپنے کمرے میں رہنے کا کہتی تھیں۔ پہلی بار ہی ان سے ملاقات کرواتے ہوئے اسے امجد کی نظروں سے عجیب خوف سا محسوس ہوا تھا جیسے وہ اسے سالم نگل جائیں گے۔ ان کی دونوں بیٹیاں مشعل اور منال اس سے اکھڑی اکھڑی رہتیں۔ ایک آدھ بار اس نے ان کا کوئی کام کرنے کی کوشش کی کہ شاید وہ اس سے خوش ہو جائیں تو انھوں نے صاف کہہ دیا۔

"تم مہمان ہو تو مہمان بن کر رہو۔" تو وہ اسے مہمان سمجھتی تھیں مطلب وہ کچھ وقت وہاں رہ سکتی تھی ہمیشہ نہیں۔

"میں جلد ہی کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر تمہاری شادی کر دوں گی۔" اس روز مہرین بہت پریشان صورت لیے کہہ رہی تھیں۔ یقیناً کچھ ایسا ہوا تھا جو وہ اسے بتانا نہیں چاہتی تھیں اور اب اس کے مستقل انتظام کا سوچ رہی تھیں۔

"لیکن میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔" اس نے صاف منع کیا تھا۔

"عورت کو شادی کی صورت تحفظ مل جاتا ہے۔"

"جیسے آپ کو مل گیا۔" مہرین خاموشی سے اس کے سر پہ ہاتھ دھر کر چلی گئی تھیں۔

ایسے ہی بہت سارے دنوں میں ایک دن منال اسے بلانے آئی تھی۔

"تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔" بڑی جتاتی نظروں سے دیکھتے کہہ رہی تھی۔ وہ الجھی۔

"مجھ سے کون ملنے آ سکتا ہے بھلا؟"

"خود دیکھ لو...... اور ہاں یہ پہلی بار ہے اور اسے آخری بار ہونا چاہیے۔ ورنہ میں امی کا لحاظ کیے بنا ابو کو بتا دوں گی اور پھر سوچ لو کہ کیا ہوگا۔" وہ اپنا حلیہ ٹھیک کرتے نیچے آئی تھی۔ سامنے دانیال بیٹھا تھا۔ مہرین سر جھکائے بیٹھی تھیں۔

"دانیال تمہیں لینے آیا ہے ہدیٰ۔" مہرین نے اسے یوں بتایا جیسے وہ اس بات سے بے حد خوش ہوں۔ ہدیٰ نے انھیں دکھ سے دیکھا تھا۔ وہ اٹھ کر اندر چلی گئی تھیں۔

"اپنی ماں کے پاس رہنے کا شوق پورا ہو گیا ہو تو اب چلیں۔" بڑی رکھائی سے وہ پوچھ رہا تھا۔ کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ اس دن اس نے جو کچھ کہا تھا اس پہ وہ ذرا سا بھی نادم ہے۔ ہاں وہ دانیال امجد تھا، اپنے کیے پہ کم ہی نادم ہوتا تھا، کم ہی معذرت کرتا تھا، کم ہی پچھتاتا تھا۔

"میں اب یہیں رہوں گی۔" لہجہ اس نے سخت کر لیا تھا۔ وہ طنزیہ مسکرا دیا۔

"چاہے یہ لوگ تمہیں رکھنے پہ آمادہ ہی نہ ہوں۔" اس نے الجھ کر اسے دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ میں کچھ تو ایسا تھا کہ ہدیٰ گڑبڑا گئی تھی۔

"تمہارا اصلی ٹھکانا وہی ہے ہدیٰ بی بی جو تم چھوڑ کر آئی ہو...... مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا سوچ کر منہ اٹھائے یہاں چلی آئی ہو...... نہ ہی مجھے یہ سمجھ میں آ رہا ہے کہ امی کے سر پہ کیا بھوت سوار ہو گیا کہ وہ میری شادی تم سے کرنا چاہتی ہیں۔"

"یہ آپ انہی سے پوچھیں۔"

"تم سے کیوں نہ پوچھوں جو مجھے چاہتی ہو۔" ہدیٰ کو لگا وہ بھربھری مٹی کی دیوار کی مانند ڈھے گئی ہے۔لڑکی کے لیے محبت ایک راز کی مانند ہوتی ہے جسے وہ ہمیشہ سینے میں دفن کر کے رکھنا چاہتی ہے۔

"اپنی شکل دیکھو جو چلا چلا کر کہہ رہی ہے کہ تم مجھے چاہتی ہو۔لیکن میں تمہیں نہیں چاہتا اس لیے تم سے شادی نہیں کر سکتا۔تمہیں یہ بات سمجھنا چاہیے۔" اس کے لہجے میں اب بھی ہدیٰ کے لیے ٹھکرائے جانے کے علاوہ کوئی جذبہ نہیں تھا۔

"سمجھ گئی تھی تبھی یہاں چلی آئی ہوں۔" اسے لگا وہ رو دے گی۔وہ اس شخص کے سامنے اب رونا نہیں چاہتی تھی۔

"تو یہاں آ کر کون سا تم نے بہت اچھا کیا ہے۔تم اپنا سامان پیک کرواور میرے ساتھ چلو۔تم کیوں نہیں سمجھ رہیں کہ یہ لوگ تمہیں یہاں زیادہ عرصہ نہیں رکھ سکتے ......مہرین مامی تمہاری شادی کرنا چاہتی ہیں بلکہ یوں سمجھو سر سے بوجھ اتارنا چاہتی ہیں۔"

"تمہیں میری اتنی پروا نہیں کرنا چاہیے۔میں اپنی ماں کے پاس ہوں اور محفوظ ہوں۔" رکھائی سے کہتے وہ دانیال کو غصہ دلا گئی تھی۔

"ہاں......اسی ماں نے فون کر کے مجھے یہاں بلایا ہے کہ تمہیں لے جاؤں یہاں سے......کچھ عرصے وہاں رکھوں جب تک تمہارا رشتہ طے نہیں ہو جاتا۔" اس نے پورا آسمان اس کے سر پہ دے مارا تھا۔اس کی ماں نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔اس کی رہی سہی عزت کا بھی جنازہ نکال دیا تھا۔

"میں بہت جلد اسی سے شادی کروں گی جو وہ میرے لیے چنیں گی۔تمہیں پروا کی ضرورت نہیں ہے۔" اپنی توہین کے احساس سے اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور وہ وہاں سے بھاگ گئی تھی۔

اپنے کمرے میں پڑی وہ کتنی دیر روتی رہی تھی جب مہرین آئیں تو وہ انہی پہ چلائی تھی۔

"چند دن نہیں رکھ سکیں آپ مجھے اور اسے بلا لیا۔میرا اتنا سا ہی مان رہنے دیتیں اس کے سامنے کہ میں اپنی ماں کے پاس آئی ہوں لیکن آپ تو شاید دن گن رہی ہیں کہ میں کب یہاں سے دفعان ہوں گی۔"

"میں مجبور......" اس نے درشتی سے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

"بس کر دیں اپنی مجبوری کے راگ الاپنا۔آپ شادی کرنا چاہتی ہیں نا میری،تو کر دیں۔ابھی اسی وقت کر دیں،جس مرضی سے کر دیں لیکن کم از کم مجھے واپس اس گھر میں مت بھیجیں۔اگر مجھے وہیں جانا ہوتا تو میں وہاں سے آتی ہی کیوں۔" وہ بری طرح رو رہی تھی۔مہرین کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

"تمہاری عزت بچانے کے لیے ایسا کیا۔اس گھر میں تم محفوظ نہیں ہو۔اس گھر کے رشتے تمہارے سگے نہیں ہیں۔تم نے خود پہ رینگتی نظریں محسوس کی ہوں یا نہیں،میں نے کی ہیں اور ان ہی نظروں سے خائف ہو کر میں ایسا چاہتی ہوں ہدیٰ۔" ہدیٰ ان کی بات سن کر شاکڈ رہ گئی تھی۔اس گھر میں واحد مرد مہرین کے شوہر تھے......تو کیا......؟ یہ سوچتے ہی اسے جھرجھری آ گئی۔تبھی مہرین اسے ہمیشہ احمد کے آنے سے پہلے اپنے کمرے میں بھیج دیا کرتی تھیں یقیناً وہ ان کی نظریں بھانپ گئی تھیں۔یہ سوچتے ہی اس کا دل لرز گیا تھا اور وہ روتی ہوئی مہرین سے لگ گئی۔

"آپ جہاں چاہتی ہیں میری شادی کر دیں ماما۔" جب یہ چھت جسے وہ تحفظ سمجھ کر آئی تھی اس کے لیے اتنی ہی بے اعتبار تھی جتنی باقی دنیا تو وہ یہاں زیادہ دن کیسے رہ سکتی تھی۔اسے یہاں سے جانا تھا تو بہتر نہیں تھا کہ وہ باحفاظت اور باعزت یہاں سے چلی جاتی۔

مہرین اسے گلے لگا کر رو دی تھیں۔پہلی بار اسے لگا تھا کہ اس کی ماں واقعی ایک مجبور عورت ہے

اور پہلی بار تھا کہ وہ نہیں روئی تھی۔
''مجھے ڈھیٹ ہونا پڑے گا۔'' ماں کے گلے لگے لگے اس نے سوچا تھا۔

☆☆☆

مہرین نے اس کی شادی اپنی سسرالی رشتے داروں میں طے کر دی تھی۔ وہ خوش تھی یا نہیں اب اس نے سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ جب زندگی اس کے لیے سانس لینے کا نام ہی رہ گئی تھی تو اس بات سے کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ خوش ہے یا نہیں۔

تبھی ایک دن اس کے موبائل پہ عطیہ کی کال آئی تھی۔ وہ ثریا کے گھر کے ساتھ رہتی تھی اور ہدیٰ سے اس کی کافی علیک سلیک رہی تھی۔

''تم ملے بنا، بتائے بنا چلی گئیں۔ ایسا بھی کیا ہو گیا؟'' لوگوں کو کتنا شوق ہوتا ہے نا گڑھے مردے اکھاڑنے کا۔ نجانے کہاں سے اس کا نمبر لے کر اب وہ اسے کال کر کے یہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ یکدم کہاں اور کیوں غائب ہو گئی ہے۔

''ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو مجھے جلدی میں یہاں آنا پڑا ان کے پاس۔ اب میں یہیں رہوں گی کیونکہ میری ماں کو میری ضرورت ہے۔'' جس جھوٹ سے اسے نفرت تھی، اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے اسی کی آڑ لینا پڑ رہی تھی۔ انسان بھی کبھی کتنا مجبور ہو جاتا ہے اپنا بھرم قائم کرنے کے لیے۔

''دانیال بھائی کی منگنی تھی۔ تب بھی تم نہیں آئیں۔'' ایک ٹیس سی دل میں اٹھ کر معدوم ہو گئی تھی دانیال کی منگنی کا ذکر سنتے ہی۔

''آ سکتی ہوتی تو ضرور آ جاتی۔'' جس لمحے سے فرار کے لیے وہ یہاں چھپی بیٹھی تھی اسی کے استقبال کے لیے کیسے وہاں جا سکتی تھی۔ زخموں پہ جمے کھرنڈ جیسے کسی نے نوچ ڈالے تھے۔

''ثریا آنٹی اتنی بیمار ہیں، تمہیں یاد کرتی ہیں۔ ان کے لیے بھی واپس نہیں آؤ گی؟''

''مشکل ہے۔'' وہ مشکل سے 'مشکل ہے' کہہ پائی تھی۔ یہ کہتے اس کا دل بھر آیا تھا۔ کیسی ظالم ہو گئی تھی نا وہ۔ دنیا نے اپنے جیسا بنا ہی ڈالا تھا آخر اسے بھی۔

''دانیال بھائی باہر جا رہے ہیں۔ پیچھے سے آنٹی انکل بہت اکیلے ہو جائیں گے۔ تمہیں یہاں ہونا چاہیے ان کے پاس لیکن اب جب انہیں تمہاری ضرورت ہے تو تم وہاں جا کر بیٹھ گئی ہو۔''

''ان کی بہو آ جائے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میری ضرورت اب یہاں زیادہ ہے۔''

''ابھی کہاں۔ ابھی تو ایسا کچھ نہیں ہے اور وہ آتی بھی ہے یا نہیں کیا پتا؟'' ہدیٰ چونکی تھی۔

''ایسے کیوں کہہ رہی ہو؟''

''امی بتا رہی تھیں بہت نخریلی سی ہے لڑکی، آخر کو ڈاکٹر ہے تو نخرا تو ہو گا ہی۔ لیکن ثریا آنٹی بس دانیال بھائی کی پسند کی وجہ سے مجبور ہو گئیں۔''

ہدیٰ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا تھا۔ اس نے بس اللہ حافظ کہہ کر زبردستی فون بند کر دیا تھا۔ کل اس کی اپنی رخصتی تھی اس نے یہ تک نہیں بتایا تھا اسے۔ کچھ باتیں بس چھپائی ہی جائیں تو بہتر ہوتا ہے۔ اس نے بھی چھپا لیا تھا۔

☆☆☆

رخصتی والی رات ہی علی حسین اس پہ واضح کر چکا تھا کہ یہ شادی اس نے اپنی بوڑھی ماں کی خدمت کے لیے کی ہے۔ وہ اس کی بیوی کم اور ان کی خدمت گار زیادہ ہو گی۔ ہدیٰ نے سر ہلا نے پہ اکتفا کیا۔ شادی کی کوئی خوشی اسے پہلے بھی نہیں تھی، اب تو رہی سہی امید بھی دم توڑ گئی تھی۔

''تمہاری اصل پناہ گاہ ثریا کا گھر ہی تھا ہدیٰ جو تم چھوڑ آئیں۔''

علی کی ماں کے غلاظت والے کپڑے دھوتے اسے مہرین کا تاسف بھرا لہجہ یاد آتا تو وہ سر ہلا دیتی۔ یہ شادی اس نے تحفظ کے لیے کی تھی نا، خوشی کے لیے تو نہیں۔ تو تحفظ تو اسے مل ہی رہا تھا، پھر وہ خوشی کے بارے میں کیوں سوچتی تھی۔

انسان بھی کیا چیز ہے، ایک شے مل جانے پہ

دوسری کا طلب گار بن جاتا ہے۔ وہ بھی بن رہی تھی۔

وہ سارا دن گھر کے سب کام بھی کرتی اور علی کی چارپائی پہ پڑی ماں کو بھی سنبھالتی تھی۔ وہ کوئی عام بیمار نہیں تھیں۔ بستر پہ پڑی عورت جن کا جسم بے جان تھا، وہ ہل کر کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کو اٹھانے، بٹھانے، نہلانے دھلانے، کھلانے پلانے کی ساری ذمہ داری ہدیٰ پہ تھی۔ علی سارا دن گھر سے باہر رہتا اور گھر لوٹتا تو سیدھا ماں کے پاس آتا تھا۔ کبھی کوئی کمی کوتاہی غلطی سے بھی دکھائی دیتی تو ہدیٰ پہ ہاتھ اٹھا دیتا۔ وہ مار کھا کر بھی خاموشی سے وہیں اس کی ماں کے بستر کے پاس چارپائی ڈالے اسی خدمت میں لگی رہتی۔

''تم اس زندگی سے تنگ نہیں آتیں ــــ؟''

ایک روز ماں جی اس کے چہرے کو بغور دیکھتے اس سے پوچھ رہی تھیں۔

''کس زندگی سے ــــ؟'' وہ میکانکی انداز میں پوچھ رہی تھی۔

''ایک بیمار عورت کو سنبھالنا، اس کی آلائش صاف کرنا پھر بھی اس کے بیٹے سے مار ہی کھانا۔ تم مجھے چھوڑ کر بھاگ کیوں نہیں جاتیں۔'' ان کے لہجے میں ہدیٰ کے لیے ہمدردی تھی۔

''مجھے عادت ہو گئی ہے۔'' وہ بھاگ کر کہاں جاتی بھلا۔ اس زندگی کے علاوہ اس کے پاس آپشنز نہیں تھے۔

''ایسی زندگی کی عادت کبھی کسی کو نہیں ہو سکتی۔'' ہدیٰ خاموش رہی تھی۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں، سات ماہ میں اسے ایک دن بھی اس زندگی کی عادت نہیں ہوئی تھی مگر وہ اس زندگی کی عادت خود کو ڈالنا چاہتی تھی جو اس کا نصیب بن چکی تھی۔

ایک صبح جب وہ ماں جی کو نہلا دھلا کر فارغ ہوئی ہی تھی تو مہرین کا فون آیا تھا، وہ اسے بتا رہی تھیں کہ ثریا فوت ہو گئی ہیں۔ اس خبر نے اس کا دل کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ ہم انسان بھی اسی امید پہ زندگی گزارتے چلے جاتے ہیں کہ کبھی نہ کبھی بچھڑنے والے سے مل ہی لیں گے لیکن زندگی یہ مہلت کب دیتی ہے۔ اسے بھی یہ مہلت نہیں مل سکی تھی۔

''تم تیار رہنا میں تمہیں لینے آ جاؤں گی۔ جنازے سے پہلے ہم پہنچ جائیں گے۔'' مہرین کہہ رہی تھیں۔

''علی شہر میں نہیں ہے اور میں ماں جی کو اکیلے چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔ میری طرف سے معذرت کر لیجیے گا آپ۔'' اس نے فون کاٹ دیا تھا۔ وہ ماں کو اپنے اندر پنپتے وجود کے بارے میں بھی نہیں بتا سکی تھی، بتانا چاہتی ہی نہیں تھی۔

شادی کے بعد یہ پہلا بار تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی، سارے دن کے کاموں کو بتاتے اس نے واحد مستقل کام رونے کا کیا تھا۔ ثریا اس کی ماں جیسی مہربان اس دنیا سے چلی گئی تھیں اور وہ ان کے جنازے میں شریک تک نہیں ہو سکی تھی۔ جب بہت رو لینے سے بھی سکون نہ مل سکا تو اس نے امجد کو کال کی تھی۔ ساری کال کے دوران بھی وہ روتی رہی تھی۔ اس سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ صرف امجد کو سن رہی تھی۔

''ثریا تمہیں بہت یاد کرتی تھی بیٹا۔ سچ بتاؤں تو اسے تمہارا دکھ ہی لے ڈوبا۔ ہو سکے تو اسے معاف کر دینا، اس کی وجہ سے، دانی کی وجہ سے جو دکھ تمہیں ملا ہے۔ ہم اس کا مداوا نہیں کر سکتے۔ چاہیں بھی تو بھی نہیں کر سکتے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہے تھے، اس دکھ کا مداوا کبھی ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اس کا حال دیکھ لیتے تو جان جاتے کہ دکھ کیا ہوتا ہے۔ تکلیف کیا ہوتی ہے۔ وہ تو نجانے کس دکھ کی بات کر رہے تھے۔ شاید وہ محبت میں ناکامی کے دکھ کی بات کر رہے تھے جسے وہ اب بھولنے لگ گئی تھی۔

☆☆☆

علی دو ہفتے بعد فیصل آباد سے لوٹا تھا اور اس کے ساتھ برقع میں لپٹی لڑکی بھی تھی۔ جب اس نے

UUNOVELS.COM

برقع اتارا تو اس کی سج دھج یہ بتا دینے کو کافی تھی کہ وہ ابھی نو بیاہتا ہے۔

"میں نے زلیخا سے شادی کر لی ہے۔" وہ نہ بھی بتاتا تو وہ جان ہی چکی تھی۔

"اچھا کیا۔ تمہیں زلیخا جیسی عورت ہی ملنی چاہیے تھی۔" وہ بے تاثر چہرہ لیے، اپنے اندر چیختے وجود کو محسوس کرتے باورچی خانے میں چلی گئی کہ کھانے کا انتظام کر سکے۔ جب سے اس کی زندگی میں یہ نوید آئی تھی وہ جیسے پھر سے جینے لگی تھی۔ عورت بڑی عجیب شے ہے، ایک کوکھ بھر جانے سے ہر دکھ بھول جاتی ہے، وہ بھی بھول گئی تھی۔

"تو کس مٹی کی بنی ہے۔ تیرا شوہر دوسری شادی کر آیا اور تجھے کوئی فرق نہیں پڑا۔" رات وہ ماں کے ساتھ لیٹی تو انھوں نے اسے لتاڑا۔

"وہ میرا کبھی تھا ہی نہیں ماں جی۔ میں اس گھر میں بس آپ کی خدمت گار بن کر آئی تھی اور وہی بن کر رہ رہی ہوں۔" کتنے پل گزر گئے تو اس نے ماں جی کو جواب دیا جب ماں جی کو لگا کہ وہ سو چکی ہے۔ چھت کو گھورتے وہ بہت دیر بعد ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔

"اور یہ جو تیرے اندر ہے وہ......؟"

"اللہ اس کا مالک ہے۔ وہ اسے سنبھال لے گا۔" ایک گہری آہ بھر کر وہ لیٹ گئی تھی۔

رات کے کسی پل اسے درد اٹھا تھا۔ ہسپتال لے جانے سے پہلے ہی اس کا بچہ مر چکا تھا۔ اللہ واقعی اس کا مالک تھا تبھی اس نے اسے سنبھال لیا تھا۔

بچے کے مرنے سے وہ مزید خاموش اور زندگی سے بیزار ہو چکی تھی۔

علی حسین سارا دن دکان پہ ہوتا اور گھر آتے ہی زلیخا کے ساتھ مصروف ہو جاتا۔

"ایسی ہوتی ہیں بیویاں جو شوہروں کو اپنے سے باندھے رکھتی ہیں۔" ماں جی اسے سمجھانے کے لیے زلیخا کا حوالہ دیتیں۔ وہ واقعی اس کی بیوی بن کر ہی آئی تھی تبھی تو شوہر کو خود سے باندھ سکی تھی۔ نہ کام کو ہاتھ لگاتی نہ ماں جی کی خبر گیری کرتی۔ اس سب کے لیے ہدیٰ موجود تھی نا۔ ہدیٰ، خدمت گزار۔

"جو بیوی بنا کر لائی جاتی ہے وہ باندھ کر بھی رکھتی ہے۔ جو بیوی کے درجے کو ہی نہیں پہنچ پاتی وہ بھلا کیسے باندھے۔ میں خدمت گزار ہوں مجھے وہی رہنے دیں ماں جی، بیوی تو میں کبھی بنی ہی نہ تھی۔"

ماں جی کو اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ دماغی طور پہ ٹھیک نہیں رہی۔ کبھی کبھار ماں جی اسے ایک طرف بیٹھا دیکھتیں تو انھیں لگتا کہ وہ خود سے باتیں کرتی اور مسکراتی رہتی ہے۔ کبھی بالکل کسی اور ہی دنیا میں کھوئی ہوئی لگتی تھی جیسے وہ یہاں موجود ہی نہ ہو۔

"تیری ماں کیوں تجھ سے ملنے نہیں آتی؟"

اس کی حالت پہ ماں جی تڑپ سی جاتیں۔

"وہ مجبور ہیں۔ ہمیشہ سے ہی مجبور تھیں۔ پہلے میں ان کی مجبوری نہیں سمجھتی تھی، اب سمجھتی ہوں۔"

ماں جی ٹھنڈی آہ بھرتیں۔

"اللہ تیری مشکل آسان کرے۔" اسے انھی کی یہ دعا لگی تھی یا شاید بددعا لگی تھی۔ ابھی وہ اپنے بچے کے غم سے نکلی ہی نہ تھی کہ ماں جی جو اس گھر میں اس کا واحد سہارا تھیں وہ بھی چل بسیں۔ اس کی اس گھر میں موجودگی کی واحد وجہ اب ختم ہو چکی تھی۔ اب اس کا کیا ہونا تھا، جس مقصد کے لیے وہ یہاں تھی وہ تو تمام ہوا، پھر وہ کس مقصد سے یہاں رہنے والی تھی۔ کیا ایک بار اسے پھر سے بے گھر ہونا تھا۔ اب وہ نیا گھر کہاں تلاش کرے گی، کہاں سے بسائے گی؟

"میں تجھے تیری ماں کے گھر چھوڑ آتا ہوں؟"

علی نظریں چراتا پوچھ رہا تھا۔ اس کی ایسی نظروں سے ہدیٰ کو خوف آیا تھا۔

"پکا پکا چھوڑ کر آؤ گے یا بس چند دن کے لیے؟" علی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"زلیخا تجھے ماں جی کی وجہ سے برداشت کرتی تھی، اب تو وہ بھی نہیں رہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ میں تجھے چھوڑ دوں۔" ہدیٰ ذرا کی ذرا مسکرا دی۔ یہ تو ہونا ہی تھا، آج نہیں تو کل لیکن یہ تو ہونا ہی تھا۔

"چھوڑ دے پھر۔" وہ اٹھ کر اپنا سامان اٹھانے لگی۔

"تو سمجھی نہیں ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ میں تجھے طلاق دے دوں۔" علی کو وہ اتنی نارمل لگی تھی کہ اس نے مزید وضاحت دینا ضروری سمجھا تھا۔

"سمجھ تو میں تب ہی گئی تھی جب ماں جی فوت ہوئی تھیں۔ بس تمہارے منہ سے نکلے جملوں کے انتظار میں بیٹھی تھی کب سے۔ سامان بھی میں نے پہلے سے باندھ کر رکھا تھا..... یہ دیکھو۔" وہ بندھی ہوئی ایک پوٹلی اور ایک بکسا اسے دکھانے لگی۔

"تو کیسی عورت ہے ہدیٰ میں کبھی سمجھ نہیں سکا تجھے۔" وہ حیرت اور ترحم بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اپنے اندر ایک جہاں سمیٹے وہ عورت ہر بار اسے نئے سرے سے حیران کرتی تھی۔

"تم میں ہے ہی کیا ہدیٰ کامران کہ کوئی تم کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ بالکل عام سی ہو، بلکہ عام سے بھی عام۔" کبھی کی کہی دانیال کی بات اسے اتنے سالوں بعد بھی یاد تھی۔ وہ خود پہ ہنس دی تھی۔ علی مزید حیران ہوا تھا۔

"اچھا ہی ہے کہ نہ سمجھو۔ بس مجھے چھوڑ آؤ۔ لاری اڈے تک لے جاؤ۔ آگے میں خود چلی جاؤں گی۔" وہ اب بھی بالکل نارمل لگی تھی علی کو یا شاید بہت زیادہ ابنارمل۔ ایک ایسی عورت جس کے اندر احساسات اور جذبات مردہ ہو چکے ہوں۔

"میں طلاق نامہ بھجوا دوں گا۔" وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔ "اور ساتھ میں حق مہر بھی۔" وہ کسی غیر مرئی نکتے کو گھور رہی تھی۔

"تو نے بہت خدمت کی ماں جی کی۔" وہ اپنی چادر کھول رہی تھی۔ علی کہے جا رہا تھا۔

"ان کی اپنی بیٹی بھی شاید ہوتی تو ایسے نہ کر سکتی۔" ہدیٰ نے اپنی چادر کی بکل ماری اور چارپائی جھک کر چارپائی کے نیچے سے چپل نکالی۔

"میں نے بڑی زیادتی کی ہے تیرے ساتھ۔ ماں جی کہتی تھیں تو ولی اللہ ہے۔ میں پاپی تھا، اللہ والی بھلا مجھے کہاں راس آتا تھی؟"

ہدیٰ جہاں کی تہاں رہ گئی۔ ماں جی نے اس کے بارے میں یہ قیاس آرائی کی تھی۔ وہ کہاں سے انھیں اللہ والی لگی تھی۔

"وہ کہتی تھیں کہ تو بہت نیک روح ہے۔ بڑی نوازش ہے اللہ کی تجھ پہ۔ تیری قدر کروں ..... لیکن میں نہ سمجھ سکا۔" علی حسین سر جھکائے کہتا جا رہا تھا۔ سر اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ سلائی کی ہوئی آدھی ادھڑی چپل پاؤں میں پہن چکی تھی اور جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ لیکن نظریں ماں جی کی بچھی چارپائی پہ تھیں۔ علی نے مڑ کر اس کی نظروں کا زاویہ ناپنے کی کوشش کی تھی۔

"چلیں۔" وہ میکانکی انداز میں پوچھ رہی تھی۔ اسے اب اس بات سے کوئی غرض نہیں رہتی تھی کہ سامنے والا کیا کہہ رہا ہے، کیوں کہہ رہا ہے۔ اس نے تو اسے سنا ہی نہیں تھا۔ اس کی باتوں میں پہلے بھی کچھ نہیں رکھا تھا اور اب جبکہ وہ جا رہی تھی تو بالکل بھی نہیں رکھا تھا۔ وہ شخص اسے طلاق دینے کا قصد کیے سب کہہ رہا تھا اس کی میٹھی باتیں بھی اب کس کام کی؟

علی نے اس کا سامان اٹھایا اور اسے لاری اڈے چھوڑ آیا۔ جاتے جاتے ہاتھ جوڑ دیے۔

"مجھے معاف کر دینا ہدیٰ۔" ہدیٰ نے اجنبی نظروں سے اسے دیکھتے گویا پہچاننے کی کوشش کی تھی۔

گاڑی اسٹارٹ ہوئی تھی یا نہیں لیکن اس کی من پسند یادوں کی ریل ضرور چلنے لگی تھی۔

بابا، ماما، ثریا، امجد انکل، دانیال، ماں جی، علی حسین۔ سب باری باری یاد آتے آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔

"میری پیاری ہدیٰ۔" ایک مہربان چہرہ اسے یاد آیا تھا۔ وہ مہرین تھیں ..... نہیں ..... وہ ثریا تھیں ..... یا شاید ماں جی۔

"خدمت گزار بن کر رہ، مالکن بنے گی تو دو کوڑی کا کر دوں گا۔" یہ کون کہہ رہا تھا۔ یہ کس کی آواز تھی۔ ارد گرد بہت شور تھا، اس کے اندر تو جمود تھا۔ پھر وہ کیوں ان آوازوں میں پہچان نہیں کر پا رہی تھی۔

"اللہ تجھے کیسے کیسے رنگ لگائے گا تو دیکھنا اور میری بات یاد رکھنا......" کون تھی جو اسے دعا دے رہی تھی؟

"میں طلاق دے رہا ہوں۔" یہ دانی کہہ رہا تھا۔ نہیں...... یہ دانی نہیں کہہ سکتا تھا۔ پھر کون؟

اپنے مطلوبہ اسٹاپ کی اسے خبر تک نہ ہوئی۔ گاڑی آخری اسٹاپ پہ رکی تو کنڈکٹر نے اسے مخاطب کیا۔

"اترو بی بی۔"

سر گھما کر دیکھا تو گاڑی میں وہ اکیلی تھی۔ سامان لیے اتر گئی۔ جانا کہاں تھا یہ تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔ کیوں یاد نہیں رہا تھا اسے؟ ذہن پہ زور ڈال کر بھی اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں جانے کے لیے نکلی تھی۔ وہ گھر سے نکلی ہی کیوں تھی بھلا؟

"بھائی صاحب یہ کون سی جگہ ہے؟" پاس سے گزرتے ایک بندے کو روک کر پوچھا۔

"یہ فیض آباد ہے۔ آپ نے کہاں جانا ہے؟"

اسے یاد نہیں تھا کہ اسے کہاں جانا تھا۔ وہ وہیں فٹ پاتھ پہ بیٹھ گئی۔ اسے بالکل یاد نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں جانے کے لیے نکلی تھی، کیوں نکلی تھی۔ ذہن پہ بہت زور ڈالنے کے باوجود بھی وہ یاد کرنے میں ناکام ہوگئی تھی۔

"بھائی یہ ایدھی سنٹر کہاں ہے۔ مجھے وہاں جانا ہے۔" وہاں تین گھنٹے بیٹھنے کے بعد وہ قریبی ٹھیلے والے سے کہہ رہی تھی جو کچھ حیران سا اسے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

"کیسی ہو؟" ایک بے شکن بستر پہ پڑی وہ ہدیٰ نہیں لگتی تھی۔ ہدیٰ ایسی تو نہیں تھی۔ اس کا دل نئے سرے سے اس لڑکی کے لیے دُکھا تھا۔ وہ قریبی اسٹول پہ بیٹھ گیا۔ وہ اسی طرح چھت کو گھور رہی تھی، اس نے آنے والے کو دیکھنا تک گوارا نہیں کیا تھا۔

"میں دانیال ہوں۔" اسے لگا تھا کہ وہ اسے پہچان نہیں سکی تبھی اپنا تعارف کروایا تھا۔ وہ پھر بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

"ہم تمہیں لینے آئے ہیں بیٹا۔" ایک مہربان ہاتھ اس کے ہاتھ کو چھوا تھا۔ پھر اس کے سر کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔ اس نے گردن کو ہلکے سے جنبش دے کر انھیں دیکھا تھا۔ وہ چہرہ اس کے لیے جانا پہچانا تھا۔ وہ انہیں جانتی تھی۔ بس نام یاد نہیں آرہا تھا۔ وہ پہلے سے بہت زیادہ بوڑھے لگ رہے تھے۔

"تم اب میرے پاس رہو گی، اپنے گھر، ہمارے گھر۔ میں نے ڈاکٹرز سے پرمیشن لے لی ہے۔ تم ہمارے ساتھ جاسکتی ہو۔" وہ ہنوز خاموش رہی تھی۔

"میرے گھر کو ایک بیٹی کی ضرورت پڑی تو احساس ہوا کہ نجانے کیوں ہم بیٹے مانگنے میں ساری دعائیں لگا دیتے ہیں، ضرورت تو ہمیں بیٹیوں کی ہوتی ہے بڑھاپے میں جو آنگن چھوڑ کر بھی اسی آنگن میں لوٹنا نہیں بھولتیں۔"

ایک آنسو ٹوٹ کر ہدیٰ کی آنکھوں سے بہا تھا اور ڈھیر سارے امجد سبحان کی آنکھوں سے۔ دانیال کو اپنا آپ ان دونوں کے درمیان اجنبی لگ رہا تھا۔ وہ بڑی خاموشی سے پلٹ گیا تھا۔

ہدیٰ کو ڈسچارج کروا کر وہ دونوں گھر لے آئے تھے۔ مہرین کو کال کر کے انھوں نے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ ہدیٰ سے بات کرنا چاہتی تھیں لیکن امجد صاحب کو مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ ہدیٰ گھر کی ہر چیز کو چھو چھو کر خاموش آنسو بہا رہی تھی۔ وہ اس گھر کی ہر ہر چیز کو یاد کرتی رہی تھی جیسے وہ سب اس کے وجود کا حصہ ہوں۔ اسے اب اس گھر میں لوٹ کر سب یاد آتا جا رہا تھا۔

دانیال اس عرصے میں خاموش تماشائی بنا سب دیکھتا رہا تھا۔ اس نے زرتاشیہ کو کال کی تھی۔

"تمہیں اب تو آنا چاہیے تھا جب میں پاکستان میں ہوں تو۔ ابو بہت اکیلے تھے، کیا ہو جاتا جو تم ان کے پاس دو گھڑی ملنے چلی آتیں۔"

"میری شادی تم سے ہو رہی ہے، ابو سے یا اس گھر سے نہیں کہ میں سب کے ساتھ وقت گزاروں۔ اب تم آئے ہو تو وقت نکال کر ملتے ہیں۔" دانیال کو اس کا جواب اچھا نہیں لگا تھا۔ اسے امی یاد آئی تھیں۔

''اس گھر کو جوڑ کر رکھنے والی صرف ہدیٰ تھی دانی جسے تم نے توڑ دیا۔'' وہ سر تھامے بیٹھا تھا۔

جتنے عرصے وہ پاکستان میں رہا تھا، زرتاشیہ اور وہ ملتے رہے تھے لیکن گھر سے باہر۔ زرتاشیہ اپنی رخصتی سے قبل گھر نہیں آنا چاہتی تھی۔ ابو کی صحت پہلے سے بہتر ہو گئی تھی۔ ہدیٰ بھی جیسے اس گھر میں آکر سنبھل چکی تھی لیکن ان دونوں کے درمیان صدیاں دیوار بن کر کھڑی تھیں کہ وہ ایک دوسرے کو مخاطب تک نہیں کرتے تھے۔ ایک گھر میں رہتے بالکل اجنبی تھے وہ ایک دوسرے کے لیے۔ ابو کی بہتر طبیعت کے باعث اس نے واپس جانے کا سوچا تھا کہ اب ہدیٰ تھی ان کی دیکھ بھال کے لیے تو اسے تسلی تھی۔ اس کے جانے سے پہلے زرتاشیہ اس کے بے حد اصرار پہ ابو سے ملنے آئی تھی۔ ہدیٰ کی اس پہ پہلی نظر پڑی اور اسے پتھر کر گئی۔ وہ اپنی جگہ سے ہل تک نہ سکی تھی۔ زرتاشیہ کچھ دیر ہی رکی تھی اور ایک چائے کا کپ پی کر چلی گئی تھی۔

''یہ زرتاشیہ تھی؟'' اس گھر میں آنے کے بعد وہ پہلی بار اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ دانیال نے سر اثبات میں ہلایا۔ وہ اس کی آنکھوں میں امڈتی حیرت کا سبب جانتا تھا۔ یہ حیرت اس نے اس سے قبل امی اور ابو کی آنکھوں میں بھی دیکھی تھی جب وہ دونوں اس کا رشتہ طے کرنے گئے تھے۔ وہ بالکل شاکڈ کی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی کیفیت سمجھتا تھا۔

''آپ اس سے محبت کرتے ہیں؟'' دانیال اس بار خاموش رہا تھا۔

ہدیٰ ہنسی تھی، بہت زور سے ہنسی تھی۔ اتنا کہ دانیال کو لگا تھا وہ پاگل ہو گئی ہو۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھیں چھلک گئی تھیں۔

''سچ میں محبت اندھی ہوتی ہے، آج اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔'' وہ پھر سے ہنس دی تھی لیکن اس ہنسی میں اپنے لیے استہزا وہ صاف محسوس کر سکتا تھا۔

''آپ کی بھی اندھی ہے۔'' وہ اس کی بات کا پس منظر جانتا تھا۔

''صرف اس کے کیریئر کو دیکھ کر، یہ کہ وہ ڈاکٹر ہے، لائق اور قابل ہے اس کے تمام عیب چھپ گئے حتیٰ کہ آپ کو اس کے چہرے پہ موجود بدصورتی کے نشان بھی دکھائی نہ دیے۔'' دانیال اب بھی چپ رہا تھا۔

''میں نالائق تھی، لاوارث تھی اسی لیے---- اسی لیے آپ نے مجھے----'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ بات مکمل کیے بنا وہ اندر کی طرف بھاگ گئی تھی۔ دانیال کو عجیب سی کیفیت نے گھیر لیا تھا۔

☆☆☆

ہسپتال کے لان میں سنگی بنچ پہ بیٹھے، اردگرد سے بے نیاز، زوہا کے کہے الفاظ اس کے دل کو اندر سے کاٹ رہے تھے۔

یہ زوہا نہیں تھی جس نے کسی کا کچھ بگاڑا تھا، یہ تو وہ تھا جس نے ہدیٰ کے لیے سب بگاڑ دیا تھا۔

وہ یکدم اٹھا اور گاڑی کی چابی جیب سے نکال کر پارکنگ کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اپنے گھر جا رہا تھا، اپنے امی ابو کے گھر۔ چودہ سال بعد، ایک بار پھر سے۔

☆☆☆

گیٹ کھل کر ساتھ لگا ہوا تھا، اس کے ہلکے سے دباؤ سے کھلتا چلا گیا۔ یہ وقت لڑکیوں کے آنے کا ہوتا تھا جو سلائی کڑھائی، کروشیا، سجاوٹی کام سیکھنے آتی تھیں۔ وہ اندر صحن میں کرسی ڈالے دھوپ سینکتی سلائیاں ہاتھ میں لیے سویٹر بن رہی تھی۔ اس کی چاپ پہ چونکی اور مڑ کر دیکھا۔ آنکھوں میں تحیر سموئے وہ اپنا چشمہ درست کرتی، اپنی نظروں کو دھوکے سے بچانے کی کوشش میں اسے بغور دیکھنے کی کوشش میں تھی۔

''اتنی صبح صبح......؟'' 'اتنے سالوں بعد' کہنے کے بجائے اس نے ایک انوکھی بات پوچھی تھی۔ ایک طرف رکھی کرسی اس نے کپڑے سے پونچھ کر اس کے بیٹھنے کے لیے بڑھائی تھی۔ وہ بیٹھنے کے بجائے کھڑے کھڑے اپنے بچپن کے اس گھر کو دیکھ رہا تھا۔ بچپن کے اس گھر میں بیٹھی اپنی بچپن کی اس دوست کو دیکھ رہا تھا۔

''تم سے معافی مانگنے آیا تھا۔''

''کیسی معافی؟'' سویٹر بنتے ہاتھ تھمے اور اس

نے حیرت سے استفسار کیا۔

"اپنے دیے بھی دکھوں کی معافی۔ میں آج ہاتھ جوڑ کر پھر سے تم سے معافی مانگتا ہوں ہدیٰ۔" وہ جڑے ہاتھوں پہ سر گرا کر رو دیا تھا۔ اپنے دیے بھی دکھوں پہ رو دیا تھا۔ دانیال امجد چودہ سال بعد پھر سے گھٹنوں کے بل بیٹھا اس کے سامنے رو دیا تھا۔

ہدیٰ نے اس کے جڑے ہاتھوں کو کھول دیا تھا۔

"یہ سب مت کرو۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔"

"مجھے بھی تو تکلیف ہوتی ہے نا ہدیٰ۔ میں اس تکلیف سے کبھی نکل ہی نہیں سکا۔ ایسے لگتا ہے کہ تمہاری بددعائیں ہیں جو مجھے کسی پل چین نہیں لینے دیتیں۔ پہلے مجھے چین نہیں لینے دیتیں اور اب زوہا کو۔" وہ رو رہا تھا۔

"مگر میں نے تو کبھی تمہیں بددعا نہیں دی۔ میں بھلا تمہیں کیسے بددعا دے سکتی ہوں۔ محبت کرنے والے دلوں سے بددعا نہیں نکل سکتی۔"

"تو پھر مجھے کیوں چین نہیں ملتا۔ زوہا کہتی ہے اسے کسی کی بددعا لگی ہے، اس کی خوشیاں کو، محبت کو، کسی کی آہ لگی ہے...... وہ بددعا، وہ آہ تمہارے سوا کس کی ہو سکتی ہے......؟" ہدیٰ نے اس روتے ہوئے شخص کو دیکھا تھا۔ ابو کی وفات کے بعد سے وہ ایسا ہی ہو گیا تھا۔ نرم دل جیسے کسی نے اس کا دل ہاتھ میں تھام کر موم کر دیا ہو۔ دکھوں نے دانیال امجد کو موم کیا تھا اور ہدیٰ کامران کو صابر۔

"میں سچ میں بھی کسی کو بددعا نہیں دیتی اور زوہا کو تو کبھی بھی نہیں دے سکتی۔ وہ تو میرے جیسی ہے نا۔"

وہ جانتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہے۔ وہ سچ کہہ رہی تھی، زوہا کے روپ میں اسے ہدیٰ دکھائی دیتی تھی۔

☆☆☆

چودہ سال قبل وہ پہلی بار تب رویا تھا جب زوہا کا رزلٹ کارڈ اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ ماں کی ٹانگوں کے پیچھے سے جھانکتی باپ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ فیل ہو گئی تھی۔۔۔ زوہا دانیال، دانیال امجد کی اکلوتی بیٹی میتھس میں فیل ہو گئی تھی۔۔۔ وہ بھی تھرڈ اسٹینڈرڈ میں۔ دانیال بے یقینی سے اس کا رزلٹ کارڈ دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میری بیٹی اتنی کند ذہن کیسے ہو سکتی ہے؟"

"ہر بچہ ایک سا نہیں ہوتا۔" زرتاشیہ نے بیٹی کو اپنے پیچھے چھپاتے اس کی غلطی کی وضاحت کی تھی۔

"یہ ہمارا بچہ ہے۔ دو ذہین ماں باپ کی اولاد کند ذہن کیسے ہو سکتی ہے؟" وہ بری طرح چلایا تھا۔

"اس کا میتھس برا ہے، میں اسے ٹیوٹر لگوا دوں گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔"

"باقی سب میں بھی مارجن سے پاس ہے۔ تم کس کس سبجیکٹ کے لیے ٹیوٹر لگواؤ گی؟"

"تم جانتی ہو ہدیٰ میں میتھس کا ایسا ماہر ہوں کہ مجھے مشکل سے مشکل حساب کے لیے بھی کیلکولیٹر کی ضرورت نہیں پڑتی۔" رجسٹر اس نے ہدیٰ کو تھما دیا تھا جس پہ ایک مشکل سوال اس نے بنا کیلکولیٹر کے حل کر دیا تھا۔

"ایسے مت دیکھو، میں تمہاری طرح حساب کا کورا نہیں ہوں۔" وہ اپنی مخصوص ہنسی ہنسا تھا۔

اپنا سر تھامے وہ یک دم رونے لگا تھا۔ یہ اس کا ماضی تھا جو منہ پہ تڑ تڑ طمانچے مارتے ہوئے اسے رونے پہ مجبور کر رہا تھا۔ بابا کی وفات کے بعد پہلی بار تھا کہ وہ اس طرح رو رہا تھا۔ زرتاشیہ نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ زوہا کو اندر بھیج کر وہ اس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ صرف بیٹی کے فیل ہونے پہ کون ایسے روتا ہے؟"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی کہ محض بیٹی کے فیل ہونے پہ کون ایسے روتا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ اس کی بیٹی نہیں تھی جو فیل ہوئی تھی، یہ وہ تھا جو فیل ہوا تھا۔ ناکامی اس کی بیٹی کی صورت اس کی ہوئی تھی۔۔۔ سیکنڈ کے دسویں حصے میں اسے ادراک ہوا تھا کہ اس کا عروج زوال میں ڈھل گیا تھا۔ اس کی تمام کامیابیوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ گیا تھا۔ اس کی ذہانت کا سارا تکبر مسمار ہو چکا ہے۔ وہ جس ہدیٰ کو

کند ذہن، نکمی اور نالائق کہتا تھا، وہ زوہا کی صورت اس کے ہاں پیدا ہو گئی تھی۔ وہ دوست نہیں تھی، اولاد تھی۔۔۔ اولاد کو ساری کمیوں، خامیوں سمیت قبول کیا جاتا ہے، پیچھا نہیں چھڑایا جاتا، مسترد نہیں کیا جاتا۔ وہ زوہا تھی، ہدیٰ نہیں تھی کہ وہ اسے ٹھکرا کر آگے بڑھ جاتا کہ اس کے پاس ایک بہتر متبادل موجود ہے۔ زوہا اس کی اکلوتی اولاد تھی اور اولاد کا کوئی متبادل موجود نہیں ہوتا۔

"مجھے آہ لگ گئی ہے اس کی۔" وہ بڑبڑا رہا تھا۔ زرتاشیہ سن نہیں پا رہی تھی۔ بس پریشانی سے اس کے ہاتھ مل رہی تھی، اس کے آنسو صاف کر رہی تھی۔ اسے نارمل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"وہ ہمیشہ اس مقام پہ لا کر بدلہ لیتی ہے جہاں سے کہیں اور جانے کا رستہ نہیں رہتا۔" وہ بالوں کو مٹھیوں میں جکڑے پاگل پن کی حد تک مضطرب تھا۔

وہ اسی رات سات ماہ بعد بابا کے گھر گیا تھا۔ ہدیٰ سے معافی مانگنے۔ اس کے سامنے ہاتھ پھیلانے۔

"تم اپنی بددعا واپس لے لو ہدیٰ۔ میں اپنی اولاد کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ وہ مجھے جان سے عزیز ہے، اس کے گرد کوئی بددعا کا حصار برداشت نہیں کر سکتا۔"

"میں نے کوئی بددعا نہیں دی۔ نہ تمہیں، نہ زوہا کو۔"

"تم جانتی ہو نا کہ تمہارے بدلے اللہ لیتا ہے مجھ سے، پھر کیوں اللہ سے میرا شکوہ کیا؟"

"میں اللہ سے شکوے کرنا چھوڑ چکی ہوں، میں بندوں سے شکوے کرنا بھی چھوڑ چکی ہوں۔"

"بابا نے کہا تھا تم اللہ والی ہو۔ تم پہ اللہ کا کرم ہے، تم نوازی گئی ہو۔ انھوں نے کچھ تو ایسا دیکھا ہوگا تم میں۔ تم مجھے دعا دے دو ہدیٰ۔ تم میرے لیے ہاتھ اٹھا دو۔"

اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ امجد انکل نے اسے یہ کبھی نہیں کہا تھا، ماں جی نے بھی ایسا کبھی نہیں کہا تھا۔ لیکن دونوں نے اپنی اولادوں سے مرنے سے پہلے یہی کہا تھا۔ کیوں کہا تھا......؟ ایسا کیا دیکھا تھا، کون سا کرم تھا جو انہیں دکھائی دیا تھا......؟ وہ گم صم سی ہو گئی۔

"سب اللہ والے ہوتے ہیں۔ اللہ سب کے پاس، سب کے ساتھ ہے۔ ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ میں، تم، ہم سب۔ دعا پہ کسی کی اجارہ داری نہیں۔ یہ وہ پکار ہے جو سب کو حاصل ہے، سب کی ملکیت ہے، سب کو نوازی گئی ہے۔ یہ نہ میری ہے، نہ تمہاری، یہ ہم سب کی ہے۔" اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو کھوجتے وہ کہہ رہی تھی۔

"تم کہو گی تو وہ سنے گا۔ وہ تمہاری سنتا ہے۔ تمہیں دیکھتا ہے۔ تمہاری مانتا ہے۔ اسے کہو کہ مجھے معاف کر دے۔"

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ اس سے کیا کہے۔ وہ اس کی اتنی سنتا تو وہ اس طرح اکیلی اس گھر میں بنا کسی رشتے کے، تنہا کیوں رہ رہی ہوتی۔۔۔؟ اس کی مانتا ہوتا تو برسوں پہلے اس شخص کو اس کا کر دیتا۔ اسے سامنے کھڑے اس شخص پہ ترس آیا۔

"میں کہوں گی۔ اگر تمہیں میرے کہنے سے سکون ملتا ہے تو میں کہوں گی کہ وہ تمہیں معاف کر دے۔"

"وہ تمہارے بدلے لیتا ہے مجھ سے تو جب تک تم مجھے معاف نہیں کرو گی وہ نہیں کرے گا۔"

"وہ اپنے ہی بندے کا بدلہ، اپنے ہی بندے سے کیسے لے سکتا ہے......؟ لیکن پھر بھی میں کہتی ہوں کہ میں نے معاف کیا، میرا اللہ بھی تمہیں معاف کرے گا۔" ایک گہری سانس بھرتے اس نے دانیال امجد کو دیکھا۔ وہ دنیا فتح کرنے والی باتیں کرتے کرتے کیسی باتیں کرنے لگا تھا۔ وہ زندگی کے پیچھے بھاگتے کس چیز کی طلب میں پڑ گیا تھا۔ وہ دنیا چاہتے چاہتے کس چاہت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

خوش قسمتی کسی کی میراث نہیں ہوتی کہ ہمیشہ ساتھ دے۔ اس کی خوش قسمتی بھی وقتِ رخصت تھی۔

"مجھ سے شادی کر لو ہدیٰ۔" یہ دوسرا جھٹکا تھا جو ہدیٰ کو لگا تھا۔

"میں زرتاشیہ کو دل سے چاہتا ہوں لیکن میری

روح تمہیں چاہتی ہے۔" ہدیٰ بے یقینی میں گھری اسے دیکھ رہی تھی۔ قدرت کا سوانگ۔ جب اسے اس انسان کی چاہت نہ رہی تو وہ اس کی چاہت میں مبتلا کر دیا گیا۔ اب تو دل اس کی محبت سے خالی ہو چکا تھا، پھر اب کیوں وہ اسے سونپا جا رہا تھا۔

"اب نہیں دانی۔ اب نہیں ...... اب تم جاؤ یہاں سے۔" وہ اپنی چادر اپنے گرد ٹھیک سے لپیٹتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ خالی نظروں سے اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

دانیال نے گہری سانس بھری۔

"تم ولی اللہ ہو ہدیٰ ...... بابا ٹھیک کہتے تھے۔"

ہدیٰ ہولے سے ہنس دی اور نفی میں سر ہلایا۔

"ایک عام سی بندی، بہت عام سی بندی۔ عام سے بھی عام۔" کبھی اسی نے کہا تھا، آج وہ کہہ رہی تھی۔ وہ اسی کا کہا اسی پہ لوٹا رہی تھی۔ دانیال نے لب بھینچے، سر نفی میں ہلایا۔

"تمہارے دکھوں نے، محرومیوں نے تمہیں ولی بنا دیا ہے۔ مجھے لگتا ہے مجھے سب کچھ نوازا گیا سوائے سکون کے اور تم کچھ بھی نہیں نوازی گئیں سوائے سکون کے۔" ہدیٰ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"اللہ تمہیں سکون سے نوازے۔"

"اب تو ہاں کر دو ہدیٰ۔ اب تو مجھے مسترد مت کرو۔ میں پچھلے چودہ سالوں سے تم سے محبت میں مبتلا ہوں، محبت کو یوں نہ ٹھکراؤ جیسے میں نے ٹھکرائی تھی۔ ایسا کرنے سے محبت بہت رلاتی ہے۔" وہ آج بھی اس کے ساتھ کا متمنی تھا ہدیٰ حیران ہوئی۔

"زرتاشیہ سے شادی نے مجھے بے سکون کیا ہے۔ میں نے دنیا چاہی تھی۔ مجھے دنیا مل گئی، باقی ہر شے ہاتھ سے نکل گئی۔ رشتے، سکون، محبت۔ میں اب یہ سب پانا چاہتا ہوں، تمہیں اپنی زندگی میں لانا چاہتا ہوں۔" زرتاشیہ شادی کے بعد بھی اس گھر میں نہیں رہی تھی۔ وہ دونوں باہر سے لوٹنے کے بعد اب ایک الگ گھر میں رہتے تھے۔ بابا ہدیٰ کے ساتھ اسی گھر میں مقیم بہت خوش رہ رہے تھے۔

وہ ویک اینڈ انہی کے ساتھ گزارتا تھا جب تک وہ زندہ رہے تھے۔ اس گھر کو اکیڈمی کی شکل بھی اس نے بابا کے کہنے پہ دی تھی۔ وہ یہاں لڑکیوں کو مختلف ہنر سکھاتی تھی۔ اپنی اس زندگی سے بہت مطمئن تھی۔ جیسے اس کے سارے دکھوں کا مداوا اللہ نے کر دیا ہو۔

"میرے اندر بہت بے سکونی ہے ہدیٰ۔ کہیں قرار نہیں ہے۔ شاید تمہیں نام دے دوں تو سکون آ جائے۔"

"مجھے اب کسی نام کی ضرورت نہیں ہے دانی۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہارا گھر ہے، بیوی ہے، بیٹی ہے۔"

"میں زرتاشیہ کے ساتھ کبھی بھی خوش نہیں رہا ہوں، تم کہو تو میں اسے چھوڑ دوں گا۔"

"میں کسی کی محبت کے مقبرے پہ اپنی محبت کا گھر کیسے بنا سکتی ہوں؟ شاید بنا بھی لیتی اگر زوہا نہ ہوتی۔ زوہا کو زوہا رہنے دو، ہدیٰ مت بناؤ۔ وہ کند ذہن، نکمی سہی لیکن ماں باپ کی محبت کی چھایا میں ہے، اسے رشتوں سے محروم مت کرو۔ ہر ہدیٰ اکیلے نہیں جی سکتی، حالات سے لڑ نہیں سکتی۔ ہر ہدیٰ سب نہیں سہہ سکتی۔ ایسی ایک ہی ہدیٰ رہنے دو، دوسری مت بناؤ۔"

"اور محبت جو تم مجھ سے کرتی تھیں؟" وہ اس کی صورت بغور دیکھ رہا تھا۔

"وہ اب شاید کہیں نہیں رہی۔" چودہ سال پہلے کا انکار آج بھی اقرار میں نہ بدلا تھا اور اسے اگلے چودہ سال میں بھی کبھی نہیں بدلنا تھا۔

"ہدیٰ ......" کپکپاتے لبوں سے اس نے دیکھا تھا۔ ہدیٰ نے سر جھکا لیا تھا۔ اس کے پاس دینے کو کچھ نہیں تھا۔ کہنے کو بھی کچھ نہیں تھا۔

وہ لٹا پٹا سا کندھے جھکائے واپس جا رہا تھا۔ اس کی شکستہ چال دیکھتے ہدیٰ نے اپنی نم ہوتی آنکھوں کو صاف کیا تھا۔

ہدیٰ کے لیے زندگی سفر کا نام تھا اور سفر جاری ہی اچھا لگتا ہے۔

☆☆

سالگرہ نمبر



ردا سکندر

اپنے لوگ



''پھر آخر کو تجھے ہمارا خیال آ ہی گیا جو واپس تشریف لے آئی۔''

کام والی ماسی سیما کو آج اتنے روز بعد اپنے سامنے پا کر یسریٰ نے دل میں شکر کا کلمہ پڑھا اور وہیں عین پر ہی اسے دھر لیا۔

''ایک ساتھ چھ چھٹیاں توبہ توبہ ---- اوپر سے فون بھی بند۔ کیوں بھئی کوئی خزانہ ہاتھ لگا ہے یا چپراسی کی نوکری مل گئی ہے تجھے کہ اب کام کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔''

کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی سیما تاسف سے اسے دیکھتی رہ گئی، جب یسریٰ نے اس پر ایک ساتھ کئی سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

''کل حسان پاکستان آ رہے ہیں اور یہاں کچھ بھی تیاری نہیں ہے میری۔ اکیلی جان کس کس طرف ہوتی۔ اس لیے سب کام پینڈنگ......''

''باجی بتا کر تو گئی تھی ناں آپ کو کہ دیورانی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے۔'' یسریٰ جدھر سانس لینے کو رکی، اسے موقع غنیمت جانتے ہوئے سیما نے بھی وہیں سے اپنی بات شروع کر لی۔ ''کیا بتاؤں آپ کو بڑی پریشانی ہو گئی تھی۔ پہلی ڈاکٹر نے تو کیس ہی نہ پکڑا، مجبوراً بڑے ہسپتال لے جانا پڑا۔ ادھر آپریشن کے ساتھ خیر سے اسے بیٹا ہوا ہے جی۔ دیور میرے کی تو دہاڑی ماری جاتی، اس لیے پیچھے سے ہم نند بھاوج ہی اسے دیکھتی پھری ہیں۔ تین وقت کا کھانا پکا کر ہسپتال لے جانا۔ بچوں کو اسکول بھیجنا۔ دو گھروں کو دیکھنے میں بس جی دوڑیں ہی لگی ہوئی تھیں۔ میرے رب کا بڑا احسان ہے اسے گھر لے آئے ہیں اب...... تو میں بھی کام پر نکل آئی ہوں۔'' بنا کہیں رکے سیما نے بھی فرفر اسے اپنی روداد سنا ڈالی۔

''نہیں، اس کی ماں کوئی بہن یا بھابھی نہ تھیں جو تم خدمات پیش کرتی پھری ہو؟''

''ہا ہا جی...... تو کیا ہم کوئی غیر ہیں اس کے۔'' اس کی لمبی چوڑی کہانی سنی ان سنی کرتی یسریٰ کے الفاظ کسی نشتر کی مانند سیما کو آ چبھے تب ہی وہ فوراً بول اٹھی۔

''بچہ سا تھا دیور میرا، جب بیاہ کے میں اس گھر میں آئی تھی۔ ماں اسے میرے سر پر چھوڑ کر خود تو کام کاج کو چلی جاتی۔ صبح کی گئی شام ڈھلے ہی اس کی واپسی ہوتی۔

باجی میں نے ہی پال پوس کر بڑا کیا ہے اسے، پھر شگنوں کے ساتھ اپنے ہاتھوں اس کی دلہن بیاہ کر لائی ہوں۔"

"روز کی شادیاں، فوتگیاں، ہنگامے اور بہانے پر چھٹیوں پہ چھٹیاں۔ ہاں بھئی مان لیا زندگی تو تم لوگوں کی ہے، ہمارے جیسے تو اس حساب سے دنیا میں جھک مارنے کو آئے ہیں۔" یسریٰ بھی ساری بھڑاس آج ایک بار میں ہی نکال لینے کے چکر میں تھی، تب ہی منہ میں بڑبڑاتی اسے اندر آنے کا اشارہ کرتی واپس پلٹی تو سیما بھی دروازہ بند کر کے شرمندہ شرمندہ سی اس کے پیچھے ہولی۔

"اچھا آپ بھلے ناغے کے دن گن کر میرے پیسے کاٹ لو باجی۔" ابھی تک اس کا برہم مزاج دیکھ کر مجبوراً سیما کو ہی پسپائی اختیار کرنا پڑی۔

"پیسے تو میں ہر صورت کاٹ کر رہوں گی۔ کسی خوش فہمی میں مت رہنا، تمہیں بھی پتا چلے کہ ایک ساتھ اتنی ساری چھٹیاں کیسے کی جاتی ہیں۔" بدستور آنکھیں ماتھے پہ رکھے یسریٰ نے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو جواباً وہ بھی سر ہلا کے رہ گئی۔ وہ اس سے کسی ایسے ہی فیصلے کی توقع کیے ہوئے تھی۔

"اوپر تلے چھٹیاں کر کے بلاشک میں آپ سب باجیوں کو ناراض کر بیٹھی ہوں مگر پھر بھی خوشی ہے کہ اپنوں کو تو کمر نہیں دکھائی۔ بہن بھائی ہی نہیں ملتے، ایک باقی تو دنیا میں سب کچھ مل جاتا ہے۔ ان پیسوں کا کیا ہے جی آتے جاتے رہیں گے۔ کم سے کم دل میں ٹھنڈ تو ہے نا باجی کہ ہم اپنوں کے کام آئے ہیں۔" تیز تیز ہاتھ چلاتی، جھاڑ پونچھ کرتی سیما ساتھ میں بولے بھی چلی جا رہی تھی۔

"بڑی عجیب سوچ ہے اس عورت کی کہ اپنا ہی نقصان کر کے خوش ہو رہی ہے اور وہ بھی رشتے داروں کے پیچھے۔" سیما کی کم عقلی پر یسریٰ نے بیزاری سے سوچا۔

"بندہ پیرا پتا ہے کیا کہتا ہے باجی کہ بہن بھائی تو ہمارے لیے آکسیجن کی طرح ہوتے ہیں۔"

"بھئی آکسیجن کہا ہو گا اس نے۔" اس بات پر بے ساختہ ہنستی یسریٰ نے فوراً ہی اس کی اصلاح کی۔ ویسے بھی کام میں سیما کی پھرتیاں دیکھ کر اس کا موڈ اب قدرے بحال ہو چکا تھا۔

"ہاں جی۔۔۔۔۔جی۔۔۔۔۔باجی ایسے ہی کچھ وہ بھی بولتا ہے کہ اپنوں کے بغیر تو ہم مرجھا ہی جائیں۔ رونق ہے جی ان کے دم سے۔ زندگیوں میں جو سکون بہن بھائیوں کے ساتھ مل بیٹھنے میں ہے وہ کہیں بھی نہیں۔ بلاشک اسکول کا منہ نہیں دیکھا میں نے پر اتنی سمجھ ضرور ہے کہ اپنے رشتہ داروں سے اچھا نہ بولنے برتنے والا دوزخی ہوتا ہے باجی۔" یہ کہہ کر سیما اپنے کام میں جت گئی تو یسریٰ بھی اپنا ناشتا بنانے کچن کو چل دی۔ پسندیدہ مارننگ شو دیکھتے ہوئے ناشتا کرنے کا ایک الگ ہی لطف تھا، جس کا آج بڑے دن بعد موقع ملا تھا۔ پھر ناشتے کے بعد ٹی وی دیکھتے دیکھتے ہی اسے اونگھ آ گئی۔ کیسی مست اور بے فکری کی نیند سو رہی تھی وہ جب سیما نے اسے جگایا۔

"اٹھ کر دیکھ لیں باجی! کچھ رہ تو نہیں گیا۔ سارے کام کر دیے ہیں جو آپ نے بتائے تھے، اب میں جاؤں؟"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔ میں دیکھ لوں گی لیکن کل جلدی آ جانا اور دیکھ، اب جو اس طرح چھٹیاں کیں تو میری طرف سے جواب ہی سمجھنا۔" اس کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ سیما کو بھیج کر وہ بھی کھانا وغیرہ بنانے کی تیاری کرنے لگی۔

"یہاں اپنے کدھر ہیں؟"

اسی دوران اچانک سے اس کا دھیان غیر ارادی طور پر اپنا جانب اٹھ گیا تو پھر یسریٰ کو اپنے گریبان میں جھانکنے کی ہمت ہی نہ ہو پائی۔ اس لیے کہ یہاں تو سراسر وہ خود بھی قصوروار تھی۔

☆☆☆

عالیہ اس کی نند دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، جس کی پچھلے چند سال سے اپنے بھائی بھاوج سے بول چال بند تھی۔ دراصل اس کے خاوند کو کاروبار بڑھانے کے لیے کچھ رقم درکار تھی۔ جس کا اس نے بھائی سے تقاضا کیا۔ حسان نے جب اس معاملے میں یسریٰ سے مشورہ کرنا چاہا وہ تو بھڑک ہی اٹھی۔

"کیا سوچ کر ان لوگوں نے ایک ساتھ پانچ لاکھ روپے مانگ لیے ہیں۔ عالیہ کو نظر نہیں آ رہا کہ ہم بھی گھر بنا رہے ہیں۔ سو خرچے ہیں کرنے والے۔ ابو کی جائیداد میں سے حصہ وہ لے چکی ہے پھر بھی نظر ہمارے پیسے پر ہے۔ آپ کو اسی وقت انکار کر دینا چاہیے تھا۔" الٹا شوہر پر ہی برس پڑی۔

”پوری گرمیاں تو وہ محترمہ شمالی علاقوں میں گزار کر آتی ہیں۔ پھر دس ہزار سے کم کے برینڈ ڈ سوٹ پہننے کا ان کے ہاں تصور نہیں۔“

”تو کون سا اپنے خرچ کے لیے مانگے ہیں اس نے، ایاز کو ضرورت ہے۔ چند ماہ میں واپس کر دیں گے وہ لوگ۔“

”آپ رہے ہمیشہ سادہ کے سادہ۔ تب ہی تو لوگ آپ سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں لیکن اس بار میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“

بہن کی حمایت میں بولنا حسان کو بھی مہنگا پڑ گیا۔ نتیجتاً اسے بھی بیوی سے کھری کھری سننے کو مل گئیں۔ یہی نہیں بلکہ شوہر کے بجائے خود عالیہ کو فون کر کے یسریٰ نے نہ صرف رقم دینے سے انکار کیا بلکہ دبے لفظوں اچھی خاصی سنا دیں کہ عالیہ نے دل برداشتہ ہو کر ان کے گھر آنا جانا، ملنا ملانا ہی چھوڑ دیا۔

نئے گھر کی خوشی میں کیسی شان دار دعوت رکھی تھی ان لوگوں نے۔ دوست، احباب، محلے دار اور دور و قریب کے تقریباً سب ہی رشتے دار مدعو تھے۔ سوائے حسان کی بہن عالیہ کے، بھائی کے گھر سے دو گلیاں چھوڑ کر اس کا گھر تھا اور اسے ہی ڈھنگ سے پوچھا نہ گیا۔ مہمانوں کی خاطر مدارت کے لیے کتنی ہی ڈشز بنوائی گئیں۔ مدرسوں میں بھجوانے کے لیے کھانا الگ سے بنا تھا مگر عالیہ کے سلسلے میں حسان کو بیوی سے سختی سے ہی تاکید تھی۔

”فون پر ہی دعوت دے دیں گے آئی تو ٹھیک ورنہ راضی کرنے ہم نے بھی نہیں جانا۔“

اسی طرح حسان کے بڑے بھائی فرحان جن سے اب رسماً دنیاداری نباہنے کے لیے ہی ملنا رہ گیا تھا۔ وہ اس وقت میٹرک کا اسٹوڈنٹ تھا۔ جب ابو کا انتقال ہو گیا۔ گھر کا بڑا ہونے کے ناتے فرحان نے اپنی انجینئرنگ کی پڑھائی ادھوری چھوڑ کر ابو کے کاروبار کو سنبھال لیا اور اپنے چھوٹے دونوں بھائی اور بہن کو نہ صرف پڑھایا لکھایا بلکہ ان کی شادیاں بھی کیں۔ کسی موقع پر بھی انہیں باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ لیکن محض یسریٰ کی سطحی سوچ نے چھوٹی چھوٹی باتوں کو بنیاد بنا کر اتنی دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔ کہیں جٹھانی سے بیر باندھ لیے تو کبھی نند کے خلاف محاذ کھڑا کیے رکھا۔ یہاں تک کہ بھائی بھائی بھی آپس میں ملنے سے رہ گئے تھے۔ پچھلی بار تو حسان بڑے بھائی سے ملے بنا یوں ہی واپس جرمنی چلا گیا تھا۔

ان ہی سوچوں کے ساتھ اس کے لیے اب مزید کچن میں کھڑا ہونا کام کرنا دوبھر ہو گیا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لاؤنج میں آ بیٹھی۔

”اپنے بہن بھائیوں کو تو ہم نے خود ہی دور کر رکھا ہے تو پھر ہمیں آکسیجن کہاں سے ملنی ہے۔ ہم میں تر و تازگی کیسے آئے گی۔ سیما کے حساب سے تو ہم بالکل مرجھائے ہوئے لوگ ہوئے۔“

ایک بالکل ان پڑھ اور گھر گھر کام کرنے والی ماسی اس جیسی تعلیم یافتہ، ماسٹر، ڈگری ہولڈر کو زندگی کا بہت بڑا سبق سکھا گئی تھی۔ اپنی انا اور خودسر طبیعت کی وجہ سے ان باتوں کو وہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی نظر انداز کرتی آئی تھی۔

”باجی دنیا میں بیٹھے نہیں رہنا کسی کو۔ یہ جان اللہ کو ہی دینی ہے۔ اس لیے اپنا معاملہ سیدھا سیدھا ہی رکھنا چاہیے، کیا پتا کب بلاوا آ جائے۔“

سیما کی اس بات نے تو اسے جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا۔ یہاں خدا کوئی اور تو نہیں تھا۔

”میری ناراضی کی ڈر سے حسان بھی اپنی بھائی بہن سے نہیں ملتے۔ فرحان بھائی نے ان کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ بھابھی کو بڑا سمجھنے اور عزت مان دینے میں کچھ حرج نہیں تھا اور پھر کیا تھا جو عالیہ کو کچھ پیسے دے دیے جاتے۔ آڑے وقت میں انسان اپنے بہن بھائیوں کی طرف ہی دیکھتا ہے نہ کہ غیروں کو...... میں نے واقعی عالیہ کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچا کر اسے دکھی کیا ہے۔“

زندگی میں کبھی کبھار کوئی چھوٹی سی بات ہی انسان کی پوری زندگی کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ یسریٰ کے ساتھ ہوا تھا۔ سیما کی باتوں نے یک سر اس کے پتھر دل کو اپنوں کے لیے نرم کر دیا تھا۔ وہ فیصلہ کن انداز میں اٹھی اور کچن میں جا کر جلدی سے کام نبٹانے لگی کیونکہ یہاں سے فراغت کے بعد اسے اپنے اور بچوں کے کپڑے وغیرہ بھی نکالنے تھے اور آج شام کو عالیہ اور فرحان بھائی کے گھروں میں جا کر انہیں راضی کرنا تھا اور پھر کل ان سب کے ساتھ ایئرپورٹ جا کر حسان کو اس کی زندگی کا سب سے بڑا سرپرائز بھی تو دینا تھا۔

☆☆

سالگرہ نمبر



ناولٹ

ایمل رضا

مہوا کا پیڑ

آتش دان میں آگ بھڑک رہی تھی۔ مہوا کی لکڑیاں سلگ رہی تھیں۔

سردیوں کی گھور اندھیری رات تھی۔ چاند تو اماوس ہوا ہی پڑا تھا۔ ستارے بھی جیسے شام غریباں میں ڈوب چکے تھے۔ اوپر سے 'لالی' کی حمد کرنے کی آواز ماحول میں سنسنی اور جسم میں جھرجھری اُتار رہی تھی۔ رات کا کھانا کھا کر سب بچے کچے دادی کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ اونچی چھت، موٹی دیواروں، قدآدم کھڑکیوں والے بڑے کمرے میں، جس کی سیلن زدگی نے سردی کو مزید بھڑکا دیا تھا۔ اسی لیے جاوید ماموں نے آتش دان میں لکڑیاں ڈال کر انہیں آگ لگا دی تھی اور کمرے کو بچوں کے لیے گرم کر دیا تھا، کیونکہ کل ملا کر بیس کے برابر بڑے اور چھوٹے بچے ہیٹر والے کمرے میں نہیں جا رہے تھے اور دادی کے کمرے سمیت ان کی ایک ایک چیز کو اپنی جاگیر سمجھ کر اس پر قابض ہوئے بیٹھے تھے۔

''یہ مہوا کی لکڑیاں کس نے ڈال دیں آتش دان میں......؟'' دادی بھی لاٹھی ٹیکتی کمرے میں داخل ہوئیں۔ بھاری وجود کی، ہماری گوری گوری دادی...... جو عمر رسیدگی میں بھی پر وقار دکھتی تھیں۔ کپڑے زیور میں نفیس مزاج اور لہجے میں عاجزی...... ایسی عاجزی جو بعض اوقات دُکھ سے نسبت رکھتی نظر آتی ہے۔

''آپ کو کیسے پتا چلا دادی...... کہ آتش دان میں مہوا کی لکڑیاں ہیں۔'' حیرت سے میں نے دادی سے پوچھا۔ دادی مدھم سا ہنس دیں۔

''بالوں کی چاندی، سونے سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے میری جان...... یہ کسی رقم سے نہیں بلکہ تجربے سے آتی ہے۔ مہوا کی لکڑیوں کا دھواں بڑا کسیلا ہوتا ہے، کیونکہ مہوا کی لکڑی جلتی کم اور سلگتی زیادہ ہے۔ دیکھو سارا کمرہ کسیلا ہو رہا ہے۔''

''ایسا کیوں ہوتا ہے دادی......؟''

''ذات ذات کے ظرف کی بات ہوتی ہے بیٹا...... بعض سوکھے پتے بھی ایسی خوشبو دیتے ہیں

کہ کیا عطر میں سے آتی ہوگی اور بعض ہری بھری شاخ بھی چھولوتو لاکھ ہاتھ دھولو ہاتھوں سے بدبو نہیں جاتی...... ہاں مہوا جب زندہ ہو تو بڑے کام کی چیز ہوتا ہے۔ اس پیڑ میں خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اس کی ایک ایک چیز استعمال ہو جاتی ہے۔ پتے، پھول، بیج، ہر ایک چیز...... اس کے پتوں کی کھاد بن جاتی ہے۔ پھولوں کی دوائی اور بیج کا مشروب...... باقی صرف ٹہنیاں بچتی ہیں۔ وہ کسی کام میں نہیں آتیں۔ نہ اُن سے لاٹھی بن سکے نہ کاٹھی...... بھسم بھی تو ڈھنگ سے نہیں ہو پاتیں، جلاؤ تو کڑوی بسائند دیتی ہیں۔ اسی لیے اسے لاوارثوں کی طرح زمین پر ہی پڑا رہنے دیتے ہیں۔ جیسے کوئی مرجائے تو اس کی ہڈیوں کا کچھ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بس یہ ہی کہ انہیں زمین میں مٹی ہو جانے دیا جائے۔ تو مہوا کی ٹہنیوں کے ساتھ بھی یہ ہی کیا جاتا ہے کہ یہ مٹی میں مل کر اس کی زرخیزی کو بڑھا دیں۔"

"یعنی مہوا کی ٹہنیاں اس کی ہڈیاں ہو گئیں۔"

"ہاں بیٹا...... یہ بھی ٹھیک ہے۔ جس چیز کا کوئی وارث نہ ہو وہ مٹی ہی تو ہوتی ہے، چاہے مٹی میں مل کر ہو یا مٹی سے اوپر پڑے رہ کر...... لیکن مہوا کے ساتھ یہ ناانصافی ہوتی ہے کہ جیتے جی اس کا فائدہ لینے والے مرنے کے بعد اسے ناکارہ خیال کرنے لگتے ہیں۔ دنیا کا تو دستور ہے کہ یہ مرے ہوؤں سے بھی کام لینا چاہتے ہیں۔ ایسے میں مہوا بے چارہ تو مفت میں بدنام ہو گیا ناں...... اس لڑکی کی کہانی نہیں یاد جو چاندنی راتوں میں مہوا کا پیڑ بن جایا کرتی تھی۔"

"نہیں دادی...... ہم نے تو ایسی کوئی بھی کہانی نہیں سنی......"

"تھی بیٹا ایک کہانی...... میں نے سنائی بھی تم سب کو بچپن میں...... اب تم سب بڑے ہو گئے ہو، میری کہانیاں کہاں یاد رہی ہوں گی تمہیں......"

"اچھا تو پھر سنا دو ناں دادی......" سب بڑے اور چھوٹے بچے مل کر کہانی کہانی کا شور ڈالنے لگے۔ دادی نے گہرا سانس لیا اور پھر مسکراتے ہوئے اپنے جہیز کی پرانی رضائی پر ہوئی کشمیری بنت کی پیچیدہ کڑھائی پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ شاید یہ ان کی ماں کے ہاتھوں کی کڑھائی تھی، کیونکہ ایک ایک ٹانکے پر ان کے ہاتھوں کی لرزش بڑھ رہی تھی۔ ہم سب خوش ہو گئے۔ یہ دادی کے بولنے کا تمہیدی فعل تھا۔

☆☆☆

حویلی میں آج ویسے بہت رونق تھی۔ یہ رونق کبھی کبھار ہی ہوا کرتی تھی۔ جب ہم سب کزن اور ہمارے والدین دادا، دادی کی گاؤں والی حویلی میں اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ اور ایسا سالوں بعد ہوا کرتا تھا، کیونکہ آدھا خاندان شہروں میں آباد تھا اور آدھا ملک سے باہر...... کبھی عید وغیرہ پر ہی سب سے سامنا ہوا کرتا تھا۔

اب کی یہ دھما چوکڑی دادا ابو کی دوسری شادی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ یہ ساری رونق دادا ابو کے خودسر اقدام نے پیدا کر رکھی تھی۔

دادا ابو نے دوسری شادی کر لی۔ یہ بات وا وڑولے (جھکڑ) کی طرح چکر کاٹتی ہوئی پورے خاندان کو ایک مقام پر لے آئی تھی۔ لاہور، کراچی، لندن، سعودی عرب...... سب تایا، چچا، ماموں، خالہ اکٹھے ہو گئے تھے۔ جو دادی کے سگے تھے وہ بھی، جو سوتیلے تھے وہ بھی...... وہ سب، اُن کے شوہر، اُن کی بیویاں، اُن کے بچے...... اور آگے سے اُن بچوں کے بھی بچے......

دادا ابو کی دوسری شادی پر عدالت بٹھانے کا تو شاید صرف بہانہ تھا۔ حقیقت میں کچھ کو گاؤں گھومنا تھا۔ کچھ کو ایک دوجے سے ملنا تھا۔ سب کے بچے بڑے ہو رہے تھے۔ سب اُن کی شادیوں کی فکروں میں تھے۔ آپس میں مل کر نئی رشتے داریاں استوار کرنی تھیں۔ کچھ کو پاکستان آئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ کچھ کو سستی خریداری کرنی تھی۔ بے چاری دادی کی لاٹھی کا تو سب نے سہارا ہی لیا تھا۔

پھر کچھ جب یہاں آ کر سب نے دادی کا رویہ دیکھا تو گویا گرم ریت پر منوں پانی پڑ گیا۔ دادا ابو سے باز پرس کرنے کا اصل مقصد کہیں زمین میں ہی گڑھ گیا، اور پورے گھر پر گویا شادی کا سا سماں بندھ گیا۔ رونق میلہ اس طرح لگ گیا جیسے کسی کی رخصتی ہونے والی ہو یا ایک ساتھ بہت سی دلہنیں اس گھر میں آنے والی ہوں۔

ویسے دادا ابو کی دوسری بیوی بے حد خوب صورت تھیں اور کم عمر بھی...... دادا ابو سے آدھی عمر کی ہوں گی اور اسی باعث شوخی اور چنچل پن اُن کی ذات میں ٹھہراؤ کیے ہوئے تھا۔ سرخ و سفید جلد پر آنکھوں کے دونوں کناروں پر جوان گوری میم نے سرمے کے تین تین نقطے ڈال رکھے تھے اس میں وہ اور بھی غضب ڈھا رہی تھیں۔ ہم سب کے آنے پر انہوں نے ہماری ایسے خاطر مدارت کی تھی اور ایسے مزے مزے کے کھانے بنائے تھے کہ لگتا تھا کہ جیسے وہ مہینوں سے یہ سب کرنے کی تیاری کر رہی ہوں۔ اسی لیے کچھ نے اُن کی خاطر مدارت کے آگے ہتھیار ڈال دیے، کچھ اُن کی خوب صورتی کے ہاتھوں پسپا ہوئے اور کچھ پر ان کی خوش اخلاقی وار کر گئی۔ پھر دادی کا یہ کہنا کہ......

''بھئی کر لی شادی تو کر لی...... مجھ سے پوچھ کر کی ہے۔ جب مجھے کوئی اعتراض نہیں تو تم کون ہوتے ہو میرے شوہر سے باز پرس کرنے والے......''

دادی کی اس بات نے سب کو چپ کروا دیا، اور میں وہاں بیٹھا نئی کم عمر دادی کی آنکھوں کے دونوں طرف سرمے کے تین تین نقطے کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ دادا ابو پر یہ نقطے ہی کاری وار کر گئے ہوں گے۔ تب ہی تو اس عمر میں انہوں نے ایسا باغیانہ کام کرنے کی ٹھانی ہوگی۔

میرے اُستاد کہا کرتے تھے کہ بعض اوقات کسی ہونے والے واقعے کی صورت حال گھر میں پہلے سے ہی بندھ جاتی ہے۔ اس وقت بھی شاید ایسا ہی کچھ ہو رہا تھا۔ آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ مہوا کی لکڑیاں سلگ رہی تھیں۔ کسی نے ان کی بساند کو محسوس ہی تو نہ کیا...... سوائے دادی کے......

''اچھا...... تو سنو...... وہ ایک ننھی سی بچی تھی۔ بالکل تم جیسی ہی...... گول مٹول، پیاری سی...... مانو جیسے چاند کی مٹی سے بنی ہو، لیکن پتا نہیں اس چاند کی مورت کے نصیب کیسے گہنا گئے۔ نجانے کون سا سیارہ اس کی تقدیر کی روشنی میں حائل ہوا کہ اس کی پیدائش کے اگلے ہی پل اس کی ماں اس دنیا سے چلی گئی۔ یوں زمانے نے اس کے نام کے ساتھ ایک اور نام جوڑ دیا۔ جنم جلی کا...... لیکن اس نام کو اس نے بہت بعد میں سنا...... تب وہ بچی تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ زمانے کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔ وہ عرش سے جنم پتری کھینچ لاتے ہیں۔ آنکھیں اس سے بھی تیز، جو آنے والے سالوں کو بھی دیکھ لیتی ہیں، اور ناک سب سے تیز...... جو جلی کی بو سونگھ لیتی ہے۔ خیر اس بچی میں ایک خاص بات بھی تھی۔ جب جب چاند کی چودہ تاریخ ہوتی تھی وہ مہوا کا پیڑ بن جاتی تھی۔''

''مہوا کا پیڑ......؟''

''ہاں...... بیٹا مہوا کا پیڑ...... اس بچی کے بعد سے ہی تو لوگ لڑکی کی ذات کو مہوا کے پیڑ سے جوڑتے آئے ہیں۔''

''لیکن مہوا کا پیڑ ہی کیوں دادی......؟''

''بتایا تو ہے بیٹا کہ مہوا کے پیڑ کی خاصیت ہوتی ہے کہ اس کی ہر چیز کارآمد ہوتی ہے۔ پھول، پتے، بیج...... یہ درجہ ہر پیڑ کو نصیب نہیں...... اور وہ لڑکی دنیاوی نصیبوں کی جلی، قدرتی درجوں سے مالا مال تھی۔ تو ہوتا یہ کہ جب جب چاند کی چودہ تاریخ ہوتی...... وہ لڑکی مہوا کا پیڑ بن جاتی اور چار سو اپنے پھولوں، پتوں اور بیجوں کی خوشبو پھیلاتی...... جس کی مہک اردگرد کے چالیس گاؤں تک جاتی...... شاید ہر درخت کا یہ ہی مقصد ہوتا ہے کہ وہ چار سو اپنی خوشبو پھیلائے۔ لوگوں کو اپنے پھل دے، اپنے پھول، پتے، جسم...... اور جیون دان کرنے کا فرض پورا

کرے۔ یہ تو زمانے کی ہوا ہے جو کسی بکائن میں کڑواہٹ بھر دیتی ہے اور کسی سنبل میں خوشبو...... مہوا میں خوبیاں اور سفیدے میں غرور، املتاس میں کوکھ کی گرمائش اور جامن میں کمزوری......"

"پھر کیا ہوا دادی......؟" دادی بہتی بہتی کہیں دُور جا پہنچی تھیں جب ہم بچے انہیں واپس لائے۔

"ہاں تو وہ لڑکی مہوا کا درخت بن جاتی تھی اور اس بات پر بہت اِتراتی تھی۔ بے چاری نہیں جانتی تھی کہ اتراہٹ کا سمے اوس کے مسے کی طرح کا لمحاتی ہوتا ہے۔ بدقسمتی کا سورج طلوع ہو تو اسے فنا ہونا پڑتا ہے۔ اس کا باپ اسے ماں اور باپ دونوں بن کر پال رہا تھا۔ بچی جیسے یہ بات جانتی تھی۔ وہ باپ پر زیادہ بوجھ نہ بنتی...... کھاٹ کی کھاٹ لگی وہ پسر پسر کرتی رہتی۔ روتی بھی تو لگتا جیسے ہنس رہی ہو...... نہ کوئی مطالبہ نہ طلب...... چاند کی چادھویں کو جو وہ مہوا بنتی تھی وہ مہک سارا مہینہ اُس کے گھر میں رہتی...... پھر ایک دن اس کی پرورش سے تنگ آکر اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی۔"

"جیسے اب دادا ابو نے کر لی ہے۔؟"

"نہیں بیٹا...... اس کے باپ کی مجبوری تھی۔ وہ مرد ذات ننھی سی بچی کو نہیں سنبھال سکتا تھا۔"

"پھر وہ سوتیلی ماں اس پر ظلم کرتی ہوگی۔"

"نہیں بیٹا۔ وہ بہت اچھی تھی۔ خدیجہ نام تھا اُس کا...... دھان پان سی عورت، مانو جیسے شہتوت کی ٹہنی ہو...... لچکیلی، کمزور اور رنگ کی گہری......"

"کیا وہ بھی آنکھوں کے کنارے سرمے کے تین نقطے ڈالا کرتی تھی دادی......؟" میں نے دادی کو تنگ کرنے کو کہا۔

"نہیں بیٹا...... اُسے تو جیسے ان سب چیزوں سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ ہار سنگار کیا ہوتا ہے وہ اس سے نابلد تھی۔ بہت ہوتا تو کبھی کبھی تیل لگا کر بالوں کی چٹیا بنا لیا کرتی تھی یا ناک میں بڑے سفید نگ کا لونگ ڈالا کرتی تھی...... اور وہ اس سادہ سے تردد کے ساتھ بہت سوں سے سندر دِکھا کرتی تھی۔

خدیجہ کو اپنی شادی کی پہلی رات کی گود بھرائی پر کوئی رنج نہ تھا۔ وہ حالات کے دھارے میں صبر وشکر کی ناؤ میں بیٹھی، روانی سے بہنے والی عورت تھی۔ لڑکی ایمن کا وہ دل سے خیال رکھا کرتی تھی۔ اُس کو صبح وشام چوریاں بنا کر دیتی، اس کو نہلاتی، کھلاتی، روز روز نئے کپڑے پہناتی، سر پر تیل کی مالش کرتی، چٹیا بناتی...... اس کے بس میں نہیں تھا، ورنہ وہ اپنی چھاتیوں کا دودھ بھی اسے پلا دیتی، اور اس سوتیلی کو سگی کر لیتی...... ایمن کو کبھی احساس ہی نہیں ہو سکا کہ اس کی سگی ماں مر چکی ہے اور اس کی پرورش کوئی اور عورت کر رہی ہے۔ جس سے اس کے باپ کا رشتہ تو ہے لیکن اس کا کوئی سمبندھ نہیں ہے۔

ویسے ایمن کا باپ بڑا دورویہ آدمی تھا۔ جیسے ٹھنڈے پانیوں میں کوئی گرم دریا آ ملا ہو...... ایک سال ساتھ دینے والی بیوی کے مرنے کے بعد اس کے ہر عمل میں تضاد کا غلبہ رہا...... وہ برائی کرتا تو لگتا اس سے برا کوئی نہیں...... نیکی کرتا تو لگتا جنم جنم کا فرشتہ ہے۔ ایمن کو اپنے باپ کے کسی عمل پر کبھی یقین نہ آیا۔ دراصل باپ ایک مسلسل فریب تھا، اور اس کا فریب دوسروں سے زیادہ خود اپنے ساتھ تھا۔ وہ الش خور تو نہ تھا لیکن پتوں میں ہیر پھیر کر کے بازی جیت جانے کو برا نہ سمجھتا تھا۔

سالوں گزرے...... خدیجہ کے پے در پے تین لڑکیاں اور بھی ہوئیں، لیکن ایمن سے اس کے پیار میں کوئی کمی نہ آئی...... وہ اسے ایسے ہی چاہتی رہی جیسے وہ اس کی پہلوٹی کی اولاد ہو...... مہوا کا پیڑ خوب پھل پھول رہا تھا۔ اس کا قد بڑھ رہا تھا اور جثہ بھی...... چاند کی چودھویں کو پورا گاؤں اُس کی خوشبو سے مہک اُٹھتا...... لیکن بعض اوقات ہوتا ہے ناں کہ خوشبو زیادہ ہو جائے تو اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے یا پھر وہ خوشبو ہی بدبو کی طرح ناگوار گزرنے لگتی ہے۔

☆☆☆

وہ برسات کی پہلی بارش کا دن تھا۔ دھرتی خوب تپنے کے بعد پہلی بارش میں ٹھنڈی ہوئی پڑی

تھی۔ در و دیوار بھی گیلے گیلے ہوا کو نم کر رہے تھے۔ خدیجہ رسوئی میں بیٹھی لالٹین کی کم پڑتی روشنی میں مکئی کی روٹی بنا رہی تھی۔ پاس ہی ایمن بھی بیٹھی سل پر پودینے کی چٹنی پیس رہی تھی۔ تینوں چھوٹی لڑکیاں اندر کھیلتے ہوئے روٹی روٹی کی صدا میں لگا رہی تھیں۔ بڑا سہانا دن تھا۔ ایمن محبت سے ماں کو دیکھنے لگی، جو روٹی، گھی اور تیل والے چولہے کی آگ سے برابر جوجھ رہی تھی اور اس کے ماتھے پر ایک شکن تک نہ تھی۔ اس کا رنگ روپ گھر کی خدمت نے کب کا چھین لیا تھا اور اسے جیسے اس بات کا کوئی ملال نہیں تھا۔ اس کی ذات میں کوئی رنج نہ تھا۔

لیکن نجانے کیا بات ہوئی کہ اس سہانے دن کا وہ لمحہ بدنظری ہو گیا۔ جیسے اس دن کو خود ایمن کی ہی نظر لگ گئی۔ محبت کی ہریالی برہا کی تانی بن گئی۔ نجانے کہاں کوتاہی رہ گئی کہ بیسن کی روٹی جل کر کڑوا دھواں دینے لگی اور چٹنی پیستی ایمن کی انگلیاں سل پر رگڑ کھا گئیں۔

باہری دروازہ دھڑام سے کھلا...... اور گھر کا واحد کفیل ''باپ'' گھر میں ایسے داخل ہوا جیسے اسے باہر سے کسی نے دھکا دیا ہو۔ ایمن اور خدیجہ جلدی سے اُٹھ کر باہر کو لپکیں۔ کِلی (کھونٹی) سے لالٹین اُتار کر خدیجہ دروازے تک آئی۔

''کیا ہوا......؟'' وہ اپنے خصم کی طرف بڑھی۔

خصم نے کوئی جواب نہ دیا، ڈگمگاتی چال چلتا ہوا وہ صحن میں بچھی چارپائی تک آیا اور اس پر پڑ کر بے سدھ ہو گیا۔

''ایمن تو اندر جا......'' خدیجہ نے ایمن سے کہا۔ ایمن پیچھے کو تو ہوئی لیکن اندر نہ گئی۔ ماں اپنے خصم کے کان میں گھس گئی۔

''کیا بے غیرتی کرتے ہو ایمن کے ابا...... گھر میں جوان ہوتی بچیاں ہیں اور تم شراب پی کر آ رہے ہو۔''

نجانے ماں کی اس سادہ سی بات میں ایسا کیا

اس کے علاوہ دیس بدیس کی رومینس، سسپنس اور تجسس سے بھرپور مشہور و معروف مصنفین کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

تھا کہ بے سدھ پڑا باپ اسپرنگ لگے کھلونے کی طرح چاق و چوبند سا اُٹھ کھڑا ہوا۔

"بے غیرتی......؟ مجھے بے غیرتی کا درس دیتی ہے۔ تجھ سے بڑھ کر کون بے غیرت ہوگا خدیجہ...... گھر کیا آئی ہے ایسے جیسے بچی کے لیے ہی آئی ہے......؟" باپ کے لہجے میں سالوں کے شکوے در آئے۔ ماں حیران سب سنتی رہی۔

"تیری ہی تو بچی ہے۔ اس کی خوشی تیری خوشی ہی تو ہے۔"

"بدبخت...... میری خوشی پھر کس کی خوشی ہے؟ بول...... ایسے لگتا ہے بیوی نہیں اپنی ماں کو بیاہ لایا ہوں۔"

"تو پھر کیوں کہا تھا پہلی رات کہ اسے ماں کی طرح پیار کرنا۔"

"یہ بھی کہا تھا کہ میری بھی فکر کرنا۔"

باپ اپنی کہہ کر چپ چاپ کمرے میں چلا گیا۔ رسوئی میں جلتے چولہے پر دھرے توے پر پڑی مسی روٹی جل جل کر کالی ہوگئی۔ اندر کمرے میں تینوں چھوٹی لڑکیاں سہمی ہوئی بیٹھی تھیں اور دروازے کے پیچھے چھپی ایمن ڈری ڈری سی خدیجہ کو دیکھ رہی تھی۔ جو صحن میں کھڑی اتنی بے یارو مددگار لگ رہی تھی جیسے کوئی قافلے والے کسی بیمار بڑھیا کو کسی سازش کے تحت لق و دق صحرا میں سوتے میں اکیلا چھوڑ گئے ہوں۔

برسات کی دوسری بارش کی رم جھم شروع ہو چکی تھی اور خدیجہ نمک کی ڈلی کی طرح پگھل رہی تھی۔ اُسے اب اندازہ ہوا تھا کہ وہ تو سالوں سے کوئی جرم کرتی آ رہی ہے۔ ایمن کی پرورش سے خدیجہ جو باپ کے دل میں محبت جگانا چاہتی تھی۔ وہ تو اُلٹا غصہ، نفرت اور بیگانگی بھر چکی تھی۔

اگلے دن خدیجہ نہائی، دھوئی، چندن کھل سے خوب رگڑ رگڑ جسم صاف کیا اور نئے کپڑے پہن، خوشبو لگا کر باپ کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ چاروں لڑکیوں کو اس نے مرغ پلاؤ کھلا کر جلدی ہی سلا دیا تھا۔ صرف ایک ایمن ہی تھی جو چار خانے کے کھیس میں منہ چھپائے جاگ رہی تھی۔ ماں کا کھیل کیا رنگ لانے والا تھا وہ دیکھنے کے لیے بے چین تھی۔

رات گہری ہوئی تو باپ کل ہی کی طرح ڈگمگاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ خدیجہ نے دروازہ کھولا اور آدھی جھوٹی، آدھی سچی مسکراہٹ چہرے پر جما کر اس کا استقبال کیا۔ خدیجہ کا بدلہ ہوا روپ دیکھ کر ایک لمحے میں باپ کے سارے نشے نے کھٹا اچار چاٹ لیا۔ خدیجہ نجانے کتنے لمحے منتظر رہی کہ وہ کچھ بولے، اس کی تعریف کرے، یا کچھ بھی...... اور ذرا چھوتی باپ بولا بھی تو بس اتنا......

"اب کیا فائدہ بھلا اس سب کا خدیجہ...... مجھے تو گناہ گار کر دیا ناں...... اب کیا فائدہ بھلا اس سب کا......"

اس دن کے بعد سے ماں جیسے جنت میں سے نکال دی گئی۔ اسے کسی پل چین نہ رہا۔ ماں کے لیے باپ تجوری کا وہ خزانہ ثابت ہو رہا تھا جس کی چابی وہ گم کر بیٹھی تھی اور اب تجوری کسی چابیوں کے ماہر سے بھی نہیں کھل رہی تھی۔ یہ زنگ کھائی تجوری کھولنے کے لیے خدیجہ نے بڑے جتن کیے۔ اپنی سادگی میں وہ بے چاری جتنا کر سکتی تھی اتنا اس نے کیا۔ اپنی کم علمی میں گم وہ محبت پانے کا شاید بس ایک ہی نسخہ جانتی تھی اور وہ تھا "خدمت" جو اس نے کی...... وہ اپنے شوہر کی سیوا ایسے کرنے لگی جیسے دونوں کی شادی ہفتہ پہلے ہی ہوئی ہو...... باپ کے کپڑے اچھے سے دھوتی، کلف لگا کر استری کرتی، اُس کے جوتوں پر گرد نہ رہنے دیتی، اس کے حقے کو ایسے مانجھتی جیسے کلی کرنے بیٹھی ہو...... اور اس سب نے اسے ہلکان کر دیا، تھکا دیا۔ ماں ایک شوہر پرست عورت بن گئی۔ لیکن اس کی ساری "پرستی" شوہر کی خدمت اور عزت پر ختم ہو جاتی تھی۔ جہاں اُلفت، وارفتگی، لبھانے کی بات آتی وہاں اس کی ساری چنگاریاں بجھی ہوئی تھیں۔

پھر کچھ افواہیں گردش کرنے لگیں۔ جنہوں نے خدیجہ کی رہی سہی ہمت بھی چھین لی۔ اس گاؤدی نے اس کا بھی حل نکالا تو عجب ہی انداز میں...... جو راجپوتی باپ کی شان میں ناقابل معافی گستاخی کر گیا۔

اپنی کسی سہیلی سے کہہ کر اس نے بہت دُور سے پازیبوں کی ایک ایسی جوڑی منگوائی تھی، جس کے جوڑ جوڑ پر بہت سے گھنگھرو لگے ہوئے تھے، اور ایک تلے دار کھسہ...... اپنے ایک پرانے سوٹ کو وہ سارا دن سلائی مشین پر بیٹھ کر نجانے کہاں کہاں سے ٹھیک کرتی رہی تھی۔ ایمن سب دیکھ رہی تھی، ماں کا یہ نیا کھیل رات میں نجانے کیسا رنگ لانے والا تھا۔ چوکھا...... یا شاید چھٹا ہوا۔

رات میں باپ کے آگے دسترخوان بچھاتے ہوئے، کھانا رکھتے ہوئے اور ہاتھ دھلواتے ہوئے سارا صحن خدیجہ کی پازیبوں میں لگے گھنگھروؤں کی جھنجھناہٹ سے بھرا ہوا تھا۔ چوڑی دار پاجامے میں اس کی بوڑھی پنڈلیاں نمایاں تھیں۔ اس کی کمر پرانے لباس کی نئی تراش کی وجہ سے تنگ ہوئی بہت سندر دکھتی تھی۔ اور اس کے ہونٹوں پر شہر سے منگوائی ہوئی لپ اسٹک خوب بھڑکی ہوئی دکھ رہی تھی۔ باپ چپ چاپ سب دیکھ رہا تھا۔ اس کی چپ والی خاموشی دروازے کے پیچھے چھپی ایمن کو ڈرا رہی تھی۔

”کھیر بھی بنائی ہے، وہ بھی لاؤں۔؟“ خدیجہ نے مسکرا کر پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بنا رسوئی سے جا کر کھیر کا پیالہ بھر لائی۔ باپ چند لمحے بھرے ہوئے پیالے اور لبالب ہوئی خدیجہ کو دیکھتا رہا پھر اس نے اگلے ہی پل پیالہ خدیجہ کے منہ پر اُلٹ دیا اور دونوں ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی۔ شیر کی مانند غصے سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

”سالی کتی عورت...... اُس کی نقل کرتی ہے۔ زینب کی نقل کرتی ہے۔ شکل دیکھی ہے تو نے اپنی...... اس کی نقل کرنے چلی ہے۔“ اور کہتے ہوئے باپ نے ماں کو دیوار پر پٹخ دیا۔

زینب، نمبردار کی لڑکی تھی۔ دُور دُور کے علاقوں تک اُس کے چوڑے دار پاجاموں، پازیبوں اور پتلی کمر کی دھوم تھی۔ وہ کہنے کو اک تارا تھی، لیکن اس میں تین خاردار تاریں نصب تھیں۔ پہلی اپنے گم شدہ محبوب کی، دوسری اپنے حسن کی، اور تیسری اپنی اونچائی کی......

خدا جانے ایمن کے باپ نے زینب کے ساتھ کتنے آسمانوں کا سفر کیا، کتنے دریا پار کیے، کتنی ندیوں میں غوطے لگائے، اور کتنے سمندروں پر جزیرے بنائے...... کیا وہ اُس کے ساتھ واقعی اتنی دُور چلا گیا تھا کہ اب اس کی واپس ممکن نہیں تھی۔؟

خدیجہ کی ساری کوششیں بے کار ثابت ہو رہی تھیں۔ اس بے چاری نے تو ایک ہی کام ساری زندگی بڑی ایمان داری سے کیا تھا۔ قسمت پر بھروسا اور خدا پر یقین...... اور اب باپ کے کارنامے اس سے اس کے دونوں عقیدے چھیننے لگے تھے۔ وہ نہ تو 'پدماوتی' تھی اور نہ ہی 'ستی ساوتری'...... جو زینب سے اپنا شوہر واپس چھین لاتی...... وہ تو 'میرا' تھی۔ جس کا ہر بھجن اُداس تھا۔

سنا تھا کہ بہت پہلے اس کا محبوب سرحد پر شہید ہوا ہے اور یہ بات زینب ساری زندگی ماننے سے انکاری رہی...... رات کے اندھیرے میں زینب کو باپ میں شاید اپنا کھویا ہوا محبوب نظر آتا تھا، اور دن کی روشنی میں وہ اسے اپنے محبوب ہونے کا درجہ دینے سے کتراتی تھی۔ اُس اک تارے کی تینوں تاریں باپ کو تاعمر اپنانے میں ہچکچانے لگتی تھیں۔

ساری زندگی وہ باپ کے ساتھ لک چھپ دانہ کھیلتی رہی اور خود راجے کہ بیٹی بنی باپ کی دسترس سے دُور رہی...... یہی وجہ تھی کہ خدیجہ جب اس کے گھر باپ کا رشتہ لے کر گئی تو اس نے منہ پھاڑ صاف صاف انکار کر دیا تھا۔

اس دن ماں کو باپ نے اپنی موٹی سول والی چپل سے مارا تھا۔

''کیا کرنے گئی تھی وہاں ...... بول کیا کرنے گئی تھی وہاں ......'' وہ مارتا جاتا اور پوچھتا جاتا۔
''فیصلہ کرنے گئی تھی کہ میرا نہیں تو اس کا ہی ہو جا......''

ماں رو رو کر وجہ بیان کرتی رہی اور باپ اسے مارتا رہا۔

اس دن ماں کی مار کا ڈر کھل گیا۔

پھر زینب کی بے رخی کے بعد باپ کی شراب مزید بڑھ گئی۔ پتا نہیں یہ شادی کے بعد والی محبوبائیں جاپانی تلوار کی طرح کیوں ہوتی ہیں۔ کیوں ان کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر رکھنا پڑتا ہے۔ جہاں بھول چوک ہوئی ...... وہاں تلوار ہاتھ سے نکل گئی۔

ماں نے باپ کو سنبھالنے کی بہت کوششیں کیں، لیکن اُس کے منہ کو اب شراب لگ چکی تھی۔ جس کا علاج گاؤں کے حکیم کے پاس بھی نہیں تھا۔ وہ شراب کو آبِ کوثر کی طرح پیتا۔ نہ تھکتا نہ بھرتا، اور گھر واپسی پر ماں کو مارتا۔ دونوں کی کوئی لڑائی آخری اور حتمی لڑائی ثابت نہ ہوتی ...... ہر لڑائی کے آخر میں ''باقی آئندہ'' لکھا ہوتا۔ ماں روتی پیٹتی مار کھاتی رہتی۔ پھر اسی مار سے جب چمڑی ادھڑی تو اندر سے ایک نئی خدیجہ برآمد ہوئی۔ جو اعتبار کی ڈسی ہوئی بد فعال سی عورت تھی۔ شوہر کی مار کا بدلہ خدیجہ، ایمن سے لینے لگی۔

''کتی ...... کتے باپ کی اولاد ...... جنم جلی ...... پیدا ہوتے ہی ماں کو کھا جانے والی ...... اتنی خدمت کے بعد تیرا باپ میرا نہیں بن سکا تو تو کیا بنے گی ......'' ماں اسی طرح ایمن کو مارتی جاتی جس طرح رات کو باپ اسے مار رہا ہوتا۔ خوب مار چک لینے کے بعد وہ اسے گلے سے لگالیتی اور پھر جی بھر کر رونے لگتی۔

یہ تماشا روز کا معمول بن گیا۔

سارا گھرانہ سورۃ منافقون پر چلنے لگا۔ سب کے دلوں میں کھوٹ آگئی۔ سب کی دلجوئیوں میں طنز شامل ہوگئے۔ ایمن کو اس نئی ماں سے کوئی شکایت نہ تھی۔ اس نے اسے کم وقت میں اتنا پیار دیا تھا کہ اب اگر وہ اس کے باپ کی مار کا بدلہ اس کے جسم سے لے کر تسلی چاہتی تھی تو بھی ایمن اُف نہ کرتی ...... لیکن اسے اس بات کا غم تھا کہ اس نوچ کھسوٹ میں مہوا کے پیڑ کے سارے پتے نوچے جا رہے تھے۔ پیڑ گنجا ہو رہا تھا۔ بنا خزاں کے موسم کے ہی وہ اپنے خوش رنگ پتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خالی ہو گیا۔ دوبارہ پھر کبھی نہ ہرا بھرا ہونے کے لیے ......

وقت چیل کے پروں کی سی تیزی اور تتلی کی مختصر عمر لکھوا کر گزرتا چلا گیا۔ زندگی کا جو راستہ طے تھا وہ اسی پر گامزن رہی ...... نہ گھاٹی آئی، نہ چڑھائی ہی نصیب ہو سکی۔

☆☆☆

ماں کی بڑی اصل پہلوٹی کی بیٹی ارم کا کہیں رشتہ طے ہوا تھا۔ ڈھولک بجتی، دیسی بدیسی گانے گائی، پاؤں پر ٹخنوں اور ہاتھوں پر کلائیوں تک مہندی لگائے ارم کو ایک شادی میں کسی عورت نے پسند کرلیا اور وہاں ہی ہاتھ پر پیسے رکھ دیے ...... خدیجہ خوش اور مطمئن تھی۔ لوگ ٹھیک ٹھاک تھے۔ زمیندار گھرانہ تھا۔ تین طرح کے پھلوں کے باغ تھے ان کے ...... اپنے علاقے میں سب سے اونچی حویلی تھی ان کی ...... لڑکا پڑھا لکھا، فوج میں بھرتی تھا۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ مغل خاندان کی شان دائیں بائیں کے بہت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ سب کہتے تھے کہ ارم کا تو نصیب جاگ گیا۔ پر ماں کہتی تھی کہ جب تک ایمن کا رشتہ نہ دیکھ لے گی چھوٹی کی شادی نہ کرے گی۔

ارم نے اپنے ہونے والے دولہے کو دیکھا تو نہ تھا، پر جو ایک پرانی تصویر ہونے والی ساس دے گئی تھی اسے ہی دیکھ دیکھ اور آنے والے وقت کو سوچ سوچ کر وہ مسکراتی رہتی تھی۔ بوڑھی ساس آتی تو اس کی دل و جان سے خدمت کرتی ...... اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے کھانے بنا بنا کر پروستی ...... ساس کو چھوٹی اتنی بھا گئی کہ ایک دن تو ضد پر ہی اڑ گئی کہ

شادی کی تاریخ لے کر ہی ٹلوں گی۔ ماں نے بہتیرا سمجھایا کہ پہلے مجھے ایمن کی شادی کرنی ہے، اور اپنے لڑکے کو تو بلا لو...... ابھی تک اسے تو روبرو دیکھا نہیں...... لیکن ساس شادی کی تاریخ لینے پر بضد...... باپ کے آگے جا کر اپنی جھولی پھیلا دی کہ میری سونی حویلی کی رونق بحال کر دو...... مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ...... چاروناچار باپ نے بھی رضامندی دے دی۔ چھوٹی کی تاریخ رکھ دی گئی۔

سارا مہینہ تیاری میں گزرا...... چھوٹی، ایمن سے باتیں کرتی جاتی اور زندگی کے سپنے سجائے جاتی، اپنے گہنے لتے کو بار بار دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہتی۔ ساس پہلے سے ہی اتنے زیور دے گئی تھی کہ ارم انہیں دیکھ دیکھ کر پاگل ہو رہی تھی، اور ان دنوں کا شدت سے انتظار کرنے لگی تھی جب وہ یہ سب پہن کر اپنے فوجی شوہر کو دکھائے گی۔

پھر ایک دن انتظار ختم ہوا، بارات گھر کی دہلیز تک آ پہنچی......اور بارات کے ساتھ بہت سی افواہیں بھی پہنچیں......

فوجی دولہا ویسا نہیں تھا جیسا چھوٹی کو مطلوب تھا۔ وہ ساس کی دکھائی پرانی تصویر سے بھی بہت پرانا تھا۔ خبر ملی کہ اس کے چار چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور بیوی مر گئی ہے۔ بوڑھی ساس نے ماں کے آگے ہاتھ جوڑ دیے کہ جس مرضی کی قسم لے لو...... اسے نہیں پتا تھا کہ فوج میں رہتے ہوئے اس کا بیٹا اتنا قابل ہو گیا ہے کہ بیاہ بھی رچا چکا ہے۔ کہتا تو تھا کہ اپنی مرضی سے شادی کروں گا۔ کر بھی لی اندازہ نہ تھا۔

"مجھے خود دو روز پہلے بتایا ہے اس نے...... لیکن ہاتھ جوڑتی ہوں یہ بارات واپس نہ لوٹانا...... میں سارا گھر بار ابھی کے ابھی اپنی بہو کے نام لگانے کو تیار ہوں۔"

ساس کی منت کے آگے ہار مانتے ہوئے ماں نے چھوٹی کو سمجھانا چاہا، لیکن چھوٹی نہ مانی...... چار بچوں کے باپ کے ساتھ وہ مرن برت تو رکھ سکتی تھی، لیکن امرت نہیں پی سکتی تھی۔

"بارات واپس چلی جائے تو لڑکی والوں سے وجہ نہیں پوچھی جاتی کہ لڑکے والے کیسے تھے، کیسے نہیں اور بارات کیوں واپس بھیج دی گئی، بلکہ سب لڑکی کے کردار پر ہی انگلی اُٹھاتے ہیں۔"

باپ نے بھی سمجھایا، لیکن چھوٹی کا انکار اٹل رہا...... پھر اس نے کمرے میں جا کر خود کو بند کر لیا، اور لاکھ دروازہ کھٹکھٹانے پر بھی نہ کھولا، ایمن نے بھی ارم ارم کہہ کر چھوٹی کو بات کرنے کے لیے آمادہ کرنا چاہا، لیکن وہ اس بڈھے دولہے کے ساتھ جانے پر نہ تو کچھ بول رہی تھی اور نہ ہی شاید کچھ سننا چاہتی تھی۔

عین اسی وقت میں ماں لجائی لجائی سی ایمن کے پاس آئی۔ اس کی چال میں پریشانی کے ساتھ ساتھ شرم کی دبک تھی۔ اس کے فریادی لب نجانے کیوں خشک ہو کر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ماں نے اشارے سے سب کو باہر بھیجا......اور ایمن کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔

"ایمن......" ماں کی پکار میں کمینگی تھی۔

بارات کے خالی جانے کا دُکھ......چھوٹی کا اٹل انکار......گھر اور خاندان پر اُٹھتی انگلیاں، وہ گھبرائی ہوئی ایسی بڑھیا نظر آ رہی تھی جس کے چرخے کے ٹیڑھے تکلے نے سارے بان میں گرہیں بھر دی ہوں۔

"ایمن...... میری بچی...... ساس کہتی ہے کہ......" ماں یہاں پہنچ کر چپ ہو گئی۔ پوری بات اسے کہنے کا حوصلہ نہیں تھا تو شاید ایمن میں سننے کا بھی یارا نہ تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ سوتیلی ماں کے سگے پیار کے خراج ادا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ کسی اور کے پالنے میں جھولنے کی محصول تھی۔ جسے اسے آج ادا کرنا تھا۔

ماں کے ساتھ باپ بھی آ لگا۔ ساس کی نئی درخواست نہ صرف اس نے سن لی تھی بلکہ اندر ہی اندر مان بھی لی تھی۔ ساری زندگی جو وہ خود کوئی فصل نہ کاٹ سکا تھا۔ کیسے جان سکتا تھا کہ نم زمین میں بیج

UUNOVELS.COM

کے پہننے کا احساس کیا ہوتا ہے۔

"ٹھیک ہے ماں...... جیسا تم چاہو......" ایمن نے جملہ پورا بھی نہ کیا تھا کہ باپ خوش خوش باہر چلا گیا اور ماں نجانے کیوں وہاں ہی بیٹھی گئی۔ چھوٹی کا کرتا پاجامہ ایمن کو پہنا دیا گیا۔ جو تنگ جوتے کی طرح اس کے سارے جسم کو کھاتا رہا...... ہاتھوں پر تازہ مہندی لگا دی گئی، نئے گہنے پہنا دیے گئے، جو ارم نے کھڑکی کے راستے کمرے سے باہر دے مارے تھے اور ان سب چیزوں میں چھپی وہ سوچنے لگی کہ اس نے چھوٹی کی چیزوں کو کیوں اتنی حسرت سے دیکھ لیا تھا کہ وہ اس کی ہی ہو گئی تھیں۔ اس نے ایسا تو نہ چاہا تھا۔

بارات کو اعتراض نہیں تھا۔ دولہے کو نہیں تھا۔ دلہن کو نہیں تھا۔ سارا کام ایسے انجام پایا جیسے جنازہ پڑھا جاتا ہے۔ مرنے والے سے لاکھ گلے شکوے ہوں، پر اس کا جنازہ تو پڑھنا ہی پڑھتا ہے ناں......

ماں جو خود ایمن کو منانے آئی تھی۔ نجانے کیوں نکاح کے لیے مولوی کے آنے سے چند لمحے پہلے بھاگتی بھاگتی ایمن کے پاس آئی۔

"ایمن...... انکار کر دے۔ میں سب سہہ لوں گی۔ مگر یہ نہیں......" ماں کے لہجے میں ٹھوس پن غائب تھا۔ وہ ایسا چاہتی تو تھی، لیکن اپنی درخواست کی منظوری کے طور پر نہیں...... اس کی یہ بات بھی ایمن کو بات مان لینے کی التجا تھی، جس میں غم ہی غم تھا۔ زندگی سے اس بے چاری کو ملا ہی کیا تھا۔ باتی کی طرح وہ لحہ بہ لحہ جلتی رہی تھی۔ دن بدن گھٹتی رہی تھی۔

"ایمن...... انکار کر دے میری بیٹی......"

لیکن ایمن تو خراج دینے کا تہیہ کر چکی تھی۔ وہ سوتیلی ماں کے سگے پیار سے سبکدوش ہو جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اب پیچھے پلٹنا مشکل تھا۔ احسان سہتے سہتے وہ تنگ آ چکی تھی۔ اب احسان کرنے کے احساس کو محسوس کرنا چاہتی تھی۔

چھوٹی روتی کرلاتی کمرے میں بند تھی۔ جو باہر تھی وہ باہر سے باہر ہی چلی گئی تھی۔

بارات رات گئے مغلوں کی اونچی حویلی میں واپس پہنچی۔ ایمن دلہن بنی گھر آئی...... ماں کا سپنا کہ پہلے اس کی شادی کروں گی۔ پورا ہو گیا تھا۔ لیکن خود اس کا سپنا ٹوٹ گیا تھا۔ پھر جب فجر کی اذانیں مل رہی تھیں تب ایمن کا دولہا اس کے کمرے میں آیا۔

"مجھے بیوی کی ضرورت نہیں ہے۔ ماں کو البتہ بہو کی تلاش تھی۔ اس لیے میں نے یہ شادی کی ہے۔ میں جسے پیار کرتا تھا ماں کو وہ پسند نہیں تھی اور جو ماں کی پسند ہے وہ میرے مزاج کی نہیں......" فوجی نے ایک ہی بات میں آنے والی ساری زندگی کا نقشہ واضح کر دیا تھا۔

اس دن چاند کی چودہ تاریخ تھی۔ جب مہوا کے پھولوں کی پنکھڑیاں اس کی شاخوں پر سے ایسے غائب ہوئیں جیسے دن طلوع ہونے پر تارے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ پیچھے بس ڈوڈیاں رہ گئیں اپنے بیجوں سمیت......

پتے پہلے ہی اُتر چکے تھے۔ اب پھولوں کی پنکھڑیاں بھی نہ رہیں تو ایمن کے اندر جیسے بہت کچھ ٹوٹ گیا۔ ماں کے پیار کا خراج دیتے دیتے اس کے پھول اس کے وجود سے خراج وصول کر رہے تھے۔

مغلانی ساس نے وعدے کے مطابق سب ایمن کے نام کر دیا تھا۔ حویلی، چار بیگھا زمین، وہ سب کچھ جو اس کا تھا، لیکن بیٹا شاید اس کا بھی نہیں تھا، اس لیے وہ اسے ایمن کو نہ دے سکی...... اس کے باوجود نافرمان بیٹے کی سادہ لوح ماں خوش تھی۔ ڈھولک پیٹنے والی "چھوٹی" نہ ملی...... وہ اس "خاموش ڈھول" پر ہی راضی ہو گئی تھی۔ اگلے روز اس نے گھر بار کی اور تجوری کی ساری چابیاں بھی ایمن کی جھولی میں ڈال دی تھیں۔

"یہ سب آج سے تیرا ہوا ایمن......"

اور ایمن جھولی میں پڑی وزنی چابیوں کو دیکھتی

رہی...... یہ اس کی پہلی گود بھرائی تھی جس کی نہ تو کوئی دردزہ تھی اور نہ ہی اسقاط کا خوف...... ان وزنی چابیوں کا بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ ایمن اپنی ساس کے آگے کبھی اُٹھ نہ سکی۔

ویسے ساس بڑی اللہ لوک عورت تھی۔ غریبوں کے کام کرتے اسے بہت سکون ملتا تھا۔ وہ ملازموں کے سارے مسئلے، الجھنوں، پریشانیوں کو جانتی تھی اورانہیں حل کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ اونچی حویلی میں ایک رونق سی لگی رہتی۔ ساس کا سارا دن مصروف گزرتا، وہ اپنے سب جاننے والوں سے ایمن کا تعارف ایسے کرواتی جیسے وہ کسی دوسری سلطنت کی شہزادی ہو...... جسے وہ اپنے بیٹے کے لیے چرا لائی ہو...... ان سارے وصفوں میں اگر وہ ذات پات کے فرق کا نظریہ فراموش کردیتی تو اس کے بیٹے کو اُس سے چھپ کر شادی نہ کرنی پڑتی...... اور ایمن کی قسمت میں شاید یہ گھرانہ نہ ہوتا جو تھا تو سارا کا سارا اس کا، لیکن جہاں اس کی حیثیت ایک ایسے مسافر کی سی تھی جو سرائے کو اپنا گھر سمجھ بیٹھتا ہے۔

ساس سارا دن اپنے بیٹے کے رویے کی تلافی کرنے کے لیے ایمن کی خوشامد کرتی رہتی تھی۔ زیور کپڑے ابھی پرانے بھی نہ ہوتے تھے کہ وہ ان کو نئے کروادیتی...... اس سب کے باوجود ایمن کا اندر خالی ہوتا گیا، وہ ساس کو نہ بتا سکی کہ شادی شدہ زندگی کا ازدواجی دور کپڑے لتے اور گہنے سے پر نہیں کیا جا سکتا...... اس کے لیے بدن کی گہرائی میں اُترنا ضروری ہے، روحوں کو جاننا لازم ہے۔

کاش ایمن کا دولہا بھی اپنی ماں کی طرح کا ہوتا...... وہ فوج کا ٹرینی تھا۔ لمبا قدم، اونچے ابرو، مضبوط ذہن، پکے ارادے...... وہ اپنی پہلی محبوبہ کو نہیں بھولا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد بھی وہ کہیں اس کے اندر زندہ تھی۔ وہ اپنی اور اس کی پرانی تصویریں نکال کر دیکھا رہتا، اس کے کپڑوں کو پکڑ کر ایسے چھوتا جیسے وہ ان میں کہیں زندہ ہو...... شاید ایمن اس فوجی کو اپنی پہلی بیوی بھلانے میں کامیاب ہوجاتی، جو وہ اس کی طرح پڑھی لکھی، سلیقہ مند اور شاید اس کے جیسی خوب صورت ہوتی......

اچھا ہوا! ایمن نے چھوٹی کو اس سے شادی نہیں کرنے دی۔ ورنہ دولہے کو لے کر اس کے جو جو ارمان تھے وہ تو ان ارمانوں کے ساتھ ہی مرگئی ہوتی......

ایمن سب برداشت کرسکتی تھی۔ پھر بھی نجانے کیوں جب جب وہ چاند کی چودھویں میں مہوا کا درخت بنتی اور دیکھتی کہ اس کے پھولوں کی پنکھڑیاں پھر سے نہیں پنپ رہیں تو اس کا اندر باہر ویران ہوجاتا......

ساس اس سے اتنی شرمندہ تھی کہ اسے کوئی کام بھی نہیں کرنے دیتی تھی۔ اسے گھر میں آئے ایک ماہ ہو چکا تھا اور ساس اسے زمین پر قدم نہیں رکھنے دے رہی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کے نخرے اٹھا کر وہ اس کا کچھ ازالہ کر رہی ہے۔ جسے نخرے اٹھانے چاہیے تھے وہ تو اس سے غافل تھا۔ ساس ہی اسے کبھی کبھی دبے لفظوں میں شرم دلایا کرتی تھی۔

''لانی ہی تھی تو کوئی پڑھی لکھی لاتی ماں...... میرے مزاج کی تو ہوتی...... اس گاؤدی کی تو شکل دیکھنے کو دل نہیں کرتا......'' فوجی ماں کو الٹا جواب دیتا......

ایمن کی ساس بھی ماں بن گئی تھی۔ وہ ہر بات کا اپنا مرضی کے مطابق حل نکالتی تھی، غریبوں کے مسئلے سلجھاتے سلجھاتے اس نے اس سب کو بھی ایسا ہی کوئی مسئلہ سمجھ لیا تھا، جسے وہ اپنی دولت کے ذریعے حل کرسکتی تھی۔

اگلے روز ساس نے ایمن کے لیے ابتدائی قاعدوں والے بہت سی کتابیں منگوادیں، اور گاؤں کی آٹھ جماعتیں پاس لڑکی کو بھاری فیس دے کر اس کے لیے استانی کے طور پر رکھ لیا۔

ایمن کو ایسے وقت میں اپنی ساس اپنی ماں لگتی۔ وہ سوچتی کچھ پرائے رشتے شرمندگی، دُکھ، پچھتاوے اور کفارے کی آگ میں جل کر کیسے نکھر جاتے ہیں ناں۔ عین ممکن ہے کہ فوجی ایسی غلطی نہ کرتا تو ساس بھی روایتی ساسوں کی طرح کی ہوتی۔

اس نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں اتنے روپے دیکھ لیے تھے اب اس کے لیے کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ کچھ روگ قسمت کو ایسے لگتے ہیں کہ زندگی جلا کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ کوئی کام کرنے لگتی تو ساس اسے منع کر دیتی۔

"نہ نہ ایمن ...... تو کوئی کام نہ کر ...... تو بس پڑھ ......"

ایمن بے چاری سے اپنی ساس کی شکل دیکھ کر رہ جاتی، بھلا جس نے ساری زندگی جنم جلی سے روگ جلی کی کتابیں پڑھی ہوں۔ وہ اب الف آم اور بے بکری والے قاعدے کیسے پڑھ سکتی ہے۔ اسے تو ان نئے لفظوں کی پہچان ہی نہیں تھی۔ مہینہ گزر گیا۔ اس کی زندگی کی پگڈنڈی ایسی پر پیچ تھی کہ وہ اتنا نہ سیکھ سکی کہ سیدھی ڈنڈی کو الف کہتے ہیں۔

کبھی کبھی ساس اسے پاس بٹھا کر زندگی کی اونچ نیچ سکھایا کرتی تھی۔ اسے اپنی ازدواجی زندگی کے زخمی راز سنایا کرتی تھی۔

"عورت کو بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے میری دھی ...... مرد ذات کا کیا ہے، کبھی وحشی گھوڑا جو ہر دم عورت کو قابو کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے تو کبھی خچر ...... عورت اور قربت سے لاپروا ...... یہ عورت ہی تو ہوتی ہے جو گھر بناتی ہے۔ خاندان کو اکٹھا رکھتی ہے۔"

ساس کی باتیں سننے میں تو بہت اچھی لگتی تھیں، لیکن ایمن کا ان پر عمل کرنے کو دل نہ کرتا تھا۔ اسے وہ ساری نصیحتیں داج کی سرخ و سفید نواڑی چارپائیوں کی طرح کی لگا کرتی تھیں، جن کو انسان اس ڈر کی وجہ سے استعمال نہیں کرتا کہ کہیں میلی نہ ہو جائیں۔

ایک روز گھر سے ماں بھی آئی تھی۔ وہ بھی ساس کی کاپی بنی ہوئی۔ شرمندہ شرمندہ ...... سمجھ میں نہ آئے کہ کیا کہے اور کیا کرے۔ الفاظ منہ میں ہی گم ہو جاتے۔ پر حلق سے اُتر بھی نہ سکیں۔ گھر سے کافی کچھ لائی تھی ایمن کے لیے، لیکن سب شاپروں میں ہی بند رہا، اس کی اتنی ہمت نہ ہو سکی کہ شاپر کھول کھول کر ایمن کے لیے لائی ہوئی چیزیں اسے دکھا سکے۔ سوتیلی بیٹی سگی ہونے کا حق ادا کر چکی تھی۔ لیکن یہ حق سوتیلی ماں نہ ادا کر سکی تھی۔ شاید وہ جذبات کی گرفت میں آ چکی تھی۔

سوتیلی ماں سگی بن سکتی ہے۔ سگی سے بھی اچھی بن سکتی ہے۔ لیکن بات جب سگی اور سوتیلی اولاد پر آ جائے تو ماں کو کوکھ میں تکلیف تب ہی ہوتی ہے جب اس کی سگی اولاد روتی ہے۔ وہ جتنی بھی شرمندہ تھی۔ ایمن خوش تھی کہ اس نے اسے کوکھ کی تکلیف سے بچا لیا ہے۔ ایک ماں کے پاس اور ہوتا ہی کیا ہے۔ اب کیا وہ اس سے اس کے پیروں تلے کی جنت بھی چھین لیتی ......

ساس ماں کے آگے اور بچھتی جائے، اسے ظاہر کرے جیسے سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ اور ماں، ساس کے جھوٹ ایسے مانے جیسے کسی ولی کو مان رہی ہو ...... ماں جتنے دن رہی اس نے ایک بار نہ پوچھا کہ تیرا رنگ و روپ کہاں گیا۔ مہوا کے پتوں کا کیا بنا، اس کے پھولوں کی خوشبو کیوں رخصت ہو گئی۔ وہ گھبرائی بڑھیا بے چاری ان باتوں کی طرف آئی ہی نہیں ...... ساری زندگی اس نے اپنے خصم کی دوسری بن بیاہی سوتن کا دُکھ سہا تھا۔ اب ایمن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ جان چکی تھی کہ ایمن اپنی مری ہوئی سوتن کا دُکھ بھینچ رہی ہے۔ دونوں طرف غم ایک ہی ندی کی صورت بہہ رہا تھا۔ طغیانی نہیں تھی، پھر بھی دل ڈوب ڈوب جاتا تھا۔

"میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں ایمن ...... دل لگا کر پڑھ لے۔" دو ماہ بعد بھی جب وہ ان گھڑی ہی رہی تو ساس نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ نادان ماں پتا نہیں کیا سمجھے ہوئے تھی؟

ایمن اُسے کیا بتاتی کہ بات پڑھائی کی نہیں ہے۔ بات تو ان مور پنکھوں کی ہے جو فوجی دیکھنا چاہتا ہے اور جو اس کے نہیں لگے ہوئے۔ بھلا فوجی نے اس سے اس کا "الف' آم، 'ب' بکری تھوڑی

سنتا ہے۔ بات تو شاید 'ک' کوئل، 'م' مور کی تھی، جو وہ بن نہیں سکتی تھی۔

فوجی کی پہلی بیوی کے چار بچوں کو ساس خود ہی پال رہی تھی۔ ایمن پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ وہ چودھرائن اپنی مزارعوں کے ساتھ بھی ظلم روا رکھنے کے سخت خلاف تھی۔ ایمن تو پھر اس کی بہو تھی۔

ایک دن ساس نے استانی لڑکی سے فوجی کا نام لکھوا کر اسے دکھایا، اور کہا کہ یہ دیکھ تیری بیوی نے لکھا ہے۔

فوجی بٹر بٹر اپنی ماں کو دیکھتا رہا۔

"میں نے تیرے آگے ہار مانی ماں......"

فوجی نے گھٹنے ٹیک دیے اور پھر اپنی بیوی کے کمرے میں چلا گیا۔

ساس کی ساری عبادتیں جیسے قبول ہو گئیں۔ ایک جو احساسِ جرم اسے کھا رہا تھا وہ تمام ہوا...... اور اس کے ساتھ ساتھ ساس بھی تمام ہو گئی۔ شاید اس کو زندگی سے یہ ہی سکھ درکار تھا۔ اس کی زندگی سے بس یہ ہی خواہش رہ گئی تھی۔ جو پوری ہوئی تو وہ پرلوک سدھار گئی۔

ساس کے بعد ایمن نے لاکھ حویلی کو سنبھالنا چاہا، لیکن وہ رونق جو ساس کے دم سے تھی اس کے جنازہ اٹھتے ہی رخصت ہو گئی۔ پھر فوجی کا یہ کہنا کہ......

"ماں کی طرح اب تم بھی حویلی میں روز میلہ مت لگائے رکھنا......"

ایمن نے سب کتنے ہی نوکروں چاکروں کو فارغ کر دیا۔ اور آدھے سے زیادہ کام خود سنبھال لیے......

فوجی کو جتنا اپنی پہلی بیوی سے پیار تھا اتنا ہی اپنے حسن پر غرور بھی تھا۔ حسن پر غرور، جو عورت ذات کا خاصہ ہے۔ مرد پر چڑھ جائے تو وہ اسے سنبھال نہیں سکتا...... خلوت میں اُس کی ایک ایک جنبش میں ایمن کے لیے احسان ہوتا اور ایمن جیسے اس کی قرض دار ہوتی چلی گئی۔ تین ہی ہفتوں میں وہ مکمل طور پر اس کے ہاں رہن رکھی جا چکی تھی۔ اس کے باوجود اسے اپنے شوہر سے پیار تھا اسے دیکھ دیکھ کر اس کے اندر خواب جاگنے لگتے تھے۔ ہاتھوں پیروں کی سدھ بدھ ختم ہو جاتی تھی۔ لیکن اس کے کسی خواب کو بھی اور مضبوط تعبیر نہ مل سکی...... وہ نہیں جانتی تھی کہ سپنوں کا تاج محل بڑی جلدی کھڑا ہو جاتا ہے۔ مگر زمین کی رجسٹری اپنے نام لکھوانے میں عمر بیت جاتی ہے۔

فوجی کی محبت روغنی نان کی طرح تھی۔ نرم گرم، پر ہاتھ لگاتے ہی بھربھرا جانے والی...... کبھی کبھی وہ ایمن سے پیار سے بات کر لیا کرتا تو ایمن کی گویا عید ہو جاتی...... اس کے ہاتھ کے بنے کھانے کی تعریف کر دیتا تو ایمن ہواؤں میں اڑنے لگتی...... فوجی کا ساتھ اس کے ساتھ ایسے رہا جیسے نہروں کا کھیت کے ساتھ...... جتنی ضرورت اتنی سیرابی...... باقی بس بندش ہی بندش......

ساس کے بعد ایمن بڑی ہنسی خوشی فوجی کے پہلے چار بچوں کا پال رہی تھی۔ وہ ان کے لیے خدیجہ سے بھی بڑھ کر ثابت ہونا چاہتی تھی۔ خدیجہ سے ایمن تک کے سفر میں وہ اپنی منزل اور نکھار رہی تھی۔ اب جب جب وہ مہوا بنتی تو دیکھتی کہ اس کے پھولوں کی خوشبو ایک بار پھر سے لوٹ رہی ہے۔ ننھی ننھی کونپلیں سر اُٹھانے لگی تھیں کہ ایک دن اچانک......

"مجھے اور بچے نہیں چاہئیں۔" فوجی نے ایک دن اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"لیکن مجھے تو چاہئیں۔" ایمن نے کمزور احتجاج کیا۔

"کیا یہ تیرے بچے نہیں ہیں۔ تو فریب کرتی ہے کہ تو ان کی ماں ہے۔ جو ماں دل سے بنی ہوتی تو کبھی ایسی بات نہ کرتی......"

اور ایمن اُسی وقت چپ کر گئی۔ فوجی کی اس بات کے بعد ایک لفظ نہ بول سکی۔ کیا اس کے پیار میں کھوٹ تھا۔ وہ واقعی میں فریب کرتی آ رہی تھی، بچوں کے ساتھ اور خود اپنے ساتھ بھی...... وہ بھی اپنی

ماں کی طرح سگی بنتے بنتے سوتیلی بنی ہوئی تھی۔
نہیں ......وہ تو سگی بننا چاہتی تھی۔ اس نے تو اپنی پوری کوشش کی تھی۔
اس دن کے بعد ایمن نے کبھی ذکر نہ کیا کہ اسے ماں بننا ہے۔ نہ خدا کے حضور دعا کی نہ فوجی سے التجا۔ کیا وہ خدا کی ناشکری ہو رہی تھی؟ خدا نے تو اسے پلے پلائے چار بچے دے دیے تھے۔ اسے اور کیا چاہیے تھا۔
لیکن نجانے کیا بات تھی۔ جب جب چاند کی چودہ تاریخ ہوتی اور وہ رات میں مہوا کا پیڑ بنتی تو دیکھتی کی ڈوڈیوں کے اندر کے بیج غائب ہو چکے ہیں۔ بیج سے ہی تو نئے پودے بنتے ہیں۔ اب اگر اس نے ٹھان لی تھی کہ اسے بیجوں کی ضرورت نہیں تو بیجوں کو بھی کیا ضرورت تھی کہ وہ اس کی ڈوڈیوں میں اپنا وجود رکھتے۔ وہ گم ہو گئے تھے۔ اس کے خوابوں کی طرح...... چپکے سے...... کسی رات...... جو مردہ ہو کر نجانے کہاں دفن ہو گئے تھے۔ ان کو پھر سے کھوجنے کے لیے کوئی کتبہ بھی تو ایمن کو نظر نہیں آتا تھا۔ دُور دُور تک بس ویرانی ہی ویرانی تھی۔
گزرتے وقت کی کاٹ سب کاٹتی جا رہی تھی۔
عمریں، خواب، آنسو، شکوے...... اس کی سب سے چھوٹی بہن دو بچوں کو پیدا کر کے فوت ہو چکی تھی۔ یوں وہ دو بچے بھی ایمن کے پاس آ گئے۔ ارم کے خاوند کو جب تیسری لڑکی ہوئی تو اس نے صاف کہہ دیا کہ چوتھی بھی لڑکی ہوئی تو وہ ارم کو طلاق دے دے گا۔ یوں جب چوتھی بھی لڑکی ہوئی تو ایمن نے اس لڑکی کو ارم سے گود لے لیا۔ یوں سات بچوں کو پال پوس کر بڑا کر کے ان کے بیاہ کر کے ایمن نے زندگی کو بڑے ڈھب سے گزار دیا۔ زندگی سے جو شکوے تھے وہ اب کچھ ایسے بھی خاص نہ لگنے لگے۔ سب بیت چکا تھا۔ اب بیتے وقت کو کیا کوسنا......

☆☆☆

لیکن پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جو سارے مندمل زخموں کو ہرا کر گیا۔ زندگی کا سارا نفع نقصان میں بدل گیا۔ اور ایمن سمجھ ہی نہ سکی کہ اس نے غلطی کہاں کی......؟ سونے کی ڈلی میں پھٹور کی ملاوٹ تو نہ تھی۔ پھر تقدیر لکھنے والے سنار نے کاٹی کیوں...... اتنی زیادہ کاٹ لی کہ ایمن کے پاس باقی کچھ بچا ہی نہیں......
یہ بہار کے دنوں کی بات ہے۔ جب قدرت جشن مناتی ہے۔ ہر طرف نئے پھول کھل آتے ہیں اور نئی خوشبو دھرتی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ ایسے ہی دنوں ایمن نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کا بیاہ کیا تھا۔ چھوٹے نے لندن میں کسی لڑکی کو پسند کر لیا تھا۔ لڑکی کراچی کی رہنے والی تھی اور شادی کے بعد لندن میں ہی رہنا چاہتی تھی۔ ایمن اور فوجی کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ دونوں نے شادی پر رضامندی دے کر دونوں کی شادی کروا دی تھی۔ کچھ عرصہ میاں بیوی دونوں بڑھا بڈھی کے پاس رہ کر واپس لندن چلے جانے والے تھے۔
نئی بہو جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی بے جھجک...... دونوں نے ہی باہر سے مخلوط اداروں میں تعلیم حاصل کی تھی اور نئی سوچ کو اس طرح سے اپنا لیا تھا کہ پرانی قدروں کو فراموش کر بیٹھے تھے۔
کاش ایمن کو کچھ اندازہ ہوتا کہ نئی دلہن کا بے جھجک پن اس کے اپنے گھر میں کیسی آگ لگائے گا تو وہ بھی اس رشتے پر رضامند نہ ہوتی۔
دونوں کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور پرانی حویلی میں نئی رونق لگی ہوئی تھی۔ لڑکی چھوٹے کپڑے پہنے، کھل کر ہنسنے، شوہر کے ہاتھ پر ہاتھ مارنے کو معیوب خیال نہ کرتی تھی۔ ساس سسر کے سامنے شوہر کو گال پر بوسہ دے دینا، گلے میں جھول جانا، لٹکنا، جھپٹنا، اس کے لیے ایک عام سی بات تھی۔ چھوٹا لڑکا بھی اسی کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ دونوں ایک ساتھ بیٹھے ہوتے تو ماں باپ کے آنے پر مجال ہے جو پرے کھسک جاتے۔ ایمن ہنس دیتی کہ میاں بیوی میں کتنا پیار ہے۔ وہ کہاں جانتی تھی کہ یہ پیار اس کا فوجی شوہر بھی دیکھ رہا ہے اور کن نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

UUNOVELS.COM

نجانے کیا بات ہے۔ہمیں اپنی ادھوری زندگی کی ادھوری خواہشات کا ادراک کسی اور کی مکمل زندگی، مکمل خوشی کو دیکھنے پر ہی کیوں ہوتا ہے۔یا یہ ادراک ایسے وقت میں مزید شدت پکڑ لیتا ہے۔ آگہی شوق، آتش شوق میں بدل جاتا ہے۔

اسی رات کا قصہ ہے۔نئی بہو نے کھانے میں نجانے کون سی نئی چیز بنائی تھی جو اس کے شوہر کو کھانا نہیں آ رہی تھی۔لڑکے کے قریب جا کر وہ اپنے ہاتھوں سے اس کو اپنے ہاتھوں کی بنی چیز کھلانے لگی۔ایمن تو شرم کے مارے باہر چلی گئی اور فوجی کی ماتھے پر شکنیں اُبھر آئیں۔ساری رات وہ کروٹ پر کروٹ بدلتا رہا۔

"کیا بات ہے۔؟" ایمن اس کی بے چینی کیسے نہ بھانپتی ...... تیس سال گزار دیے تھے اس نے فوجی کے ساتھ...... ساتھ رہتے ہوئے بھی الگ الگ ہی سہی ...... لیکن تیس سال کا عرصہ اتنا تو ہوتا ہی ہے کہ انسان دیوار کے دوسری طرف والے کو بھی اچھے سے جاننے لگ جائے۔

"دونوں میاں بیوی میں کتنا پیار ہے ناں......؟" فوجی روشن دان میں سے نظر آتے چاند کو دیکھتے ہوئے بولا۔جیسے روشن دان سے پرے وہ چاند کو نہیں بلکہ بیٹے اور بہو کے کمرے میں دیکھ رہا ہوں۔

"ہاں......تو اچھی بات ہے ناں......"

"سوچتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی کہاں بِتا دی۔"

ایمن کے دل پر جیسے کسی نے توپ کا گولہ داغا...... کہاں بِتا دی......؟ اور اگر وہ یہ سوال فوجی سے پوچھتی تو......؟ اپنی زندگی کا حساب وہ فوجی سے لینا چاہتی تو وہ کیا جواب دیتا...... جب وہ اس سے پوچھتی کہ اس کی ریاضت کا کیا نتیجہ نکلا، اس کے حصے کا کھوٹا سکہ کیوں کسی بازار میں نہ چل سکا تو کیا فوجی کے پاس تھا اس کے سوال کا جواب...... اس کے حساب کا نفع...... اس کے گھاٹے کا مال......؟

"اپنے بچوں میں بِتا دی اور کہاں......"

"کیا زندگی ایسی ہے کہ اس کا کوئی بھی لمحہ ضائع کیا جائے؟ بول ایمن ...... تو کیا بولے گی۔ ماں کے کہنے پر پڑھ لکھ تو گئی ہے۔لیکن پڑھی لکھی سوچ کہاں سے لائے۔" یہ دوسرا توپ کا گولا تھا جو ایمن کے دل پر چلا۔فوجی نے اسے بڑے سالوں کے بعد جاہل ہونے کا طعنہ دیا تھا۔لیکن کیوں......؟ ابھی یہ گتھی نہ سلجھی تھی۔

جتنے دن لڑکا اور اس کی بیوی گھر پر رہے، فوجی کی نظریں دونوں کا تعاقب کرتی رہیں اور اپنی زندگی کی بے نوری پر نوحہ کناں رہیں۔ان دونوں کے وجود سے وہ اپنی زندگی کو نسبت دینے لگا تھا اور اس کے حساب میں بھی ایمن کے حساب کی طرح سب منفی ہی منفی ظاہر ہو رہا تھا۔نقصان ہی نقصان...... عبث ہی عبث...... دونوں کے ہی کھاتے میں کن لفظوں کا ہیر پھیر تھا کہ کسی ایک کو بھی نفع نصیب نہیں ہو سکا تھا۔

اب فوجی بات بات پر ایمن سے لڑنے لگا تھا۔اسے ایمن کی ایک ایک بات بری لگنے لگی تھی۔

"وقت سے پہلے ہی بڈھی ہو گئی ہے۔بچے تو نے نہیں جنے...... خدمت تجھ سے میں نے نہیں کروائی۔پھر بھی شکل دیکھ اپنی۔دیکھنے کو دل نہیں کرتا...... جتنا سکھ اس گھر میں تھا کوئی اور ہوتی تو ابھی تک جوان رہتی......"

ایمن اس پڑھے لکھے کو کیا بتاتی کہ جوانی کی سج اگر سہولیات پر منحصر ہوتی تو شہزادیاں، ملکائیں کبھی بوڑھی نہ ہوتیں، اس کی نسبت اگر سکھ سے ہے بھی تو صرف محبت کے سکھ سے ہے۔جو اسے اس حویلی میں ملا تو سہی، لیکن ہمیشہ اتنا جس سے زندگی چلتی رہے۔ کبھی سیر شکم ہونے کی حس جاگی ہی نہیں......

ایمن نے لڑکے کے آگے ہاتھ جوڑے کہ وہ جلد از جلد واپس لندن چلا جائے، لڑکا کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا، لیکن وہ اپنی بیوی کو لے کر واپس لندن چلا گیا۔لیکن اس کے واپس جانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔جو خواب وہ اپنے باپ کے دل میں جگا گیا تھا وہ اب عملی تعبیر پا کر ہی اس کی آنکھوں سے رخصت ہونے والے تھے۔

پھر فوجی نے ایک اور بات پکڑ لی...... کوئی لڑائی ہو جاتی تو ایک ہی بات پر تان ٹوٹتی۔ میں تو دوسری کر لوں گا۔ میں تو دوسری کر لوں گا۔ ایمن آگے سے ہنس دیتی...... بلکہ اکثر کہہ دیتی کہ کرلو...... دوسری کرلو اس عمر میں...... میں نے کیا پایا جو اسے مل جائے گا۔

گاؤں سے پرے ایک قافلہ رُکا تھا۔ بنجارے لوگ تھے۔ ان کی لڑکیاں ہاتھوں پر ٹھپہ لگانے کا کام کرتی تھیں۔ عورتیں مٹی کے کھلونے گھوڑے بیچتی تھیں اور مرد گلی گلی بندر ریچھ کا تماشا دکھاتے پھرتے تھے۔ لڑکیاں ان کی بلا کی خوب صورت تھیں۔ نڈر، بے خوف اور قدرے بے جھجک...... زیادہ تر لباس سے بے پروا ہی رہتی تھیں۔ دوپٹے اور کھلے گریبانوں کی زیادہ ہوش نہ ہوتی تھی انہیں...... یا وہ اس معاملے میں بے نیاز تھیں۔ جب تک قافلہ رکا رہا، گاؤں بھر میں خوب رونق لگی رہی...... پھر ایک رات خوب ٹوٹ کے بارش برسی...... برسات کی پہلی بارش...... جس سے قافلے والوں کے سارے خیمے اُکھڑ گئے۔ قافلے والے سیلاب کے ڈر کی وجہ سے جلدی ہی وہاں سے رخصت ہو گئے، لیکن اُن کی ایک لڑکی اس گاؤں میں ہی رُک گئی۔

کیا گوری چٹی لڑکی تھی۔ بالکل انگریزنی...... ہاتھ لگاؤ تو میلی ہو...... پانی پیتی تو حلق سے اُترتا محسوس ہوتا......

عشا کی نماز کے بعد دروازے پر دستک ہوئی تو ایمن نے حویلی کا بڑا کواڑ کھولا...... یہ فوجی کی واپسی کا وقت تھا اور اس کے بہت سے کاموں کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ اس کے آنے پر دروازہ کھولنے کا کام بھی ایمن ہی کیا کرتی تھی، جس سے اسے خوشی ملا کرتی تھی۔ اب کی بار جو کواڑ کھولا تو فوجی کے ساتھ ساتھ ایک اور پرچھائیں بھی اندر داخل ہوئی۔ یہ مونث پرچھائیں تھی۔ جس کے گلے میں کنٹھ تھا، ہاتھوں میں ہاتھی دانت کا کڑا...... اور لباس کا گھیرا اتنا وسیع کہ اس میں وہ کسی چمن کا سب سے منفرد گلاب نظر آتی تھی۔

اور وہ بھی چاند کی چودہ تاریخ جب مہوا کے پیڑ کی ساری جڑیں کٹ گئیں۔

''یہ...... یہ کون ہے۔؟'' ڈری ہوئی بڈھی نے سہم کر پوچھا۔

''میری بیوی اور تیری سوتن...... چاہے تو چھوٹی بہن بنا لے چاہے تو سوتن ہی سمجھ......'' فوجی تن کر بولا...... ایمن نے گرنے سے بچنے کے لیے کواڑ تھام لیا۔

گلاب صفت لڑکی، اپنی خوش رنگ اوس چھوڑتی، بے باکی سے فوجی کی بانہوں میں بازو ڈالے اندر چلی گئی اور یہ آپس میں مدغم ہوئی پرچھائیں ایمن کو شیش ناگ کی طرح ڈسنے لگی۔

ایک دم سے بڈری ایمن میں نجانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ وہ بھاگم بھاگ اپنے کمرے میں پہنچی...... سارے بستر ہٹا کر جلدی سے اس نے پیٹی میں سے اپنا پرانا ٹرنک نکال کر کھولا...... وہاں سے ماں کی دی ہوئی چاندی کی ایک پرانی سرمہ دانی نکالی اور آنکھوں کے کنارے سرمے کے تین تین ویسے ہی نقطے ڈال لیے جیسے وہ لڑکی اپنی آنکھوں کے کنارے ڈالے ہوئے تھی۔

لیکن وہ لڑکی تو جوان تھی، آنکھوں کے کنارے ڈالے سرمے کے تین تین نقطوں میں قیامت ڈھا رہی تھی اور ایمن تو اب بڈری ہو چکی تھی۔ اپنے جھریوں زدہ چہرے پر اس نے ایسی قبیح حرکت کی تو بدصورتی میں جیسے مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ جانتی تھی کہ مہوا کے پیڑ پر اب کچھ باقی نہیں رہ گیا۔ سوائے اس کی ناکارہ ہڈیوں کے...... کچھ باقی نہیں رہ گیا...... کچھ باقی نہیں رہ گیا۔''

ایمن دادی نے کہانی ختم کی اور پھر...... اپنے جہیز کی رضائی میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

باہر گھور اندھیری رات میں حمد کرتی ''لالی'' خاموش ہو گئی تھی اور اب اس کی جگہ گیدڑ شور مچانے لگے تھے۔

آتش دان میں آگ بجھ چکی تھی۔ مہوا کی ہڈیاں چیخ رہی تھیں۔

☆☆

سالگرہ نمبر



عنبرین ایدال

میں، تم اور محبت



''میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔اتنی کے میرے پاس وہ الفاظ بھی نہیں۔جن سے میں تمہیں بتا سکوں۔'' شہریار نے بوجھل لہجے میں ثنا سے کہا۔

ثنا دم سادھے شہریار عرف شیری کے منہ سے اپنے لیے محبت کی بے چینیوں اور بے قراریوں کو سن رہی تھی۔ اس کا وجود دور کہیں فضاؤں میں اڑتا پھر رہا تھا۔ مگر ذہن......ذہن کی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے شیری......! مگر میرے گھر والے نہیں مانیں گے۔'' ثنا نے بے بسی سے اپنے لب کاٹتے ہوئے کہا۔

''تو تم انہیں مناؤ نا۔ پلیز ثنا! میں نے جب سے تمہیں چاہا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں چاہا۔ میں تمہارے بنا مر جاؤں گا۔ آخر کیا کمی ہے مجھ میں اور ایسا کیا ہے تمہارے اس کزن میں، جو مجھ میں نہیں ہے۔ اچھا خاندان ہے۔ ویل آف ہوں۔ اچھی جاب ہے۔ میں تمہیں وہ سب دے سکتا ہوں جو ایک لڑکی چاہتی ہے۔ پھر بھی تمہارے گھر والے......'' شیری نے ناراضی بھری نظروں سے ثنا کو دیکھا۔

''میرے گھر والوں کو تم بہت پسند ہو شیری! مگر سب سے بڑا مسئلہ......'' ثنا نے بات ادھوری چھوڑی۔

''کیا سب سے بڑا مسئلہ ہے......؟ اور جو مسئلہ تمہارے گھر والے بنائے بیٹھے ہیں۔ ذات پات کا مسئلہ......تو یہ میرے بس میں تو نہیں ہے نا۔ اگر تم بلوچ ہو اور میں انصاری فیملی سے ہوں اور ویسے بھی میں اور میرے گھر والے ان باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔''

''لیکن میرے گھر والے ان باتوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں ہمارے ہاں اپنی ذات سے باہر شادی نہیں کی جا سکتی۔'' ثنا نے ڈبڈبائی آنکھوں سے شیری کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر اپنے ہاتھ مسلنے لگی۔ شیری جو ایک دم غصے میں آ گیا تھا۔ ثنا کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر فوراً ہی موم ہو گیا۔

''ارے ارے اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ میں تو تمہیں بتا رہا تھا۔'' شہریار نے ثنا کے ہاتھوں پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''رہنے دو، تم ہر بار یوں ہی کرتے ہو۔ اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو میں بھی تو تم سے محبت کرتی ہوں۔

تمہیں کیا لگتا ہے میں نے اپنے گھر والوں کو منانے کی کوشش نہیں کی۔ ان سے میں ناراض بھی ہوئی۔ لڑی بھی مگر ان کی ناں ہاں میں نہیں بدلی۔" ثنا نے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر آنسو پھر بھی پلکوں کی باڑ توڑ کر اس کے گالوں پر بکھرنے لگے۔

"میں کیا کروں؟ میں اپنے دل، اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ مجھے بس تمہارا ساتھ چاہیے عمر بھر کے لیے۔ اپنی آخری سانس تک کے لیے۔ ایک بات یاد رکھنا ثنا! اگر تم مجھے نہ ملیں نا تو میں خودکشی کرلوں گا۔"

شیری جذبات کی انتہا پہ تھا۔

"اللہ نہ کرے شیری! تمہیں کچھ ہو۔ کبھی تو سوچ کر بول لیا کرو۔" ثنا نے ناراضی سے کہتے ہوئے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتا۔ تم میری محبت، جنون، عشق ہو۔ میری ایک بات مانو گی۔" شیری نے ملتجی لہجے میں کہتے ہوئے ثنا کے ہاتھ تھامے۔

"میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے تمہارے گھر والوں کو منانے کے لیے کیا کیا نہیں کیا۔ مگر ان کی ناں ہاں میں نہیں بدلی۔ اب تو اس کا ایک ہی حل بچا ہے۔"

شیری نے بات کے اختتام پر ثنا کی طرف دیکھا۔

"کیا حل ہے؟" ثنا نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے صاف کیا اور سامنے پڑا کافی کا مگ منہ سے لگالیا۔

"ہم کورٹ میرج کرلیتے ہیں؟" شیری نے ثنا کا چہرہ اپنی نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" ثنا کے ہاتھ سے کافی کا مگ لڑکھڑا گیا۔

گرم کافی ٹیبل پر گری اور سفید کور کو داغ دار کرگئی۔

"دھیان سے۔" شیری اٹھ کر ثنا کے قریب آیا۔

"تمہارے اوپر تو نہیں گری۔" شیری کے لہجے میں فکر مندی تھی۔ ثنا ایک پل کو شیری کی اپنے لیے اس فکر مندی پہ مغرور سی ہوئی۔

"تم ہمیشہ میری اتنی ہی فکر کرو گے۔" ثنا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ شیری مسکرا دیا اور کرسی گھسیٹ کر ثنا کے پاس بیٹھ گیا۔

"اس سے بھی کہیں زیادہ۔" شیری نے ثنا کے موی ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

ثنا ساکت سی اسے دیکھتی رہی۔ فرم میں کتنی ہی لڑکیاں تھیں جو شیری کے پیچھے پیچھے پھرتی تھی۔ مگر وہ تو بس ثنا کا دیوانہ تھا۔ اسے تو ثنا کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔

"شیری! مما پاپا مان کیوں نہیں جاتے؟" ثنا کے لہجے میں یاسیت سمٹ آئی تھی۔

"یہی تو میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ اگر وہ نہیں مان رہے تو کیا ہم الگ ہو جائیں۔ یہ ہماری زندگی ہے اور ہمیں کس کے ساتھ اپنی زندگی گزارنی ہے۔ اس کا فیصلہ بھی ہمیں خود کرنا چاہیے۔ ماں باپ ہیں۔ خدا نہیں۔ جو نہیں مانے تو ہم الگ ہو جائیں۔ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور تم بھی یہی چاہتی ہو۔ یہ بات کافی ہے اور یوں بھی میں کون سا تمہیں کہہ رہا ہوں۔ اپنے والدین سے مت ملنا۔ ہم دونوں بعد میں جا کر معافی مانگ لیں گے۔ اور ماں باپ اپنی اولاد سے زیادہ دیر تک ناراض نہیں رہ سکتے۔ اور تم تو ان کی اکلوتی بیٹی ہو۔ تھوڑی سی ہمت کرلو ثنا! ورنہ ہم ہمیشہ کے لیے الگ ہو جائیں گے۔" شیری نے منت آمیز لہجے میں کہتے ہوئے ثنا کی سمت دیکھا۔ ثنا کشمکش و پیچ میں گھری ہوئی تھی۔

"ثنا!" شیری نے ساکت بیٹھی ثنا کا کندھا ہلایا۔

"آں ہاں۔" ثنا نے شیری کی طرف دیکھا۔

"کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟"

"بہت ہے۔ مجھے تم پر بہت یقین ہے۔ مگر......"

"کیا اگر مگر...... میں تمہیں کب سے سمجھا رہا ہوں۔ مگر تم......" شیری نے اب خفگی سے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم اپنے والدین کی بات مانو اور اپنے کزن سے شادی کرلو۔ تمہیں نہ میری پروا ہے اور نہ ہی میری محبت کی۔" شیری کہہ کر بیرونی دروازے کی سمت بڑھا۔

"شیری!" ثنا تیزی سے اس کے پیچھے لپکی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔" ثنا نے شیری کے ساتھ چلتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"سچ میں......!" شیری نے بے یقینی سے رک کر ثنا

کی آنکھوں میں دیکھا۔

''ہاں سچ میں...... میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ مما، پاپا کو میں نے منانے کی بہت کوشش کی۔ مگر وہ اپنی ضد پہ قائم ہیں تو ٹھیک ہے، رہیں قائم۔ میں ان کی ضد میں اپنی محبت کو نہیں چھوڑ سکتی۔'' ثنا نے فیصلہ کرلیا تھا۔

''تھینک یو ثنا۔ تھینک یو سوچ۔'' خوشی سے شیری کی آواز کانپنے لگی۔

☆☆☆

پھر اگلے دو دن بعد ہی ثنا نے شیری کے ساتھ کورٹ میرج کرلی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پاکر بہت خوش تھے۔ ثنا کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنے ماں باپ اور دونوں بھائیوں کا خیال تک نہیں آیا۔

ہنی مون سے واپس آنے کے بعد ثنا شیری کے ساتھ اپنے گھر گئی مگر اس کے والدین نے اس سے عمر بھر نہ ملنے کا کہہ کر دروازہ بند کردیا۔

''شیری! تم نے تو کہا تھا سب مان جائیں گے۔'' ثنا نے روہانسی ہوکر اپنے ساتھ کھڑے شیری سے کہا۔ جو لاپروائی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

''اب مجھے کیا پتا تھا۔ تمہارے پیرنٹس اس قدر ظالم اور سنگدل ہوں گے۔ اب چلو نا یار۔ بہت گرمی ہے۔'' شیری نے منہ بنا کر ثنا سے کہا۔

''شیری! میرے ماما پاپا اور......'' ثنا نے کچھ کہنا چاہا۔

''ثنا میں جارہا ہوں۔ تم ہی اس بند دروازے کے پاس کھڑی رہو۔'' شیری نے بے رخی سے کہا اور ایک طرف کھڑی کار کی جانب بڑھ گیا۔ ثنا چاروناچار شیری کے ساتھ آکر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''میں بعد آؤں گی۔ میں معافی مانگ لوں گی۔ میں سب کے پاؤں پکڑلوں گی۔'' ثنا نے دل میں خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا اور سیٹ بیک پہ سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

ثنا کچن میں کھانے کی تیاری کررہی تھی۔ شیری لاؤنج میں اپنی ماں کی گود میں سر رکھے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ اچانک کچن سے ثنا کی چیختی ہوئی آواز باہر لاؤنج میں آئی۔

''اُف ایک تو تمہاری بیوی کو ذرا بھی برداشت نہیں دو گھڑی ماں کے پاس سکون سے بیٹھ جاؤ۔ دیکھو، اب کیا ہوگیا ہے؟'' شیری کی ماں نے منہ بنا کر شیری سے کہا۔

شیری بڑبڑاتا ہوا پاؤں میں سلیپر پہن کر کچن کی طرف بڑھا۔

''کیا ہوگیا ہے ثنا؟'' شیری جھنجلاتا ہوا۔ ثنا کے قریب آتے ہوئے بولا۔

''شیری میرا ہاتھ......'' ثنا نے اپنا ہاتھ شیری کے سامنے کیا۔ تیز چھری سے ثنا کی انگلی پہ گہرا کٹ لگا ہوا تھا اور خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔

''کبھی تو کوئی کام دھیان سے کرلیا کرو۔'' شیری کہہ کر پلٹا اور کیبنٹ سے فرسٹ ایڈ باکس نکال کرلے آیا۔

''لو بنڈیج کرلو۔ امی ناراض ہورہی ہیں کہ میں جب بھی اُن کے پاس بیٹھتا ہوں۔ تم جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرتی ہو۔ یہ لگالو۔ میں امی کے پاس جارہا ہوں۔'' شیری کہہ کر کچن سے باہر نکل گیا۔ ثنا حیرت سے شیری کی پشت کو دیکھتی رہی۔ درد ہاتھ میں زیادہ تھا یا دل میں ہوا تھا۔ ثنا اندازہ نہیں لگا پارہی تھی۔

اندھی محبت اندھی کھائی کی طرح ہوتی ہے۔ ایک بار اس میں گر گئے۔ پتا نہیں چلتا ہمارا وجود باقی بچے گا یا ہزاروں ٹکڑوں میں منقسم ہو جائے گا۔ مرد اور اس کی محبت کب بدل جائے یہ کوئی بھی نہیں جانتا۔ معشوق اور بیوی ہونے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے اور ثنا کو آج اپنی ماں کی باتیں یاد آرہی تھی۔ خون کے قطروں کے ساتھ ساتھ اس کے آنسو بھی بہہ رہے۔

''ثنا بھوک لگ رہی ہے۔ کھانا لگادو۔'' شیری کی آواز گونجی۔

''میں تمہارا اس سے بھی زیادہ خیال رکھوں گا۔'' ابھی کچھ دن پہلے ہی تو کہا تھا۔ ثنا بے بسی سے مسکرائی اور سر جھٹک کر فرسٹ ایڈ باکس کھول کر اس میں سے بینڈیج نکالنے لگی۔ بینڈیج کے بعد اسے کھانا بھی تو لگانا تھا۔

☆☆

سالگرہ نمبر



مکمل ناول

فرح بخاری

کنارِ خواب جو

صبح کے چھ بجے جبکہ نظامِ زندگی ایک سستی بھری انگڑائی لے کر دھیرے دھیرے رفتار پکڑنے کی تگ ودو میں ہوتا ہے، مسافروں کو یہاں سے وہاں پہنچانے کا فریضہ انجام دینے والے بس اسٹینڈز نسبتاً زیادہ بیدار اور فعال دکھائی دیتے ہیں۔ پھر صبحیں اگر مارچ کی آجائیں تو ویسے بھی پانچ ساڑھے پانچ بجے سے دن کھلنا شروع ہوجاتا ہے۔ تبھی چھ بجے یہاں دن کا سا سماں تھا۔ مختلف بسوں اور ویگنوں کے بے ہنگم ہارن مسافروں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے کے لیے ایک تواتر سے بجے جا رہے تھے۔ کنڈیکٹر حضرات ہارن کی آواز کو ناکافی سمجھتے اپنا راگ بھی الاپ رہے تھے۔ لیکن اگر ان ملی جلی آوازوں کا گلا گھونٹ بھی دیا جاتا تو سگریٹ اور ڈیزل کی کثیف بُو دُور دُور تک پھیل کر یہاں ایک بس اسٹینڈ کی موجودگی کا پتا دے رہی تھی۔ پھر بھانت بھانت کی ان بولیوں کے درمیان یہاں سے وہاں بھاگتے وہ مسافر جو جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچ جانے کی چاہ میں تھے، سستی ویگنوں بسوں کے اس اڈے پر موجود مسافر طبقہ بھی اوسط سے قدرے نچلے طبقے پر مبنی تھا۔

پرانی بوسیدہ روش پر سبک خرامی سے چل کر اس بس اسٹینڈ میں داخل ہونے والا وہ خوش پوش، خوش شکل نوجوان جیسے کیچڑ میں کنول جیسا تھا۔ ظاہری حلیہ اس کے خوش حال ہونے کے ساتھ ساتھ ماڈرن اور پڑھے لکھے ہونے کا بھی پتا دیتا تھا۔ لائٹ بلو جینز کے ساتھ لائم کلر کی چوڑے کف اور کالر والی جدید تراش کی شرٹ پہنے وہ شانوں پر میڈیم سائز کا جدید سفری بیگ ڈالے ہوئے تھا۔ ماحول میں قطعی طور پر مس فٹ اس خوبرو نوجوان کی جانب کئی نگاہیں ایک ساتھ اٹھی تھیں، پہلی نظر میں دیکھنے پر لگتا کہ نک سک سے تیار اس نوجوان نے خود پر خوب محنت کر رکھی ہے۔ لیکن دوسری نگاہ صاف اپنی ہی سوچ کی نفی کرتی کیونکہ ظاہری حلیے سے زیادہ اس کی شخصیت میں کچھ ایسا تھا جو اسے دوسروں سے ممتاز اور الگ کرنے کا باعث تھا۔ نوجوان کے چہرے کی غیر معمولی کشش کی سب سے بڑی وجہ اس کا چمکتا سنہری رنگ اور ہلکی ہلکی داڑھی تھی اور سیاہ داڑھی اس کے چہرے کو نجانے کیوں مذہبی سے زیادہ ماڈرن اور حسین لک دے رہی تھی۔

دیکھنے والی ہر نگاہ میں اُس لمحے ایک ہی تاثر تھا کہ شاید وہ جوان راستہ بھول کر ادھر نکل آیا ہے۔ جوان کے ماتھے پر کھنچی پریشانی کی بے شمار لکیریں اور چہرے کا تناؤ بتاتا تھا کہ ذہنی طور پر وہ اس ماحول سے بہت پرے کہیں اور پہنچا ہوا ہے۔ اس کا ہرگز

اپنے آس پاس پر دھیان نہیں تھا۔ راولپنڈی جانے والی بس میں سوار ہو کر وہ خاموشی سے ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سستی سگریٹ اور ڈیزل کی بو اگرچہ بری طرح دماغ پر چڑھ رہی تھی لیکن جوان کا حوصلہ اور برداشت قابل دید تھے۔ اپنا سفری بیگ اس نے



نیچے پیروں کے نزدیک رکھنا چاہا لیکن کیلے کے گلے سڑے چھلکوں اور کھائی ہوئی قلفیوں کی تمیوں بھری لکڑی کی اسٹکس دیکھ کر بیگ کو گود میں ہی پڑا رہنے دیا۔ سیٹ کی پشت سے سر لگا کر اب وہ خالی خالی نظروں سے رنگ برنگی چھت کو گھور رہا تھا۔ باقی مسافر بھی اب تیزی سے بھرنا شروع ہو گئے تھے۔ تقریباً دس منٹ بعد ڈرائیور نے سیٹ سنبھالی اور حرکت کے آثار نمودار ہوئے۔ پانچ سات منٹ بعد بس نے اڈے سے نکل کر ردھم پکڑا تو پچھلے کئی گھنٹوں کی شدید اعصابی جنگ سے نبرد آزما اس نوجوان نے پلکیں موند کر خود کو نیند کے سپرد کرنے کی کوشش کی لیکن بدقسمتی سے نیند بھی بس کے پہیوں سے لپٹی بے ہنگم بے ربط آوازوں کی صورت اس کے حواسوں پر مزید طاری اور زیادہ بھاری ثابت ہوئی۔ جیسے تیسے تین گھنٹوں کا سفر تمام ہوا اور آٹھ بجے بس راولپنڈی پہنچ گئی۔

اب یوں تو پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے یہیں راولپنڈی میں رات گزارنے کے لیے کوئی سستی جگہ تلاش کر کے اگلی صبح سے نوکری ڈھونڈنے نکلنا تھا۔ لیکن وہیں راولپنڈی بس اسٹینڈ پر ہی اچانک اس کی نظر مری جانے والی کوسٹر پر پڑی جو نکلنے کے لیے تیار کھڑی تھی تب بنا سوچے سمجھے اس نے ٹکٹ خرید لیا اور اب وہ مری کی طرف رواں دواں تھا۔ چیل کے دیو قامت درختوں کو تیزی کے ساتھ قریب سے گزرتے دیکھا وہ اس ایک نکتے پر غور کرتے حیرت زدہ تھا کہ آخر اتنی عجلت میں اس نے اپنا فیصلہ کیوں تبدیل کیا۔ شاید تقدیر میں لکھے فیصلوں کے ظہور پذیر ہونے کی راہیں یونہی سہل ہو جایا کرتی ہیں۔ پنیاں کے سرسبز میدانوں میں پھرتے گزشتہ سات روز کے دوران اس نے مستقبل کے کئی نئے منصوبے ترتیب دیے تھے، ذہن کو کریدا تو ان میں مری کہیں لکھا نظر نہیں آیا تو پھر کیوں اور کیسے......؟

بے حد و بے حساب ہریالی اور خوب صورتی کی طرف آنکھ اٹھاتے وہ پہلی مسکراہٹ تھی جس نے اس نوجوان کے چہرے کی دلکشی میں مزید اضافہ کیا تھا۔ بنا کسی پلاننگ اور عملی سوچ کے کسی خیال کا بلاوجہ دل میں جاگزیں ہونا اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے دل کا ٹھیک اس فیصلے پر جم جانا یونہی تو نہیں ہو سکتا۔ تناؤ کی کیفیت میں دھیرے دھیرے کمی سی آنے لگی۔ خود سے سوال جواب کے دوران طے پایا کہ اسلام آباد جیسے مہنگے شہر میں اپنے معیار کی نوکری پانے کے لیے جوتے گھسنے سے کہیں بہتر ہے مری جیسی مصروف تفریح گاہ پر کوئی ایسا کام ڈھونڈنا جس سے فوری طور پر کم از کم معقول آمدنی اور رہائش کے بنیادی مسئلے پر قابو پایا جا سکے۔ کام کی نوعیت اور اس کے امکانات پر غور کرنا ابھی باقی تھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے باقی سامان کے ساتھ ڈگریوں کی فائل رکھتے اس نے خصوصی خیال رکھا تھا کہ کوئی چیز مس نہیں ہونی چاہیے۔ یہاں کچھ بھول جانے کا مطلب اسے ہمیشہ کے لیے کھو دینا تھا۔ جس گھر سے وہ بدنامی، رسوائی اور دھتکارے جانے کے ڈھیر سے میڈل سجائے نکلا تھا اس کے مکینوں میں سے کسی کی آنکھ میں اسے اپنے لیے واپسی کا انتظار نظر نہیں آیا، اس لیے کسی سے کچھ منگوانے بھجوانے کی اُمید فضول تھی۔ زندگی اب شاید مرتے دم تک پردیس کی نذر ہونے والی تھی۔

''اور پردیس......'' سر جھٹک کر وہ حال میں واپس آیا۔ کوسٹر اب پہاڑ کے ٹیڑھے میڑھے راستوں کو تیزی سے عبور کرتی اوپر ہی اوپر رواں دواں تھی۔ جانے مری سے اس اچانک دوستی کا نتیجہ کیا نکلنے والا تھا۔ شاید برسوں کا ساتھ۔ شاید اگلے روز واپسی، ذہن بالکل خالی تھا۔ اس کی خالی جیب اور خالی پیٹ کی طرح۔

☆☆☆

بارش تھم چکی تھی، اب درختوں کے پتوں اور پودوں سے بچا کھچا پانی ہلکے ہلکے ٹپک کر گیلی گھاس میں شامل ہو رہا تھا۔ اگرچہ یہ مارچ کے آغاز کی بارش تھی لیکن ماحول میں ٹھنڈ کے احساس کو اچھا خاصا

بڑھا رہی تھی کیونکہ بہر حال یہ مری کا مارچ تھا۔ بارش اور گیلے لان کے باعث لڑکیوں کے گروہ کالج کے برآمدوں اور راہداریوں میں گھومنے لگے تھے اور بریک کی یہ ہلچل مشکل سے پندرہ یا بیس منٹ تک رہنے والی تھی۔ کنعان نے کینٹین کے ہنگامے سے ہٹ کر دور برآمدے کے آخری پرسکون گوشے میں بیٹھنے کو ترجیح دی۔ بچی کچی بارش کے منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے یہاں کی خاموشی نہایت سازگار تھی۔ لیکن وہ دانیہ رباب ہی کیا جو خاموشی کو زیادہ دیر خاموشی رہنے دے۔ کچھ ہی دیر میں چاٹ اور سموسوں کی پلیٹ بمع اپنے بیگ کے جیسے تیسے سنبھالتی اس کے سر پر وارد ہو چکی تھی۔

''اُووف......'' ایک پلیٹ کنعان کو تھما کر اس نے دھپ سے خود کو برآمدے کی سیڑھیوں پر گرایا۔ ''مصیبت میں ڈال دیتی ہے تمہاری یہ گوشہ نشینی کی عادت۔ آدھی بریک تو اسی آن جان میں نکل جاتی ہے۔ کنعان نے مسکرا کر کھانا شروع کرتے تبصرہ محفوظ رکھا۔

''ہاں تو فوراً شروع ہو جاؤ۔ کوئی آئیڈیا نکالا تمہارے زرخیز دماغ نے؟''

'' آرام سے کھا تو لینے دو۔'' کنعان اسی شرارتی انداز میں مسکرائے جا رہی تھی۔ ''اب اتنی بھی بدتہذیب نہیں کہ کھانے کے دوران بولوں۔''

''یہی تو مصیبت ہے۔ اِدھر کھانا ختم ہوگا، اُدھر بریک۔ یاد رکھنا کنعان! آج اگر باسط کو جواب نہ دیا ناں تو منگنی ٹوٹنے کی نوبت آ سکتی ہے۔'' دیا اپنی ہولناک ٹینشن گویاں بھی سموسہ کھاتے آرام و سہولت سے اس تک پہنچا رہی تھی۔

''مرو نہیں۔ میتھس کی کلاس آج آف ہے۔ میم صبیحہ آج چھٹی پر ہیں۔''

''ہائیں سچ۔'' دیا کی نعرہ نما چیخ پر کئی لڑکیوں نے مڑ کر دیکھا۔ دیا نے شرمندہ سا ہنس کر سب او کے کا اشارہ دیا۔ اور اب جھٹ پٹ پلیٹیں واپس کر آنے کے بعد وہ پہلے سے کہیں زیادہ جوش کے ساتھ اپنے ٹاپک پر پلٹی تھی۔

''بتاؤ ناں پھر۔ کیا جواب دوں باسط کو؟''

''میرے حساب سے ڈیئر۔'' کنعان نے بڑے تدبر سے آغاز لیتے آنکھیں نیم چندھیا کر گال پہ انگلی بجائی۔ ''تمہیں اپنے گھر والوں کے مزاج کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کرنا چاہیے۔ باسط تمہارا منگیتر ہے، شوہر نہیں کہ بلا چوں چرا تم اس کی بات مان لو۔''

''لیکن میں اسے انکار نہیں کرنا چاہتی۔ تم جانتی ہو وہ بہت اچھا ہے۔'' دیا ایک دم ڈھیلی پڑی۔

''گھر والوں کے مزاج کو دیکھنا مطلب...... صاف انکار۔''

''اتنا ہی اچھا ہے تو ضد چھوڑ دے۔ بات چیت تک کی اجازت نہیں ہے، تم دونوں کو پھر بھی چوری چھپے رابطے میں ہو۔ کیا اتنی بے ایمانی کافی نہیں تھی کہ اب یہ ملنے کا شوشا۔''

''یار سمجھو ناں۔'' دیا نے منہ بسورا۔ ''وہ بس ایک بار آمنے سامنے ملنا چاہتا ہے۔ منگنی کی تقریب بھی ابو نے ساتھ بٹھا کر کرنے نہیں دی۔ یاد نہیں تمہیں؟ تیار کر کے مجھے کمرے میں بٹھا دیا اور اماں صاحبہ چند خواتین کے ساتھ آ کر انگوٹھی پہنا گئیں۔ باسط کو بس تصویریں دکھانے کا احسان کر دیا، ان میں بھی بھاری بھرکم کپڑوں، جیولری اور میک اپ میں کہاں ''اوریجنل دیا'' کی سمجھ آئی ہوگی۔''

''جب تم طے کیے بیٹھی ہو کہ مل کر ہی جان چھوڑو گی تو مجھ سے مشورے کا مطلب؟'' کنعان بھی آسانی سے میلٹ (پگھلنے) ہونے والی نہیں تھی۔

''تم جانتی ہو۔ تمہاری ہاں سے مجھے کتنی تسلی ہوتی ہے۔'' دیا کی جواباً اپنی مجبوریاں تھیں۔ کنعان ہنس پڑی۔

''وہ ''ہاں'' جو مجھ سے گن پوائنٹ پہ کروانا چاہتی ہو۔''

''اچھا چلو۔'' دیا نے رخ پورا اس کی جانب موڑتے ایک نئی بحث کا آغاز کیا۔ ''میں تم سے پوچھتی ہوں۔ میری جگہ اگر تم ہوتیں تو کیا کرتیں اس

موقع پر؟"

"میں......؟" کنعان اخروٹ کے درخت سے نظر ہٹاتے دکھ سے مسکرائی۔ "امی زندہ ہوتیں تو اپنا مسئلہ یقیناً ان ہی سے شیئر کرتی لیکن......" کنعان کی لیکن میں حسرت دیا اس اس شدت سے پنہاں تھی کہ فوری طور پر دیا بالکل ہی چپ ہوگئی۔ صبح سے شام تک نان اسٹاپ اپنے قصے اس سے ڈسکس کرتے وہ کبھی کبھی اس کی تنہائیوں کو بالکل فراموش کر بیٹھتی تھی۔

"میرا مطلب ہے تم ایک بار اپنی امی سے بات کر کے دیکھو۔" کنعان نے موڈ کا رنگ بدلا۔ "وہ تمہارے ابو کے مزاج کو بھی جانتی ہیں اور نئے رشتے کی نزاکتوں کو بھی۔ اگر باسط کا اصرار انہیں جائز لگا تو وہ خود تمہیں اس سے ملوانے میں مدد کریں گی۔"

"مدد......" دیا نے تھک کر ہاتھ گرائے۔ "فٹ سے جوتا اٹھا کر میری پیٹھ کا نشانہ لیں گی۔ نہ انہوں نے کبھی مجھ سے دوستی کرنے کی کوشش کی نہ ہی سمجھنے کی، پھر وہ اتنی پڑھی لکھی بھی نہیں۔"

"لیکن پھر بھی وہ تمہاری خیر خواہ ہیں۔" کنعان نے اس کے ہاتھ پہ نرمی سے اپنا ہاتھ رکھا۔ "ماں پڑھی لکھی ہو یا نہیں۔ اولاد کی سچی ہمدرد ہوتی ہے اور اس کے حق میں بہتر فیصلہ ہی کرتی ہے۔"

"تو یعنی میں باسط کو انکار کردوں۔" دیا یہی نتیجہ نکال پائی۔

"چلو یہی سمجھ لو۔" کنعان نے مسکرا کر تائید کی۔ "لیکن تمہیں انہیں باسط کے خیالات سے آگاہ کرنا چاہیے، آخر کو انہوں نے تمہارا رشتہ طے کیا ہے انہیں ہر بات کا علم ہونا چاہیے تاکہ کل کو تمہارے لیے کوئی مسئلہ......"

"اُف میری ماں بس کرو۔" دیا نے تپ کر اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔ کنعان گھبرا کر پیچھے ہوئی۔ انداز میں صاف انجان بننے کی ایکٹنگ تھی۔

"تم نہیں سمجھ سکتیں محبت کی مجبوریاں۔ جب تک تمہیں خود یہ ادراک نہ ہو جائے۔"

"پھر تو کبھی نہیں ہوسکتا۔" وہ نفی میں سر ہلاتے اعتماد سے مسکرائی۔

"ہیں......تم کیا محبت پروف اُتری ہو؟" دیا اب تعجب سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں شاید......" کنعان نے کندھے اچکائے۔ "کیونکہ میرا مزاج ان باتوں کی طرف مائل نہیں ہے، مجھے لگتا ہے یہ طبیعت کا میلان ہوتا ہے، مختلف معاملات کی طرف ہمارا جھکاؤ ہی ہمیں اس کی طرف راغب کرنے کا باعث بنتا ہے۔"

"یہ محبت ہے ڈیئر فرینڈ، کوئی ہابی نہیں جسے تم میلان ورجحان سے جوڑ رہی ہو۔" دیا اس کی نسبت زیادہ سنجیدہ تھی۔ "اور تمہارے خیالات تو کچھ ایسا ظاہر کررہے ہیں کہ جس بندے کی طبیعت اس طرف مائل نہ ہو اسے کبھی محبت نہیں ہوتی۔ کمال ہے۔"

"ہاں بالکل۔ بہت سے لوگ ہیں جنہیں کبھی اس ٹائپ کی محبت نہیں ہو پائی۔ بعض کو زندگی کے جھمیلوں نے اس کی فرصت نہیں دی اور بہت سے ایسے ہوں گے جو اسے خرافات سے زیادہ کچھ سمجھنے کو تیار نہیں ہوں گے۔"

"ہاں۔" دیا نے سر اثبات میں ہلایا۔ "مانا کہ بہت سے لوگ ہیں جنہیں اس خوب صورت جذبے کی ہوا بھی چھو کر نہیں گزری، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ محبت "وارد" ہوتی ہے اور کبھی کبھی اس کا درود ایسے لوگوں پر بھی ہو جاتا ہے جنہیں لفظ محبت بھڑ کی طرح کاٹتا ہے۔ اس لیے میری پیاری دوست......"

دیا نے بات ادھوری چھوڑ کر مسکراتے ہوئے کنعان کی آنکھوں میں دیکھا۔ "محبت جیسے بے ساختہ جذبے کا کسی میلان ورجحان سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ کبھی بھی، کسی بھی عجیب وغریب حالت میں کسی بھی عجوبہ سچویشن میں کسی کو بھی ہوسکتی ہے۔ بنا کسی لوجک، سوچ اور پلاننگ کے۔ اور بس یہی سچ ہے۔ لیکن ہاں کسی حد تک تم بھی ٹھیک ہو، جس میلان و رجحان کا تم ذکر کررہی ہو، اس کے دائرے میں واقعی ایسے لوگ آتے ہیں جن کی ہر نکڑ پر کسی نہ کسی سے

آنکھیں بھی چار ہو جاتی ہیں اور پلک جھپکتے میں اسے وہ محبت بھی کہہ بیٹھتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں کنعان، جو محبت کے اصل مفہوم سے آگاہ ہی نہیں۔"

"تو یعنی ...... مجھے بھی ہو سکتی ہے؟" کنعان کا اعتماد متزلزل ہوا۔

"بالکل ہو سکتی ہے۔ لیکن ......" دیا نے کچھ سوچ کر اس کی صورت دیکھی جس کا صرف اعتماد ہی ڈانواں ڈول نہیں ہوا تھا۔ چہرے کا رنگ بھی اُڑ چکا تھا۔ لہجہ بھی ڈوبنے والوں جیسا۔ "اس میں اتنا گھبرانے کی۔ کیا بات ہے، ایسی دلچسپ وارداتوں کا تو دل منتظر رہتا ہے۔"

"نا بابا۔" کنعان نے خوف سے جھرجھری لی۔ "جتنا محبت کے بارے میں جانا، پڑھا اور دیکھا ہے۔ اس کی شدت، بے چینی، سدھ بدھ کھو دینا، کچھ بھی کر گزرنا ......"

"خیر ...... اس آخری خدشے سے تو میری بھی توبہ۔" دیا اس کی بات کاٹ کر ہنس پڑی۔ "کچھ بھی کر گزرنا تو غالباً خرابی ہے دماغ کی۔"

"او کے۔" کنعان نے مسکرا کر ہاتھ آگے بڑھایا۔ "تو پھر اس ایک بات پر متفق ہونے کی خوشی میں وعدہ کرو کہ بنا سوچے سمجھے بھی باسط بھائی کی محبت میں کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گی۔"

"ہوں۔" اپنے متعلق کنعان کا کنسرن دیکھ کر دیا نے بھی مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"بائی داوے۔ آئیڈیا کیا تھا باسط بھائی کے دماغ میں؟"

"کسی ریسٹورنٹ میں لنچ وغیرہ۔"

"او ......" کنعان نے لب سکوڑے۔

"خطرناک آئیڈیا ہے۔ اور اب؟ ان کی ناراضی؟"

"نہیں۔" دیا اب ریلیکس نظر آ رہی تھی۔

"دوسرا آپشن یہ تھا کہ کالج آنے جانے کے دوران کسی روز وہ سرِ راہ مجھے دیکھ لے گا۔"

"تو یہ بھی کیا کم ہے۔" کنعان بیگ کندھے پر ڈالتے اٹھ کھڑی ہوئی جبکہ دیا نے کلائی پکڑ کر بے ساختہ کسی خیال سے اسے روکا۔ کنعان نے تعجب سے رخ موڑا۔

"کیا ہوا؟"

"تم بھی مجھ سے وعدہ کرو۔" دیا کے دوست دار لہجے سے نرمی جھلک رہی تھی۔ "لائف میں کبھی بھی مجھ سے کچھ بھی شیئر کرنے سے ہچکچاؤ گی نہیں۔ بھلے اپنے حق میں اچھی نہیں ہوں لیکن تمہیں ہمیشہ اچھی اور نیک صلاح ہی دوں گی۔ ان شاء اللہ۔"

"مجھے تمہاری نیت پر کوئی شک نہیں ہے۔" کنعان نے اس کا بازو کھینچا۔

"ہاں لیکن میری عقل اور سمجھ پر تو ہو سکتا ہے۔" وہ بھی مسکراتے ہوئے ساتھ چلنے لگی۔

"اچھا بتاؤ نا۔ کیا واقعی محبت میں بندے کی مت وت ماری جاتی ہے؟" کنعان اب دیا کو چھیڑ کر لطف لے رہی تھی۔

"ہاں کبھی کبھی۔" دونوں اب روش پر چلتے لائبریری کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

"میں تو کبھی کسی مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں۔" کنعان نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"اور بنا آنکھ وانکھ اٹھائے ہی محبت ہو گئی۔ جیسے ......" وہ سوچنے لگی۔ "جیسے موبائل فون وغیرہ۔"

"استغفر اللہ۔ یہ فون شون کی محبت تو نام سے ہی بھیانک لگتی ہے۔ میں تو نیا نمبر دیکھ کر کال ہی اٹینڈ نہیں کرتی، بہت ہوا تو ابو کو پکڑا دیا۔"

"تم نے تو واقعی محبت میں گرفتار ہونے کے بھی امکانات کو خود سے کوسوں دور رکھا ہوا ہے۔" دیا اب اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہو رہی تھی۔

"اور کیا۔ بات میرے حساب سے اب بھی وہی ہے۔ یعنی بندے کے مزاج کا ایسے معاملوں کی طرف راغب ہونا۔"

"تم سے بحث بے کار ہے بھئی۔ لیکن ہاں۔" لائبریری کا دروازہ کھولتے وہ ہینڈل پر دباؤ دے کے رکی۔ "چشمِ تصور سے ایک ایسے دن کو میں دبے

پاؤں کنعان رفیق کی زندگی میں داخل ہوتے دیکھ رہی ہوں جب اس کی ساری پلاننگ دھری رہ جائے گی اور......"

"شٹ اپ۔" کنعان نے ہاتھ میں پکڑا پاؤچ پھینتے ہوئے دیا کے کندھے پر مارا اور وہ جھکائی دیتے اندر داخل ہوگئی۔

☆☆☆

"یہ زندگی دو دن کی ہے، ایک دن تمہارے حق میں اور ایک دن تمہارے مخالف۔ جو دن تمہارے حق میں ہو اس دن غرور مت کرنا اور جو دن تمہارے مخالف ہو اس دن صبر کرنا۔"

مری بس اسٹینڈ پہ کھڑے اس نے بٹوے سے کب کا تہ کیا ہوا پانچ سو کا اکلوتا نوٹ ہتھیلی پر رکھا تو کبھی کا پڑھا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول یاد آ گیا، ساتھ ہی پہلے امی اور پھر ماما جی کی یاد آ گئی۔ برسوں پہلے یہ پانچ سو کا نوٹ ماما جی نے عید کے موقع پر دیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد امی نے کہا کہ ماما جی کے نوٹ کو خرچ مت کرنا ان کے دیے پیسوں میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ اسے بٹوے میں سنبھال کے رکھ دو اور اسے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اس کی جیب تو ہمہ وقت ہزاروں روپے سے بھری رہتی تھی، لاپروائی سے امی کا حکم بجالایا۔ لیکن آج بہر حال اسے اس قیمتی نوٹ میں ڈھیر ساری برکت کی ضرورت تھی۔ کیونکہ لے دے کے فی الحال یہی اس کا کل سرمایہ تھا۔

بدقسمتی نے چاروں طرف سے ایک ساتھ وار کیا تھا۔ ذلت، بدنامی رسوائی گھر سے بے دخلی سب ایک طرف، عین اس موقع پر جیب کا بھی خالی ہونا سوائے تقدیر کی ستم ظریفی کے کچھ نہ تھا۔ بینک اکاؤنٹ نامی چیز اگرچہ اب تک اس کی زندگی میں شامل نہیں ہوئی تھی لیکن اباجی ہمیشہ کھلا جیب خرچ دیا کرتے اور وہی اس کی جیبوں، سائیڈ ٹیبلو کی درازوں میں دھرا رہتا۔ حتیٰ کہ ایک ہفتہ پہلے جبکہ سب کچھ معمول پر تھا اس کی جیب میں پورے اٹھارہ ہزار اور کچھ روپے تھے۔ دس بجے کے قریب ایک دوست یہ کہہ کر اس میں سے آٹھ ہزار روپے ادھار لے گیا کہ اسے اپنی بائیک کی مرمت کروانی تھی۔ اور باقی کے دس ہزار وہ پنیاں میں پناہ دینے والے اپنے محسن کے ہاتھ پر از راہ شکر یہ دھر کر اسے حیران چھوڑ آیا تھا۔

مختصر یہ کہ اب بچ پردیس ایک وہ تھا اور ایک یہ پانچ سو کا نوٹ۔ تو یعنی آج اسے ہر حال میں اپنے لیے کوئی کام تلاش کرنا تھا، تاکہ کچھ رقم ہاتھ آ جائے تو رات گزارنے کا ٹھکانا ہو سکے۔ لیکن فی الحال اس کے لیے ہر چیز سے اہم ناشتے کا معرکہ سر کرنا تھا۔ معرکہ اس لیے کہ مری جیسی جگہ پہ سستے ترین ناشتے کی تلاش اسے معرکہ سر کرنے سے کم نہیں لگی، کم از کم ہاتھ پہ دھری رقم دیکھ کر تو اس کا یہی خیال تھا۔ چاہتا تو کسی سپر اسٹور وغیرہ سے ایک آدھ بسکٹ کا پیکٹ لے کر بھی بھوک مٹا سکتا تھا لیکن اس نے خود ہی اپنے خیال کو رد کر دیا کہ بعد میں کہیں شدت کی بھوک نے ستایا تو سب مصلحتیں بھول بھال وہ پورا نوٹ ہی کسی فاسٹ فوڈ شاپ میں نہ جھونک دے، لہٰذا کسی مناسب اور سستے ہوٹل کی تلاش میں بجائے مال روڈ کی طرف جانے کے اس نے بس اسٹینڈ سے پیچھے کی راہ لی۔ جانے کیوں پر اس لمحے وہ لوگوں سے گھبرا رہا تھا۔

خاموشی کو ساتھی بنائے آج آٹھواں روز تھا اور اس تجربے کا حاصل وصول کچھ "عہد" تھے جن کو پورا کرنے کے لیے عملی پریکٹس غالباً شرط تھی۔

حیرت نے دھیرے دھیرے کچھ انکشاف کے سے انداز میں اس پر اترنا شروع کیا تھا۔ سوچوں میں ڈوبتے اور پھر ڈوب کر ابھرتے اس ایک پوائنٹ پر اس کا تعجب مجتمع ہو جاتا کہ کہاں جا چھپی تھی یہ ذہانت اور سوچ بچار اُس وقت۔ جب وہ دین و دنیا سے بے بہرہ اپنی بربادی کے سامان جمع کر رہا تھا، راتوں رات ایسی چوٹ پڑی کہ ساری بھولی بسری عقل و دانش ایک ساتھ آن وارد ہوئی تھی۔ بے گھر ہوتے ہی عملی سوچ کچھ ایسے عود کر آئی کہ اب نہ وہ پیچھے کے بارے میں سوچ رہا تھا نہ پیچھے والوں کے بارے

میں۔ وہ صرف آج کو دیکھ رہا تھا اور آگے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اپنے کیے پر ندامت ہی اتنی تھی کہ بیٹھ کر سوچنے میں سراسر شرمندگی اور پچھتاوا دامن گیر ہونے لگتے۔ ''گزر چکے'' کو گرد سا دامن سے جھاڑ کر آگے بڑھنا ہی اسے جینے پر آمادہ رکھ سکتا تھا۔

چلتے چلتے وہ ٹھٹک کر رُکا۔ بے دھیانی میں وہ کچھ زیادہ ہی آگے نکل آیا تھا۔ دُور دُور تک آبادی کے ہی آثار نہ تھے، ہوٹل یا ریسٹورنٹ کیا خاک ملنا تھا۔ اس نے مایوس ہو کر دوبارہ پیچھے جانے کا ارادہ کیا اور تبھی سڑک سے کچھ نیچے پتھریلے ڈھلوانی راستے کے اختتام پر درختوں کے جھنڈ سے پرے دھواں اور ہلکی ہلکی سریلی آواز سی سنائی دینے لگی۔ وہ بجائے ڈھلان اترنے کے سڑک پر ہی چلتے ذرا اور آگے آیا تو جھنڈ کے بعد وہ ایک بوسیدہ سا ڈھابے نما چائے کا ہوٹل تھا۔ چھجے سے لٹکی پتیل کی چینکیں دور سے دکھائی دے رہی تھیں۔ گانے کی آواز بھی اب صاف سنائی دینے لگی تھی۔

اساں تاں کر کے کُردے ہاسے، تیں تے ہتھاں دی چھاں
پیار تیڈے چا کملا کیتا، ایڈے کملے ناں ں ں
(ہم تو تمہارے اوپر اپنے ہاتھوں کا سایہ بنا کر چلتے تھے۔ تمہارے پیار نے ہمیں پاگل کر دیا ورنہ ہم اتنے بھی پاگل نہ تھے)

اور بڑے گھنٹوں بعد یہ دوسری مسکراہٹ تھی جو بے ساختہ نوجوان کے لبوں کو چھو گئی تھی۔ وہ کچھ سوچ کر ڈھلان اترنے لگا۔ چھوٹی سی دکان کے آگے بانس اور چھجے کی مدد سے چوڑا برآمدہ بنایا گیا تھا۔ جس کے نیچے میزوں کرسیوں کی جگہ چارپائیاں اور لمبے لکڑی کے بنچ سرونگ کے لیے رکھے گئے تھے۔ کسی قسم کا رش بھی دیکھنے میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی سامنے کی دن کے ساڑھے دس بجے تھے پھر بھی معلوم نہیں کیوں ناشتے کا ٹائم ختم لگ رہا تھا۔ ڈھابے پر موجود تین لوگ حیرت سے اسے قریب آتا دیکھ رہے تھے۔ جن میں سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ ایک بائیس پچیس سال کا جوان اور ایک دس گیارہ سالہ لڑکا۔

''چائے ملے گی؟'' اس نے باری باری حیرت سے تکتے چہروں کو دیکھا جو دل ہی دل میں غالباً یہ سوچ رہے تھے کہ نوجوان شاید ابھی ان سے کوئی ایڈریس وغیرہ پوچھے گا۔

''جی جی...... کیوں نہیں۔ آیئے۔'' ادھیڑ عمر آدمی نے فوراً چارپائی گھسیٹ کر نزدیک کی۔

''ساتھ کچھ کھانے کو بھی......''

''حکم کریں صاحب! بسکٹ، کیک، نان، پراٹھا، ڈبل روٹی۔''

''چائے اور ایک پراٹھا۔'' اس نے بیگ اتار کر چارپائی پر رکھا۔

''فخری۔ رب نواز سے کہو جلدی سے ایک تازہ پراٹھا اور چائے کا کپ تیار کرے۔ صاحب ساتھ میں کچھ انڈہ وغیرہ۔''

آدمی نے دوبارہ نوجوان کی طرف دیکھا جس نے جھٹ نفی میں سر ہلایا تھا۔ فی الحال کسی ''بڑے آرڈر'' کا وہ ہرگز متحمل نہیں ہو سکتا تھا، دل میں تو یہ خیال بھی آیا کہ چائے اور پراٹھے کی قیمت بھی پوچھ لے لیکن جس قدر وہ اس کی پرسنالٹی سے مرعوب نظر آ رہے تھے، اپنا سوال اسے کچھ مناسب نہیں معلوم ہوا۔

''پیچھے کہیں سے آ رہے ہیں صاحب؟'' ادھیڑ عمر آدمی جو ڈھابے کا مالک لگتا تھا، ہاتھ سے مری کی مخالف سمت والے روڈ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اچھے ہوٹل تو آگے بہت ہیں؟'' صاف گوئی سے استفسار کرتے ہوٹل کے مالک نے پہلی بار اسے چونکنے پر مجبور کیا۔ ایک شگفتہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل گئی۔

''تو یہ ہوٹل ''اچھا'' نہیں ہے؟'' نوجوان کا شرارتی سوال اتنا بے ساختہ تھا کہ ہوٹل کا مالک قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''ہاں۔ میرے کہنے کا یہی مطلب تھا۔'' وہ اب محظوظ ہو کر سر ہلا رہا تھا۔ ''دراصل باؤ جی۔ یہ جو دائیں طرف بڑی بلڈنگ بن رہی ہے ناں۔'' اس نے مڑ کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ لہجہ اس بار سنجیدہ تھا۔

"وہاں اچھی خاصی لیبر کام کرتی ہے۔ بس ان ہی کے ناشتے پانی کی خاطر یہ چھوٹا سا ہوٹل کھول لیا۔ وہ بھی دُور جانے سے بچ جاتے ہیں اور ہمیں بھی چار پیسے کمانے کا موقع مل جاتا ہے۔"

"اوہ...... تو یہاں صرف لیبر کے لوگ آتے ہیں۔"

"زیادہ تو وہی آتے ہیں پر کوئی منع تھوڑی ہے۔" وہ ہنسا۔ "جس کا دل چاہے لگے بسم اللہ۔ پر باؤ جی۔ کم ہی کوئی اِسے اس قابل سمجھتا ہے، اور آپ جیسے صاحب لوگ تو بالکل بھی نہیں۔ میں سمجھا آپ کسی کا پتا پوچھتے آئے ہوں گے۔

آدمی خاصا باتونی لگتا تھا اور دلچسپ بھی۔ قدرے فربہی مائل، گول چہرے اور سامنے سے اُڑے بالوں والے قریب پچپن سے ساٹھ کے بیچ کی عمر کے اس آدمی کی مسکراہٹ بڑی نرم اور انداز خوب دوستانہ سا تھا۔ جوان نے اپنے دل و دماغ سے جمود کی دھند اور شدید تناؤ کی کیفیت کچھ چھٹتی محسوس کی۔

"پھر تو حیرت ہوگی آپ کو یہ جان کر کہ شہر سے دُور ایسی ہی کوئی جگہ تلاش کرتا ہوا آیا تھا۔

"اچھا؟" آدمی نے تعجب سے ابرو کھینچے۔

"کسی نے بتایا تھا اس کے بارے میں یا کسی کا پوچھتے ہوئے آئے ہیں؟ جانے آدمی کی سوچ نے کس سمت کا سفر کیا وہ نفی میں سر ہلاتے ہنس پڑا۔

"کسی نے نہیں۔ سب جیب کی مجبوری ہے۔ کسی سستے ہوٹل کی تلاش میں اتنی دُور تک آیا ہوں۔"

"ضرور باؤ جی کی جیب کسی نے کاٹ لی ہوگی۔ چھوٹے لڑکے نے ناشتے کی ٹرے سامنے رکھتے تدبر سے تبصرہ کیا۔ "یہاں بہت خیال رکھنا پڑتا ہے صاحب۔ ذرا سی چوک ہوئی اور......"

"ارے نہیں چھوٹو۔" جوان نے پیار سے اس کے بال بکھیرے۔ "قسمت نے جیب کاٹ لی ہے۔"

"اوئے کیا باتیں لے بیٹھے ہو فخری۔ صاحب کو ناشتا تو آرام سے کرنے دو۔"

"تو تمہارا نام فخری ہے؟" جوان نے مسکرا کر اس سفید گڈے سے لڑکے کو دیکھا۔

"جی صاحب۔ پورا نام فخر عباس۔ اور یہ میرے نانا میاں نذر حسین۔" فخری نے اچانک ہی مستعد ہو کر سبھاؤ سے مکمل تعارف دیا۔

میاں نذر حسین اور جوان ایک ساتھ ہنس پڑے۔

"اور آپ صاحب جی۔" چھوٹی چھوٹی مگر چمکتی شفاف آنکھوں میں اشتیاق لیے فخری آگے کو ہوا۔

"میرا نام سوار ہے۔" وہ ٹھٹکے کو رُکا۔ "سوار علی۔"

"بہت پیارا نام ہے۔" وہ اب چہک رہا تھا۔

میاں نذر نے پیار سے اسے ساتھ لگایا۔

"میری بیٹیاں میانوالی میں بیاہی ہوئی ہیں۔ وہاں ہمارا پورا خاندان ہے۔ یہ میری بڑی بیٹی کا لڑکا ہے۔ پانچ بہن بھائی ہیں ماشاء اللہ۔ داماد میرے کو اللہ خوش رکھے۔ اسی نے ہم بوڑھے میاں بیوی کے اکیلے پن کو دیکھتے ہوئے اِسے یہاں رکھ چھوڑا ہے۔ اِدھر ڈھابے کے پیچھے ہی ہے ہمارا گھر۔ دن کو تو اسکول جاتا ہے، بعد کا وقت میری مدد کرواتا ہے۔ آج یونہی نانی سے کہلوا کر چھٹی کر لی۔ بڑے لاڈ اٹھاتی ہے اس کے۔ میاں نذر اسے کھانے کی طرف متوجہ کرتے خود ہی بتانے لگے۔ سوار نے کھانا ختم کر لیا تو فخری برتن سمیٹ کر آگے بڑھ گیا۔ سوار بھی میاں نذر کی سنگت میں چلتے ڈھابے کے کاؤنٹر نما حصے میں آیا۔ جیب سے رقم نکال کر میاں جی کی طرف بڑھائی۔

"آرام سے دے دینا سوار باؤ۔" میاں نذر نے مسکرا کر دوبارہ اس کی مٹھی بند کر دی۔ "اب تو آتے رہو گے۔"

"دوبارہ بھی آؤں گا میاں جی۔ لیکن ابھی آپ رکھ لیں۔" سوار نے نوٹ ان کے سامنے رکھا۔

"کب تک رُکیں گے مری؟" انہوں نے حقہ نکالنے کے لیے گلا کھولا۔

"ابھی تو آج پہلا دن ہے۔ کام کی تلاش میں نکل رہا ہوں۔ دیکھیں قسمت کتنا ساتھ دیتی ہے۔" وہ مسکرایا۔

''اچھا؟'' میاں جی کا ہاتھ رُکا۔ ''میں سمجھا گھومنے پھرنے آئے ہوں گے...... کیسا کام؟''

''معلوم نہیں۔'' سوار نے لاعلمی سے کندھے اُچکائے۔ ''بس دعا کیجیے گا۔'' اس نے بیگ اٹھا کر باہر کارخ کیا پھر چند قدم پہ جا کر کچھ سوچتے ہوئے رکا۔

''ایک زحمت دینا چاہتا ہوں۔'' وہ پلٹ کر دوبارہ ان کے نزدیک آیا۔ ''آپ کے لیے ممکن ہو تو میرا یہ بیگ شام تک اپنے پاس رکھ لیں۔''

''آرام سے چھوڑ جاؤ باؤ۔ پوچھنے کی کیا بات ہے۔ اب اِسے اُٹھا کر کہاں گھومتے پھرو گے۔'' وہ کاؤنٹر سے نکل کر سامنے آئے۔

''بہت شکریہ آپ کا۔ آپ بس ایک مرتبہ چیک کرلیں اِسے۔''

''ارے نہیں سوار بیٹا۔'' انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے روکا۔ ''چیک کیا کرنا۔ تم بس اپنا قیمتی سامان اور رقم وغیرہ اپنے پاس رکھ لو۔ باقی دیکھنا کیا ہے۔''

''احتیاط اچھی چیز ہے میاں جی۔ یونہی کسی پہ بھروسا کرلینا کبھی کبھار اپنے لیے پریشانی کا باعث بن جاتا ہے۔ موجودہ ملکی حالات تو یوں بھی کسی لاپروائی کے ہرگز متحمل نہیں ہوسکتے۔'' اس نے رسان سے کہتے خود ہی اپنا بیگ چارپائی پر اُلٹ دیا اور حالانکہ پردیس میں کسی پر بھروسا کرنے کا یہ تو اس کا بھی پہلا تجربہ تھا جبکہ نئی منزلوں کی طرف سفر کرتے اس کا خود سے تہیہ تھا کہ کسی کا جلد اعتبار نہیں کرے گا۔ لیکن خیر انسانوں سے بھری اس دنیا میں انسانوں سے گریز بھی ناممکن ہے۔ پہلے ہی مرحلے پر اپنے ایک عہد سے روگردانی نے پہلا سبق یہ دیا کہ خود سے کیے وعدوں کی راہ میں گنجائشیں نکالنے کا مرحلہ بھی شاید ہر موڑ پر پیش آئے۔ پھر کھینچ لینے کی طاقت تو ہوتی ہی ان ہی راہوں میں ہے جن پر جانے سے دانستہ خود کو روکا جائے۔

''کاش کہ ہمارے ہاں ہر کسی کی سوچ تمہارے جیسی ہو جائے، برائی تو مانو جڑ سے ہی اُکھڑ جائے گی۔'' میاں جی بری طرح متاثر لگے۔

''اپنے الفاظ واپس لے لیں میاں جی۔ سوار نے دوستانہ انداز تکلم اپناتے انہیں وارن کیا۔ ''یہ جملہ'' بددُعا تو ہوسکتا ہے بے چاری انسانیت کے لیے۔ دعا ہرگز نہیں۔''

''کیوں چلا رہے ہو سوار باؤ۔ نذر حسین نے بھی دنیا دیکھی ہے۔'' انہوں نے ابرو سے اشارہ کیا کہ سامان وہ واپس رکھ دے۔ ''دُور سے ہی پتا چلتا ہے کہ کوئی اچھا خون ہو۔''

''اِسی خون کے ساتھ تو دغا کر بیٹھا ہوں۔'' سوار کی تھکی تھکی آہ اور جملہ اتنے بے ساختہ تھے کہ اس بار میاں نذر بھی جواباً کچھ نہیں کہہ پائے۔

☆☆☆

''بی بی جی۔ ندیم صاحب آئے ہیں۔''

''ہوں؟'' ثمامہ نے مُندی مُندی آنکھوں سے دیکھتے کروٹ بدلی۔ ''سونو اسکول چلا گیا تھا۔ آج تو ضد نہیں کی؟''

''جی نہیں بی بی۔''

''اچھا ندیم صاحب کو ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ میں آتی ہوں۔''

اُٹھ کر بیٹھتے اس نے کھلے بالوں کو ہاتھوں پر لپیٹا۔ وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ دن کے گیارہ بجے تھے۔ وال کلاک سے نظر کیلنڈر پر پڑتے ہی بے ساختہ زیرلب مسکرا دی۔

''دیر تک سونے کے دن گئے ثمامہ ابراہیم۔ اب تو کمر کس کے میدان میں اُترنے کا وقت ہے...... اُف......'' مستقبل کا تصور ذہن میں اُبھرتے ہی اُسے جھرجھری سی آگئی۔ لب البتہ ابھی تک مسکا رہے تھے۔ وہ آنے والے دنوں کی دھوپ چھاؤں سے نمٹنے کے لیے کچھ کچھ خوف زدہ تھی تو بہت حد تک اپنی تیار کردہ پلاننگ کو فیس کرنے کے لیے ایکسائٹڈ بھی تھی۔ ''کچھ نیا'' کرنے کی لگن ہمیشہ اسے یونہی گدگدا دیا کرتی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے میں اپنا حسین سراپا دیکھتے وہ ایک ادا سے مسکرائی۔

''اِس مرتبہ حالات تھوڑے مختلف ضرور ہیں لیکن ثمامہ آج بھی وہی ہے۔ رنگی، اِنرجیٹک، حوصلہ

مند اور اپنے گول تک پہنچنے کے لیے ثابت قدم۔“ لاشعوری طور پر گردن میں تھوڑا سا تناؤ آ گیا تھا۔ خود کو داد دینے کے لیے وہ اسی طرح اپنی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خود کو بڑھاوا دیا کرتی تھی۔

”آداب بیگم صاحبہ۔“ ندیم اسے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر مؤدب سا اٹھ کھڑا ہوا۔

”آداب ندیم صاحب۔ تشریف رکھیے۔“

ثمامہ پندرہ منٹ میں تیار ہو کر اپنے مہمان کے مقابل موجود تھی۔ اس کی آمد سے کمرے میں ہلکی ہلکی مسحور کن سی خوشبو بکھر گئی تھی۔

ندیم نے دل ہی دل میں اس کے پہناوے کی داد دی۔ نہایت قیمتی لیکن دھیمے اور سوبر کلرز کے کپڑوں میں مکمل مگر غیر محسوس میک اپ کیے وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ماحول کو اپنے اثر میں کر لینے کے ہنر سے خوب خوب آگاہ لگ رہی تھی۔

”میم۔ اینکسی کا کام مکمل ہو گیا ہے۔ خالد رضا آپ کی آمد کے بارے میں جاننا چاہ رہے تھے۔“

”میں تو چاہتی ہوں ندیم صاحب۔ آج ہی یہاں سے چلی جاؤں لیکن یہاں کے معاملات تو آپ جانتے ہی ہیں۔ بہت سوچ سمجھ کر وائنڈ اپ کرنا ہوگا۔“

”میں سمجھ سکتا ہوں میم۔“ ندیم نے تائید میں سر ہلایا۔ ”بائی داوے کیا پلان ہے آپ کے ذہن میں، شاید میں کچھ مدد کر سکوں۔“

”کیوں نہیں ندیم صاحب۔ آپ کے مخلصانہ مشوروں کی بدولت ہی تو اتنا بڑا اسٹیپ اٹھا پائی ہوں ورنہ علیم الدین کے بعد تو لگتا تھا پوری ہستی ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی ہے۔ کرائسس کا اتنا طویل وقت۔ آپ جیسے مخلص ساتھی میسر نہ ہوتے تو دو قدم اٹھانا محال تھا۔“ وہ اچانک ہی حد سے زیادہ آزردہ دکھائی دینے لگی تھی۔ ”اور اب یہ آنے والا وقت.....“

”آنے والا وقت آپ کا ہے بیگم صاحبہ۔ اطمینان رکھیے۔ آپ کو کبھی پچھتاوا نہیں ہوگا۔“ ندیم نے بھرپور انداز میں تسلی دی تبھی ملازمہ ٹرالی میں چائے کے لوازمات لیے اندر داخل ہوئی۔ ثمامہ نے جوابی جملہ اپنے منہ میں دبا لیا۔ ندیم بھی جانتا تھا کہ یہاں کسی کے سامنے کچھ بھی ڈسکس کرنا فی الحال خطرے سے خالی نہ تھا۔ ملازمہ کے جاتے ہی ثمامہ نے دھیمی آواز میں بتانا شروع کیا

”کچھ روز پہلے میں بڑے گھر گئی تھی۔ علیم الدین کی پہلی بیوی تو آپ جانتے ہیں وہیل چیئر پر ہوتی ہیں، غالباً آرام کر رہی تھیں۔ بلال آفس گیا تھا، ثمرہ شاید یونیورسٹی گئی تھی۔ میری ملاقات بلال کی مسز عندلیب سے ہوئی۔ باتوں باتوں میں، میں نے سرسری اپنے یہاں سے جانے کا ذکر کر دیا تھا“

”یعنی..... حسن ابدال؟“ ندیم نے تائید چاہی۔

”جی جی۔ آپ سے مشورے کے بعد یہی طے پایا تھا ناں کہ میں انہیں اپنے میکے جانے کی بات کروں گی وہ بھی ہمیشہ کے لیے۔“

”تو پھر۔ کچھ اعتراض ہوا اس پر؟“ ندیم کو تجسس تھا کہ ثمامہ کی الجھن کیا ہے۔

”ارے نہیں نہیں۔ بلکہ وہ تو خاصی خوش نظر آئی، مجھے پریشانی بلال کی جانب سے ہے۔ اب اسلام آباد سے مری کا فاصلہ ہی کتنا ہے ندیم صاحب۔ اتنا بڑا پروجیکٹ شروع کر کے اسے بلال سے چھپانے کی کوشش۔ مجھے تو سراسر بچگانہ پن لگ رہا ہے۔ سوچ میں ہوں کہ خود ہی اگر کھل کے سب کچھ بتا دوں۔ چھپانا کہیں نقصان کا باعث نہ بنے۔“

وہ اپنی فنگر رنگ کو اضطراب سے گھماتی اس لمحے حقیقتاً کنفیوژ نظر آئی۔ ندیم نے مسکرا کر اس کی کیفیت کو جانچا۔

”میں کچھ کہوں میڈم؟“

”جی جی۔“ ثمامہ بھی گہری سوچ سے باہر آئی۔

”جب پہلے پہل ہم نے مری میں ہوٹل کے قیام کا فیصلہ کیا تھا میرے ذہن میں تب بھی یہی تھا کہ بات ایک نہ ایک دن کھلے گی تو ضرور۔ مری جیسی مصروف تفریح گاہ جہاں اسلام آباد والوں کا آنا جانا تو ویک اینڈز کے حساب سے رہتا ہے۔ بلال کی نظروں سے

زیادہ عرصے تک پوشیدہ رہنے کا امکان خاصا کم ہے۔"
"تو یعنی ہم بتا دیں بلال کو۔" ثمامہ کو نئی پریشانی نے گھیرا۔ ندیم تب بھی اطمینان سے مسکراتا رہا۔
"نہیں میم۔ آپ ایک نکتے تک پہنچ نہیں رہیں۔ بلال صاحب کو نہ بتانے کی وجہ صرف اتنی ہے کہ ابھی آپ خود بھی نہیں پر ہیں۔ ایک بار وہاں جا کر ہوٹل کا سارا کنٹرول اپنی مرضی اور پوری آزادی سے اپنے ہاتھ میں لے لیں گی پھر چاہے بلال کو پتا چلتا بھی رہے وہ آپ کے کام میں رخنہ اندازی نہیں کر سکتا۔ بتا کر جانے سے اسے لگے گا آپ اس سے اجازت طلب کر رہی ہیں جبکہ اسے اب اس زعم سے نکل آنا چاہیے کہ وہ آپ کو اپنی مرضی پہ چلا رہا ہے اور آگے بھی چلاتا رہے گا۔ آپ کا ہوٹل نہ صرف آپ کی ملکیت ہے بلکہ آپ کا خواب ہے۔ بلال پہ اپنے عمل سے ثابت کریں کہ آپ کا بیٹا بھی علیم الدین کی دولت کا اتنا ہی حق دار ہے جتنا کہ وہ۔"
"تھینکس ندیم صاحب۔" ثمامہ نے ایک گہرا لیکن بوجھ رفع کرتا سانس خارج کرتے مسکرا کر صوفے کی بیک سے ٹیک لگائی۔ "آپ جیسے رہنما اللہ ہر ایک کو نصیب فرمائے، جانے میرا دماغ کیوں اس قدر بند ہو رہا تھا۔ آپ صحیح کہہ رہے ہیں، اپنے منہ سے کچھ بھی بتانا بلاوجہ خود کو خفت زدہ شو کرنا ہوگا۔ تو یعنی....." اس نے کھل کر سانس لیا۔ "ہم واقعی کبھی بھی نکل سکتے ہیں۔"
"اور پیکنگ وغیرہ؟"
"سب مکمل ہے۔ یہ گھر تو فرنشڈ ہی کرائے پر لگ رہا ہے۔ چابی میں آپ کو دے جاؤں گی، وہ لوگ اگلے ہفتے شفٹ کر رہے ہیں۔ میں بس اپنی والدہ اور بھائی سے مشورہ کر لوں۔ ویسے وہ دونوں بھی مینٹلی ریڈی ہیں۔ اُمید ہے کل صبح سویرے ہم نکل جائیں گے۔ ان شاء اللہ۔"
"یہ زیادہ اچھا ہے۔" ندیم اب جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "بلال صاحب اِن دنوں خود بھی یو ایس اے گئے ہوئے ہیں۔ ان کی واپسی تک آپ پوری طرح مری میں سیٹ بھی ہو چکی ہوں گی۔ میں بھی یہاں حالات پر نظر رکھتا رہوں گا۔"
"یہاں کے کرایے داروں سے بھی میں نے حسن ابدال جانے کا کہا ہے۔ کرایہ وغیرہ کے معاملات بھی آپ کے توسط سے چلتے رہیں گے۔"
وہ بھی ندیم کے ساتھ چلتے پورچ میں آگئی۔ ندیم کے اس کی ذات پر بہت احسان تھے۔ وہ تہ دل سے اس کی ممنون تھی اور اب جبکہ ہمیشہ کے لیے اس شہر کو چھوڑ کر جا رہی تھی جانے پھر کب اور کن حالات میں دوبارہ ملاقات ہوتی۔ وہ دانستہ ہی اسے الوداع کہنے گیٹ تک چلی آئی تھی۔
"بے فکر رہیے آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"
"ہوٹل کے افتتاح کے موقع پر اپنی فیملی سمیت ہمیں جوائن کرنے کی کوشش کیجیے گا۔ مجھے خوشی ہوگی اگر آپ میرے ہوٹل کے پہلے مہمانوں میں سے ہوں۔" ثمامہ نے پورے خلوص سے ندیم کو دعوت دی جس پر وہ شکریہ کے انداز میں تھوڑا سا جھک کر مسکرایا۔
"شیور میم۔ ہیو آ نائس اینڈ سیف جرنی۔ ٹیک کیئر آف یورسن اینڈ یو۔" دعا کے انداز میں کہتا وہ باہر نکل گیا ثمامہ گیٹ بند کر کے مڑی اور اپنے ہی بنگلے کو الوداعی نظروں سے دیکھنے لگی۔

☆☆☆

انسان کے ذہن میں پلنے والے خیالات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو خواہش بن کر پیدا ہوتے ہیں، دوسرے وہ جو اگلے ہی پل اندیشوں کی صورت سر اُبھارتے ہیں۔ آج صبح ہی مری کی کوسٹر میں بیٹھتے سوار کی خواہش تو مری سے برسوں کی دوستی کی تھی لیکن اندیشہ اگلے روز واپسی کا بھی تھا۔ اور جانے یہ اندیشے ہمیشہ ہماری خواہشوں کو نگلنے میں کوشاں کیوں رہتے ہیں۔
مری میں گزرا وہ ایک دن شام ہوتے ہوتے ڈھیر ساری مایوسی اپنے دامن میں سمیٹ لایا تھا۔ سوار میاں نذر کے ڈھابے پر واپس آ گیا تھا اور اس وقت باہر بچھی چارپائی پہ سر نیہوڑائے اُلٹی سیدھی سوچوں میں

غلطاں تھا۔ فوری پریشانی یہ لاحق تھی کہ آج ہی اسلام آباد واپس چلا جائے یا اگلی صبح روانہ ہو۔ کام حاصل کرنے کی تگ ودو میں آج وہ کئی ہوٹلوں، ریسٹورنٹس اور عام دکانوں پر گیا تھا۔ لیکن کہیں سے بھی کوئی مثبت رسپانس دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔ ایک دو فاسٹ فوڈ شاپس میں شیف کی ضرورت تو تھی لیکن ویٹر یا روم سروس کے لیے کسی نے حامی نہیں بھری۔

فخری نے پانی کا گلاس سامنے رکھا تو وہ ایک ہی سانس میں چڑھا گیا، دن بھر میں پانی تک پینے کا خیال نہیں آیا تھا۔ میاں نذر دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ سوار نے دو روٹیوں اور دال کا آرڈر دیا جو کہ مشکل سے آٹھ دس منٹ میں فخری نے اس کے سامنے لا کر رکھ دیے۔ بلڈنگ پر کام کرنے والے مزدور بھی آنا شروع ہو گئے تھے۔ دیہاڑی مکمل کر کے آنے والوں کے چہروں پر ایک اطمینان سا تیرتا دکھائی دیتا تھا۔ آپس میں خوش گپیاں کرتے ان مزدوروں کو دیکھ کر سوار نے سوچا کہ اینٹیں ڈھونے کا کام شاید اُسے با آسانی مل جائے

"آ گئے سوار باؤ۔" نذر حسین کی نرم خلیق آواز پر سوار نے بے ساختہ سر اٹھایا۔ وہ مسکراتے ہوئے سامنے کی چارپائی پر بیٹھ گئے تھے۔ "سناؤ۔ کیسی رہی کام کی تلاش؟"

"بہت ہی بُری میاں جی۔" سوار تھکا تھکا سا مسکرا دیا۔

"کام نہیں ملا؟" میاں جی کے لہجے سے بھی افسوس جھلکا۔

"نہ کام، نہ ٹھکانا۔" سوار نے ایک سرد آہ کھینچے پلیٹ پیچھے کھسکائی۔ "نصیب کی سیاہی اِن روشنیوں کے مقابلے میں بہت گہری ہے۔" اُس نے سڑک پہ دور نظر آتی روشنیوں کی طرف ابرو اُٹھائے۔

"تو پھر...... کیا سوچ بیٹھے ہو؟" میاں نذر اِس لمحے اُسے سننا چاہتے تھے۔

"واپسی...... ابھی نہیں تو کل صبح۔"

"گھر سے کیا سوچ کر نکلے تھے۔ اور واپس جا کر کیا جواب دو گے؟" میاں جی اسے بولنے پر اُکسا رہے تھے۔

"گھر سے نکال دیا گیا ہوں۔ نہ واپس وہاں جانا ہے، نہ کسی کو جواب دینا ہے، بس جینے کے لیے کچھ کرنا ضروری ہے۔"

"لو۔ پھر تو مسئلہ ہی کوئی نہیں۔" میاں نذر ایک دم مسکرا دیے، سوار نے تعجب سے انہیں دیکھا۔

"بھئی اصل چیز تو جینے کی اُمنگ ہے، مایوس انسان پر شیطان سب سے پہلے موت جیسے خیالات مسلط کر کے اس کا اللہ پر یقین متزلزل کرتا ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ زندگی کی باتیں کر رہے ہو، اور بھئی جو شخص جینا چاہتا ہے اس کے لیے ہر دروازہ کھلا ہے، جس میں چاہے داخل ہو جائے۔"

میاں جی اسے تصویر کا روشن پہلو دکھا رہے تھے، جو اباً وہ کہہ نہیں پایا کہ...... "ہاں جینا تو میں چاہتا ہوں پر اپنی نظروں میں اپنا قد بلند کرنے کے لیے۔ خود کو موقع دیتے کچھ اچھے کام کر کے اپنا اعتماد بحال کرنا چاہتا ہوں۔ اُجلے شفاف پانی جیسی زندگی گزار کر دامن کے داغ دھونا چاہتا ہوں۔ اپنے ضمیر کی جواب دہی شاید دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ ضمیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا محاسبہ کرنے میں بڑی محنت لگتی ہے۔ وجود گناہوں سے آلودہ ہو تو انسان اپنے سائے سے بھی نظریں چرائے پھرتا ہے۔ میرے جینے کی وجہ صرف ایک ہے کہ مجھے اپنے پروردگار سے گناہوں کے کفارے تک کی مہلت چاہیے۔"

"اوئے رب نواز۔ فخری کے ہاتھ ایک کڑک چائے کا کپ بھیجو۔ دیکھتے نہیں باؤ کیسا تھکا ہوا لگ رہا ہے۔" میاں نذر نے وہیں سے ہانک لگائی۔

"ابھی بھیجتا ہوں میاں جی۔" رب نواز نے دُور سے ہاتھ ہلایا۔

"اچھا تو کہاں کہاں گئے۔ کتنے دفتروں کی خاک چھانی۔" میاں جی اب سامنے کی مسہری پر لمبے لیٹ گئے، جیسے سوار کی مصروفیات جاننے کے علاوہ انہیں کوئی کام نہ ہو۔

"دفتر نہیں میاں جی۔" سوار مسکرانے لگا۔

"ہوٹلوں میں ویٹر کی جاب ڈھونڈ رہا تھا یا عام دکانوں پر ہیلپر وغیرہ کی۔"

"نہ کر سوار۔" میاں جی بے چارے پورے لیٹے بھی نہ تھے کہ دوبارہ اُٹھ بیٹھے۔ "تم صبح "ایسا" کام ڈھونڈنے نکلے تھے؟"

"تو آپ کیا سمجھے؟" سوار اب اچھے موڈ میں آ گیا تھا۔ میاں جی کی حیرت کا مزا لیتے وہ مسکرا کر داڑھی کھجانے لگا۔

"پڑھے لکھے لگتے ہو۔ کوئی ڈھنگ کی نوکری ڈھونڈو یار۔ ایسی صاحب لوگوں والی صورت پہ ویٹری...... نہ کر یار۔" وہ اب اچھے خاصے بدمزا لگ رہے تھے۔

"اب آپ تو ایسا نہ کہیں میاں جی۔ محنت کر کے کھاتے کماتے ہیں۔ "محنت" پر تو آپ کی طرف سے وعظ آنا چاہیے تھا۔ پھر کام کہاں برے ہوتے ہیں۔ برے تو ہم انسان ہوتے ہیں۔"

"خوب کہتے ہو بیٹا۔" میاں جی فوراً قائل ہوئے۔ "پر اللہ کے بندے صبح بتا کر تو جاتے کہ کس مقصد کے لیے جا رہے ہو، کم از کم تمہیں تھوڑی رہنمائی ہی دے دیتا۔ سارا دن تم نے بلاوجہ خود کو تھکایا، تمہارا کام تو یہیں بیٹھے میں فون پر کروانے کی کوشش بھی کر سکتا ہوں۔"

"اچھا۔" حیران ہونے کی باری سوار کی تھی۔

"آپ کروا دیں گے میرا کام؟"

"ایک شرط پر۔" میاں جی کی آنکھوں میں نتیجہ خیز فیصلے کی چمک تھی۔ سوار متعجب سا بس دیکھے ہی گیا۔

"خود کو دنیا کی بھٹی میں جھونکنے والا پھر اس کی تپش کو برداشت کرنا بھی سیکھے۔ شعلے کی ہر لپک کے ساتھ اسے اپنے حوصلوں کو اور ہوا دینی ہوتی ہے۔ انہیں جل کر راکھ نہیں ہونے دیا جاتا۔ سیکھنے کی پہلی منزل کا تجربہ کسی تیراک سے پوچھو۔ ڈوبنا، اُبھرنا، غوطہ لگانا، ہاتھ پیر مارنا، پہلی ڈبکی کے بعد سطح پر نکلنا۔ ایسا ہے جیسے یوں......" انہوں نے ہتھیلی اپنے چہرے کے سامنے کی۔ "یوں موت کو سامنے دیکھنا، ذرا سا اعصاب نے ساتھ چھوڑا اور یہ لیا سرکش موجوں نے اپنی آغوش میں۔ جس تلخ تجربے نے تمہیں یہ دربدری دی ہے اُسے دہراؤ اپنے دماغ میں، صرف اس لیے کہ پہلے جو ہوا وہ آگے نہیں ہونا چاہیے، خود کو کھوج لینے کا راستہ آسان نہیں ہے بیٹے، منزل کا نشان پانے نکلے ہو، ٹھوکریں تو ملیں گی، سیدھے صاف راستے بھی آئیں گے، بندگلی سے بھی واسطہ پڑ سکتا ہے، چلتے چلے جانے کی لگن ہوگی تو سب رُکاوٹیں پار کر لو گے۔" اُنہوں نے کھنکار کر توقف کیا۔

"آج تمہاری نئی زندگی کی پہلی صبح تھی اور تمہاری کم ہمتی کا یہ عالم ہے کہ اس پہلی شام کو ہی آخری سمجھ کر بوریا بستر لپیٹ بیٹھے۔" اب کے اُنہوں نے سوار کی آنکھوں میں دیکھتے [illegible] انداز اپنایا۔ "کل کے سورج سے کسی معجزے کی توقع رکھتے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے، ہمارے لیے اگر کوئی کچھ کر سکتا ہے تو وہ ہم خود ہیں۔ اور کوئی نہیں۔" سوار نے ماتھا دونوں ہاتھوں پہ گرا لیا۔

"معافی چاہتا ہوں میاں جی۔ بس ابھی بے یقینی کی کیفیت میں ہوں، کچھ سمجھ نہیں پا رہا، آپ کا ملنا شاید قدرت کی پہلی مہربانی ہے۔"

"اچھا چائے پیو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ میں ذرا مشتاق خان سے بات کر لوں۔" وہ موبائل اسکرین روشن کر کے تھوڑے فاصلے پر چلے گئے۔ سوار نے اندر تک سکون محسوس کرتے پہلا سِپ لیا۔ کوئی بوجھ تھا جو میاں جی کی باتوں سے دھیرے دھیرے سرکتا محسوس ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

"تیار ہو گئیں بٹیا؟"

"جی اماں۔" کنعان نے جلدی جلدی لوشن اپنے ہاتھوں اور چہرے پر رگڑ کر چادر اوڑھی۔

"اور دیا بی بی؟" اماں نے برقع سر پہ جما کر تالا

چابی سنبھالے۔

''جی وہ بھی آ رہی ہے۔''

کالج بیگ کندھے پہ لٹکا کر کنعان نے کمروں کے دروازے لاک کیے۔ کالج شوز برآمدے کے کونے میں رکھے تھے۔ گھر کی چپلیں اُتار کر جلدی سے وہ پیروں میں ڈالیں اور باہر کی راہ لی۔ موسم آج مِلا جُلا سا تھا۔ دھوپ شاید نکلنا چاہتی تھی پر بادل آڑے آ رہے تھے۔ اور یہ بھی غنیمت تھا۔ کنعان نے ہونہہ کر کے بادلوں کو منہ چڑایا۔ اُس دھوپ کی تپش کو ذرا پسند نہیں تھے یہ بادل وادل۔ بارش بھی پچھلے روز کی اس لیے بھا گئی کہ گرما کی پہلی بوندا باندی تھی۔ ٹھنڈ میں تو اس کی بارش سے بھی خوب ناراضی چلتی۔

تالا لگا کر ایک نظر پیچھے گلی کی طرف ڈالی۔ دیا کا گھر تھوڑا پیچھے بائیں مڑ کر تھا۔ اکثر تو تالا لگاتے ساتھ ہی وہ موڑ کاٹ کر آتی دکھائی دیتی اور اگر نہ بھی پہنچتی تب بھی کنعان اماں کو لیے ڈھلان چڑھ کر اُوپر سڑک پر آ جاتی کیونکہ کالج جانے سے پہلے اسے گھر کی چابیاں ہوٹل کے ریسیپشن پر بیٹھے ابو کو دینا ہوتی تھیں۔ دیا گھر پہ تالا پڑا دیکھ کر سیدھی خود بھی ہوٹل میں آ جاتی جہاں کنعان اس کے انتظار میں رُکی ہوتی تھی۔ برسوں سے اس گھر کی اب یہی روٹین تھی۔

اب سے کچھ تین سال پہلے جب کنعان دسویں جماعت میں پڑھتی تھی اس کی امی کا انتقال ہو گیا۔ بڑی بہن ماہین اس سے پورے پانچ سال بڑی تھی اور امی کی وفات سے محض ایک ماہ پہلے بیاہ کر کوہالہ چلی گئی تھی۔ اس کے ابو رفیق احمد گزشتہ بارہ برس سے ہوٹل ازمیر کے منیجر تھے، وہ لوگ کشمیر سے یہاں آئے تھے۔ ازمیر ہوٹل اصل میں جاوید علوی کی ملکیت تھا۔ اماں کو رفیق احمد نے دو سال پہلے کنعان کی سہولت کی خاطر ہی گھر میں رکھا تھا۔ وہ ایک بیوہ بے سہارا خاتون تھیں۔ دن بھر لوگوں کے گھروں میں کام کر کے رات کو کبھی کہیں تو کبھی کہیں سو جایا کرتیں۔ رفیق احمد نے انہیں اپنے ہاں کام پہ ٹھہرا کر ان کی رہائش کا مسئلہ مستقل بنیادوں پر حل کر لیا۔ البتہ دن کے وقت جبکہ کنعان کالج اور رفیق احمد ہوٹل چلے جایا کرتے، انہیں ایک خاتون کے گھر ان کا بچہ سنبھالنے کے لیے جانا پڑتا تھا۔ وہ خاتون کسی اسکول میں ٹیچر تھیں اور اپنی غیر موجودگی میں سوائے اماں کے کسی پر بھروسا کرنے کو تیار نہ تھیں۔ اس لیے باقی تمام گھروں کا کام چھوڑ دینے کے باوجود بھی وہ اس بچے کی کیئر کا کام نہ چھوڑ سکیں۔

کنعان ریسیپشن پر آئی تو ابو کہیں دکھائی نہیں دیے۔ صدیق بھائی کو سلام کر کے چابی ان کی طرف بڑھائی۔

''ابو نہیں ہیں صدیق بھائی؟''

''اندر آفس میں ہیں جاوید صاحب کے ساتھ۔''

''او۔'' کنعان نے سر ہلایا۔ تبھی دیا نے اندر جھانک کر آواز دی تو وہ فوراً ہی پلٹ گئی۔

''لیٹ تو نہیں ہوئی؟'' دیا کے انداز میں عجلت تھی۔ کنعان نے حیرت سے گھڑی دیکھی۔

''نہیں تو...... ٹھیک ہی جا رہے ہیں۔''

''اچھا۔'' دیا کچھ بے چینی و بے یقینی سی محسوس کرتی پھر سے تیز ہوئی۔

''خیر تو ہے۔ آج بڑی ایفی شئینسی دکھا رہی ہو۔''

''ہوں۔'' وہ ایک دم ہی گل اناری ہوئی۔ ''باسط ہوں گے سامنے کہیں۔''

''کیا؟'' کنعان بے ساختہ اُچھلی۔ ''بہت بڑی مصیبت ہو دیا تم۔ آج ہی بلوا لیا کم بخت پہلے سے بتا تو دیتیں۔''

''ہیں؟'' دیا نے تشویش سے اس کا جائزہ لیا۔ ''تم نے کیا پھولوں کے ہار پہنانے تھے دولہا بھائی کو؟''

''بھاڑ میں جائیں پھولوں کے ہار۔ پہلے بتانا تھا کمینی۔ میں چھٹی کر کے گھر بیٹھ جاتی۔''

''ہاہا......'' دیا کا قہقہہ نکل گیا۔ ''بڑی ڈرپوک

ہو تم سے۔ بھئی دور سے دیکھ کے چلا جائے گا بے چارہ، کون سا مجھے اٹھانے آرہا ہے۔"

"مجھے نہیں بننا تھا ایسی خوف ناک سچویشن کا حصہ وصہ۔ اور تم بھی زیادہ کھی کھی مت کرو۔ راستہ چلتے ہنستی ہوئی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں اور ہاں......" اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔ "وہ نظر آجائے تو چپ چاپ ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے نکل جانا۔ خبردار جو اشارے کر کر کے مجھے دکھانے کی کوشش کی۔" وہ اب دانستہ اس سے دور بھی ہوگئی تھی۔ دیا دل ہی دل میں سخت پچھتائی کہ آخر اس پاگل کو بتایا ہی کیوں۔

دونوں چلتے چلتے اب مال روڈ پر آگئی تھیں۔ یہاں کی رونقیں معمول سے قدرے کم لگ رہی تھیں۔ شاید ورکنگ ڈیز تھے اس لیے۔ مال روڈ پر چڑھتے ہی بائیں جانب جی پی او کے ساتھ کشمیر پوائنٹ جانے والے راستے کے آغاز میں ان کا کالج تھا۔ دیا نے مال روڈ پر آتے ہی باسط کو دیکھ لیا تھا۔ وہ جی پی او کی سیڑھیوں پر بیٹھا اسی کا منتظر تھا۔ اسے کالج روڈ پر جاتے دیکھ کر خود بھی مسکراتے ہوئے ہم قدم ہوگیا۔ کنعان چونکہ دو تین قدم آگے تھی اس نے یہ "اضافہ" محسوس نہیں کیا۔ اس نے اپنی چوکنا نظریں سامنے سے آنے والوں پر جما رکھی تھیں، کسی "مشکوک" آدمی کو کھوج لینے کی کوشش میں آنکھیں گویا سرچ لائٹ بنی ہوئی تھیں۔ بظاہر تو بھی کچھ نارمل لگ رہا تھا تبھی اچانک احساس ہوا کہ کچھ دیر پہلے تک اس کا مذاق اُڑا کر ہنستی دیا کی زبان اور ہنسی دونوں کو بریک لگ چکی تھی۔

"تو کیا؟" اس نے گھبرا کر تھوک نگلتے ترچھی نظروں سے سائیڈ پر دیکھا، جسے وہ سامنے تلاش کر رہی تھی وہ تو دھیمی مسکان لیے دیا کے ہم قدم چل رہا تھا۔ کنعان اسے دیا کی منگنی کے موقع پر دیکھ تو چکی تھی، شک کی گنجائش نہ رہی، دیا جونہی اس کے نزدیک آئی اس نے بازو سے کھینچ کر گویا میراتھن میں حصہ لیا۔

"کیا کررہی ہو پاگل۔" دیا نے احمقوں کی طرح ریس لگاتی کنعان سے زبردستی اپنا بازو چھڑوایا۔

"مم...... میں جارہی ہوں۔" وہ ان سُنی کر کے کئی قدم آگے نکل گئی۔

"لاحول ولا۔" دیا نے آگے چلتی بلکہ تقریباً بھاگتی کنعان کو دیکھ کر ہنسی ضبط کی۔ دل سے بے ساختہ اپنی سیدھی سی دوست کے لیے دعا نکلی۔

"اللہ کرے زمانے کی بُری ہوا تمہیں چھو کر بھی نہ گزرے۔ آمین۔"

☆☆☆

بلیک جینز کے ساتھ سوار نے سفید شرٹ منتخب کی تھی۔ سامنے کے بٹن بند کر کے اس نے انگلیوں سے ہی بالوں کو کنگھی کر کے درست کرلیا۔ ہلکی ہلکی داڑھی اس کے روشن کتابی چہرے کے ساتھ خوب جچتی تھی۔ کھڑکی کے شیشے میں نظر آتے اپنے دھندلے عکس کا ایک ناقدانہ جائزہ لیتے وہ ڈھابے کے اندرونی کمرے سے برآمدے میں آیا۔ میاں جی چائے کا کپ رکھ کر مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ پچھلی رات سوار یہیں سویا تھا۔ اس کے لیے کام کی بات انہوں نے اپنے کسی دوست مشتاق خان سے کی تھی۔ نو بجے سوار کو مشتاق بھائی سے ملنا تھا۔ میاں جی نے بتایا کہ مال روڈ پر ان کی مٹھائیوں کی دکان ہے۔ اب اللہ جانے سوار کے لیے ان کے ذہن میں کیا تھا۔ بہرحال وہ خوش تھا کہ کچھ سبب تو پیدا ہوا کام کی نوعیت کے بارے میں وہ ہر سطح تک سوچ آیا تھا، اب کوئی بھی خلاف مرضی کام شاید اس کے لیے ناگواری کا باعث نہیں تھا، ہاں بس ایک مٹھائیاں بنانے کے کام کو چھوڑ کر۔ کہ ظاہر ہے وہ کام اسے آتا ہی نہیں تھا، یعنی مٹھائیاں بنانے کی نوبت آئی سوار میاں۔ تو سمجھو یہاں بھی کام سے گئے۔ وہ اپنے خیالات پر خود ہی مسکرا دیا۔

"تیار ہوگئے بیٹا؟"

"جی میاں جی۔ آپ بس شاپ کا ایڈریس

سمجھادیں۔"

"اگر تم کینٹ مارکیٹ سے نکل کر مال روڈ پہ چڑھو تو مجھے کال کرلو۔ میں ساتھ ساتھ سمجھاتا جاؤں گا۔"

"موبائل فون نہیں ہے میاں جی۔" سوار کے لہجے میں واضح شرمندگی تھی، میاں جی نے کندھا تھپکا۔

"اچھا کوئی بات نہیں۔ پہلے کبھی جانا ہوا ہے وہاں؟ وہ اب کچھ سوچ رہے تھے۔"

"بالکل میاں جی۔ سارا مال روڈ دیکھا بھالا ہے۔ کل تو کافی دیر ادھر ہی گھومتا رہا ہوں۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ تم چرچ کے سامنے مخالف سمت والی دکانوں میں مشتاق مٹھائی والے کا پوچھتے جانا۔ آسانی سے پہنچ جاؤ گے۔ باقی تمہارے متعلق میں نے تھوڑا سا اسے بتادیا ہے۔ تمہیں اپنے بارے میں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"جی؟" سوار ان کے مبہم جملے کا مطلب ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا۔ میاں جی نے مسکرا کر اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔

"جہاں بندے کی پہچان اس کے کام سے ہوتی ہو وہاں بلاوجہ کے بیچ غیر اہم اور غیر ضروری ہوتے ہیں۔ میں نے مشتاق سے کہا ہے کہ تم میرے ایک دوست کے بیٹے ہو، والد کی بیماری کی وجہ سے ذمہ داریوں کا بوجھ تم پر آپڑا ہے اس لیے کام کی تلاش میں یہاں آئے ہو۔"

"لیکن......" سوار نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔

"یہ جھوٹ نہیں ہے سوار۔"

"لیکن میاں جی۔ آپ بھی کیوں میری ذمہ داری لے رہے ہیں۔ کل کو آپ بھی شرمندہ ہوسکتے ہیں اس بھروسے پر۔" سوار کے لہجے میں دبا دبا سا احتجاج تھا۔ میاں جی نے نرمی سے اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لیتے رسان سے سمجھانا شروع کیا۔

"میں نے کہا تھا اپنی غلطیاں اپنے اندر دوہراتے رہو۔ یہ نہیں کہا تھا کہ زمانے بھر میں مشہور کرنا بھی ضروری ہے۔ توبہ کی طلب ہے تو اپنی پردہ پوشی خود کرو۔ اپنا اشتہار لگانے والے کو اللہ سخت ناپسند کرتا ہے۔ جہاں تک سوال ہے ذمہ داری اٹھانے کا تو شاید اس کا جواب خود میرے پاس بھی نہیں ہے۔ اللہ نے مجھے بیٹا عطا نہیں کیا سوار، لیکن ایسا بھی نہیں کہ ہر آئے گئے کو بیٹا بنالیتا ہوں۔ زندگی صبر شکر سے ہی گزار دی۔ پر تمہارا صرف ایک ہی جملہ کہ "گھر سے نکال دیا گیا ہوں۔ کچھ ایسے دل کو چھو گیا کہ آنکھیں بند کر کے تمہاری مدد کو نہ صرف یہ دل تیار ہو گیا بلکہ تمہیں اپنا بیٹا سمجھنے میں مجھے عجیب سی تسکین حاصل ہوئی۔"

"حالانکہ ایسے متنازعہ جملے کے بعد تو آپ کے دل میں مزید خوف آنا چاہیے تھا کہ جانے "کیا" کرکے آیا ہوگا۔ سوار نے خود اپنا استہزا اڑایا۔

"ایسا نہیں کہتے۔" وہ برا مان گئے۔ "جن راستوں کو چھوڑ آئے ہو، وہاں کی باتیں ایک ایک کے سامنے دہرا کر نہ خود کو تکلیف میں ڈالو اور نہ لوگوں کے تجسس کو ہوا دو۔ موٹے موٹے چند بنیادی سوال جن کا روزمرہ کی زندگی میں تمہیں سامنا ہوسکتا ہے، ایک ہی دفعہ میں رٹ لو۔ ماضی کو ساتھ ہی لے کر چلنا تھا تو وہ شہر کیا برا تھا جسے چھوڑ کر آئے ہو۔ تمہیں تو غالباً گھر سے نکالا گیا تھا نا۔ شہر چھوڑنے کا فیصلہ تو تمہارا اپنا ہوگا، اور مقصد ظاہر ہے کچھ بن کر واپس لوٹنے کا۔ تم پچھتائے ہوئے لگتے ہو سوار، نادم ہو اپنی کسی غلطی پر۔ بس یہ ندامت یہ پچھتاوا ساتھ رکھنا۔ یہ ساتھ ہوں گے تو آگے کسی غلطی کا امکان کم سے کم ہوگا۔ چلو بسم اللہ کرو۔ اللہ کامیاب فرمائے۔" انہوں نے مسکرا کر کندھا تھپکا۔

"شکریہ میاں جی۔" سوار بے ساختہ آگے بڑھ کر ان کے گلے لگ گیا۔ "آپ کی رہنمائی میرا حوصلہ بڑھا دیتی ہے، میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گا۔"

"شاباش۔ یہ کی نا بیٹوں والی بات۔ چلو جاؤ اب۔ مشتاق خان تمہارا ہی انتظار کر رہا ہے۔"

"جی میاں جی۔" وہ خوشی خوشی مڑا، سامنے کھڑے فخری کے حسب عادت بال بکھیرے۔ اُس نے جھٹ سلیوٹ مارا۔

"نوکری پکی کروا کے آنا بھیا۔" وہ پیچھے سے چلایا اور سوار ہنس کر ہاتھ ہلاتے ڈھلان چڑھنے لگا۔

☆☆☆

پچھلے روز کام کی تلاش میں مال روڈ پر پنڈی پوائنٹ سے کشمیر پوائنٹ کے بیچ اس نے خوب خاک چھانی تھی۔ لیکن دماغ پر کام تلاش کر لینے کا اتنا دباؤ تھا کہ کھل کر "مری" کو محسوس ہی نہیں کر پایا تھا۔ آج مشتاق خان کی تلاش میں نکلتے ذہن بہت حد تک پرسکون تھا۔ کینٹ مارکیٹ سے گزرتے ذہن کے پردے پر گزشتہ برس کا ٹور نمایاں ہوا، تب کی بے فکری یاد کر کے سوار کے لبوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد دوستوں کی سنگت میں یہاں آنا بڑا ہی یادگار تجربہ رہا تھا۔ سوار کی آنکھوں کے سامنے اس وقت ایک دکان تھی۔ بالکل سامنے کی دیوار پر جہاں چارسوتی میں کڑھائی کیے ہرن کی فریم شدہ تصویر آویزاں تھی۔ پچھلے سال عین اسی جگہ ایک گٹار لٹکا تھا۔ جسے دیکھتے ہی انگلش موویز کا کوئی کاؤبوائے یاد آنے لگتا ہے، سوار کا اسے خریدنے کو کچھ ایسا من بے تاب ہوا کہ اس نے تہیہ کر لیا چاہے دوستوں سے رقم اُدھار لینی پڑ جائے یہ گٹار تو وہ ہرگز نہیں چھوڑے گا۔ خوش قسمتی سے قیمت اس کی رینج میں نکلی۔ اور اب وہ گٹار اس کے رُوم کی داہنی دیوار کی رونق تھا۔ اور اس کا روم......

وہ خیالوں میں جانے کہاں تک جانے والا تھا کہ دکان کے مالک نے آواز دے کر اسے حال میں حاضر کیا۔ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھتے سیڑھیاں چڑھ کر مال روڈ پہ آ گیا۔ چرچ کے سامنے والے حصے میں اسے مشتاق خان کی سوئٹس شاپ ڈھونڈنے میں زیادہ دِقت نہیں ہوئی اور اس وقت وہ مشتاق خان کے مقابل موجود تھا۔

"سوری یار تمہیں یہاں تک آنے کی زحمت دی۔" مشتاق خان نے بے تکلفی سے سوار کے کندھے پہ ہاتھ مارا۔ "اصل میں تمہیں جانا کہیں اور ہے لیکن اپنا نذر حسین چاہتا تھا کہ پہلے ہم دونوں آپس میں مل لیں۔ بڑی تعریف کر رہا تھا تمہاری۔ آؤ بیٹھو۔" وہ اُسے بازو کے گھیرے میں لیے اندر آ گئے۔

سوار کی خاک سمجھ میں نہیں آیا کہ اُسے جانا کہاں ہے اور وہ یہاں کیوں آ گیا ہے۔

"میرا ایک دوست ہے، ہوٹل میں منیجری کرتا ہے۔ دو روز پہلے اُس نے فون کر کے کام ذمے لگایا۔ ریسیپشن پر کام کرنے والے دو لڑکوں میں سے ایک لڑکا اپنی شادی کی وجہ سے چھٹی لے کر کشمیر گیا ہے۔ کسی بھروسے مند آدمی کی ایک مہینے کے لیے ضرورت ہے...... تم کر لو گے یہ ریسیپشن وغیرہ کا کام؟"

"جی جی بالکل۔" سوار نے فوراً سر اثبات میں ہلایا۔ مٹھائیاں بنانے سے نجات مل رہی تھی، پھر وہ تو روم سروس کی جاب کے لیے پچھلا پورا دن خوار ہوتا رہا تھا اور یہاں ریسپشنسٹ کی جاب مل رہی تھی۔ "بس ایک چھوٹی سی گزارش اور ہے۔"

"ہاں ہاں کہو؟" مشتاق خان اُسے بغور سن رہا تھا۔

"اگر آپ اُن سے ایک ہفتے بھر کے ایڈوانس کی بات بھی کر لیں۔ دراصل میری جیب بالکل خالی ہے۔" سوار نظر چرا گیا۔

"ایڈوانس کی بات۔" مشتاق خان کسی سوچ میں پڑ گیا۔ "یار، بہتر ہے ابھی یہ بات نہ کریں۔ تم ایسا کرو۔" اُنہوں نے سائیڈ جیب سے بٹوہ نکالا اور ہزار روپے کا ایک نوٹ سوار کی طرف بڑھا دیا۔

"فی الحال اِسے اپنے پاس رکھو، تنخواہ ملنے پر لوٹا دینا۔ بلکہ یہ ختم ہو جائیں تو اور لے لینا۔ ویسے بے فکر ہو جاؤ۔ وہاں تمہارے خرچے بہت کم

ہوجائیں گے۔ رہائش تو تجھے پتا ہے فری ہے، کھانے وغیرہ کا معلوم کرلینا۔'' اُنہوں نے مسکراتے ہوئے سوار کا کندھا تھپکا جو حیرت سے اُس مہربان اجنبی کو دیکھ رہا تھا۔ میاں نذر جتنے خود اچھے تھے اُن کے دوست بھی اتنے ہی ہمدرد اور اچھے تھے۔

''اوئے راشد۔ یار باؤ کے لیے مٹھائی لے آؤ۔''

''نہیں نہیں مشتاق بھائی۔'' وہ اتنی نوازش پر بوکھلا کہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ارے بھئی منہ تو میٹھا کرو۔ عارضی سہی۔ نوکری تو لگی ہے نا۔'' وہ خوش اخلاقی سے ہنسے۔ سوار نے مسکراتے ہوئے برفی کا ایک پیس اُٹھالیا۔

''اب یہاں سے تم پہلے تو آرام سے جی پی او چوک تک چلے جاؤ۔ اُنہوں نے اب سمجھانا شروع کیا۔'' دونوں ہی دکان سے باہر نکل آئے تھے۔

''بس بائیں طرف بینک کے ساتھ ایک راستہ جاتا ہے۔ دو، تین موڑ کاٹنے پر خود ہی دیکھ لو گے، ہوٹل ازمیر کا بورڈ۔ یہ کارڈ بھی رکھ لو۔ پیچھے میرے دوست کا نام اور نمبر لکھا ہے۔ صرف اُسی سے بات کرنا، وہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔''

''بہت شکریہ مشتاق بھائی، میں واقعی بہت مشکل میں تھا۔'' سوار کو شکریے کے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

''اوئے بس کر یار۔'' وہ ہنستے ہوئے اُس سے بغل گیر ہوئے۔ ''تقدیر بناتی ہے سب کے کام، لوگ تو محض وسیلہ ہوتے ہیں۔ جاؤ اللہ کامیاب کرے۔''

''آمین۔'' وہ اجازت لے کر دکان کی سیڑھیاں اُتر آیا۔

☆☆☆

چمکیلی دھوپ نے اپنے چاندی جیسے پر ہر سمت میں پھیلائے تو مری کے اُونچے نیچے دُھلے دُھلائے راستوں پر مزید نکھار آ گیا۔ ثمامہ کی گاڑی دن دس بجے کے قریب مری میں داخل ہوئی تو استقبال دھوپ سے ہوا۔ ایکسپریس وے سے براستہ کشمیر پوائنٹ وہ لوگ جی پی او چوک پہنچے۔ جہاں رش کی وجہ سے کچھ دیر اُنہیں رُکنا پڑا۔ ڈرائیونگ وہ خود کر رہی تھی۔ جھلایا ہوا ٹریفک وارڈن، فی الحال کشمیر پوائنٹ والوں کا راستہ کھولنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ فرنٹ سیٹ پہ اس کے ساتھ بیٹھا عدیل بری طرح جھوم رہا تھا۔ پیچھے امی کی گود میں بیٹھے ثمر نے جوس جوس کی رٹ لگا دی تو ٹانگیں سیدھی کرنے کے خیال سے وہ خود ہی نیچے اُتر آئی۔

''ایک ایپل جوس۔'' اُس نے پیٹھ کیے جوسر پر ہاتھ رکھ کر کھڑے لڑکے کو مخاطب کیا لیکن وہ جگہ سے ہلا تک نہیں۔

''اے بھیا۔ ایک گلاس فریش ایپل جوس چاہیے۔'' اُس نے پاؤچ کو ہلکے سے لڑکے کے کندھے پر چج کیا۔ وائٹ شرٹ والا وہ لڑکا مڑا تو آنکھوں میں تعجب لیے کھڑی کمان سی بھنویں سخت خفگی کا تاثر لیے ہوئی تھیں۔ ثمامہ نروس سی ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹی۔

''جوس۔'' اس بار اس کا لہجہ انتہائی مدھم تھا۔ تبھی جوسر کے پیچھے سے ایک لڑکا رومال سے ہاتھ صاف کرتے نمودار ہوا۔

''جی بی بی؟''

''اوہ۔'' وہ سخت شرمندہ سی اُس دوسرے لڑکے کو دیکھنے لگی۔ ''جوس...... ایپل کا...... ایک گلاس۔'' گڑبڑا کر آرڈر دیتے ایک چور نگاہ اُس وائٹ شرٹ والے کی طرف ڈالی جو، اب قطعی اُس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

''جی اور آپ؟'' دکان دار تیزی سے ہاتھ چلاتے اب وائٹ شرٹ والے سے مخاطب تھا۔

''بھائی یہ ازمیر ہوٹل کہاں پڑتا ہے؟''

''یہ...... جو سامنے راستہ جا رہا ہے۔ اسی پر جاتے جائیں۔ آبادی کے بعد کچھ موڑ کاٹ کر۔'' دکان دار نے سڑک کے مخالف سمت میں سامنے جاتے راستے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

UUNOVELS.COM

''جی شکریہ۔'' وہ بنا ثمامہ کو خاطر میں لائے سنجیدہ سا ایک طرف کو بڑھ گیا اور وہ شرمندہ سی دور تک اُسے جاتے دیکھتی رہی۔

''بے حد حسین اور نفیس سادہ داڑھی والا تو خود ایک سیاح تھا۔ بلاوجہ وہ اُسے جوس والا۔ لاحول ولا۔'' لب چباتے اُس نے نفی میں سر ہلایا ''کیا سوچتا ہوگا بے چارہ کیا تو ہینڈسم اور ماڈرن دکھائی دے رہا تھا، میں بھی ناں عقل سے پیدل ہوں بالکل۔ لیکن وہ جو سر پر جو ہاتھ رکھے کھڑا تھا، حلیے کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔''

''یہ لیں میڈم۔'' لڑکے نے جوس آگے بڑھایا اور ثمامہ اپنی لایعنی، بے تکی سوچوں سے باہر آئی۔

بندہ بھی کبھی کبھی کیسی غیر ضروری باتوں پہ دھیان دیتا ہے۔ وہ خود کو سرزنش کرتے ہنس کر واپس مڑی۔ مال روڈ کا راستہ بھی کھل چکا تھا۔ انیکسی پنڈی پوائنٹ کے راستے میں تھی۔ وہاں تک پہنچنے میں پندرہ منٹ مزید لگے۔ خالد رضا گھر کھول کر ایک کک وہاں چھوڑ گیا تھا۔

''واؤ...... مما...... یہ ہمارا گھر ہے۔'' ثمر گھوم پھر کر ایک ایک چیز کو دیکھتا بڑی گلاس ونڈو کی طرف بھاگا۔

''آہستہ یار۔'' عادل نے بیچ راستے میں اُسے پکڑا۔ ''اس کا بہت خیال رکھنا پڑے گا آپی۔'' وہ بازو سے پکڑ کر اسے بہن کے پاس لایا۔ ثمامہ اب تھک کر صوفے میں دھنس چکی تھی۔

''ارے کیوں فکر کرتے ہو۔'' ثمامہ کی جگہ اسے امی نے جواب دیا۔ ''اب سیانا ہے ماشاء اللہ۔ اور پہلے دن تو ہم بھی بچوں والا جوش محسوس کر رہے ہیں۔ اس کا کیا قصور۔''

''کھانا بنواؤ آپی۔ بہت بھوک لگی ہے۔'' عادل انگڑائیاں لیتا اب ایک ایک کمرے میں بھی جھانک رہا تھا۔

''میں تو پہلے چائے پیوں گی تھی۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔''

''جی امی۔ چائے بنانے کا کہہ دیا ہے اور کھانا بھی تیار ہے۔ میں ذرا خالد صاحب سے کام والی کا پوچھ لوں۔ فون پر کہہ رہے تھے پہلے سے موجود ہوگی۔ ذرا پتا کرلوں۔'' وہ نمبر ملاتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

شام کے ملگجے سائے در و دیوار پر پھیلنے لگے تھے۔ چنار کے درختوں پر گھونسلوں کو لوٹ آنے والے پرندوں کی چہکاریں بڑھیں تو کنعان نے مسکرا کر کچن کی کھڑکی کھول دی۔

''کیسا منضبط نظام ہے قدرت کا۔ سورج ڈھلتے ہی ہر چیز اپنے ٹھکانے کو لوٹنا شروع کر دیتی ہے۔ ایک انسان پر ہی کیا موقوف۔ ہر ذی روح اس معمول کا پابند نظر آتا ہے۔ بلکہ انسان تو خصوصاً اس لگے بندھے نظام میں بے قاعدگی کا باعث ہے۔ روایت شکن۔ باغی۔ اور...... خیر......'' کنعان نے سر جھٹکا۔

''گھر کی محفوظ پناہ گاہ میں واپس آنا بھی کتنا خوب صورت احساس ہے۔''

اُس نے وال کلاک کی طرف ایک نظر دیکھا۔ ابو کے آنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ اُس نے ہانڈی کا ڈھکن اُٹھایا۔ اماں نے قیمہ دال بنائی تھی، بھوک کچھ اور بڑھ گئی۔ فریج سے آٹا نکال کر دوپٹے کی گرہ لگائی۔ بھلے سے اماں کو ابو نے گھر کے سبھی کاموں کے لیے رکھا ہوا تھا لیکن کنعان نہ تو ست تھی اور نہ ہی بے حس۔ گھر کی صفائی، کوکنگ، کپڑے دھونا غرض ہر کام میں وہ ان کی پوری پوری مدد کیا کرتی۔ اماں سالن بنا کر فارغ ہوتیں تو وہ اُنہیں ٹی وی لگا دیتی۔ اماں رات آٹھ بجے والے ڈراموں کی بہت شوقین تھیں۔ کنعان بھی اپنی کتابیں لے کر وہیں آ بیٹھتی۔

رفیق احمد ہوٹل سے واپس لوٹے تو وہ دونوں کھانے اور نماز سے فارغ ہو کر ڈرامہ ہی دیکھ رہی تھیں۔

"کیسی ہے میری بیٹی۔" رفیق احمد نے پیار سے اُسے اپنے ساتھ لگایا، وہ روزانہ ہی کنعان سے ایسے ملتے جیسے کہیں دور سے آئے ہوں۔

"بالکل ٹھیک ابوجی۔ کھانا لاؤں؟"

"نہیں بیٹا۔ کھانا کھا چکا ہوں۔ آج جاوید صاحب کے کچھ مہمان آئے تھے۔ مجھے بھی اُنہوں نے ڈنر میں شامل کرلیا۔ بس قہوہ بنادینا۔ لیکن ابھی نہیں، بلکہ ایسا کرو۔" اُنہوں نے سائیڈ جیب سے موبائل فون نکالا۔ "تمہاری پھوپھو کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ تم بھی خیریت دریافت کرلو۔"

"کیا ہوا پھوپھو کو؟" موبائل لیتے وہ پریشان سی اُنہیں دیکھنے لگی۔

"زیادہ پریشانی والی بات نہیں ہے، بلڈ پریشر ذرا زیادہ ہائی تھا۔ اُمید ہے اب تک طبیعت سنبھل چکی ہوگی۔" اُنہوں نے آنکھوں سے موبائل کی طرف اشارہ کیا، کال مل چکی تھی وہ ہیلو کرتے ذرا دور چلی گئی۔

"بی بی تو ہمارے ہاں آنے والی تھیں ناں؟" اماں نے تفکر سے رفیق احمد کو دیکھا

"جی بوا۔ پروگرام تو ابھی بھی ہے، شاید ہفتہ بھر لیٹ ہوجائے لیکن آئیں گی ضرور۔ کنعان سے ملے بنا کہاں رہتی ہیں زیادہ دن۔" وہ اب مسکراتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔

"خیال بھی تو ماں کی طرح کرتی ہیں۔ بہت پیار کرتی ہیں بیٹیا سے۔" اماں محبت سے چُور لہجے بولتی کچن کی طرف چلی گئیں اور رفیق احمد یہاں سے وہاں واک کرکے پھوپھو سے بات کرتی کنعان کو دیکھنے لگے۔

☆☆☆

تین منزلہ اُس نئے ہوٹل کی بلڈنگ ثمامہ کی توقع سے کہیں بڑھ کر شاندار تھی۔ لوکیشن کے حساب سے اگرچہ اینکسی قدرے دُور تھی لیکن بہرحال مری جیسے ہل اسٹیشن پر دور نزدیک کے یہ فاصلے بے معنی تھے۔ اینکسی سے ہوٹل تک روزانہ جاگنگ کرتے ہوئے چلے آنا بھی کچھ کم صحت بخش نہیں تھا۔

"بیوٹی فل۔" سر اُٹھا کر ہوٹل کی خوب صورت بلڈنگ کو دیکھتے دبا دبا جوش ثمامہ کی میٹھی مسکان سے ظاہر ہوا۔

خالد رضا نے کہا کہ آج وہ تھکی ہوئی ہے، آرام کرکے اگلی صبح ہوٹل دیکھنے آئے لیکن ثمامہ سے رات بھر کا انتظار بہت کٹھن تھا۔ وہ دوپہر کو تین گھنٹے کی نیند لے کر شام کو خوب فریش محسوس کرتے گاڑی نکال کر ہوٹل کی عمارت دیکھنے آگئی۔ ہوٹل کا ماڈل اگر ایک خواب تھا تو سامنے کھڑی یہ بلڈنگ ایک بہت حسین تعبیر تھی جو اس وقت ثمامہ کی آنکھوں کے سامنے موجود تھی۔ اس سے پہلے جب وہ کنسٹرکشن کا جائزہ لینے خود تین چار مرتبہ مری آئی تھی تب ظاہر ہے بلڈنگ نامکمل تھی۔ ایسی پرفیکٹ شکل میں دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

"نیون سائن ابھی نہیں لگا خالد صاحب؟ نام تو ڈن ہوچکا تھا۔" وہ کچھ خیال آنے پر مڑی۔

"جی جی میڈم۔" خالد رضا مؤدب سا آگے بڑھا۔ "دراصل پینٹر نے "پیٹرا اِن" کے تین چار لوگوز ڈیزائن کیے ہیں۔ آپ کو جو ڈیزائن، کلر اور فونٹ اچھا لگے، نیون سائن اُسی کے مطابق تیار ہوگا۔"

"ہوں، گریٹ۔ پھر تو میں آج ہی دیکھ لیتی ہوں اور ہوٹل کے باقی معاملات بھی ان شاءاللہ کل سے دیکھنا شروع کردیں گے۔ کل صبح سے میں روزانہ یہاں آیا کروں گی۔"

"جی میڈم۔ آیئے۔" گلاس ڈور کھول کر خالد نے ثمامہ کے لیے راستہ چھوڑا۔

داخلی دروازے سے اندر آتے ہی ایک کشادہ لیکن مختصر راہداری تھی جس کے دائیں جانب ریسیپشن اور بائیں جانب آفس تھا۔ دس بارہ قدموں کی اِس راہداری سے نکلتے ہی بہت بڑا ہال نما ریسٹورنٹ تھا۔ مسافروں اور سیاحوں کے لیے رہائشی کمرے فرسٹ اور سیکنڈ فلور پر تھے۔ "پیٹرا اِن" رش

والے ایریے سے تھوڑا ہٹ کر پنڈی پوائنٹ کی طرف تھا۔ ہجوم اور گھٹن سے گھبرانے والے سیاح عموماً اب ایسے ہی ہوٹلوں کا رخ کرنے لگے تھے۔ البتہ یہ مضافات نہیں تھا، بلکہ آبادی اور مضافات کے بیچ بیچ نسبتاً پرسکون جگہیں زیادہ کشش کا باعث بن رہی تھیں۔ آنے والے دنوں میں "پیٹرا اِن" سکون کے متلاشی سیاحوں کے لیے یقیناً ایک ٹھنڈی چھاؤں کی حیثیت اختیار کرنے والا تھا۔

ثمامہ کے مرحوم شوہر علیم الدین نے یہ جگہ آج سے چھ سال پہلے شادی کے موقع پر ثمامہ کو گفٹ کی تھی۔ شادی چونکہ خفیہ تھی تو اِس لیے تحفہ بھی دنیا سے پوشیدہ ہی رہا، اور دو سال بعد جب علیم الدین کے بیٹے بلال نے اس خفیہ شادی کا راز پالیا تو ثمامہ علیم الدین کی دوسری بیوی کی حیثیت سے باقاعدہ طور پر اُس کے ساتھ ایک الگ گھر میں رہنے لگی۔ علیم کے ساتھ ثمامہ محض تین سال ہی گزار سکی۔ پیٹ کے کینسر نے چند مہینوں کے اندر علیم الدین کی جان لے لی اور فوراً بعد کا ایک سال جائیداد کے جھگڑوں میں گزر گیا۔ علیم الدین کی وصیت نے وفات کے تین دن بعد ہی گھر میں جھگڑا کھڑا کر دیا تھا۔ بلال سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُس کا باپ اپنی تین فیکٹریوں میں سے پوری ایک فیکٹری ثمامہ کے نام کر جائے گا۔ لاکھوں اور کروڑوں کما کر دینے والی فیکٹری ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسل رہی تھی، نہ وہ فیکٹری سے دستبردار ہونا چاہتا تھا نہ ہی وصیت پر عمل کیے بنا کوئی چارہ تھا۔ ثمامہ نے وہ تمام عرصہ سخت ڈپریشن میں گزارا تھا۔ بلال روزانہ اس کے سر پر کسی عذاب کی طرح نازل ہو جاتا اور نت نئے آئیڈیاز کی پٹاری کھول کر بیٹھ جاتا۔ پیش نظر سراسر اپنا ذاتی مفاد ہی ہوتا۔ اور اس کی آخری تجویز یہ تھی کہ فیکٹری کی دیکھ بھال وہ بلال کو سونپ دے۔ منافع کی رقم اُسے گھر بیٹھے پہنچا دی جائے گی ہر ماہ۔ اب پتا نہیں وہ کس بنیاد پر ثمامہ کو بے وقوف سمجھتا تھا، بہر حال نہ وہ بے وقوف تھی اور نہ ہی اتنی سیدھی کے ایسے پینتروں کو سمجھ نہ پاتی۔

علیم الدین کے ذاتی وکیل اور ایڈوائزر ندیم ملک سے تب پہلی مرتبہ ثمامہ نے تفصیلی ملاقات کی۔ یہ وہی وکیل تھے جس کی مدد سے علیم الدین نے مری والی پراپرٹی خریدی تھی۔ اُسی نے ثمامہ کو مشورہ دیا کہ فیکٹری کی دیکھ بھال اگر اکیلے اس کے بس کی بات نہیں ہے تو وہ اُسے بلال کو بیچ دے اور حاصل ہونے والی رقم لے کر یہاں سے کہیں دور چلی جائے۔ ثمامہ کو بھی یہی مشورہ سب سے بہتر لگا کیونکہ اب وہ ہمیشہ کے لیے ان لوگوں سے دور چلے جانا چاہتی تھی۔ جب علیم ہی نہیں رہا تھا تو ایسے سوتیلے رشتوں سے راہ و رسم کے نتیجے میں سوائے نقصان کے کچھ اس کے ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔

یہ مشورہ بھی ثمامہ کو ندیم نے دیا تھا کہ فیکٹری سے ملنے والی رقم کو وہ ہوٹل میں انویسٹ کرے۔ تجویز ثمامہ کے دل کو اس لیے بھی بہت بھائی کہ مری والی پراپرٹی سے بلال قطعی طور پر بے خبر تھا۔ دوسرے کام ایسا تھا کہ ثمامہ نے محض تصور سے ہی اپنے اندر ایک نئی اِنرجی بیدار ہوتی محسوس کی۔ اور آج دو سال بعد اُسکی محنت کا پھل بالآخر "پیٹرا اِن" (petra inn) کی صورت اس کے سامنے موجود تھا۔

☆☆☆

کاش یہ شامیں اور راتیں روز نہ آیا کریں۔ جانے کیوں اُس کے زخموں کی طرح یہ بھی روز تازہ ہو جاتی تھیں۔ بڑھتے اندھیروں کے ساتھ شازمہ کے خوف اور ڈر بھی بڑے اور بھیانک ہونے لگتے۔ رات۔ جو ہر گھر میں سکون اور آرام کی صورت اُتر کر مکینوں کو چین کی نیند فراہم کرتی تھی۔ شازمہ کے آنگن میں صرف وحشت اور تنہائی کی سوغات لیے اُترا کرتی۔ اور وہ ہر آگے کو سرکتے لمحے کے ساتھ خوف کے بھاری سایوں کو خود پر اور زیادہ مسلط اور حاوی محسوس کرتے اپنے آپ میں سمٹتی چلی جاتی۔

کبھی وہ اُونچی آواز میں ٹی وی لگا کر خود کو بہلانے کی کوشش کرتی تو صحن میں کسی کی چاپ کا خود ساختہ گمان اس کی سانس تک نچوڑ لیتا۔ تب صحن اور

برآمدے کی تمام بتیاں روشن کر کے کسی کے بھی وہاں نہ ہونے کی تسلی کر کے اندر کی طرف بڑھتی اور بلاوجہ کچن یا کمرے میں کسی کا سایہ سا لہراتا محسوس ہونے لگتا، جھنجلا کر وہ چھوٹے سے گھر کا ایک ایک کونا روشن کر دیتی۔ لیکن کب تک۔ پورا گھر روشن کر کے آخر سویا بھی تو نہیں جا سکتا تھا۔ جیسے تیسے خود کو آمادہ کر کے ساری کھڑکیاں، سارے دروازے کئی کئی مرتبہ بند کرنے کی تسلی کر کے لائٹس آف کرتے بستر پر آ لیٹتی تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور اور انجانے خوف کسی آکٹوپس کی طرح پورے وجود سے لپٹے ہوئے سے لگتے۔

اُسے سچ مچ ہی آٹسو لوفوبیا (تنہائی کا خوف) ہو گیا تھا۔ تنہائی کا عفریت بہت بھیانک بڑا جان لیوا تھا۔ اپنے وہموں اور خدشوں سے نجات کے لیے وہ نت نئے طریقوں پر غور کرنے لگتی۔ جن میں سرفہرست کسی ایسی عورت کا انتظام کرنا تھا جو مستقل طور پر اس کے پاس رہائش اختیار کر سکتی۔ وقاص سے اس سلسلے میں کچھ بھی کہنا بے کار ثابت ہوا تھا۔ جواباً ہنسنا، اس کا مذاق اُڑانا اور بات کو چٹکیوں میں اُڑا کر بھول ہی جانا اس کی عادت بن چکا تھا۔ تبھی پچھلے دنوں مجبور ہو کر اپنی مدد آپ کے تحت شازمہ نے خود اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ محلے والیوں سے راہ و رسم بھی کچھ اسی مقصد سے بڑھائے تا کہ کسی غریب بے سہارا عورت کا بندوبست کرنے میں سب اس کی مدد کریں۔ کوشش کا نتیجہ بھی مثبت نکلا۔ سامنے والی رفعت آنٹی نے دو محلے پیچھے ایک غریب عورت سے اس بارے میں بات کی جس کے آٹھ بچے تھے اور شوہر دیہاڑی کا مزدور تھا۔ وہ خود تو آ کر شازمہ کے پاس نہیں رہ سکتی تھی البتہ اپنی دس گیارہ سالہ بیٹی سکینہ کو اس کے پاس چھوڑنے کے لیے تیار ہو گئی۔

روپے پیسے کے معاملات طے پا گئے اور شازمہ نے وقاص سے اجازت بھی لے لی۔ اگلے ہی دن سے سکینہ اس کے پاس آ کر رہنے لگی۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ خوف انسان کے اپنے اندر ہوتا ہے۔ سکینہ کی آمد شازمہ کے سارے خدشے اور خوف یوں بہا لے گئی جیسے کہ کبھی وہ تھے ہی نہیں۔ ایک گیارہ سالہ بچی جو نہ اسے کسی چور ڈاکو سے بچا سکتی تھی، نہ کسی اَن دیکھی مخلوق سے...... تنہا ہوتے جس کے ہونے کا وہم شازمہ کی جان کو آ جاتا تھا۔ ''دوسراہٹ'' کا احساس بذاتِ خود ایک بہت بڑی تسلی تھا۔ وہ سکینہ کو کہانیاں سناتے اس سے باتیں کرتے یوں نیند کی مہربان دیوی کی آغوش میں چلی جاتی کہ پھر صبح ہونے پر ہی اس کی آنکھ کھلتی۔ اس دوران ہفتے میں ایک بار وقاص کی آمد اس خوشی اور سکون کو مکمل کر دیتی اور شب و روز بھرپور اطمینان سے گزرنے لگے۔ لیکن شازمہ کو یہ خوشی زیادہ دنوں تک راس نہ آ سکی۔

سکینہ کا ایک سترہ اٹھارہ سال کا بھائی نزدیکی کسی شہر میں کام کی تلاش میں گیا ہوا تھا۔ کوئی کام نہ ملنے پر بیس بائیس دنوں بعد وہ واپس لوٹا تو سکینہ کے بارے میں سن کر خوب آگ بگولا ہوا۔ اسی روز بازو سے پکڑ کر بہن کو ساتھ لے گیا کہ ابھی ہمارے اتنے بھی برے دن نہیں آئے کہ بہنوں کی کمائی کھائیں۔

شازمہ ہکا بکا کھڑی دیکھتی رہ گئی۔ کیونکہ ایک مرتبہ پھر وہ اکیلی کر دی گئی تھی۔ شام کے لمبے سائے ناگن کی طرح اس کے وجود سے لپٹنے کو تیار کھڑے تھے۔ گھبرا کر اس نے فوراً ہی وقاص کا نمبر ملایا۔

''پلیز وقاص۔ آج کسی طرح میرے پاس رہنے کے لیے آ جاؤ۔ میں بہت ڈر رہی ہوں۔''

''تمہارے پاس آ سکتا میری جان۔ تو تم اکیلے پن کی سزا کیوں کاٹ رہی ہوتیں۔'' وقاص نے رسان سے سمجھانے کی کوشش کی۔

''آج انکار نہ کرو وقاص۔ سچی ان بیس دنوں میں تو بالکل ہی عادت ختم ہو گئی تھی اکیلے رہنے کی۔ آج رات مجھ سے ایک پل بھی سویا نہیں جائے گا۔'' وہ ایک دم رو دینے والی ہو گئی۔ وقاص نے خود پر ضبط کرتے سختی سے لب بھینچے۔ شازمہ کی حالت کو اُس سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا۔ وہ تو اُس کی پریشانی کم کرنے کے خیال سے خود کو لاپروا ظاہر کرتا تھا ورنہ شازمہ کا یہ اکیلا پن سب سے زیادہ اس کے دل کا امتحان تھا۔

''تم جانتی ہو شازمہ۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ تمہیں

تو پتا ہے میری مجبوری۔"
"مجھے کچھ نہیں پتا وقاص۔" وہ کہنے لگی۔ "کوئی تو ہوگا جسے آپ ایک رات کے لیے اپنی جگہ فیکٹری کا خیال رکھنے کو کہہ دیں۔ ایک رات سے بھلا کیا ہو جائے گا۔"
"ایک رات میں کیا نہیں ہو جاتا سوئٹ ہارٹ۔" وقاص نے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔ "فیکٹری کے ایک ہی رات میں راکھ ہونے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ راکھ کے ڈھیر کو دوبارہ فیکٹری کی صورت اُٹھانا کتنی جان جوکھوں کا کام تھا کوئی مجھ سے پوچھے۔ خیر......" وقاص نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے اصل موضوع کی طرف آیا۔ "آس پڑوس کی کسی آنٹی کو بلا لو ایک رات کے لیے۔"
"ایسا یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔" شازمہ کی بھی آہ نکل گئی۔ "سب بہت اچھے اور بہت خیال رکھنے والے ہیں لیکن ہر کسی کی مجبوریاں ہوتی ہیں۔"
"اچھا پلیز ڈیئر۔ ایک ہی رات کی تو بات ہے۔ کل شام تو میں خود آرہا ہوں ناں۔ اتوار کے دن کوئی بندوبست کر کے ہی جاؤں گا ان شاء اللہ۔" وقاص نے اس بار عجلت سے اجازت لے کر فون بند کر دیا تھا۔
شازمہ نے تھک کر ہاتھ اپنی گود میں گرائے۔ وقاص نے ہمیشہ کی طرح آج بھی اُس کی بات نہ مانتے اُلٹا اسے قائل کر لیا تھا۔ وہ بھی نیم رضامندی کی کیفیت میں ہر بار کی طرح ہتھیار ڈال گئی۔
وقاص سے اس کی شادی کو چند ہی ماہ ہوئے تھے۔ وہ نزدیکی شہر سے یہاں اس نئے شہر آئی تھی۔ اس کا شوہر وقاص ایک لکڑی کے کارخانے کا مالک تھا۔ وقاص کے قریبی رشتہ داروں میں ایک بھائی بھی اس شہر میں رہتا تھا لیکن جائیداد کے جھگڑوں نے برسوں پہلے ہی دونوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا تھا۔ ماں باپ وغیرہ تھے کوئی نہیں۔ وہ اپنی مرضی سے محض اپنے دم پر ہی شازمہ کو بیاہ لایا تھا۔ اور یہاں آکر اسے اس نئے محلے میں کرایے کا مکان لے کر دیا تھا۔ پہلے پہل تو شازمہ کے لیے اس تنہا آزاد، سسرالیوں کے جھنجھٹ سے پاک زندگی میں بے انتہا کشش تھی۔ لیکن وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وقاص اس اکیلے گھر میں اسے تنہا چھوڑ کر چھ دنوں کے لیے اپنی فیکٹری میں رہا کرے گا۔ وقاص نے اپنی مجبوری اسے ان لفظوں میں بیان کی تھی کہ فیکٹری کے اندر کام کرنے والے اس کے اپنے بھروسا مند کچھ ورکرز نے اس کی فیکٹری کو آگ لگا کر اس کا بزنس تباہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ جو کہ یقیناً اس کے بھائی سے ملے ہوئے تھے۔ پورا ایک ڈیڑھ سال لگا کر وقاص نے اپنی تباہ حال فیکٹری کو اپنی محنت کے بل بوتے دوبارہ کھڑا کیا تھا اور اب وہ کسی پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے رات وہ لازمی فیکٹری میں بسر کرتا۔ البتہ ہفتے کی شام وہ بھی ورکرز کو رخصت دے کر ایک رات کے لیے شازمہ کے پاس آکر اتوار کا آدھا دن بھی یہیں گزار کر واپس چلا جاتا کیونکہ اتوار کو فیکٹری بند رہتی تھی۔
شازمہ تھک کر ستون سے ہٹ آئی۔ اب بارہ، ایک بجے تک ٹی وی دیکھتے اسے کسی طرح اپنی رات کو دھکا لگانا تھا، آنے والے کل کی اُمید پر......

☆☆☆

"ہوں۔" ثمامہ نے فائل بند کر کے خالد رضا کی طرف دیکھا۔ "مجھے لگتا ہے افتتاحی تقریب کی ڈیٹ ہمیں کچھ آگے کرنی پڑے گی۔ جب تک اسٹاف مکمل نہ ہو جائے ہمیں کام کا آغاز نہیں کرنا چاہیے۔" ثمامہ نے اگلی صبح قدرے زیادہ باریک بینی سے معاملات کا جائزہ لیا تو پہلی بار کچھ متفکر سی نظر آئی۔
"لیکن ہمارے پاس صرف ریسٹورنٹ کا عملہ مکمل نہیں ہے میڈم۔" خالد رضا نے سمجھانے کی کوشش کی۔ "ہم ہوٹل کا کام باآسانی کسی بھی وقت شروع کروا سکتے ہیں۔ صرف اُوپری منزل پر چند ایک کمروں میں ڈیکور کا کام ہو رہا ہے۔ باقی روم سروس، لانڈری، کلیننگ وغیرہ کا سارا عملہ پورا ہے اور ایسے تو یہاں کئی ہوٹل ہیں جن میں صرف رہائش کی سہولت ہے، کھانے وغیرہ کا کچھ جھنجھٹ نہیں۔"

"لیکن ہم یہ جھنجٹ پالے بیٹھے ہیں خالد صاحب۔" ثمامہ کے حسین گلابی لبوں پہ لطیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "یہاں اصل مسئلہ فرسٹ امپریشن کا ہے۔ اصل کارکردگی تو شروع شروع میں ہی دکھانی پڑتی ہے۔ لوگ اگر "ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ" کا بورڈ پڑھ کر ہمارے ہوٹل کو ترجیح دیں لیکن مطلوبہ سہولت میسر نہ آئے تو کتنا برا اثر لے کر جائیں گے اس لیے۔ ثمامہ نے ریوالونگ چیئر سے ٹیک لگا کر ہلکا سا اُسے دائیں بائیں گھمایا۔ "چند دن ٹھہر جانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ میں خود بھی کچھ دن ذرا بزی ہوں۔ سوچ رہی ہوں ہوٹل کے باقاعدہ افتتاح سے پہلے کوئی کلب وغیرہ جوائن کرلوں۔ سوسائٹی میں جان پہچان بھی تو ضروری ہے۔"

بالکل میڈم یہ تو بہت اچھا سوچا آپ نے۔ میری کچھ مدد درکار ہو تو میں حاضر ہوں۔" وہ اب اُٹھ کھڑا ہوا تھا

"بہت شکریہ خالد صاحب، کیوں نہیں۔ میں ویسے بھی یہاں نئی ہوں۔ آپ کی رائے اور مشورہ تو مجھے ہر موڑ پر درکار ہوگا۔ دراصل کوئی میجر لطف اللہ خان ہیں۔ ان کی مسز سے پچھلی شام میری اچھی سلام دعا ہوئی ہے۔ وہیں انیکسی کے پاس ان کا بنگلا ہے۔ اُنہوں نے ہی ایک کلب کے بارے میں بتایا ہے اُدھر کشمیر پوائنٹ کی طرف۔ کہہ رہی تھیں فیملیز کے لیے مخصوص ہے اور زیادہ تر خواتین ہی ہیں۔ اُمید ہے وہاں کافی فیملیز سے اچھی جان پہچان ہوجائے گی۔"

"جی میم، میری مسز بھی جانتی ہیں اِس بارے میں، ویسے وہ بھی آپ کو انوائٹ کرنا چاہ رہی تھیں۔" خالد نے ذرا جھجک کر اظہار کیا۔

"ارے سچ۔" ثمامہ حقیقی مسرت سے چہکی۔ "یہ تو بہت خوشی کی بات ہے، لیکن فارمیلٹیز میں بالکل مت پڑیے۔ مجھے آپ کبھی بھی اپنے ساتھ گھر لے جایے، بلکہ ایسا کریں۔" ثمامہ نے آنکھیں گھما کر ذرا دیر کو سوچا۔ "آپ اُنہیں انیکسی لے آیئے کسی دن۔ سیکنڈ ٹائم تو آج کل بالکل فری ہوتی ہوں۔ اُن سے مجھے یقیناً یہاں کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع ملے گا۔"

"شیور میم۔" خالد بڑی قدردانی سے مسکرایا۔ "میری وائف بھی کافی سوشل قسم کی ہیں۔ آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔"

"تب تو انہیں جلد از جلد لے آیئے۔"

"جی۔ مجھے اجازت میم؟" خالد اب جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

"جی بالکل۔ بس آپ ریسٹورنٹ کے لیے شیف وغیرہ کی تلاش میں ذرا تیزی لائیں۔ جب تک باقاعدہ افتتاح نہ ہوجائے، ذہن مسلسل دباؤ میں رہے گا۔"

"میں سمجھ سکتا ہوں میم۔ ان شاء اللہ جلد بندوبست ہو جائے گا۔" وہ ہلکا سا سرخم کرتے باہر نکل گیا۔ ثمامہ نے کرسی سے ٹیک لگاتے اپنی پُرسوچ نگاہ سامنے لگی پینٹنگ پر جمائی۔ کسی آنے والے وقت کا محض تصور کرنا اور پیش آنے پر عملاً اُس سے دوچار ہونا دو کتنے مختلف تجربے ہوتے ہیں۔ مری آنے سے پہلے وہ ہوٹل کی تصویریں اور ماڈل دیکھ کر ایک ہی خوش کن پہلو تصور کرپاتی تھی۔ ایک بہت بڑے اور خوب صورت ہوٹل کی مالکن ہوکر اُسے چلانا اور بس۔ اور اب یہاں آنے پر احساس ہورہا تھا کہ بڑے کام میں ہاتھ ڈالنا ایسا سیدھا بھی نہیں ہوا کرتا۔ لیکن بہرحال وہ حوصلہ کھونے والوں میں سے نہیں تھی۔ فی الحال تو اُسے عادل کے لیے کالج اور ثمر کے لیے اسکول دیکھنا تھا۔ اُن ماموں بھانجے کو اپنی اپنی جگہ سیٹ کردینے کے بعد ہی وہ ہوٹل کی طرف دھیان دے سکتی تھی۔ اصل مسئلہ ریسٹورنٹ کا تھا جس کے لیے کک میسر نہیں آرہے تھے۔ اخبار میں اشتہار دینے کا نتیجہ بھی کچھ خاطر خواہ حاصل نہیں ہوسکا تھا۔ جتنے لوگ بھی انٹرویو دینے آئے بقول خالد رضا عملی پریکٹس میں اچھی کارکردگی نہیں دکھا پائے تھے۔

☆☆☆

صبح ہی صبح بادل دیکھ کر کنعان کا موڈ قدرے آف ہوگیا۔ اُسے تو جون جولائی میں بھی اپنا مری بادلوں سے پاک ہی پسند تھا، لیکن مری کا مزاج شاید اس کی پسند سے میل نہیں کھاتا تھا بھی تو گرمی کے ستائے پاکستانی ان خوب صورت بادلوں کی اٹھکیلیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے سر کے بل دوڑے چلے آتے تھے۔

تالا لگا کر وہ اماں کے ساتھ چڑھائی چڑھ کر اُوپر روڈ پر آئی۔ ایک نظر دوبارہ مڑ کر گلی میں دیکھا۔ دیا ابھی تک دکھائی نہیں دی تھی۔

"دیا بیٹی تو آئے گی ناں؟" اماں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھ کر اس کی سوچ پڑھی۔

"جی اماں۔ فون پر بات ہوئی تھی، وہ تیار ہورہی تھی۔ میں ابو کو چابی دے کر وہیں رُک جاؤں گی۔ آپ جائیں۔"

"اچھا۔ اللہ حافظ۔" وہ برقع درست کرتے ہوئے اپنے راستے کو مُڑ گئیں اور کنعان نے ہوٹل کا رُخ کیا۔ تین اسٹیپ چڑھ کر ہوٹل کے ریسیپشن تک آئی لیکن کاؤنٹر خالی ملا۔ اُس نے دائیں بائیں کے کوریڈورز میں دُور تک نگاہ کی لیکن ابو، قاسم، صدیق کوئی دکھائی نہیں دیا۔ ایک اور سیاح بھی اُس کے نزدیک کھڑا کسی اٹینڈنٹ کا انتظار کررہا تھا۔ کنعان کاؤنٹر پر ہلکے ہلکے چابی بجاتے کسی کی آمد کی منتظر تھی۔ دیا کے آنے تک یوں بھی اُسے یہیں رُکنا تھا۔

"فرمایئے۔ کیا مدد کرسکتا ہوں؟" ساتھ کھڑے سیاح نے باقاعدہ پوری طرح گھوم کر اُسے مخاطب کیا تھا۔

کنعان نے پہلی مرتبہ توجہ سے اُسے دیکھا، آنکھوں میں صاف صاف حیرت جھلک رہی تھی۔ بھلا وہ ہوتا کون تھا اُس سے ایسا بے تکا سوال کرنے والا۔ لیکن بنا کچھ کہے وہ اِس بدتمیزی کو شرافت سے ہضم کرگئی اور دوسری جانب دیکھنے لگی۔

"بولیے میڈم۔ کچھ کام ہے آپ کو؟" لڑکے نے مؤدبانہ ایک بار پھر اُسے مخاطب کیا۔

کنعان نے اِس بار غصے سے گردن پھیری، بھلے شکل وصورت بہت اچھی تھی۔ بولنے کے ڈھنگ سے بھی خوب آشنا تھا۔ لیکن لڑکی اکیلے پاتے ہی متوجہ کرنے کی یہ کوشش انتہا درجے کا چھچھورا پن محسوس ہوا۔

"اپنے کام سے کام رکھیے مسٹر۔ فری ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔" کنعان نے تیوری چڑھا کر اس مرتبہ سیدھا جواب دینے کو ترجیح دی۔

سوار نے کان کھجاتے لڑکی کی دماغی حالت درست نہ ہونے پر سنجیدگی سے غور کیا۔ "ہوٹل کے اندر بھی گھس آئی ہے، بنا کسی کام کے اتنی دیر سے کاؤنٹر پر بجی ہے، اُوپر سے کالج کی یونیفارم بھی پہن رکھی ہے، کوئی مسافر کالج کی ڈریس میں رُوم بک کروانے کیوں آئے گا بھلا۔ کہیں......؟" سوار کی سوچ کے دھارے نے اچانک ایک بھیانک رُخ اختیار کیا۔ "کہیں گھر سے بھاگ کر تو نہیں آئی؟ اور یہی اُسے قرین قیاس بھی لگا۔ گھر سے کالج کا جھانسا دے کر نکلنے والی ضرور کالج ٹائم کے دوران دوسری ایکٹیویٹز میں مگن رہتی ہے۔ لیکن واہ بھئی، کانفیڈنس کا تو جواب نہیں، مجال ہے جو چہرے سے ذرا بھی گھبراہٹ جھلکتی ہو۔

"محترمہ آپ اپنا اور میرا وقت ضائع کررہی ہیں۔" وہ اب سائیڈ سے گھوم کر کاؤنٹر کے اندر والے حصے میں داخل ہوگیا تھا۔ اور اب دیوار پر لگے "کی اسٹینڈ" کی چابیوں کو چھیڑ رہا تھا۔

مسافر کی اِس جرأت پر کنعان کا مزید خون کھولا۔ اگر اِس آدمی کو اپنے کمرے تک پہنچنے کے لیے چابی وغیرہ کی ضرورت تھی، تب بھی ہر حال میں کسی اٹینڈنٹ کا انتظار کرنا ضروری تھا۔ اور اس سے پہلے کہ کنعان منہ سے کچھ بولتی وہ لڑکا کی اسٹینڈ سے ہٹ کر کاؤنٹر کی طرف پلٹا اور دراز یں کھولنے لگا۔

"اے ے ے۔" کنعان گھبرا کر چیخی۔ خوش شکل اُچکا تو رقم وغیرہ بھی اینٹھنے کے چکر میں تھا۔ لیکن جانتا نہیں تھا کہ سامنے کھڑی لڑکی یہاں کے مالکوں میں سے ہے۔ یقیناً اُسے مسافر سمجھ کر ہاتھ کی مہارت دکھا رہا تھا۔

"کوئی ہے۔صدیق بھائی۔" وہ دائیں طرف کے کوریڈور میں گھس کر اونچی آواز میں چلانے لگی۔

سوار بھاگ کر کاؤنٹر والے حصے سے باہر نکلا۔

لڑکی تو واقعی بالکل پاگل تھی۔صبح صبح کمروں میں مسافر بے چارے آرام کر رہے تھے اور وہ جاہل گلا پھاڑ پھاڑ کر۔

"چپ رہو پاگل۔" سوار نے آناً فاناً اُسے جالیا اور بازو دبوچ کر پیچھے ریسیپشن کی طرف دوبارہ دھکیلا۔ "کمرا بک کروانا ہے تو پھوٹو منہ سے اور...... اور......" اچانک ایک خیال نے سوار کے دماغ کی گھنٹی بجائی۔وہ صدیق کو بھی جانتی تھی۔

"کس سے ملنا ہے تمہیں۔کالج یونیفارم میں یہاں کیا کر رہی ہو۔"

"ارے۔" کنعان آنکھیں نکالتے دوبارہ آگے بڑھی۔ "تمہیں کیوں بتاؤں۔چور اُچکے کہیں کے۔ریسیپشن اکیلا پا کر رقم اُٹھا رہے تھے۔"

"اے ے ے۔دماغ خراب ہے پاگل لڑکی۔" سوار طیش میں آگے بڑھا اور ابھی شیشے کا دروازہ کھول کر پہلے صدیق اور پیچھے دیا اندر داخل ہوئی۔

"ارے۔ایک منٹ۔" صدیق بھاگ کر قریب آیا

"صدیق بھائی! یہ لڑکا مجھے بلاوجہ تنگ کر رہا ہے۔" کنعان بھاگ کر صدیق کی اوٹ میں ہوئی۔

"اے۔شرم نہیں آتی الزام لگاتے۔بے وقوف لڑکی۔"

"س......سوار......رُکو......" صدیق نے ایک بس ہاتھ نہیں رکھا اُس کے منہ پر۔ "یہ کنعان بی بی ہیں، رفیق سر کی بیٹی، گھر کی چابیاں دینے آئی ہیں۔" صدیق بے چارے کا وضاحت دیتے منہ سرخ ہو گیا۔

کنعان ابھی بھی ہونقوں کی طرح صدیق کو تک رہی تھی اور یہاں صدیق کو دوسرے تعارف کی ضرورت محسوس ہوئی۔

"کنعان بی بی۔یہ سوار حسن ہے۔کل شام سے یہاں کام پر آیا ہے۔قاسم کی جگہ۔اُس کی شادی ہے ناں، وہ ایک ماہ کی چھٹی پر ہے۔"

"اوہ۔" سخت جھینپ کر کنعان نے ہاتھ اپنے منہ پہ رکھا اور آدھی نظر ہی سوار کی جانب اُٹھا پائی، جو نچلا لب دانتوں میں دبائے زور سے آنکھیں بھینچ کر اُس سے زیادہ شرمندہ نظر آتے رُخ پھیر گیا تھا۔کنعان نے چابیاں صدیق کو تھمائیں اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

"میرا آج جوتا ٹوٹ گیا تھا مصیبت، آدھے راستے سے ہی واپس لوٹ جانا پڑا۔" دیا بل کھاتے راستے پر جنگلے کے ساتھ ساتھ چلتے اپنی بپتا سنانے لگی۔

"شکر ہے یہ پرانے کوٹ شوز ابھی اس حالت میں تھے کہ صاف شاف کر کے پہن سکتی تھی۔تم لگتا ہے کافی دیر سے آ چکی تھیں۔" اُس نے بات کرتے ایک نظر کنعان دیکھا، نیچے راستوں کو دیکھتے اللہ جانے قدم گن رہی تھی اپنے۔جواب بہرحال نہیں آیا تھا اُس کی طرف سے۔

"قاسم بھائی کی شادی ہو رہی ہے۔مجھے تو نہیں بتایا تم نے۔اور ہاں تم اُس نئے لڑکے سے جھگڑا کیوں کر رہی تھیں؟" دیا کے پاس سوال بہت تھے لیکن جواب آج ایک بھی نہیں تھا۔مال روڈ نظر آنے لگ گئی تھی۔یہاں سے کشمیر پوائنٹ والے روڈ کو چڑھنے کے بیچ محض چند ہی قدموں کا راستہ تھا لیکن رش کی وجہ سے سلسلۂ کلام ہمیشہ ہی منقطع ہو جاتا۔کالج روڈ پر چڑھتے ہی دیا پھر شروع ہو گئی۔

"موسم بدل رہا ہے کنعان۔کسی دن شاپنگ پہ چلو ناں۔میں تو ریڈی میڈ شرٹس لوں گی کڑھائی والی۔شالوں سویٹروں سے نجات مل گئی ناں تو ایسے کپڑے پہننے کا مزا آئے گا۔ہے ناں؟" دیا نے تائید طلب نظروں سے کنعان کو دیکھا اور پہلی بار اُسے اچنبھا ہوا۔

کنعان رفیق اس کے ساتھ موجود ہوتے بھی ہرگز وہاں نہیں تھی۔ہوٹل سے نکلتے ہی وہ تو کسی اور سفر پہ روانہ ہو گئی تھی۔دیا نے کئی سوال پوچھے اُس نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا تھا اور اب دیا بالکل چپ ہو گئی تھی تو کنعان اِس پر بھی نہیں چونکی تھی، چونکتی بھی کیسے۔وہ تو یہاں موجود ہی نہیں تھی۔چہرے پر حواس باختگی اور گھبراہٹ کے آثار ابھی بھی محسوس کیے جا سکتے تھے۔

اب دیا کے نزدیک واقعہ اتنا بڑا تو ہرگز نہیں تھا کہ کالج پہنچنے کے پورے راستے، پھر سارا دن کلاس اٹینڈ کرنے، حتیٰ کہ چھٹی کے بعد واپس آنے تک اُسی کے زیرِاثر رہا جاتا، لیکن کنعان بی بی تو آج واپسی کا راستہ بھول بیٹھی تھیں اور ایسا نہیں تھا کہ سارا دن ہی وہ بولی نہیں تھی، لیکن فرق تھا اور اس شدت کا فرق تھا کہ دیا کو لگا آج کا دن اُس نے کسی روبوٹ کے ساتھ گزارا ہے۔

مال روڈ سے اُتر کر وہ اپنے راستے کو مڑ چکے تھے۔ دن بھر کی صبر آزما خاموشی سے اُوب کر بالآخر دیا نے گل افشانی کا ارادہ کیا لیکن خوب سوچ کر۔

"خوب صورت تو ویسے بہت ہے۔"

"ہاں۔" جواب فوراً آیا لیکن یوں جیسے دُور کسی مندر کی گھنٹی بجی ہو۔

لیکن آیا بس کچھ روز کے لیے ہے۔

"ہوں؟"

دھند دھیرے دھیرے چھٹنے لگی۔ کسی طویل ارتکاز کا پردہ چاک ہوا اور کنعان نے چونک کر دیا کی طرف دیکھا آنکھیں چار ہوتے ہی جس نے شرارت سے چمکتی آنکھوں کے ساتھ سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ کنعان نے گڑبڑا کر سر اُٹھایا۔ ازمیر ہوٹل کا نیون سائن نظر آنے لگا تھا۔ ہوٹل اب محض پچیس تیس قدم کی دُوری پر تھا۔ واپسی پر اُنہیں ہوٹل سے جانی نہیں لگنی ہوتی تھی۔ اماں اُن سے پہلے ہی گھر واپس آ چکی ہوتیں۔ لیکن سامنے سے تو گزرنا ہی تھا۔ جانے کیسی نامعلوم سی سنسنی دوڑی تھی پورے وجود میں، چہرے سے تپتے انگاروں جیسی حرارت پھوٹنے لگی۔

عین آگے سے گزرنے پر کنعان نے چور نگاہوں سے شیشے کے پار کچھ کھوج لینا چاہا لیکن ہوٹل کا بیرونی حصہ اور ریسپشن خالی نظر آئے، وجود کی حرارت پر ایک دم برف سی پڑنے لگی تھی کہ دیا نے ٹہوکا دیا۔ کنعان نے خفگی سے گھورا تو وہ معنی خیز مسکراہٹ لبوں پر سجائے ایک جانب کو دیکھ رہی تھی۔ کنعان نے نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو آنکھیں ٹھہر گئیں۔ جسے وہ ہوٹل کے اندر ڈھونڈ رہی تھی وہ مخالف سمت والے جنگلے کے پاس کھڑا کسی آدمی سے بات کر رہا تھا۔ صبح والی اُسی ڈیپ گرے شرٹ کے ساتھ بلیک ڈریس پینٹ پہنے، اور اب مسکرا کر اُس نے الوداعی انداز میں سامنے کھڑے شخص سے مصافحہ کیا تھا۔ کسی کے مسکرانے پر بھی آس پاس کا پورا منظر یوں بھی جی اُٹھتا ہے، پہلی بار دیکھا تھا۔ اور آدمی کے رخصت ہوتے ہی اُس نے ہوٹل کی طرف بڑھتے ایک اُڑتی پڑتی بالکل بے ارادہ سی نظر کنعان پر ڈالی تھی۔ بظاہر کچھ بھی نہیں تھا اُس ایک نظر میں، جانے کنعان کی ہتھیلیوں سے پسینہ کیوں پھوٹ نکلا۔

"سچ میں یار۔ یہ تو بڑا پیارا ہے۔" دیا نے بلاتوقف تبصرہ کیا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو۔ شرم نہیں آتی؟" کنعان کے حلق میں کچھ پھنسا۔ اپنی آواز بھی اجنبی سی لگی۔

"لو۔ ابھی تم ہی تصدیق کر رہی تھیں۔" وہ ڈھٹائی سے ہنسی۔

"کس بات کی تصدیق۔ کیا بولے جا رہی ہو؟"

صبح جس کی دید نے کنعان کو اسٹاپ لگایا تھا، دوبارہ دیکھنے پر جیسے اسٹارٹ کا بٹن دب گیا۔ دونوں ہوٹل کے فوراً بعد آنے والی ڈھلان اُتر کر گھر کے راستے کو مُڑ گئی تھیں۔ دیا بنا جواب دیئے مسکراتی رہی۔ کنعان نے گھر کا دروازہ بجایا۔ دیا ہاتھ ہلاتے آگے بڑھ گئی لیکن چند قدم پر رُک کر واپس مُڑی اور اب وہ اُلٹے قدموں سے چل رہی تھی۔

"مجھ سے "ہر" بات شیئر کرنے کا اپنا وعدہ مت بھولنا۔ بھروسے مند دوست بھی نعمت ہوا کرتے ہیں، یاد رکھنا۔" پورے دانت نکال کر ہنستے اب وہ گلی مُڑ گئی تھی۔ اماں نے دروازہ کھولا اور کسی اجنبی کا تصور دل اور آنکھوں میں بسائے اپنے ہی گھر میں ایک نئی کنعان نے قدم رکھا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)



عطیہ خالد



سلائی مشین کی چوکی زینب کی ہم جولی تھی۔ جہاں اس کے رات اور دن کٹتے تھے۔ جس کے سنگ وہ بڑبڑاتی، ہنستی، رو بھی دیتی تھی۔ یہ مشین جس پر بیوگی کے بعد اس نے اپنی جوانی قطرہ قطرہ پگھلا کر حوادث زمانہ کی آنچ پر سوختہ کی تھی۔ اسی چوکی کے ایک کنارے جانماز بچھی رہتی تھی۔ مسائل بڑھ جاتے تو زینب مشین چھوڑتی اور جانماز پر پناہ ڈھونڈتی۔ اپنے خالق کے حضور مناجات کرتی۔ پھر جو کلام سے پہلے آواز سن لیتا ہے۔ کیسے نہ مہربانی کرتا اس بیوہ کے یتیم بچوں پر۔

احمد اور زارا شروع سے ہی پڑھائی میں پہلے نمبر پر رہے تھے۔ زینب کو ہمیشہ اتنا کام ملتا رہا کہ دونوں کی پڑھائی کے خرچے پورے ہوتے رہے تھے۔ ہاں پیٹ بھر کر روٹی کھانے کی عادت تینوں نے نہیں ڈالی تھی۔ کپڑوں جوتوں کے خواب نہیں دیکھے تھے۔ جیسا تیسا ملا کھا لیا، پہن لیا تھا۔ زندگی مشقت سے پر تھی، اور آسائشوں سے مبرا...... اچھی تھی زندگی...... تب یہ خوشی کی خبر سننے کو ملی۔ ساری مشقتیں وصول ہو گئی تھیں۔

ہر بار امتحان میں وہ راتوں کو کتابوں کے ساتھ جاگتے تو وہ جائے نماز پر جاگتی۔ اسے اپنے رب سے صرف اپنے بچوں کی کامیابی چاہیے تھی۔ پہلی بار احمد دسویں میں ضلع بھر میں اول آیا تو اسے لگا کہ کڑی دھوپ سے وہ ٹھنڈی سڑک پر آ گئی۔ انگلیوں کی پوروں کے زخموں پر مرہم رکھا گیا۔

''اماں مجھے لیپ ٹاپ لینا ہے۔ اس کے بنا پڑھائی اب ممکن نہیں رہی۔'' احمد نے جھجکتے ہوئے ماں کو مخاطب کیا۔

''اچھا۔ کرتی ہوں کچھ۔ تمہاری اور زارا کی ٹیوشن والے پیسوں سے جو کمیٹی ڈالی ہے وہ اگلے ماہ نکلے گی۔ تم تب تک گزارا کر لو۔ مجھے بھی سلائی کا بڑا آرڈر ملا ہے۔ امید ہے اتنے پیسے ہو جائیں گے۔'' زبردستی چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے زینب نے احمد کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''جی اماں......'' احمد نے سر کو مزید جھکا کر روٹی کے اٹکتے نوالے کو پانی سے اندر کیا۔

''میں پڑھ لکھ کر اپنی اماں کی سب تنگیاں دور کر دوں گا۔ ان شاء اللہ......'' احمد نے کئی بار کا کیا ہوا عہد دل میں پھر دہرایا۔

اس کی لگن اور شوق میں پہلے سے بڑھ کر تیزی آ گئی تھی۔ وہ سچ مچ کتابیں گھول کر پی رہا تھا۔ ایف اے میں بھی اس نے بورڈ میں ٹاپ کیا تھا۔ اخبار میں اس کے انٹرویو کے ساتھ تصویریں بھی چھپی تھیں۔ کالج کے سالانہ میگزین کے ٹائٹل پیج پر اس کا ذہانت سے بھرپور چہرہ چمکا رہا تھا۔ زینب کے سجدے کیوں نہ طویل ہوتے۔ شکر سا شکر تھا۔ وہ آسمان کی طرف تشکر سے دیکھتی کوئی مجذوب لگتی۔

☆☆☆

"اماں جو ماموں نذیر احمد گاؤں والی زمین ہمیں دے دیتے تو میں پڑھائی کے ساتھ کھیتی باڑی کر لیتا۔اماں پھر تمہیں مشین سے آنکھیں نہ پھوڑنی پڑتیں۔یا پھر وہ شہر والا مکان ہمیں رہنے کے لیے دے دیتے تو میں اس میں ٹیوشن سینٹر بنا لیتا۔گھر کا کرایہ بچتا تو میں تمہیں سلنڈر والا چولہا لگا دیتا۔ دھوئیں نے تمہاری آنکھوں کا ناس مار دیا ہے۔"

بڑے دنوں بعد احمد نے زمین اور مکان والی بات دہرائی تھی۔مکان مالک نے کرایہ بڑھا کر پانچ ہزار کر دیا تھا۔دونوں ماں بیٹا صحن میں تاروں بھرے آسمان کے نیچے لیٹے باتیں کر رہے تھے۔زارا اندر ہی سوتی تھی۔باہر سونا اسے کبھی بھی پسند نہیں تھا۔

"میں کروں گی بھائی نذیر احمد سے ایک بار پھر بات کہ وہ زمین نہ بھی دے تو کم سے کم میرے حصے کا مکان تو دے دے۔ہو سکتا ہے اب وہ مان جائے۔ اب تو اس نے شوگر مل میں بھی حصہ ڈال لیا ہے۔"

"اگر ماموں نے مکان دے دیا تو ہم زارا کو کالج میں داخلہ دلوا دیں گے۔اسے پرائیویٹ پڑھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔" احمد نے ایک اور خواب دیکھا۔

"ہاں۔اگر ایسا ہو گیا تو تم قسطوں پر موٹر سائیکل لے لینا۔یہ ویگنوں سے تو جان چھوٹے گی۔زارا تو پرائیویٹ امتحان آرام سے دے لے گی۔تم جو ہو بہن کو



پڑھانے والے۔" زینب نے سمجھایا اور کروٹ لے لی۔

اس کا بند بند تھکن سے چور تھا۔ سارے دن میں اس نے چار سوٹ سلائی کیے تھے۔ گھر کا سارا کام تو زارا نے سنبھال لیا تھا لیکن سلائی تو اسے ہی کرنی ہوتی تھی۔ زارا مدد کروا دیتی تھی لیکن اس کے جتنی ماہر نہیں تھی۔ سعادت مند اولاد بھی قدرت کا انمول تحفہ ہے جس کا شکر ہر دم لازم کر لیا تھا زینب نے خود پر۔

ماموں نذیر کا ذکر ہو اور بڑی بڑی آنکھوں والی ثمرہ، احمد کی آنکھوں میں نہ اتر آئے بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔ ثمرہ ان تینوں کو بڑی پسند تھی۔ اپنی معصوم اور بے ریا فطرت کے باعث وہ بہت جلد سب کے دلوں میں گھر کر لیتی تھی۔ احمد تو پھر اس کی پھوپھو کا بیٹا تھا اور اسے جی جان سے پسند تھا۔ بے شک دونوں کے درمیان کبھی بات نہ ہوئی تھی لیکن محبت کو باتوں کی کب ضرورت ہوتی ہے وہ تو دلوں کے درمیان بہتی ہے۔ آنکھوں سے پھوٹتی ہے۔

زینب کو اگلے ہی روز احمد، ماموں نذیر احمد کے گھر چھوڑ آیا۔ خود وہ ثمرہ کے اصرار کے باوجود پانی پینے کے لیے بھی نہ رکا تھا۔ اسے بڑی امید تھی کہ اس بار ماموں زینب کی بات مان لے گا۔ نذیر احمد کے آنے تک زینب ساگ بناتی ثمرہ اور بھرجائی سے باتیں کرتی رہی۔ اس نے ان دونوں سے زیادہ تیزی سے ساگ کاٹ دیا تھا۔ ساگ جب تک پک کر تیار ہوا نذیر احمد بھی آ گیا تھا۔

ثمرہ نے چھوٹی میز پر ساگ اور مکی کی روٹیاں تازہ مکھن کے ساتھ چن دی تھیں۔ وہ اپنی دلی خواہش کے باوجود اپنی پیاری پھوپھو کی آمد پر کوئی اہتمام نہیں کر سکی تھی۔ وہ اپنے ماں کی آنکھ کے اشارے بخوبی سمجھتی تھی اور انہیں ماننے کی پابند تھی۔ کھانے کے بعد زینب نے بیٹھک میں جانے کے لیے اٹھتے ہوئے بھائی کو روک لیا۔

"بھائی نذیر احمد ماشاءاللہ چودھویں جماعت میں ہو گیا ہے۔ اس کی پڑھائی کے خرچے میری سلائی سے پورے نہیں ہوتے۔" زینب نے دھیمی آواز سے کہا۔

"تو کس نے مت دی ہے کہ اسے پڑھاتی جا، میں نے پہلے بھی بتایا تھا شوگر مل میں نوکری کی جگہ خالی ہے۔ پورے سولہ ہزار دے رہے ہیں وہ......" نذیر احمد نے فوری حل پیش کیا۔

"احمد بہت اچھا پڑھ رہا ہے بھائی! اس کو وظیفہ بھی مل رہا ہے۔ مجھے اس کو افسر بنانے کی بڑی ریجھ ہے۔" زینب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو پڑھا...... خرچوں کو نہ رو۔" نذیر نے حقہ منہ سے لگا لیا۔

"بھائی! میں کہنا چاہتی تھی کہ احمد کے پڑھنے تک ہمیں شہر والا مکان رہنے کو مل جاتا تو......" زینب نے ہمت نہ ہاری۔

"تیری نظر کھا گئی مکان کو زینب! پچھلے دنوں اس کے بڑے کمرے کی چھت گر گئی تھی۔ ابھی مرمت کا کام چل رہا ہے۔ اس کی طرف سے نظریں ہٹا لے۔" بھائی نذیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"لیکن بھائی نذیر میرے لیے تو کچھ کر جا......"

"میں بیٹھک میں جا رہا ہوں پیچھے اپنی بھرجائی کا مغز نہ کھاتی رہنا۔" اس نے انگلی اٹھا کر اسے آگے بولنے سے روکا اور چلا گیا۔

زینب نے دوسری چارپائی پر لیٹی ہوئی اپنی بھرجائی کو دیکھا جس نے سر پر باندھی ہوئی پٹی سرکا کر آنکھوں کو بھی ڈھک لیا تھا۔ زینب چادر درست کرتی ہوئی دھیمے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ پیچھے سے بھاگ کر آتی ہوئی ثمرہ کو لپٹا کر پیار کر کے اس نے دروازہ ٹھیک سے بند کرنے کی تاکید کرتے ہوئے گلی میں پاؤں رکھ دیے۔

"اللہ حافظ! پھوپھو۔"

"اللہ حافظ! میری جان۔" زینب نے بنا پیچھے مڑے کہا اور قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

گھر پہنچنے پر احمد اس کے لیے گھڑے سے ٹھنڈا پانی لے آیا۔ پانی پی کر اس نے احمد کا ہاتھ تھام لیا۔ احمد اسے ساتھ لگائے لگائے چارپائی پر لے آیا۔ زینب کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ کیا جواب لے کر آئی ہے۔ پھر بھی احمد نے اپنی تسلی کے لیے پوچھ لیا۔

"امی! کیا کہا ماموں نے؟"

"انکار کر دیا...... مگر تم فکر نہ کرنا احمد! اللہ کرم کرے گا۔" زینب نے احمد سے زیادہ خود کو تسلی دی۔

احمد کا چہرہ تو اتر گیا لیکن وہ ہنس دیا۔

"آپ جیسی ماں کے ہوتے ہوئے، میں کیسے فکر کر سکتا ہوں۔ آپ بھی فکر مت کیجیے گا۔"

بیٹے نے کہہ تو دیا تھا لیکن پھر بھی زینب کا دل بھر آیا تھا۔ بھائی تھوڑا سا مان ہی رکھ لیتا۔ اور نہیں تو یہی کہہ دیتا کہ اچھا زینب سوچوں گا، جتنا ہو سکا کر دوں گا۔ لیکن نہیں...... ماں جایوں کے خون سفید ہو جائیں تو محبت کی بینائی میں تکلیف کا موتیا اتر آتا ہے۔ جن کے ساتھ کھیل کود کر سارا بچپن گزرا، اس نے تکلیف میں اکیلا چھوڑ دیا۔ بھائی بھائی کہتے اس کی زبان نہیں تھکتی تھی، اس بھائی نے زندگی کی تکلیفوں میں تھکنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا۔

"امی ثمرہ کیسی تھی؟" اپنی گم چپ ماں کو زارا نے مخاطب کیا۔

"اچھی تھی۔ شہر سے کوئی بیکنگ کا کورس کر رہی ہے۔ آگے پڑھنے کی تو بھائی نے اجازت نہیں دی۔" زینب نے گہری سانس بھر کر بیٹی کے چہرے کو دیکھا جو ثمرہ کے ذکر پر کھل گیا تھا۔

"کہنا تھا ناں کہ ہم سے بھی ملنے کے لیے آ جایا کرے......"

"تمہارا پوچھ رہی تھی بہت...... ہاں کہہ تو رہی تھی کہ کسی دن ملنے کے لیے آؤں گی۔" ماں نے بیٹی کو جھوٹی تسلی دی۔

"سچ امی! وہ آئے گی تو میں تنجن پکاؤں گی اور مرغ پلاؤ۔" زارا نے اس کی متوقع آمد کا مزا لیا۔

"ٹھیک ہے۔ جو دل چاہے پکانا۔ وہ آئے تو سہی...... اچھا برتن جلدی سمیٹ کر یہ کپڑے پانی میں بھگو دو۔ مجھے شام میں ان کی کٹنگ کرنی ہے۔" تھوڑی دیر کے لیے کمر سیدھی کرنے کے لیے بیٹھی زینب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"امی! ثمرہ کتنی پیاری ہے ناں! میرے بھائی احمد کے ساتھ کتنا جچے گی۔ میں نے تو بھائی احمد سے بھی پوچھا تھا کہ اسے ثمرہ کیسی لگتی ہے؟ تو وہ مسکرایا تھا۔" زارا نے اپنے دل کے حال کے ساتھ بھائی کے دل کا پول بھی کھول دیا۔

"ارے میری بد عقل بچی! بھائی کا بھی دماغ بھی خراب کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔" زینب نے سر پیٹ لیا۔ "اب خاموشی سے اٹھتی ہے یا میں خود بھگولوں کپڑے۔"

زینب کے کہتے ہی زارا کپڑے اٹھا کر نل کی طرف بھاگی اور زینب کی آنکھوں کے آگے ثمرہ کا نرم و نازک سراپا آ گیا۔ کیسی پیاری تھی وہ اس کو۔ یہ تو زینب کا دل ہی جانتا تھا۔ اس کو بہو بنانے کا ارمان تو اسے اس روز سے تھا جس روز وہ پیدا ہوئی تھی۔ لیکن زینب جانتی تھی کہ یہ دیوانے کے خواب سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔ کہاں راجا بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔ زینب نے ٹھنڈی سانس بھر کر مشین چلا دی۔

☆☆☆

"امی! کیا پکا ہے؟ بڑی زور کی بھوک لگی ہے۔" احمد نے ماں کے تخت پر کپڑے ہٹا کر جگہ بناتے ہوئے کہا۔

"ماش کی مسالے والی دال......" زینب نے پیار سے کہا۔

"اور یہ مٹھائی کہاں سے آئی ہے؟" احمد نے ماں کے تخت پر پڑی مٹھائی کی پلیٹ دیکھ کر پوچھا۔

"تمہارے ماموں نے بھجوائی ہے۔" زینب نے اداسی سے کہا۔

"کس خوشی میں؟" احمد نے برفی کی ڈلی منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ثمرہ کی بات طے ہو گئی ہے۔" زینب کی بات سنتے ہی مٹھائی احمد کے گلے میں اٹک گئی۔

"اچھا...... مبارک باد دینی تھی ماموں کو......" احمد نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"دے دی تھی...... زارا سے کہو تمہیں کھانا نکال کر دے......"

"ابھی تو میں سونے جا رہا ہوں، پھر کھا لوں گا......" کہہ کر وہ رکا نہیں تھا اور فوراً اندر چلا گیا تھا۔

UUNOVELS.COM

وہ تو چلا گیا لیکن ماں کو تکلیف دے گیا۔ ''کاش شرافت کے ساتھ ساتھ میرے بیٹے کے پاس پیسہ بھی ہوتا، تو آج اس کا دل نہ ٹوٹتا۔'' زینب نے سوچا۔

محبت بھلا کب اونچ نیچ امیر غریب دیکھتی ہے۔ یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ مغلوب کر دیتی ہے۔ چھا جاتی ہے۔ بے بس کر دیتی ہے۔ احمد بھنچتے ہوئے سر کے ساتھ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ پسینے سے اس کا بدن تر تھا لیکن اسے پنکھا چلانے کا ہوش تھا نہ سکت۔ اس کی بند آنکھوں کے پیچھے ثمرہ کا دلفریب وجود تھا۔ ثمرہ...... جس سے نجانے کب اسے محبت ہو گئی تھی۔ یہ محبت تو اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ اب تو اس سے فرار ممکن نہیں تھا۔ ایسے میں یہ خبر کہ ثمرہ کسی دوسرے کی ہونے جا رہی ہے۔ احمد کی تو جیسے جان نکل گئی تھی۔ نجانے کتنی دیر وہ بند آنکھوں کے ساتھ جاگتا رہا خود کو سمجھاتا رہا۔ لیکن دل تھا کہ سمجھنے پر آمادہ ہی نہیں تھا۔

''بھائی مغرب ہونے والی ہے، آپ نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ امی آپ کو باہر بلا رہی ہیں۔'' زارا نے لائٹ اور پنکھا آن کیا۔

''تم چلو! میں آ رہا ہوں۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ کی آنکھیں کتنی لال ہو رہی ہیں بھائی......'' زارا مزید فکر مند ہوئی۔

جاتے جاتے اس نے رک کر زارا کی طرف دیکھا۔

''زارا! خاموش رہنا سیکھو۔ اتنا بول کر اماں کو پریشان کر دو گی۔''

زارا شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

''ٹھیک ہے بھائی......''

وہ سمجھ گئی کہ اس کا بھائی اسے خاموش ہونے کے لیے کیوں کہہ رہا ہے۔ بچپن سے اب تک انہوں نے اتنی بار اپنے دل مارے تھے کہ اب تو وہ روتے بھی نہیں تھے۔ انہیں عادت ہو گئی تھی۔ وہ شکوہ کرتے نہ آہ بھرتے۔ بیوہ ماؤں کے بچے سب کچھ سیکھ جاتے ہیں۔ وہ جان جاتے ہیں کہ زمین ان کے لیے بہت کشادہ ہو گی لیکن لوگوں کے دل نہیں۔ کیا تھا جو ماموں اس کے بھائی کی قابلیت دیکھ لیتے اور اپنی بیٹی کا ہاتھ دے دیتے۔ آج نہیں تو کل اس کا بھائی کامیاب ہو ہی جاتا۔ کوئی اچھی جاب مل جاتی تو ان کی بیٹی کو بھی خوش رکھتا۔ لیکن ماموں کا دل تو ہمیشہ سے ہی پتھر رہا تھا ورنہ وہ ان یتیموں کے سر پر ہاتھ نہ رکھ دیتے۔

☆☆☆

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے تمہارا ایم بی اے بھی ہو گیا اور زارا کے فرض سے بھی میں سبکدوش ہو گئی۔ اب اللہ کرے تمہیں اچھی سی نوکری مل جائے تو میں تمہاری بھی شادی کر دوں۔'' زینب نے چارپائی پر لیٹتے ہوئے کہا۔

احمد کو ایک دم کمرے میں گھٹن کا احساس ہوا اور وہ باہر صحن میں نکل آیا۔ کھلے صحن میں گہرے گہرے سانس لے کر اس نے اپنے دل کے درد کو سنبھالا۔ اب زینب اکثر و بیشتر اس کی شادی کا ذکر کرتی رہتی تھی اور احمد بے قرار ہو جاتا۔ ثمرہ کا من موہنا چہرہ اس کے سامنے آ جاتا اور دل اس کا ساتھ چاہنے لگتا۔ لیکن ثمرہ تو دور افق پر جگمگانے والا چاند تھی جس کے ساتھ کی محض خواہش ہی کی جا سکتی تھی۔

''مجھے اچھی سی نوکری مل جائے تو ہو سکتا ہے ماموں مجھے ثمرہ کا ہاتھ دے ہی دیں۔'' احمد سوچ کر رہ جاتا تھا، لیکن سوچنے سے کیا ہوتا تھا۔ دو بار ثمرہ کی منگنی ہو کر ٹوٹ چکی تھی، پھر بھی ماموں نے اس کی طرف نظر نہیں کی تھی۔ کیا تھا ایک بار اشارہ کر دیتے کہ چلو اچھی سی جاب مل گئی تو میں تمہیں اپنی پیاری سی بیٹی کا ہاتھ دے دوں گا۔

وقت کسی کے لیے نہیں رکتا۔ احمد نے ایم بی اے کر لیا تھا اور اس نے کوئی کمپنی، کوئی فرم نہیں چھوڑی تھی جہاں اپنا سی وی ڈراپ نہ کیا ہو۔ وہ جلد سے جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہو جانا چاہتا تھا۔ اسے بہت سی جگہوں سے کال تو آئی تھی لیکن بات نہیں بن سکی تھی۔ وہ فارغ نہیں رہ سکتا تھا، اس لیے جیسی بھی معمولی سی جاب ملی تھی وہ کرنے لگا تھا۔ سیلری کم تھی، محنت بھی زیادہ تھی لیکن نہ ہونے سے تو کچھ ہونا بہتر تھا۔ وہ مایوس تو ہوا تھا لیکن ہر طرف یہی حال تھا۔ قسمت والوں کو اچھی جاب مل رہی تھی۔

یاسیت بھرے کئی دن گزرے تو اچانک ہی شہر کی ایک مشہور فرم سے شاندار پیکیج کے ساتھ نوکری کی آفر آ گئی تھی۔ وہ انٹرویو کے لیے چلا گیا تھا لیکن اسے کچھ زیادہ امید نہیں تھی کہ جاب اسے مل جائے گی۔

''تم پہلے تو کبھی ایسے مایوس نہیں ہوئے احمد!'' زینب اس کے دل کا حال بھانپ جاتی تھی۔

''پہلے ایسے خوار بھی نہیں ہوا اماں! اچھی جاب کہاں ملتی ہے......''

''اچھا نصیب مل جاتا ہے میرے احمد! ماں کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں، آج نہیں تو کل تمہارا نصیب جاگ جائے گا۔''

وہ تلخی سے ہنس دیا۔ زندگی میں اتنے دھکے کھا لیے تھے کہ لگتا تھا کہ اب کوئی سکھ نصیب نہیں ہوگا۔

زارا اپنے گھر میں خوش تھی، چھوٹی سی فیملی تھی۔ شادی کے ایک سال بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ قطر چلی گئی تھی۔ اپنا ایک سی وی اس نے قطر کی ایک فرم میں بھی ڈراپ کر دیا تھا۔ زارا کا شوہر بھی اس کی جاب کے لیے کوشش کر رہا تھا۔

وہ دن بھر عجیب سی شکل بنا کر گھومتا رہتا تھا۔ زینب اسے دیکھتی تو سلگ کر رہ جاتی تھی۔ نہ اچھی جاب ملی، نہ دل کی کلی کھلی۔ کیا یتیم بچوں کو تا عمر، خوابوں کی کرچیاں سمیٹنی پڑتی ہیں۔

☆☆☆

''قطر سے مجھے کال آئی ہے اماں!......'' اتنی بڑی بات وہ منہ لٹکا کر بتا رہا تھا۔

زینب خوشی سے کھل اٹھی تھی۔

''جاب دے دی انہوں نے تمہیں......''

''مجھے وہاں بلا رہے ہیں...... لیکن میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا......''

''مجھے اکیلا کوئی کاٹ کھائے گا۔ تم جاؤ۔ جاب کرو، واپس آؤ گے تو تمہاری شادی کر دوں گی۔ پھر میں اور تمہاری بیوی مل کر رہیں گے۔ ایسے انکار نہ کرو احمد! ناں ڈالنا ٹھیک نہیں ہوتا۔''

احمد نے ماں کے گلے میں بانہیں حمائل کر دیں۔ وہ آبدیدہ ہو چکا تھا۔ اس کی ماں نے تن تنہا انہیں پالا تھا، اب اولاد کی خوشی کے لیے وہ اپنا بڑھاپا بھی اکیلے کاٹنے کے لیے تیار تھی۔ ماؤں کے دل کس مٹی سے بنے ہوئے ہوتے ہیں جو اپنے لیے نہیں اولاد کے لیے دھڑکتے ہیں۔

قطر سے اسے جاب کا کانٹریکٹ ملا تو جیسے اس میں ہمت آ گئی۔ وہ کانٹریکٹ لے کر ماموں کے پاس چلا گیا۔ وہ ایک آخری بار ماموں کو منانا چاہتا تھا۔ اس نے کانٹریکٹ لے جا کر ماموں کے آگے رکھ دیا۔

''میں دو سال کے لیے جا رہا ہوں ماموں۔ مجھے وہاں رہائش بھی ملے گی۔ سیلری بھی بہت اچھی ہے۔ اللہ نے چاہا تو بہت جلد پروموشن بھی ہو جائے گی۔ میں اماں کو وہاں بلا لوں گا اور اسے بھی جس سے میری شادی ہوگی۔'' جھجک کر اس نے کہا۔ ماموں سے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ بنا دیکھے بھی وہ دیکھ سکتا تھا کہ اوٹ میں کھڑی ثمرہ یہ سب باتیں سن رہی ہے۔ شاید دل ہی دل وہ بھی یہ دعا کر رہی ہوگی کہ اس کے ابا مان جائیں۔

ماموں نے کتنی ہی دیر تک اسے گہری نظر سے دیکھا۔ بولے کچھ نہیں۔ ایک بار کانٹریکٹ ہاتھ میں لے کر دیکھا اور ہوں کیا۔ وہ مایوس ہو گیا تھا۔ گھر آیا تو منہ اترا ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ماموں نہیں مانیں گے۔ ناچار اپنے جانے کی تیاری کرنے لگا۔

جس دن اس کی فلائٹ تھی اس دن ماموں اس سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ وہ ایئرپورٹ پر جا رہا تھا کہ ماموں نے اسے سینے سے لگا کر کہا تھا۔

''تمہارے واپس آنے تک ہم شادی کی تیاری رکھیں گے۔ اپنی بیوی کو ساتھ لے جانا۔ زینب کو میں اپنے ساتھ اپنے گھر رکھوں گا۔ تم فکر نہ کرنا۔''

اس نے بے یقینی سے ماموں کو دیکھا۔ اماں کی آنکھیں کیسے بھر آئی تھیں۔ بھائی کا اتنا کہنا ہی ان کے دل کو کیسا سکون دے گیا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اپنے بیٹے کا منہ چوم لیا تھا۔

''دیکھ لیا میرے بیٹے! صبر کا ثمر ضرور ملتا ہے۔ جاؤ رب کے حوالے۔''

☆☆

سالگرہ نمبر



ناولٹ

صدف ریحان گیلانی

اے دل بے خبر

"ارے۔ ارے وہ دیکھو سامنے سے مکلارن آرہی ہے۔ روکو اسے۔ یہ پکڑلو۔ کیا دھانسو گاڑی ہے یار۔ ایک دم اڑن کھٹولا۔" پرجوش سی آواز پر بے اختیار ان کے کان کھڑے ہوئے تھے۔

"اونہوں ایک دم بوگس۔ بہت بری لگتی ہے مجھے۔ ابھی پیچھے تین چار ٹھکانے لگا کر آیا ہوں۔ بلکہ دو لافراری کے بھی پرخچے اڑا دیے۔ سات آٹھ راہ گیر بھی اسی چکر میں ٹپکلے گئے۔ یہ پولیس کی گاڑیاں دیکھ رہی ہو نا۔ یہ اسی لیے تو میرے تعاقب میں ہیں اور میں ٹھہرا پرانا کھلاڑی۔ ہوا کا گھوڑا ہوں میں ہوا کا گھوڑا۔ سب پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اور جیت ہر بار میرا مقدر ہوتی ہے۔ اب بھی ہاتھ ملتے رہ جائیں گے سالے۔ مزا تو اب آئے گا۔ وہ دیکھو وہ آرہی ہے گلاڈو۔ میری فیورٹ کار۔ کیا بمباسٹک چیز ہے یار اور اس کی اسپیڈ۔ اوئے ہوئے۔ ہوش اڑا دیتی ہے جہاں سے گزرے۔ مت پوچھو۔ ہوا پر تیرتی ہے ایمان سے ہوا پر۔ اس کے راستے میں کوئی بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ کچومر نکالتی ہے ایک پل میں۔ سب کو ایسا تہس نہس کرتی ہے کہ کیا بات ہے۔ بس یہی پکڑنے لگا ہوں میں۔ پھر دیکھنا تم میرے کارنامے۔" ہمیشہ کا جذباتی ترین توقیر اپنی دھن میں مگن بولتا چلا جا رہا تھا۔ اور پھٹنے کی حد تک کھلی اسے گھورتی دو آنکھوں میں ایسا غیض و غضب بھرا تھا کہ جیسے اس پر آگ ہی برسا دیں گی۔ اب اس سے زیادہ بکواس برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا ان میں۔ اپنے ہی گال پیٹتے وہ تو گویا چیخ ہی پڑی تھیں۔

"توبہ۔ توبہ۔ کیا اول فول بکے جا رہا ہے نامراد۔ ارے ذرا بھی خوف خدا ہے تم میں؟ یہ کیا مارا ماری کی باتیں کیے جا رہے ہو۔ ارے ثمرین۔ ادھر آؤ ذرا سنو اپنے انوکھے لاڈلے کی بکواس۔ کیا واہی تباہی بکے جا رہا ہے یہ۔" ان کی پاٹ دار آواز پر توقیر اور عمارہ نے ہڑبڑا کر آئی پیڈ سے سر اٹھایا۔ وہ کب ان کے عقب میں آ کھڑی ہوئیں۔ وہ سراسر بے خبر تھے۔ بوکھلائی ہوئی ثمرین بھی کچن سے دوڑی آئیں۔

"یا اللہ رحم۔ کیا ہو گیا بی جان؟"

"اے بی بی مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔ پوچھو اپنی اس اولاد سے جو زمانے بھر کا غنڈہ بنا جانے کتنے راہ چلتے پھڑکا آیا ہے اور کتنی کاریں پھوڑے بیٹھا ہے۔ پولیس اس کے پیچھے پڑی ہے اور یہ ان سالوں کو مزے چکھاتا پھر رہا ہے۔ زبان دیکھو ذرا اس کی۔ یہ بہن کے ساتھ گفتگو ہو رہی ہے۔ ارے کیا سیکھ رہا ہے یہ لڑکا۔ تمہیں کچھ خبر بھی ہے؟" ان کا بس نہیں چلا تھا کہ اس بے ہودگی پر پوتے کے ساتھ ساتھ بہو کو بھی اٹھا کر گھر سے باہر پھینک آتیں۔ ثمرین نے ناسمجھی سے ان دونوں کو

دیکھا۔ جبکہ سارا معاملہ سمجھ میں آتے ہی وہ دونوں ہنس ہنس کرلوٹ پوٹ ہورہے تھے۔

''ارے آپ کیا سمجھ رہی ہیں بی جان۔ میں تو جی ٹی اے فائیو کھیل رہا ہوں۔ یہ گیم ہے۔ ریس لگی ہوتی ہے کاروں کی۔ مشن کمپلیٹ کرنا ہوتے ہیں۔ میں وہی بتا رہا تھا عمارہ کو۔'' توقیر نے بامشکل ہنسی ضبط کرتے انہیں معاملے سے آگاہی دینا چاہی۔

''آئے تم کیا اتنا جاہل سمجھتے ہو مجھے۔ کیا میں اتنا بھی نہیں جانتی۔ پتا ہے مجھے گیم کھیل رہے ہو تم۔ مگر یہ بھی بھلا کوئی کھیلنے والی گیم ہوئی۔ جس میں ایسے مار دھاڑ کرتے پھر رہے ہو۔ ارے ستیاناس جائے ان بدبختوں کا جنہوں نے ایسی واہیات گیمیں بناڈالیں۔ یہی سب کھیل کھیل کر ہی تو بچے آپے سے باہر ہوئے جاتے ہیں۔ جب اتنی مارا ماری کریں گے تو کیا خاک تمیز و تہذیب رہے گی ان میں۔ دید لحاظ سب کا سب اٹھ جائے گا ان کے اندر سے۔ ارے آج کل کی نسل یونہی تو جنونی نہیں ہوتی جا رہی۔ آئے روز سن لو کوئی کسی کو کاٹ رہا ہے یا خود کو ہی مار رہا ہے۔ انسان' انسان نہیں رہے۔ کیڑے مکوڑے بنا دیے گئے ہیں اور یہ سب ان ہی گیموں کا شاخسانہ ہے۔ اٹھا کر پھینکوا سے پرے۔ آئندہ نہ دیکھوں میں تمہیں یہ سب کرتے۔ تمہاری ماں کو تو ذرا عقل نہیں۔ مجال ہے جو دیکھ لے اولاد کیا کرتی پھر رہی ہے۔ ارے جو میں نا ہوتی اس گھر میں تو اللہ جانے کیا ہوتم لوگوں کا۔'' انہوں نے پوتے کے ساتھ بہو کو بھی



لپیٹ لیا جو اس الزام پر تڑپ ہی گئی تھیں۔

''ارے بی جان صرف گیم ہی تو کھیل رہا ہے وہ۔ خدانا خواستہ کوئی جرم تو نہیں کیا اس نے جو آپ اتنا سیخ پا ہو رہی ہیں۔ اب دن بھر سخت پڑھائی میں سر کھپانے کے بعد بچے اتنا ساحق بھی نہیں رکھتے کہ خود کو تازہ دم کرنے کے لیے کوئی کھیل ہی کھیل لیں۔ آپ بھی نا حد ہی کرتی ہیں قسم سے۔''

''ہاں۔ ہاں حد تو میں ہی کرتی ہوں بہو۔ بس ہر بار تم بچوں کے سامنے مجھے ہی جھوٹا کر دینا۔ میں نے کب منع کیا کوئی کھیل کھیلنے سے۔ مگر کیا ضروری ہے کہ یہ اسی قسم کی گیم کھیلیں۔ صوفے میں دھنس کر آنکھیں پھوڑتے دماغ الجھانے کو اگر تم لوگ کھیل کہتے ہو تو بھئی یہ تم لوگوں کی سوچ ہے۔ تم جیسے بد عقل لوگ ہی ہو سکتے ہیں یوں تازہ دم۔ ورنہ تو تکان اتارنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کمرے سے نکلے باہر کی کھلی فضا میں سانس لے کر تیز تیز چلے۔ چڑی چھکا (بیڈمنٹن) پٹھو گول گرم' پکڑم پکڑائی کھیلے۔ یوں ذہن بھی بٹے گا اور خون کی گردش کے بڑھنے سے سوئے حواس بھی جاگیں گے۔ اگر یہ بھی نہیں تو وضو کرے اور مصلٰی بچھا کر اللہ کے حضور اس کا شکرانہ ادا کر لے۔ تمام تھکن یوں اترے گی کہ جیسے کبھی جسم کو گھیرا ہی نہیں اور تو اور دل و روح کی صفائی الگ۔ مگر ناجی۔ کبھی ماں نے نماز پڑھی ہے جو وہ اولاد کو سکھائے کہ بیٹا ایسے ہوتا ہے انسان تازہ دم۔'' وہ بھی بی جان تھیں۔ جو سچ کہنے سے کبھی نہ چوکتیں۔ ثمرین بس انہیں دیکھ کر رہ گئیں۔ اب اس سچ کا کیا جواب دیتیں۔ کارِ زندگی نے کچھ یوں الجھا رکھا تھا کہ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے جس عملِ خیر کو سب سے پہلے ادا کیا جانا چاہیے۔ باقیوں کی طرح انہوں نے بھی اسے سب سے آخر میں رکھ چھوڑا تھا۔ جب کبھی فرصت ملتی تو ہاتھ لگا وقت پکڑ لیتیں۔ ورنہ اللہ ہے نا معاف کرنے والا اور بے شک وہ تو معاف کرنے والا ہے۔ مگر ہم وہ کیوں نہیں بنتے جنہیں معافی مانگنا ہی نہ پڑے۔ مگر یک ہاہ......

اور جب کچھ نہ سوجھا تو بڑبڑاتی ہوئی واپس ہولیں۔

''اے لو اب کدھر چل دیں اور یہ منہ میں کیا بدبدائے جاتی ہو۔ جو بھی کہنا ہے کھل کر کہو۔ ہزار بار سمجھایا ہے کہ ان کی ڈھال مت بنا کرو۔ ارے پھر اک دن وہ آئے گا کہ تم اپنے لیے ڈھال ڈھونڈتی پھرو گی۔ ایک ہی بیٹا ہے تمہارا۔ ذرا کڑی نظر رکھو اس پر۔ مگر مجال ہے۔۔''

''اوہو۔ کیا مطلب ہے آپ کا بی جان۔ ایسا بھی کیا کر دیا ہے میں نے۔ جو آپ مما کو اس قسم کے مشوروں سے نوازتی ہیں۔ آخر کر ہی کیا رہا تھا میں جو آپ نے طوفان اٹھا دیا ہے۔ دادیاں تو اکلوتے پوتوں پر جان نچھاور کرتی ہیں۔ اتنا پیار کرتی ہیں ان سے اور ایک آپ ہیں ہر وقت میرے پیچھے ہی پڑی رہتی ہیں بس۔ اس بار آجائیں بابا۔ مجھے ان سے کہنا ہے ہاسٹل بھیج دیں مجھے۔ کم از کم آپ کو تو سکون آجائے اور میں بھی اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے جی سکوں۔ تنگ آگیا ہوں ہر وقت کی چخ چخ سے۔'' توقیر بدتمیزی سے بولتا آئی پیڈ صوفے پر اچھالتا تن فن کرتا باہر چل دیا۔ بی جان ہکا بکا سی اسے جاتا دیکھتی رہیں۔ پھر جیسے ہوش میں آتے ہی پیچھے لپکیں۔

''ارے لڑکے رکو تو سہی۔ شام سے رات ہونے کو ہے۔ کدھر جا رہا ہے ہو اس وقت۔ خبردار جو گھر سے باہر نکلے۔ ٹھہر جاؤ توقیر۔'' مگر وہ توقیر ہی کیا جو سن لے۔ وہ تو بندوق سے نکلی گولی کی طرح گیٹ پار کر گیا تھا۔ لان میں درختوں کے جھنڈ تلے بیٹھی تابعہ اس افتاد پر ہڑ بڑا کر کھڑی ہوئی تھی اور برا ہی ہوا کیوں کہ اب توپوں کا رخ اس کی جانب ہو جانا تھا اور وہی ہوا۔ ان کی آمد اس قدر اچانک ہوئی تھی کہ وہ ہاتھ میں دبے آفتی آلے (سیل فون) کو چھپا بھی نہ سکی تھی جس پر ان کی نظر پڑی تو انہوں نے گویا نئے سرے سے اسٹارٹ لے لیا۔

''ارے تم سارے کے سارے ایک ہی جیسے ہو۔ مجھ بڑھیا کو ستا کر بہت مزا آتا ہے نا۔ کبھی مت ماننا میرا کہا۔ اتنی بار سمجھایا ہے تمہیں کہ شام ڈھلے

باغ میں مت آیا کرو۔ دو وقت مل رہے ہوتے ہیں۔ ہر جاندار گھر کو لوٹ رہا ہوتا ہے۔ کئی اوپری چیزیں سفر میں ہوتی ہیں۔ خدانہ کرے کسی چیز کی نظر پڑ گئی تو؟ پہلے کم فکریں ہیں زندگی میں جو اوروں کو بھی بلاوے دیتے ہو۔ نافرمانی تو جیسے گھٹی میں پڑی ہے تم سب کے۔ مجال ہے جو کوئی سن جائے۔ ہائے میرے اللہ یہ آج کل کے بچے ایسے بے ادب اور بے خبر ہیں کہ استغفار۔ دیکھو تو کیسے گیا ہے وہ نا ہنجار۔ اور اوپر سے اس کی ماں۔ یہ سب اسی کی شہ ہے۔ کتنی بار کہا ہے کہ جب میں کچھ بولتی ہوں تو مت آیا کرو بیچ میں ارے جو بھی کہتی ہوں۔ تم لوگوں کے بھلے کو ہی کہتی ہوں نا۔ ایک میرا بچہ ہے۔ جو ادھر پردیس میں تم سب کے لیے کما کما کر باؤلا ہو رہا ہے۔ جو منہ سے نکالتے ہو اگلے پل ہتھیلی پر دھرا ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے جو آپے سے باہر ہوتے جا رہے ہو سب کے سب۔ من مانی کرنا تو ختم ہے تم ساروں پر۔ اور یہ کیا آفت کی پڑیا ہاتھ میں لیے کھڑی ہو۔ تمہارا کیا واسطہ ہے اس سے۔ تمہاری عمر کتابیں پڑھنے کی ہے اس مصیبت کو اٹھانے کی نہیں۔ چلو اندر جا کر باورچی خانے میں ماں کا ہاتھ بٹاؤ۔“ انہوں نے تو ٹھیک ٹھاک کلاس لے ڈالی۔

تابعہ نے چہرہ جھکائے چپ چاپ کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔ ہارٹ بیٹ پہلے ہی بے قابو تھی اس پر بی جان کا بھی لیکچر وہ قطعاً افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ انگلیوں میں دبے سیل فون کے گرد ادر شکنجہ کسے اندر کی راہ لی۔

ثمرین نے اولاد پر کبھی روک ٹوک نہیں کی تھی۔ مگر بی جان کو کون سمجھاتا جو انہیں ہر ہر بات پر ڈانٹ ڈپٹ کرنا اپنا بنیادی حق سمجھتی تھیں۔ (اور جو کہ تھا بھی۔ مگر یہ بات اب ان سب کو کون سمجھاتا) اور خاص طور پر ان میں سے کسی کے بھی ہاتھ میں سیل فون دیکھ کر تو وہ سیخ پا ہو جاتیں۔ اور اپنے کمرے کا رخ کرتی تابعہ سوچ رہی تھی کہ انہیں کیا خبر جسے وہ آفتی آلہ قرار دیتی ہیں وہ تو ایسا دروازہ ہے جو اک طلسماتی، جگمگاتی روشنیوں بھری اک ایسی وادی کی جانب لے جاتا ہے۔ جہاں جا کر زندگی کے نئے نویلے رنگوں سے آشنائی ہوتی ہے۔ جو پہلے گذاری وہ بھی بھلا کوئی زندگی تھی۔ جینا کسے کہتے ہیں یہ تو اب پتا چلا۔ اپنی ہی بچھڑی ہوئی ذات سے ملاقات کا نشہ کیا ہوتا ہے وہ تو اس نے اب جانا تھا۔ اور وہ اس مدہوشی میں یوں گم ہو چکی تھی کہ اس سرور سے نکلنا مشکل تھا۔

سیل فون بیڈ پر اچھال کر وہ بھی وہیں چت لیٹ گئی۔ چمکتی آنکھیں چھت پر ٹکی تھیں اور لبوں پر اک الوہی سی مسکان اور جو آج کل اکثر ہی اس کے چہرے پر رہنے لگی تھی۔ خوابوں کی رتھ پر پہلی بار سوار ہونے والا ہر مسافر اسی گمان میں گم ہوتا ہے کہ وہ چمکتے تاروں کی رتھ پر ہے اور اب یہ بنا کسی رکاوٹ اور کٹھنائی کے سیدھا منزل کو جائے گی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ سفر کی ابتدا اور انتہا میں کتنا فاصلہ محیط ہے اور آیا یہ پھولوں پر طے ہوگا یا کانٹوں پر۔ وہ تو بس اپنے ہی گمان میں مست ہوتا ہے اور اس کی تدبیر سے بھی اوپر اک چیز ہوتی ہے اور وہ ہوتی ہے تقدیر اور یہ سب تو وہی طے کرتی ہے اور اس کی مسکراہٹوں پر اک طنزیہ نگاہ ڈالتی تقدیر نے اس کے لیے کیا موڑ تجویز کیا تھا؟ یہ تو اب کتاب قسمت کا صفحہ پلٹنے پر ہی علم ہوگا۔

☆☆☆

سعودیہ سے توثیق صاحب کی کال تھی۔ اپنی مشکل جاب سے مہینے میں ایک بار مشکل سے وقت نکال کر وہ ان سب کو طویل کال کر پاتے تھے۔ تب سب سے ہی تفصیلی بات ہوا کرتی۔ بی جان ہمیشہ آخر میں فون پکڑتیں تاکہ تسلی سے بولتی رہیں۔ کوئی ٹوکنے والا نہ ہو۔ آج بھی یہی ہوا تھا۔ انہیں خوب چہکتے دیکھ کر توقیر کلستا ہوا بول اٹھا۔

”اسے کہتے ہیں زبان و بیان میں تضاد ہونا۔ بی جان کو تو سیاست دان بننا چاہیے تھا۔ قسم سے سب کے چھکے اکھاڑ دیتیں۔ وہ وہ پٹخنیاں دیتی ناں کہ اچھے اچھے میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ یوٹرن لینا تو کوئی ان سے سیکھے۔ اتنے رنگ تو گرگٹ بھی نہیں بدلتا ہوگا۔ جتنا ان کے فرمان بدل جاتے ہیں۔ یعنی

کہ حد ہو گئی۔ جس چیز کو ہم ہاتھ بھی لگائیں تو اک طوفان بلاخیز اٹھا دیتی ہیں اور خود اتنے احترام سے تھامے ایک گھنٹے سے مصروف ہیں کہ اللہ کی پناہ۔ ہمارے لیے حرام اور ان کے لیے حلال۔ واہ جی یہ تو سراسر دوغلا پن ہوا میں اس ظلم کے خلاف پروٹسٹ کروں گا۔ میدان میں آ کر دھرنا دوں گا۔" چبا چبا کر بولتے اس نے اک بازو ہوا میں لہرایا۔ عمارہ ہنس پڑی۔

"بھائی صاحب آپ بھول رہے ہیں شاید۔ آپ بد قسمتی سے اس نظام کا حصہ ہیں۔ جہاں صرف دکھاوے کا قانون چلتا ہے۔ یہاں بکری بھیڑیے کو بھی کھا سکتی ہے۔ ذرا احتیاط سے چلیے۔ کہیں پھسل کر کھائی میں نہ جا گریے گا۔ اتنی اونچی اڑان اچھی نہیں۔ کہیں دوران پرواز ہی نا پر کاٹ دیے جائیں۔ آپ کو دھرنا دینے سے پہلے ہی نہ کہیں دھر لیا جائے۔"

"اونہوں۔" ثمرین نے ان کی کھسر پھسر پر فوراً گھر کا۔ بی جان کی نظر کم ہوئی تھی مگر کان ہرگز نہیں۔ وہ آج بھی ہلتے ہونٹوں سے مفہوم جان لینے والوں میں سے تھیں اور کون سا دور تھیں وہ۔ سامنے والے صوفے پر ہی تو بیٹھی تھیں۔ کچھ سن لیں گی تو گھر تک پہنچا کر دم لیں گی۔ مگر ایک بات کا اطمینان تھا انہیں۔ ان کے یا پھر بچوں کے کسی رویے پر بی جان خود چاہے کتنا ہی غصہ ہو لیتیں۔ ڈانٹ ڈپٹ کر لیتیں۔ مگر آج تک کبھی انہوں نے بھولے سے بھی اتنی دور بیٹھے بیٹے سے بھی کوئی شکایت نہیں کی تھی بلکہ وہ تو ان سب کو بھی سختی سے منع کیا کرتی تھیں کہ وہاں میرا بچہ ہم سب سے اتنا دور جانے کن کن مصائب کا سامنا کرتے ہوئے دن رات محنت کر رہا ہے۔ اکیلا پن اور تنہائی کاٹ رہا ہے۔ پردیس کے جھمیلوں میں الجھا ہے۔ اسے ہمیشہ اچھی خبر ہی دیا کرو۔ خبردار کوئی فضول کے قصے کہانیاں نا سنائے اسے۔ یہی وجہ تھی جو وہ ہنس ہنس کر بیٹے سے گپیں لگانے میں گم تھیں۔ لیکن توقیر بھی کہاں کم تھا پوتا تو ان کا ہی تھا نا۔ وہ بھی باز نہ آیا۔ جیسے ہی انہوں نے فون رکھا اس کا شکوہ شروع ہو گیا تھا۔

"ویسے آپ بھی نا کمال کی ہستی ہیں بی جان۔ یہ ڈیوائس استعمال کرنے سے جب ہمیں منع کرتی ہیں تو پھر خود کیوں ہاتھ لگاتی ہیں ایسی چیزوں کو؟" اور اس کے تیکھے سوال پر وہ بڑے تحمل سے مسکرائی تھیں۔

"دن بہ دن بہت سیانے ہوتے جا رہے ہو۔ بڑی باتیں کرنا آ گئی ہیں تمہیں۔ اچھا یہ بتاؤ یہ عینک کا استعمال کیوں کرتی ہوں میں؟"

"آپ کی نظر کمزور ہے تو ظاہر ہے ٹھیک سے دیکھنے کے لیے ہی لگاتی ہیں اسے۔ یہ بھی کوئی بات ہے پوچھنے والی۔" توقیر نے گویا مکھی اڑائی اور بی جان کی نا سمجھی پر مسکرایا۔

"چلو شکر ہے اتنا تو علم ہے تمہیں۔ عینک نظر کے لیے ہوتی ہے اب ویسے تو یہ کان کے ساتھ بھی لگی ہوتی ہے لیکن ٹھیک سے سننے میں مدد نہیں دے سکتی۔ بالکل اسی طرح جو چیز جس کام کے لیے ہو اسے اسی مقصد کے لیے استعمال کیا جائے تو فائدہ دیتی ہے۔ وگرنہ دوسری صورت میں نقصان کا احتمال بھی ہوتا ہے۔ میں تم لوگوں کو کسی بھی کارآمد شے کے استعمال سے منع نہیں کرتی بس اتنا ہی تو کہتی ہوں کہ زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ اسے فضول کے کاموں میں ضائع مت کرو۔ وہ وقت جو تم کسی بے کار مشغلے میں گم ہو کر گزارتے ہو اسی وقت کا تم کوئی اچھا مصرف بھی نکال سکتے ہو۔ جیسا کہ......"

"اوہ۔ سوری بی جان آپ کی پیاری باتیں پھر کسی وقت سن لوں گا ابھی میرے جم جانے کا ٹائم ہو گیا ہے۔ او کے سی یو اگین۔" وہ انجانے میں انہیں خود ہی چھیڑ بیٹھا تھا۔ مگر اتنا حوصلہ کہاں تھا کہ کوئی نصیحت برداشت کر لیتا۔ جوتوں سمیت صوفے پر اچھلا اور اسی طرح پیچھے کو چھلانگ لگاتا بھاگتے ہوئے لاؤنج سے نکل گیا۔ بی جان متاسف سی سر ہلا رہی تھیں۔ عمارہ اس کی شان میں رطب اللسان صوفہ اور اپنا دوپٹا جھاڑ رہی تھی۔ ثمرین نے بامشکل بے ساختہ مسکراہٹ کا گلا گھونٹا تھا۔ اگر جو بی جان کی نگاہ پڑ جاتی تو باقی کا ملبہ ان پر ہی گرتا تھا۔

UUNOVELS.COM

☆☆☆

''یہ لیں پیاری بی جان آپ کے لیے گرما گرم دودھ۔ وددن نی اسپون تخم بالنگا۔'' وہ حسب معمول اپنے ڈیوٹی آورز کے آخری اور سب سے ضروری کام کی انجام دہی کے لیے ان کے روبرو کھڑی تھی۔ بی جان نے ہاتھ میں تھامی تسبیح آنکھوں سے لگا کر سرہانے رکھی اور اس کا چہرہ محبت سے دونوں ہاتھوں میں تھام کر پھونک ماری۔

''جیتی رہو میری بچی۔ اللہ سلامت رکھے۔ دنیا کا ہر سکھ پاؤ۔ نصیب روشن ہوں۔'' ان کے لب ہر روز کی طرح آج بھی محو مناجات تھے۔ کچھ دنوں سے ان کی دعاؤں پر بے اختیار دل دھڑکنے لگا تھا۔ اب بھی چوتھی دعا نے پلکیں لرزا دیں۔ اک دلربا سا تصور آنکھوں کی پتلیوں پر تھرتھرانے لگا۔ چہرہ اک آسودہ مسکان سے جگمگا گیا۔ جسے ان سے مخفی رکھنے کو جھک کر سائیڈ دراز ٹٹولنے لگی۔

''کیا ڈھونڈ رہی ہو۔'' بی جان دودھ کا گلاس پکڑے اس میں چمچ ہلا رہی تھیں۔

''آپ کی میڈیسن دیکھ رہی ہوں۔ آج آپ نے بلڈ پریشر کی دوا کھائی تھی؟ یا حسب سابق آج بھی بھول گئیں۔ پتا ہے نا جب آپ دوا نہیں کھاتیں تو خود بھی پریشان ہوتی ہیں اور ہم بے چاروں میں سے بھی کسی نہ کسی کی شامت آجاتی ہے۔'' وہ آنکھوں میں مچلتی شرارت لیے کہہ رہی تھی۔ بی جان نے بھنویں سکیڑ کر دیکھا۔

''اچھا تو یوں کہو کہ میری فکر نہیں۔ تم چار بے چارے مجھ سے اپنی جانیں بچانے کو روز زبردستی دوائیں کھلاتے ہو مجھے۔ اچھا ہوا جو آج مجھ پر یہ بھید کھل گیا۔ اب آئندہ احتیاط کروں گی تم سب کے ہاتھوں دوا کھانے سے۔''

''ہائیں یہ کیا کہہ رہی ہیں بی جان۔ میرے کہنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔ اور کیا آپ ہمیں ایسا سمجھتی ہیں۔ ہم کیا آپ کو خدانا خواستہ کوئی غلط دوا کھلا سکتے ہیں؟'' ان کی بات نے اس کے چھکے ہی چھڑا دیے۔ بوکھلا کر انہیں دیکھا۔ جن کے جھریوں بھرے چہرے پر انتہائی سنجیدگی نظر آرہی تھی۔ وہاں اب مسکراہٹ چھب دکھلانے لگی۔

''ارے لڑکی تم تو سچ مچ ڈر گئیں۔ مذاق کر رہی تھی میں۔ دنیا بے شک بڑی نرالی ہوگئی ہے۔ روز ہی کچھ نہ کچھ نیا ہوتا ہے یہاں۔ مگر میں جانتی ہوں۔ میری اولاد ایسی دیدہ ہوائی نہیں۔ بڑا ہی سادہ اور نیک فطرت ہے میرا توثیق اور اس کے بچے بھی اسی کی تصویر ہیں۔ بس آج کل زمانے کو دیکھ کر کچھ دھندلائے ہوئے سے ہیں۔ لیکن کوئی بات نہیں تھوڑا وقت گزرے گا تو سارا منظر صاف ہوتا چلا جائے گا۔ اور یہ کچھ یوں نکھر کر ابھریں گے کہ تمام عالم سراہے گا۔ مجھے اپنے اللہ پر پورا بھروسا ہے۔ میری کوئی بھی دعا رد نہیں ہوگی۔ ان شاء اللہ۔''

''اچھا جی۔ بہت خوب یعنی ہماری اچھائیوں کا سارا کریڈٹ بھی آپ نے اپنے اور بابا کے لیے رکھ لیا۔'' ان کے مان بھرے لہجے پر وہ بھی مسکرا دی۔

''ہاں تو کیوں نہ رکھوں۔ ارے بھئی پہلا حق تو ہمارا ہی ہے نا اور یہاں بیٹھو میرے پاس ایک بڑی اچھی خبر سنانی ہوں تمہیں۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر بیڈ پر بٹھا لیا۔ وہ متجسس سی گوش بر آواز ہوئی۔ بی جان کا لہجہ مسرت سے لبریز تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

''توثیق بتا رہا تھا۔ اس نے اپنے اور میرے لیے عمرے کی درخواست جمع کروائی ہے اور پوری امید ہے اللہ کے گھر سے بلاوا آئے گا۔ کتنی شدید خواہش ہے میری۔ زندگی میں ایک بار تو اپنی آنکھوں سے اپنے رب کے گھر کا نظارہ کرلوں۔ پہلے ایک بار اللہ نے بلاوا بھیجا تھا۔ مگر اس کی رضا وہی جانے۔ تب جانے کیا مصلحت تھی۔ جو میں جاتے جاتے رہ گئی تھی اور شکر ہے اس ذات پاک کا۔ لگتا ہے اس کے دربار میں میری بھی شنوائی ہوگی۔ میں نے تو یہ خبر سن کر ہی شکرانے کے نفل پڑھے ہیں۔ تم بھی دعا کرو اس برس منظوری ہو جائے۔'' وہ حد درجے خوش تھیں۔ اور ان کی دلی حالت ان سب سے بھی چھپی

تو نہ تھی۔ خوب اندازہ تھا۔ ان کی آرزو کس قدر شدید ہے۔ ہر ایک سے تو دعا کی التجا کرتی تھیں وہ۔ تابعہ نے پیار سے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"ان شاء اللہ۔ اس بار آپ کی یہ تمنا ضرور پوری ہوگی بی جان۔ میں نے بھی آپ کے لیے بہت ساری دعائیں کی ہیں۔ آپ خود ہی تو کہتی ہیں جو کام ہوتے ہوتے رک جائے اس میں ضرور ہمارے لیے کوئی بہتری پوشیدہ ہوتی ہے۔ پھر ہمیں کاش اور کیوں کے پھندے میں الجھ کر اپنے ایمان کو کمزور نہیں پڑنے دینا چاہیے۔ بس اللہ کی رضا جان کر پیچھے ہٹ جانا چاہیے۔ تو آپ بھی اطمینان رکھیں جو ہوا وہ رضائے الٰہی تھی اور جو اب ہوگا وہ بھی اسی کا حکم۔"

"ارے واہ میری گڑیا تو بڑی سیانی ہو گئی ہے۔" بی جان نے محبت سے اسے ساتھ لگا لیا۔ روشن پیشانی چوم لی۔

"یہ سب اچھی باتیں میں نے آپ سے ہی تو سیکھی ہیں بی جان۔ آپ کے پوتا پوتیوں میں اک میں ہی تو سمجھدار اور سیانی بچی ہوں۔ باقی سب تو۔" اس کے شرارتی لہجے میں تفاخر بھرا تھا۔ ہاتھ سے باقی سب کے لیے پاگل پن کا اشارہ کرتے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ بی جان مسکرا رہی تھیں۔

"ہاں بھئی میں مانتی ہوں میری یہ پوتی سب میں سمجھدار اور خوب سیانی ہے۔ اسی لیے تو توثیق اور میں فکر مند ہو چلے ہیں تمہارے لیے۔ اور پتا ہے کیا ایک اور خاص بات ہے میرے پاس تمہیں بتانے کو۔ میرے لیے آج کے دن کی یہ بڑی خوشی یوں بھی ہے کہ میرے بیٹے نے اس کام کا ذمہ مجھے دیا ہے۔ پورے اعتماد کے ساتھ۔ اور میری دعا ہے اللہ ہمیں اس فرض سے مکمل خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔"

"اُفف...... بی جان آپ نے تو اردو گرائمر کی کلاس ہی شروع کر دی۔ آسان اور سادہ الفاظ میں بتائیں۔ یہ کیا پہیلیاں بجھوانے لگ پڑی ہیں۔ ایسی کون سی ذمہ داری سونپ دی ہے بابا نے آپ کو؟"

وہ جھنجلائی سی پوچھ رہی تھی۔ مزاج کا اتاؤلا پن اس نے ان سے ہی تو لیا تھا۔ مجال ہے جو ذرا تحمل سے معاملہ سمجھ لے۔ جبکہ وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں ماجرہ کہہ بھی گئی تھیں۔ مگر ہک ہاہ۔ اس کی موٹی عقل۔ جس پر وہ مسکرا دیں۔ پیار سے پوتی کا چہرہ دیکھا اور دونوں ہاتھوں میں تھام کر محبت سے چوم لیا۔

"اللہ۔ اللہ۔ یہ آپ کو کیا ہوا بی جان۔ آج بڑا پیار آ رہا ہے مجھ پر۔ سب خیر تو ہے نا؟" وہ سچ میں حیران ہوئی تھی۔

"ہاں ہاں۔ میری بچی سب خیر ہے۔ جب بیٹیاں اپنے قد کے برابر ہو جائیں اور انہیں دیکھ کر ان کی متوقع جدائی دل کو گھبرانے لگے تو پھر ان پر یوں ہی بار بار پیار آتا ہے۔ مجھے تو پتا ہی نا چلا دیکھتے دیکھتے کب تم اتنی بڑی ہو گئیں کہ ہمیں تمہاری شادی کی فکر ستانے لگی ہے۔ یہ وقت بھی نا یوں دبے پاؤں گذر جاتا ہے کہ......"

"ایک منٹ۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ کون سا وقت؟ کس کی شادی؟ کیسی فکر؟" وہ تو ٹھیک ٹھاک گڑبڑا گئی۔ بے اختیار انہیں ٹوکا۔

"ارے میری جان تمہاری فکر۔ تمہاری شادی اور کیا۔ توثیق نے یہی تو کہا ہے مجھ سے۔ وہ چاہتا ہے کہ اب جلد از جلد تمہاری فکر سے آزاد ہو جائے۔ مجھ سے تمہارے لیے ایک اچھا سا لڑکا ڈھونڈنے کا کہا ہے اس نے۔" وہ خوشی سے مغلوب لہجے میں بتا رہی تھیں اور اس کے حلق میں تو جیسے کانٹا اٹک گیا تھا۔

"یہ...... یہ...... کک...... کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"ارے وہی کہہ رہی ہوں جو تمہارے باپ نے کہا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ اسی سال تمہاری منگنی یا پھر نکاح کر دیا جائے اور رخصتی تمہاری تعلیم مکمل ہونے پر۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔" وہ کسی شرارتی ہمجولی کی طرح بے تکلفی سے پوچھ رہی تھیں اور وہ روٹھے سیاں کی مانند تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پپ...... پتا نہیں۔ یہ...... یہ ایک دم ہوا کیا ہے بابا کو؟ منگنی' نکاح' شادی؟ اف بی جان مجھے یقین ہے یہ آپ ہی کا دیا ہوا مشورہ ہے۔ ورنہ اتنی دور بیٹھے بابا کو ایک دم کہاں سے بے چینی اٹھنے لگی۔ اور یاد رکھیں کوئی ضرورت نہیں ہے میرے لیے خاندان کا کوئی اونگا بونگا نمونہ دیکھنے کی۔ میں ہرگز بھی شادی نہیں کروں گی۔ ہاں۔ بتا رہی ہوں میں آپ کو۔''

''ہائیں ہائیں۔۔ یہ کس لہجے میں بات کر رہی ہو؟ ارے رکو۔ سنو تو سہی۔'' وہ آوازیں ہی دیتی رہ گئیں وہ تن فن کرتی کمرے سے جا چکی تھی۔ وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔

''آے ہائے۔ اے بی حفصہ تم بھی نا۔ پیٹ کی بڑی ہی ہلکی ہو۔ بھلا ضرورت ہی کیا تھی اس چھٹانک بھر کی لڑکی سے بات کرنے کی۔ پتا تو ہے تمہیں ان سب کا۔ ثمرین کی اولاد ہے ویسی ہی جلد باز اور کم عقل۔ جب سارا معاملہ طے ہو جاتا پھر بتلاتیں تم ان کو اور اب آئندہ کے لیے منہ سی رکھو۔ سمجھیں۔''

☆☆☆

''اوہو۔ آپی اللہ کا واسطہ ہے اک جگہ ٹک کر بیٹھ جائیں۔ میرا صبح فزکس کا ٹیسٹ ہے۔ اور آپ کی اس لیفٹ رائٹ کی پریڈ نے میرا دھنا دھڑ کر ڈالا ہے۔ آپ کو یوں چکر کھاتے دیکھ کر قسم سے مجھے بھی چکر آ رہے ہیں۔ یہ کتاب' یہ بیڈ' یہ کمرہ سب گھوم رہے ہیں اب تو۔ آخر پرابلم کیا ہے؟ بتاتی کیوں نہیں ہو؟'' وہ جب سے بی جان کے کمرے سے آئی تھی۔ شدید مضطرب سی ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک پھرکی کی طرح گھوم رہی تھی۔ اچھی بھلی سبک خرامی سے چلتی نہر میں جیسے پتھر پھینک کر لہریں بنا دی تھیں کسی نے۔ اک پل قرار نہ تھا۔ کچھ دیر قبل کس قدر پرسکون تھی زندگی اور اب لگ رہا تھا چہار جانب بھونچال اٹھ رہا ہے۔ اس پر مصیبت یہ کہ اس کے دسیوں کیے گئے میسجز کا ایک بھی جواب نہیں آیا تھا۔ وہ بن جل کی مچھلی کی مانند تڑپتی نہ تو اور کیا کرتی۔ عمارہ کو اک ''ٹکڑی'' سی گھوری سے نواز کر اس نے پھر سیل فون کی اسکرین پر نظر ڈالی۔

''اتنی شدت سے کس خوش نصیب کی کال کا انتظار کر رہی ہیں؟ کچھ بتائیں تو سہی۔'' اس نے تو لاپروائی سے کتاب کے صفحے الٹتے پوچھا تھا۔ لیکن اسے اپنی بے وقوفی کا بروقت احساس ہوا۔ اپنے اس ری ایکشن سے وہ اسے خواہ مخواہ مبتلائے تشویش کر رہی تھی۔ اسے کسی کی کال یا جواب کا انتظار تھا۔ وہ اسے نہیں بتا سکتی تھی۔ کیونکہ یہ اک ایسا حسین راز تھا جسے ابھی وہ خود تک ہی محدود رکھے ہوئے تھی۔ کچھ زیادہ پرانی بات نہیں یہی کوئی چند ماہ پہلے کا قصہ ہے۔ جب اک روز۔۔

☆☆☆

''ارے یہ زاہدہ ابھی تک میرا ڈریس لے کر نہیں پہنچی۔ حد کرتی ہے یہ عورت بھی۔ ہر بار اسی طرح تنگ کرتی ہے۔ مجال ہے جو کبھی وقت پر کام کر جائے۔ اب شام ہونے کو ہے اگر یہ نہ آئی تو میں نفیسہ آپا کی بیٹی کی منگنی میں کیا پہن کر جاؤں گی۔'' ثمرین پورے گھر میں بڑبڑاتی پھر رہی تھیں۔

''اے بہو کچھ تو خوف خدا کرو۔ تمہاری الماری لبالب کپڑوں سے بھری پڑی ہے ایک سے ایک اعلا جوڑا ہے تمہارے پاس۔ کچھ بھی پہن جاؤ۔ تمہیں تو کہا بھی تھا کہ مت اضافی خرچا کرو۔ مگر تم سنو بھی۔ اسے کہتے ہیں بے گانی شادی میں عبداللہ دیوانہ۔ منگنی تمہاری دور پار کی نفیسہ آپا کی بیٹی کی اور فالتو خرچا میرے بیٹے کا۔ ہونہہ......'' بی جان اور کچھ نہ سنائیں یہ تو ہو نہیں سکتا تھا۔ اور سن کر ثمرین چپ رہیں یہ بھی کسی کتاب میں درج نہیں سو وہ تنک کر کہہ گئیں۔

''یہ آپ کا انیس سو بیس کا زمانہ نہیں کہ پیٹی میں رکھا دسیوں بار کا پہنا چھینٹ' ساٹن' کریپ یا جاپانی سوٹ نکالا اور چڑھا کر کہیں بھی چلے گئے۔ یہ اکیسویں صدی ہے بی جان۔ یہاں لوگ اک اک چیز پر نظر رکھے ہوتے ہیں اور کم بخت بھولتے بھی

نہیں۔ اتنا تو ہمیں خود کو یاد نہیں رہتا کہ کس جگہ ہم نے کون سا جوڑا پہنا تھا۔ مگر یہ آس پاس کے اور شریکا برادری کے سارے لوگوں کو ازبر ہوتا ہے۔ اور اکثر تو منہ پر کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔ مجھے بھی کوئی شوق نہیں فالتو خرچ کرنے کا۔ مگر یہ جو کچھ کرتی ہوں نا آپ کے بیٹے کی عزت بڑھانے کو ہی کرتی ہوں۔ اگر کہیں اچھا پہناوا پہن کر نہ جاؤں نا تو یہ لوگ آپ کو ہی آ کر سنائیں گے۔ کہ آپ کی بہو کو پہننے اوڑھنے کی تمیز نہیں۔ میاں باہر سے ریال کما کما کر بھیجتا ہے اور وہ ہے کہ اجڑے حالوں میں پھرتی ہے۔ تب پھر آپ کو ہی مجھ سے شکوہ ہو گا۔ اب بھلا بتائیں میں جاؤں تو جاؤں کہاں؟ یہاں تو وہ حال ہے کہ نا جائے ماندن نا پائے رفتن۔" ثمرین نے کلستے ہوئے حقیقت کہہ سنائی۔ بی جان جوان کے "انیس سو بیس" کے جھٹکے سے بے سدھ ہو گئی تھیں۔ یک دم ہوش میں آ گئیں۔

"اے لو بھیا ہمیں تو یاد بھی نہیں اتنا کچھ۔ تب کیا ہوتا تھا اور کیا نہیں۔ اور ادھر ہماری بہو نے کیسے فر فر سب کپڑوں کے نام بھی بتا دیے۔ اس سے تو یہی ثابت ہوا نا کہ تم بھی اسی گزری صدی کی سوغات ہو۔ اب اکیسویں میں آ کر اس کے گن گاؤ تو کوئی بات نہیں۔ جہاں زمانے کے رنگ بدلے گئے وہاں تم سب بھی بدل جاؤ۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم تو جیسے پہلے سیدھے تھے ویسے ہی اب بھی ہیں۔ ہمیں ان سب نزاکتوں کی کیا خبر۔ ہم نے تو مٹکے میں بند رہ کر عمر گزار لی۔ تم لگاؤ سمندر میں چھلانگیں اور ہماری بلا سے جو مرضی آئے کرو۔ تمہارے میاں کی کمائی ہے رکھو یا اجاڑو۔ تمہارے تو سدا سے یہی چھن رہے کہ آنے کی گڑیا اور ٹکا سر منڈوائی کا بھرتی ہو۔ ماں نے دو سلائیاں لگانا سکھا دی ہوتیں تو آج اس وقت کو تو نہ پڑی ہوتیں تم اور اللہ کا واسطہ اپنی حالت دیکھ کر ہی کوئی نصیحت پکڑ لو۔ آج میں تمہاری ماں کو باتیں کہہ رہی ہوں اور کل کو کوئی تمہارے بچے ادھیڑ رہا ہو گا۔ ان لڑکیوں کو ان کتابوں کے علاوہ بھی کوئی سلیقہ سکھا دو۔ غضب خدا کا آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔" وہ خفگی سے کہتی اپنے کمرے کی جانب ہو لیں۔ ثمرین لال بھبوکا چہرہ لیے ایک بار پھر زاہدہ کو کال ملا رہی تھیں۔ پھر جھنجلا کر سیل فون پھینکا۔

"یہ لو۔ ایک اور مصیبت۔ بیلنس کو بھی ابھی ختم ہونا تھا۔ تابعہ تم اپنے فون سے کال کر کے پوچھو کب تک آئے گی وہ سستی کی ماری عورت۔" اور تابعہ جو کتاب میں سیل رکھے مزے سے گیم کھیل رہی تھی اس حکم نامے پر منہ بسور کر رہ گئی۔ مگر اس وقت انکار کا مطلب ماں کے سارے غصے کا بوجھ خود پر لادنا تھا اور وہ ایسی حماقت نہیں کر سکتی تھی۔ سو اس کا سیل فون اٹھا کر زاہدہ کا نمبر اک نظر دیکھا اور کال ملائی۔ ادھر دوسری بیل پر ہی کال پک کر لی گئی تھی اور ادھر کی سنے بغیر ہی وہ شروع ہو گئی۔

"ہاں۔ زاہدہ آپا؟ مما کا ڈریس تیار ہو گیا؟ آپ کو پتا ہے نا آج انہوں نے جانا ہے۔ وہ آپ کا کب سے ویٹ کر رہی ہیں۔ پلیز جلدی سے آ جائیں۔ ورنہ آپ کی خیریت مشکوک ہو جائے گی۔ بس دس منٹ میں پہنچ جائیں۔ او کے۔" اس نے زاہدہ کو بولنے کی مہلت دیے بنا صرف اپنی سنا کر کال ڈراپ کر دی۔

"بے فکر ہو جائیں مما۔ زاہدہ آپا بس آ رہی ہیں۔" ماں کو تسلی دے کر وہ پھر سے اپنے مشغلے میں گم ہو گئی اور دو منٹ نہ گزرے کہ ہانپتی کانپتی زاہدہ حاضر ہو گئی۔

"ہائے ہائے۔ ایک تو غضب کی گرمی اوپر سے ان نامراد بسوں کا سفر۔ کمر ہی دہری ہو جاتی ہے ایمان سے۔ اے منی ایک گلاس پانی تو پلا دو ذرا۔" اور منی نے کچن سے بے تابانہ نکلتی ماں کو ایسی تفاخرانہ نگاہ سے دیکھا گویا زاہدہ کو جادو کی چھڑی سے وہی لائی ہو۔ ثمرین اب اس کی کلاس لے رہی تھیں۔

"ارے بھئی آج کا ہی وعدہ تھا میرا۔ ابھی تو دن باقی ہے شام بھی نہیں ڈھلی۔ بس جو ٹائم دیا تھا

اس سے دو گھنٹے لیٹ ہوگئی۔ وہ بھی اس لیے کہ اسی لین کے مرزا صاحب کی بیگم کا سوٹ بھی سلائی کر رہی تھی۔ سوچا انہیں بھی ہاتھ کے ہاتھ ہی دے جاتی ہوں۔ پھر کام روک کر گھر سے نکلنا اور بسوں کے دھکے کھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ فون خراب تھا میرا ورنہ آپ کو بتا دیتی۔ تو آپ کو اتی سی پریشانی بھی نہ اٹھانا پڑتی۔" پانی لیے آتی تابعہ نے زاہدہ کی وضاحت سنی تھی۔ اور ثمرین نے گھور کر اسے دیکھا۔ یعنی کچھ دیر قبل ماں کے ساتھ بھی یہ کھیل کھیلا گئی تھی وہ۔ اور وہ ہکا بکا۔ کال تو پک ہوئی تھی۔ مگر کہاں؟ اور پورے دس منٹ بعد اس کا فون گنگنایا تھا۔ اس نے کان سے لگایا۔ نہایت مہذبانہ لب و لہجے میں کوئی پوچھ رہا تھا۔

"محترمہ آپ نے اس قدر اصرار سے آنے کی دعوت تو دے دی۔ لیکن مجھ ناچیز کو آنا کہاں ہے۔ کچھ اتا پتا تو بتایا نہیں۔ عین عنایت ہوگی۔ اگر آپ راہنمائی فرمادیں تو بندہ سر کے بل چل کر آنے کو تیار ہے۔" اور جتنا اس کی آواز سن کر دل بیٹھا تھا اسی قدر اس کی بات سن کر دماغ گھوم گیا۔ بے اختیار جھاڑ دیا۔

"شٹ اپ۔"

"اوہ۔ اس نام کے ایریا سے تو قطعاً ناواقف ہوں میں۔ کیا راستہ سمجھا سکتی ہیں مجھے۔" اس کی آواز سے صاف شرارت چھلکی پڑ رہی تھی۔ اس نے مارے غصے کے کال کاٹ دی اور زیر لب اس نامعلوم کی شان میں اک قصیدہ پڑھ ڈالا۔ کچھ دیر بعد پھر بیل ہوئی تھی۔ مگر اس بار اس نے کال پک کرنے کی غلطی نہیں کی اور اس روز تو یہ قصہ یہاں تک ہی رہا۔ لیکن اس کے بعد۔

☆☆☆

اور یہ تذکرہ ہے تقریباً پانچویں دن کا۔ جب حسب معمول رات بیڈ پر جانے سے پہلے اس نے اپنی لمبی چوٹی کھول کر برش کرنا شروع کیا۔ اسے یہ لمبے، سلکی اور ملائم بال بی جان سے گویا وراثت میں ملے تھے۔ بچپن میں وہی خوب کیئر بھی کیا کرتی تھیں۔ اس کے رونے دھونے کی پروا نہ کرتے ہوئے پکڑ دھکڑ کر تیل لگاتیں۔ کنگھا کر کے کس کر چٹیا گوندھتیں کچھ اس طرح کہ آنکھوں کے پھیلاؤ کے ساتھ ماتھا بھی باہر کو نکل آتا۔ وہ بہتیرا واویلا مچاتی مگر اس کی چٹیا بنانے کا ان کا وہی ایک اسٹائل رہا۔ جس پر وہ کلاس میٹس کے مذاق کا نشانہ بھی بنتی رہی۔ وہ اسے اس حد تک زچ کر دیتی تھیں کہ وہ اکثر اسکول سے کھلے بال لے کر گھر آیا کرتی اور پھر اس کی کم ہوتی اور بی جان کے دھموکے۔ آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھتے اسے کتنے ہی دن یاد آتے گئے۔ اپنا وہ جھنجلانا اور رونا۔ وہ سہیلیوں کی شرارتیں اور ہنسی اڑاتے جملے۔ اور یہ بھی کہ اسے تضحیک کا نشانہ بنانے والی اس کی وہی کلاس میٹس اب اس کے انہی بالوں کو کتنی حسرت سے دیکھا کرتی ہیں۔

اور ان ڈھیر ساری یادوں کے بعد آج ایک بار پھر ان سب کو کلسانے کا جی چاہا تھا۔ تب ہی تو ایک پیاری سی سیلفی واٹس ایپ پر اپ لوڈ کر دی۔ جانتی تھی زمانے بھر کی فارغ سکھیاں اس وقت اپنے اپنے سیل فونز کو ہی چمٹی ہوں گی اور وہی ہوا۔ جب تک وہ بال سمیٹ کر بیڈ پر آئی نوٹی فیکیشنز کا ڈھیر لگ چکا تھا۔ اور وہ سارے کا سارا ایک ہی ہستی کی طرف سے تھا۔ جس نے اس کے حسن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا ڈالے تھے۔ گو کہ انداز نہایت شائستہ اور لفظوں کا چناؤ بہترین تھا۔ مگر وہ دھک سے رہ گئی۔ یہ بھلا کون؟ یہ نمبر تو اس کے لیے سراسر انجان تھا۔ ڈی پی پر ایک بے حد خوبرو نوجوان کا چہرہ تھا۔ اور وہ خود حسن کے اعلا معیار پر سو فیصد پورا اترتا تھا۔ یوں گویا زمانہ قدیم کا کوئی شہزادہ۔ گلابیاں ملے سپید رنگت والے چہرے پر اس کی قندیل سی آنکھیں ہی اس قدر روشن تھیں کہ جن کے سامنے دن کے اجالے بھی ماند پڑ جائیں۔ تیکھی کھڑی ناک اس کے مزاج کی عمدگی کا پتا دے رہی تھی۔ خوب صورت کٹاؤ والے ہونٹ مسکرا رہے تھے اور اس کی یہ مسکراہٹ

انفف۔ کسی کا بھی دل چرانے کی صلاحیت سے مالا مال تھی۔ ہلکی سی بڑھی شیو نے تو جیسے اس چہرے کو اور نکھار بخشا تھا۔ کئی ثانیے تو وہ گم صم سی دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی پھر جیسے اک جھرجھری سی لے کر بیدار ہوئی اور فوری طور پر ارادہ کیا اسے کوئی کرارا سا جواب دینے کا لیکن پھر کچھ سوچ کر ارادہ موقوف کر ڈالا۔ آخر ضرورت ہی کیا ہے کسی کے منہ لگنے کی۔ مگر یہ کم بخت ہے کون؟ اس خیال نے اتنا بے چین کیا کہ قیاس کے گھوڑے چہار اطراف میں کھلے چھوڑ دیے اور الجھا سرا جلد ہی ہاتھ آ گیا۔ یہ تو وہی نمبر تھا۔ جو اس دن زاہدہ کو کال ملاتے غلطی سے کہیں اور جا ملا تھا۔

''ہونہہ۔۔۔ دفع دور۔۔۔ زمانے بھر کے فارغ لوگ۔ اچھی شکلوں والی تصویریں لگا کر سمجھتے ہیں کسی کو بھی بے وقوف بنا لیں گے۔ وہ اور لڑکیاں ہوں گی جو تعریف کے دو بول اور اس بوتھی کو دیکھ کر ریجھ جاتی ہوں گی۔ میں تو تابعہ توثیق ہوں۔ آئندہ اگر فری ہونے کی کوشش کی تو وہاں پہنچا کر آؤں گی۔ جہاں سے واپسی کا راستہ ملنا مشکل ہو جائے گا۔'' غائبانہ دھمکیاں لگاتے اس نے سیل فون پرے اچھال دیا۔

اور یہ کہانی یہاں تک ہی نہیں رکی رہی تھی۔ بلکہ یہ تو پھر سلسلہ وار کا قصہ ہی بن گیا۔ جب وہ اپنی کوئی تازہ سیلفی اپ لوڈ کرتی۔ تو ادھر سے اک مدحتی بیان ضرور جاری ہوتا۔ (اور جسے وہ ہر بار اگنور کر دیتی) اور وہ خود تو جیسے اسی شوق میں زندہ تھا۔ صبح' دوپہر' شام' آتے جاتے' کھاتے پیتے' چلتے پھرتے اپنی فریش سیلفی لگاتا رہتا۔ دن رات کے بدلتے منظروں کی طرح اس کی رنگ بدلتی تصویریں چاہتے نہ چاہتے اس کی نظر سے بھی گزرتی رہتی تھیں اور اسے اندازہ ہوا تھا وہ کوئی معمولی شخصیت نہیں۔ کیونکہ وہ جن جگہوں اور آفس کی تصاویر لگاتا تھا وہ سب کی سب نہایت شان دار تھیں۔ وہ یقیناً کسی بہت بڑی کمپنی میں کسی بڑی پوسٹ پر تھا۔ اس کا حلیہ اس کی میز اس کا انداز اس کا چہرہ اس کا وجود سب ہی اتنے متاثر کن ہوتے تھے کہ وہ جو تابعہ توثیق تھی۔ اک دن

اک عام سی لڑکی بن گئی۔ جانے کس رو میں بہتے اک دن اس کے ٹیکسٹ کا رپلائے کیا تو پھر بات سے بات نکلتی ہی چلی گئی اور یوں اک نیا فسانہ شروع ہو گیا۔ وہ یقیناً اک ساحر تھا جس کی طلسماتی باتوں نے جلد ہی اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ اسے دن اور رات کی تفریق بھولنے لگی۔ یاد رہنے لگا تو بس اس کا چہرہ' اس کی مسکراہٹ' اس کی گفتگو۔

☆☆☆

اضطراب اس حد تک بڑھا کہ وہ کمرے سے نکل آئی۔ بی جان کس قدر پر جوش تھیں اور یہ تو اسے خوب اندازہ تھا وہ ان لوگوں میں سے تھیں۔ جو ایسی ذمہ دارانہ صلاحیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ جنہیں کسی ٹارگٹ کو حاصل کرنے کے لیے اگر سات دن کا وقت دیا جائے تو وہ اسے فقط چھ دن میں کر کے داد و تحسین وصول کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ کوئی بعید نہیں وہ اب رشتہ طے کر کے ہی اسے خبر کریں۔ اور وہ اب ایسے کسی بھی معاملے کے جنم لینے سے پہلے ہی حفاظتی بند باندھنا چاہ رہی تھی۔ جس کے لیے سبطین اعوان سے رابطہ ضروری تھا اور آخر کار اس کی کوشش بار آور ہو ہی گئی۔ اس کی کال پک کر لی گئی۔ اور وہ سانس لیے بنا ہی شروع ہو گئی۔

''کہاں ہیں آپ؟ کدھر بزی تھے؟ کتنی کالز کر چکی ہوں۔ میرا فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے۔''

''ارے کیا ہوا؟ آج دوپہر میں تو ہماری بات ہوئی ہے۔ میں اس وقت ایک میٹنگ میں تھا۔ فون سائیلنٹ پر تھا۔ اس لیے تمہاری کالز کا پتا نہیں چلا۔ لیکن تم اتنا گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟ سب خیریت ہے نا؟ تم ٹھیک ہو؟ تابی مائے لو آر یو او کے؟'' سبطین اعوان کا لہجہ زخموں پر مرہم رکھنے جیسا تھا۔

اس کی آواز سے ہی تڑپتا دل سنبھلنے لگا۔ وہ اس کے انداز سے ہی پہچان گیا تھا وہ پریشان ہے۔ یہی تو ہوتی ہے محبت۔ دنیا والے کہتے ہیں یہ اس زمانے میں ناپید ہے۔ لیکن کوئی اس سے پوچھتا تو وہ بتاتی کہ اس زمانہ موجود میں اس جذبے کا نام ''سبطین

اعوان" ہے۔اس کی بے چینیوں کو قرار آنے لگا۔وہ خواہ مخواہ یوں بدحواس ہوئی۔جب وہ ہے تو پھر کسی کی کیا پروا۔وہ سب سنبھال لے گا نا۔اب ایک دم سے اسے کیا جاتی۔یا پھر اندر کہیں بی جان کی نصیحتیں بکل مارے بیٹھی تھیں۔جن کا کہنا تھا کہ...... مرد کو باہر کی الجھنیں ہی اتنا گھیرے ہوتی ہیں کہ اسے اندر کے مسائل سے بھی ایک دم سے آگاہی مت دو۔ بلکہ اس کے لیے عقل مند عورت پہلے ماحول سازگار کرے پھر بات کرے۔سو ہلکی پھلکی ہو کر مسکرادی۔

"کتنی دیر سے ہماری بات نہیں ہوئی۔آپ نے میرا کوئی ایک میسج سین نہیں کیا۔کالز نہیں لے رہے تھے۔ مجھے تو پریشان ہونا ہی تھا نا۔ پلیز نہ کیا کریں اس طرح۔"

"اوہ میری جان۔ میں قربان۔" اس کی ادائے دلبرانہ پر وہ تو نثار ہی ہو گیا۔

"سوری بھئی۔ معاف کر دو۔ میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا۔کہا نا بزی تھا۔اور کچھ کام کی پریشانی تھی۔لیکن ڈونٹ وری۔"

"کیا پریشانی تھی آپ کو؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟" وہ پھر سے حواس باختہ ہوئی۔

"ارے بھئی بزنس ہے۔اس میں اپ اینڈ ڈاؤنز تو چلتے رہتے ہیں۔ایسی کوئی خاص پریشانی بھی نہیں۔تم چھوڑو۔بس اپنی سناؤ۔اتنی شدت سے میری یاد کیوں ستا رہی تھی محترمہ کو؟" اس کا لہجہ ہی نہیں بلکہ لب بھی مسکرا رہے ہوں گے۔بن دیکھے جان گئی تھی۔وہ بھی ہنس دی۔

"جناب کی یاد ہے کسی وقت بھی ستا سکتی ہے۔اب میں نے اس کے لیے کوئی خاص وقت تو مقرر کر نہیں رکھا۔نہ ہی کوئی وجہ کہیں سنبھال رکھی ہے۔بس دل چاہا تھا آپ کی آواز سننے کو تو۔۔۔"

"ہاؤ سوئیٹ۔ کتنا پیارا ہے تمہارا یہ دل۔ صدقہ اتارتی رہا کرو اس کا۔" وہ جھٹ بولا تھا۔

"لو بھلا میں کیوں اتاروں یہ کام تو آپ ہی کریں۔" اس کا لہجہ ناز بھرا تھا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ سر آنکھوں پر۔ یہ تو سعادت عظیم ہے میرے لیے۔"

"سچ۔"

"مچ۔" اور دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔

☆☆☆

کل رات بابا کی کال آئی تھی اور بی جان بہت دیر تک آواز دبائے ان سے گٹ مٹ کرتی رہیں۔ ثمرین کو تو تجسس ہوا ہی۔کھد بد اسے بھی لگ گئی اور اس پر مستزاد اگلے ہی دن جب وہ مکمل تیاری کے ساتھ کہیں جانے لگیں تو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"کہاں جا رہی ہیں بی جان؟ میں چلوں آپ کے ساتھ؟" اور وہ اسے دیکھتے دھیمے سے مسکرادیں۔

"کبریٰ آپا کی طرف جا رہی ہوں۔پچھلے مہینے جب میں گئی تھی تب تو تم نے صاف منع کر دیا تھا۔ آج اگر مرضی ہے تو چلو میرے ساتھ۔" اور وہ سیدھی ہو بیٹھی۔بی جان کی ان آپا سے ماں سمیت ان سب کی ہی جان جاتی تھی۔کیونکہ ان کی وہ بڑی بہن ان سے نہ صرف عمر میں بڑی تھیں بلکہ عادات و اطوار میں بھی کہیں "بڑی" تھیں اور اپنے اس "بڑے پن" کا مظاہرہ کرنے سے ذرا بھی نہ چوکتی تھیں۔حتیٰ کہ ان کی گناہ گار آنکھوں نے کئی ایک بار تو ان کو بی جان کی بھی "عزت" کرتے دیکھا۔

"آپا کا بڑا نواسا ہے نا۔ وہ تمہاری عاصمہ پھوپھو کا بیٹا۔اس نے مقابلے کا امتحان پاس کیا ہے۔ ماشاء اللہ بڑا ہی لائق فائق بچہ ہے۔اللہ نے صورت تو دی ہی لیکن سیرت میں بھی کم نہیں۔آپا بتا رہی تھیں اپنی کلاس میں سب سے زیادہ نمبر لیے ہیں اس نے۔بھئی خاندان کا تو طرہ اونچا کر دیا۔ میں نے رات توثیق کو بتایا تو بہت خوش ہوا وہ اور کہنے لگا بی جان آپ صبح ہی جا کر خالہ جان اور عاصمہ آپا کو میری جانب سے ڈھیروں مبارکباد دے کر آئیں۔ بس اس کے کہنے پر ہی جا رہی ہوں میں تو۔راستے سے مٹھائی بھی لے لیں گے۔ اٹھو تم بھی جھٹ کپڑے بدل کر آ جاؤ تو چلو میرے ساتھ۔یہ تو اچھا

ہی ہوگا۔ تم وہاں آپا کے نواسے سے بھی مل لینا۔" بی جان مزے سے تفصیل بتا رہی تھیں۔ اب کے تو اس کے کان بھی کھڑے ہوئے۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ میں کس خوشی میں ملوں گی آپ کی آپا کے نواسے سے۔ اور یہ انہی کی بات کر رہی ہیں نا۔ وہ جو عاصمہ پھوپھو کے چشماٹو اور لم ڈھینگ سے بیٹے ہیں؟"

"ہائیں۔ کس قدر بری بات ہے۔ ارے اتنی بھاری بھاری فیسیں وصول کر کے تمہاری استانیاں کیا یہی ادب تمیز سکھاتی ہیں تمہیں۔ کسی کے لیے کیا اس طرح بات کرتے ہیں؟ اور چشمے کی بھی خوب کہی۔ یہ تو آج کل کے دور میں بچے بچے کو لگ رہا ہے اور کئی تو تم جیسے فیشن کے مارے یونہی لگائے پھرتے ہیں۔ اس معصوم کو تو دن رات پڑھائی کی وجہ سے یہ بوجھ ڈھونا پڑ گیا۔ اور لم ڈھینگ کیوں۔ ارے ایسے قد کاٹھ کے لڑکے تو اب مشکل سے ملتے ہیں۔ کوئی کوئی مائی کا لعل ہے جسے یہ مردانہ صفت نصیب ہوتی ہے۔ ورنہ تو آج کل کے لڑکے اللہ مارے پیچھے سے دیکھنے پر زنانہ ہی لگتے ہیں۔ ایک تو سوکھی چرخ سی ٹانگیں اس پر ویسی ہی کسی ہوئی پتلونیں چڑھا کر مریخ سے آئی مخلوق ہی لگتے ہیں کم بخت۔" بی جان کو تو ان موصوف کی شان میں کی گئی گستاخی نے آگ بگولا ہی کر ڈالا۔ وہ تو ابھی اور بھی لتے لیتیں کہ ثمرین گھبرائی ہوئی سی ادھر آئیں۔

"اب کیا ہو گیا؟ کس پر غصہ ہو رہی ہیں؟"

"ارے بی بی میری کیا مجال جو میں کسی پر غصہ ہونے لگوں۔ میں تو ایک بات سمجھا رہی تھی تمہاری اس شہزادی کو۔ تم تو توپ سے نکلے گولے کی طرح بھاگی ہی چلی آئی ہو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ ہاں تو پھر چل رہی ہو۔ جاؤ جلدی سے اپنا کوئی اچھا سا جوڑا پہن کر آؤ اور دیکھو زیادہ لیپا پوتی کی ضرورت نہیں ہے۔ خیر سے بنا منہ رنگے بھی اچھی ہی لگتی ہو تم۔ یوں بھی یہ رنگائی لیپائی کے کام لڑکیوں کو بیاہ کے بعد ہی سجتے ہیں۔ خیر سے جب اپنے گھر بار والی ہو جاؤ گی تو جیسے مرضی کیا کرنا۔" بہو کو بتا کر انہوں نے اس کی جانب رخ پھیرا تھا۔ اور یہ تاکید تو وہ اسے اکثر ہی کیا کرتی تھیں۔ مگر اس پل جی مکدر ہو گیا۔

"سوری آپ ہی جائیں۔ مجھے یاد آ گیا۔ ایک بہت ضروری ٹیسٹ کی تیاری کرنا ہے مجھے۔" اسے بر وقت بہانہ سوجھا تھا۔ بی جان نے بغور ایک نظر دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"چلو جیسے تمہاری مرضی۔ مت جاؤ۔ ویسے بھی سیانے کہتے ہیں۔ کبھی کبھار بچوں کی مرضی کو بھی اہمیت دینا چاہیے کیونکہ لینے اور دینے کا اصول تو ہر جگہ چلتا ہے۔ کبھی ان کی مان لو اور کبھی اپنی منوا لو۔ ہے نا؟" ان کا انداز تو سادہ ہی تھا مگر جو اسے بری طرح کھٹکا۔ ان کے جانے کے بعد بھی وہ کتنی دیر تک اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔

☆☆☆

سبطین اعوان کی مصروفیات کا گراف آج کل کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ اس لیے ان کے رابطے میں تعطل آنے لگا تھا۔ اس پر بی جان کی مشکوک سرگرمیاں جان نکالے دے رہی تھیں۔ اس روز تو حد ہی ہو گئی جب انہوں نے اعلان کیا کہ وہ بڑی آپا اور ان کی فیملی کو کھانے پر بلا رہی ہیں۔ وجہ وہی ان کے نواسے کی شاندار کامیابی تھی۔ جس کے اعزاز میں اس کے پورے خاندان کی دعوت کا اہتمام ہونے جا رہا تھا۔ وہ بی جان سے سلگ گئی تھی۔ اور جب احتجاجاً آواز بلند کرنا چاہی تو بی جان کی گھورتی نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا۔

"اے لڑکی تم کاہے کو انگارے چبا رہی ہو۔ مہمان میں بلا رہی ہوں۔ وہ میرے گھر آئیں گے۔ تم کو ہرگز بھی نہیں کہوں گی کسی کام کا۔ ابھی اتنا دم خم ہے مجھ میں۔ سارا انتظام خود کر سکتی ہوں۔ تم بے فکر رہو۔ ارے بھئی فکریں تو مجھے ہیں۔ جس دادی کی پوتیاں اس کے قد سے بھی نکلنے لگیں تو اب کیا وہ فکر بھی نہ کرے۔"

"آپ کا مطلب کیا ہے اس بات سے۔" اس

کی رہی سہی جان بھی نکلنے کو تھی۔

''ارے کوئی مطلب نہیں ہے میرا۔ کہاں سے آ گئی ہو تنگ کرنے۔ چلو نکلو ادھر سے جا کر اپنا کام کرو اور مجھے اپنا کرنے دو۔ اچھی بھلی لسٹ بنا رہی تھی میں۔ آ کر سب کچھ بھلا دیا۔'' وہ عینک درست کرتیں پھر سے کاغذ پر کچھ لکھنے لگیں۔

وہ جلتی بلتی منظر سے ہٹ گئی تھی۔ وہ اتنی مضطرب ہوئی تھی کہ اس بات چیت کے بعد جیسے ہی سبطین سے رابطہ ہوا تو وہ سب احتیاطیں بالائے طاق رکھتے ہوئے اس سے اپنے سب خدشات کہہ گئی۔ اور سکتہ تو دوسری جانب بھی چھا گیا تھا۔ وہ دم سادھے سنتا رہا۔

''میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔ میں صاف انکار کر دوں گی بی جان کو۔ مجھے صرف آپ کا ساتھ چاہیے۔ میں آپ سے ہی شادی کروں گی۔ سن لیا آپ نے سبطین؟'' جذبات کی رو میں بہتے روتے روتے وہ حال دل بھی عیاں کر گئی تھی۔

''ہوں۔ میں نے سن لیا ہے۔ اور پلیز اس طرح روؤ تو مت۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ سنبھالو خود کو اور ٹھیک ہے تم انکار کر دو۔ یہ حق تو تمہیں ہمارا مذہب بھی دیتا ہے۔ تمہارے گھر والے کوئی زبردستی تو نہیں کر سکتے نا تم پر اور انہیں کرنا بھی نہیں چاہیے۔ سب پڑھے لکھے اور باشعور لوگ ہیں اور سنو سب ٹھیک ہو جائے گا میری جان۔ چپ اب نا؟ اور جلدی سے اپنی ایک پیاری سی مسکراتی ہوئی سیلفی بھیجو مجھے۔ ہری اپ۔'' اس کی باتوں نے لمحوں میں بے فکر کر دیا تھا۔ وہ ساری پریشانی بھول بھال گئی۔

اور پھر گھر میں مہمان آئے اور چلے بھی گئے۔ بڑی آپا کا نواسا بھی آیا تھا وہی چشماٹو اور لم ڈھینگ۔ جو تمام وقت توقیر کو پڑھنے اور آگے بڑھنے کے مفت مشورے دیتا رہا۔ اور جن کے رخصت ہوتے ہی اس نے واشگاف الفاظ میں اعلان کر ڈالا۔

''خبردار آئندہ یہ موصوف گھر کے آس پاس بھی نظر آئے تو۔'' اور پھر جس کا جواب بھی اسے فوری موصول ہوا تھا۔ یعنی بی جان کی فلائنگ چپل۔ جو ہمیشہ کی طرح عین نشانے پر لگی تھی۔ تابعہ کو نہیں یاد اس پل وہ اسے کتنے دن بعد پیارا لگا تھا۔ لیکن یہ اطمینان بہر حال ضرور ہوا کہ کسی بھی طرح کے ناموافق حالات میں کم از کم ایک ووٹ تو ہے اس کے پاس۔ وہ مطمئن سی اٹھ آئی۔ مگر یہ سکون عارضی ثابت ہوا تھا کیونکہ اگلی ہی رات اسے بابا کی کال آ گئی تھی۔

''کافی دیر سے ٹرائی کر رہا ہوں۔ تمہارا فون بزی جا رہا تھا۔ کس سے بات کر رہی تھیں۔'' کان میں اتری ان کی آواز تو نرم و مشفق ہی تھی مگر اس کے حلق میں جیسے ہڈی اٹک گئی۔

''وہ......وہ......بابا جان وہ میری فرینڈ ہے نا عالیہ۔ اس سے بات کر رہی تھی۔'' پہلے پہل کچھ مشکل ہوتا ہے نا اتنا مان و اعتبار دینے والے والدین سے جھوٹ بولنا اور مقام افسوس، کتنا عام ہو گیا ہے یہ سب۔ بس ذرا دیر کو ہی تو زبان لڑکھڑائی ہے اور پھر ایسی روانی کہ الاماں۔

''اچھا اور کیا ہو رہا آج کل۔ پڑھائی تو ٹھیک جا رہی ہے نا تمہاری۔ ایگزام کب تک ہیں؟'' محبت و شفقت سے لبریز دل رکھنے والے بابا کو احساس بھی نہیں ہوا تھا اس کے دھوکے کا۔ وہ اس سے چھوٹے چھوٹے سوالات کرتے رہے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ اصل مدعا کی جانب آئے تھے۔ جو کہ اس کے وہی بدترین خدشات تھے۔ بی جان اور ان کی دلی خواہش تھی کہ اب اس کی شادی کر دی جائے اور اس کے لیے جو پھندا انہوں نے مل کر تیار کیا تھا۔ وہ وہی چشماٹو اور لم ڈھینگ نامی تھا۔ وہ اس سے اس کی رائے پوچھ رہے تھے۔

''میں جانتا ہوں میری بیٹی بہت سمجھ دار ہے۔ تمہیں میری تمام باتیں سمجھ آ گئی ہوں گی۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے آرام سے سوچ سمجھ کر بی جان کو بتا دینا اور مجھے یہ بھی یقین ہے میری گڑیا کی سوچ ہم

سے الگ نہیں ہوگی۔ ٹھیک کہانا؟۔ اب تم آرام کرو۔ شب بخیر۔" یہ تو اس کا دل ہی جانتا تھا کہ اب شب ہو یا سحر اس کے لیے خیر کہاں؟ اس کے چار اور تو صحرا کی گرم ہواؤں کے جھکڑ سے چلنے لگے تھے۔ روح تو کیا جان تک جھلس گئی تھی۔ اس فکر اور پریشانی کے کڑے لمحات میں ایک وہی تو تھا جو ہمدردی کے دو بول کہہ سکتا تھا اور اس نے وہی در جا کھٹکھٹایا۔ جو کچھ کوشش کے بعد وا ہوہی گیا۔

"کبھی کبھی تو آپ حد کر دیتے ہیں۔ کہاں بزی تھے اس وقت؟" وہ جھنجلائی ہوئی سی برس پڑی۔

"مونو کو نیند نہیں آرہی تھی اس کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ تاکہ وہ تھک کر سو جائے اور تمہیں بتایا تو ہے کہ جب وہ میرے پاس ہوتا ہے تو مجھے ساری دنیا بھول جاتی ہے۔ خیر تم کہو۔ سب ٹھیک تو ہے نا ڈارلنگ؟"

"اُف.....ایک تو یہ آپ کا مونو۔ کوئی اپنی جان سے چلا جائے آپ اس کے ساتھ مصروف رہیں بس۔ مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنا ہے۔ ابھی اسے اٹھا کر پھینکیں کمرے سے باہر۔" وہ چڑ کر کہہ گئی اور ادھر یقیناً وہ اک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا تھا۔

"کیا فضول بات کر رہی ہو۔ میری جان ہے وہ۔ میرے جگر کا ٹکڑا۔ میرا دل۔ میری روح۔ میں ساری دنیا اس پر سے وار کر پھینک سکتا ہوں۔ اتنا پیارا ہے وہ مجھے اور تم۔"

"توبہ ہے۔ آپ تو عجیب نرالی شخصیت ہیں۔ کیا کوئی کسی جانور کے لیے بھی اتنا جنونی ہو سکتا ہے؟ آپ تو......"

"ہاؤ ڈیئر یو۔ تم نے مونو کو جانور کہا؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ ایک بار پھر اچھلا تھا۔ اور وہ اس کے سخت لہجے پر بگڑ اٹھی۔

"ہاں تو۔ ایک جانور کو جانور ہی کہا جائے گا نا۔ اب میں آپ کے اس پالتو بلے کو انسان تو کہنے سے رہی۔ چاہے آپ نے اسے ہزاروں روپوں میں خریدا ہوگا۔ مگر اس سے اس کا اصل تو نہیں بدلا۔ ہے تو وہ پھر بھی وہی۔"

"کیا...... کیا کہا تم نے؟ میرا پالتو بلا۔ او گاڈ۔ اٹ مین کہ تم مونو کو گولو سمجھ رہی ہو۔ واٹ آ جوک یار۔ ارے بھئی جسے اکثر تم میرے ساتھ تصاویر میں دیکھا کرتی ہو۔ وہ تو ڈیڈ کا شوق ہے۔ وہ انہیں ان کے ایک جرمن دوست نے گفٹ کیا تھا اور جو ہم سب کے ساتھ ہی خوب ہل گیا ہے اور قسم سے وہ بھی بڑی چیز ہے۔ اس زمانے میں جی رہا ہے نا تو اس کی حرکتیں بھی انوکھی ہیں۔ میں جب بھی گھر پہ ہوتے ہوئے سیلفی بناتا ہوں تو وہ کمینہ جانے کہاں سے آ کر میری گود میں گھس جاتا ہے۔ بہت نائی ہے۔ مگر مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ تم اسے مونو سمجھو گی۔ اس کا نام تو گولو ہے یار۔ اوہ گاڈ۔" وہ ہنس ہنس کے دہرا ہو رہا تھا اور وہ جو پہلے ہی جلتے توے پہ تھی۔ کلستی استفسار کر گئی۔

"تو پھر یہ مونو کون ہے؟"

"مونو۔ ارے تم اسے اب تک نہیں جانتیں۔ جب کہ میں نے تمہیں بتایا بھی تھا۔ مونو۔ مطلب منیب سبطین۔ میرا بیٹا۔ میری زندگی۔ میرا شہزادہ۔ میرا......" وہ ہنستے ہنستے اسی جھونک میں بتاتا جا رہا تھا اور اسے لگا وہ بہت اونچائی سے کہیں نیچے گر رہی ہے۔ اک چھک چھک کرتی ٹرین تھی جو پوری رفتار سے آئی اور اس کے پرخچے اڑاتی چلی گئی۔ اس کی ہنستی آواز دماغ پر کسی وزنی ہتھوڑے کی طرح ضربیں لگا رہی تھی۔ وہ کتنا بے فکر مزے سے ہنستا بولتا جا رہا تھا۔ جبکہ اس ایک پل میں اس کی تو دنیا ہی گھوم گئی تھی۔ کتنے لمحے گزرے۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی اور سبطین کی ہنسی تھمی تو دوسری جانب چھائے سناٹے کا احساس ہوا۔

"تانی۔۔ کیا ہوا۔ اچھا چلو ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔ اب تو تمہاری غلط فہمی دور ہو گئی نا۔ آئندہ دھیان رکھنا۔ کچھ تو بولو یار۔ ہیلو تم سن رہی ہو؟"

UUNOVELS.COM

"آپ کا بیٹا اور آپ کی بیوی؟" اس کے حلق میں جیسے کوئی کانٹا پھنسا تھا۔ سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

"ہاں۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا۔"

"کب؟"

"اوہو۔ تب ہی۔ جب پہلی بار ہماری تفصیلی گفتگو ہوئی تھی اور تم نے میری فیملی کے بارے میں پوچھا تھا اور میں نے بتایا تھا کہ میں ایک مکمل خاندان رکھتا ہوں۔ مام ڈیڈ' بہن' بھائی ہنی اور مونو۔ کیا بھول گئی ہو؟"

"جھوٹ۔ آپ نے مجھے اپنی بیوی اور بیٹے کے بارے میں بالکل نہیں بتایا تھا۔" وہ کڑے ضبط سے گزر رہی تھی۔ لہجہ چیخ چیخ گیا۔

"کم آن یار۔ میں جھوٹ نہیں بولتا اور ہنی اور مونو کا تذکرہ تو میں اکثر کرتا رہتا ہوں۔" اور ہاں وہ یہ نام تو لیتا رہتا تھا۔ مگر وہ ہی ایسی عقل کی اندھی رہی کہ کبھی تفصیلاً ان کے بارے میں جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ انہیں اب تک اس کے کوئی پالتو جانور ہی سمجھ رہی تھی۔ اُف خدا۔۔ وہ تو کھول گئی۔ وہ کیوں ڈھکے چھپے لفظوں میں بات کرتا رہا' کبھی کھل کر کیوں نہیں بتایا۔ اس کا پارہ ساتویں آسمان تک جا پہنچا۔

"آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ آپ ہنی اور مونو کا ذکر کرتے رہے ہیں۔ مگر اپنی بیوی اور بیٹے کا نہیں۔ جب آپ ایک مکمل فیملی رکھتے ہیں تو پھر آپ نے میرے جذبات کا مذاق کیوں اڑایا؟ کیوں دھوکا دیا مجھے؟ کیوں بات چیت کرتے رہے میرے ساتھ۔ کیوں کیا آپ نے ایسا؟ آپ شادی شدہ ہیں کیوں نہیں بتایا مجھے۔" آخر کار وہ پھٹ پڑی۔ اتنے دن سے وہ اس شخص کی لچھے دار باتوں کے پھندے میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ پہلے سے ایک عورت کی زندگی میں تھا۔ ایک بیوی کا شریک حیات' ایک بچے کا باپ۔ اور اس کی ڈھٹائی تو دیکھو۔ کتنی مہارت سے اسے بھی شیشے میں اتارے بیٹھا تھا۔ اور اس جیسی کم فہم اور بے وقوف بھی بھلا کوئی ہوگی اس روئے زمین پر جو اس کے بچھائے جال میں آسانی سے قید ہوتی چلی گئی۔ آنکھوں پر غفلت کے ایسے پردے پڑے کہ سب سدھ بدھ بھلائے اسی کے خواب دیکھنے لگی۔ کیا کیا نہ سپنے بن ڈالے تھے ان آنکھوں نے۔ اُف۔ اسے خود پر شرم آئی۔

"سو واٹ۔ شادی شدہ ہوں۔ تو کیا ہوا؟ کیا میں دوسری شادی نہیں کر سکتا؟ جبکہ میں اس کا حق رکھتا ہوں۔ میرے مذہب نے اس کی اجازت دی ہے مجھے۔ تابعہ تم کیوں ہیزی ٹیٹ ہو رہی ہو۔ دیکھو۔"

"چپ رہیں مت کریں میرے ساتھ کوئی بھی بات۔ مجھے دوبارہ کبھی بھول کر بھی کال مت کیجیے گا۔" اس نے چلاتے ہوئے کہا اور نہ صرف کال کاٹ دی بلکہ سیل فون پاورڈ آف کر کے دور اچھال دیا۔

اس نے کئی قصے سن رکھے تھے بلکہ کئی لڑکیوں کو تو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔ جو بڑے مزے سے سہیلیوں کو بتا رہی ہوتیں۔

"ارے یار بڑا ہی ڈفر نکلا کم بخت۔ بڑے دنوں سے ہماری اتنے مزے کی گوسپ ہو رہی تھی۔ کل باتوں باتوں میں اس کے منہ سے نکل گیا۔ وہ تو شادی شدہ تھا۔ مجھے تو یہ سنتے ہی جیسے آگ لگ گئی۔ میں نے بھی وہ سنائیں کہ ساری عمر یاد رکھے گا۔ آئندہ کسی دوشیزہ کو بہکانے کی غلطی نہیں کر سکے گا۔ الو کا پٹھا۔ ہاہاہا۔۔" پھر ہاتھ پہ ہاتھ مار کر اپنے بیوقوف بن جانے پر بڑی بہادری سے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتی وہ نادان لڑکیاں۔ تو کیا واقعی انہیں کوئی دکھ نہیں ہوتا تھا؟ وہ سچ میں ہنس رہی ہوتی ہیں یا صرف ان کا چہرہ ہی یہ منظر دکھا رہا ہوتا ہے؟ اب کسی کے اندر کا حال تو بس اللہ ہی جانے۔

لیکن اسے اپنی خوب خبر ہو رہی تھی۔ ایک الاؤ تھا جو بھڑک اٹھا تھا۔ یہاں سے وہاں تک صرف درد ہی درد تھا۔ کوئی کند چھری لیے اسے کاٹ رہا تھا۔ اس کی روح' اس کا دل' وہ بری طرح تڑپ رہی تھی۔ وہ

کیسے اس کی دل فریب باتوں میں الجھی رہی۔ اتنا عرصہ وہ اسے الو بناتا رہا اور وہ ایسی کم عقل کہ اس کے لیے لطف کا ذریعہ بنی رہی۔ گھٹنوں پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر روتے اسے سارا عالم بھول گیا تھا۔ بس وہ تھی اور اک اذیت بے کراں۔

بی جان نماز عشاء اور تسبیحات سے فراغت کے بعد عادتاً لائٹس اور گیٹ کا لاک چیک کرنے نکلی تھیں کہ لان کے اس اندھیرے گوشے سے اس کی رونے کی آواز نے انہیں بری طرح ڈرا کر رکھ دیا۔

”کک ۔۔۔ کون ہے ادھر؟“ انہوں نے پوچھا مگر جواب نہ آنے پر آگے بڑھیں تو اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

”تابعہ۔ تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟ خدا کا خوف کرو لڑکی تم نے تو میری جان ہی نکال دی۔ اور رو کیوں رہی ہو۔ سب خیریت ہے نا؟ کیا ہوا ہے؟“ اس کے تر بتر چہرے نے انہیں ٹھیک ٹھاک پریشان کر ڈالا۔ اس کے اندر سے تو جیسے کوئی سمندر ابلتا آ رہا تھا۔ آنسوؤں کا اک اور ریلا رخساروں پر بہہ نکلا۔ اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ فون نیچے گھاس پر پڑا تھا۔ جسے جھک کر اٹھایا۔ اور جس طرح اس نے جھپٹ کر ان سے چھینا۔ کسی انہونی کے احساس نے ان کا دم نکال دیا۔ اسے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔

”کس کا فون آیا تھا تمہیں اس وقت؟ آدھی سے زیادہ رات بیت چکی ہے تم کس سے بات کر رہی تھیں؟ تابعہ۔ بولو بتاؤ اور خبردار جو تم نے مجھ سے جھوٹ بولا؟ جان لے لوں گی میں تمہاری۔ ٹھہرو میں تمہارے باپ کو فون کر کے پوچھتی ہوں۔ آدھی رات کو ہمارے گھر تو صرف اس کا ہی فون آتا ہے نا۔“ اور وہ جھٹ اٹھی تھی مگر قدم بڑھنے سے پہلے ہی انہوں نے بازو دبوچ لیا۔ اس پہر تنہا بیٹھے جس طرح وہ رو رہی تھی۔ اس پر وہ اب اتنی آسانی سے تو اس کی جان چھوڑنے والی نہیں تھیں۔

”کچھ نہیں ہوا ہے۔ کسی کی کال نہیں تھی۔ آپ کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ چھوڑ دیں مجھے۔ میرے سر میں درد تھا۔ اس لیے آئی تھی میں تازہ ہوا میں۔“

”سچ کہہ رہی ہو؟“ ان کا لہجہ تشکک بھرا تھا۔

”آپ کو کیا لگتا ہے دنیا میں صرف آپ ہی سچ بولتی ہیں؟ باقی سب تو جھوٹے ہیں جیسے۔ ہونہہ۔“ انتہائی بدتمیزی سے کہتے۔ اک جھٹکے سے بازو چھڑاتی وہ اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔ بی جان کی پرسوچ نظروں نے دور تک جاتے دیکھا۔

☆☆☆

”میں اپنے گھر کا بہت لاڈلا اور دلارا بچہ تھا۔ والدین نے ہر بات منہ سے نکلنے سے پہلے پوری کی۔ کبھی میری کوئی خواہش تشنہ نہ رہی تھی۔ یہ نارسائی اور تشنگی کیا بلائیں ہوتی ہیں۔ میں اس درد سے واقف ہی نہیں تھا۔ مگر جانتی ہو۔ مجھے اس اذیت سے کب اور کن کے ہاتھوں دوچار ہونا پڑا؟ میرے وہی مام اور ڈیڈ۔ جو میری ہر خوشی کا خیال رکھتے تھے۔ جب میری زندگی کے سب سے اہم فیصلے کا وقت آیا تو اس وقت انہوں نے میری رائے لینا بھی ضروری نہ سمجھا اور بس کھڑے کھڑے مجھے آگاہ کیا گیا۔ جبکہ میں نے بہتیرا واویلا مچایا۔ ضد، دھونس، دھمکی ہر ہتھیار آزمایا۔ مگر میری ایک نہ سنی گئی اور انہوں نے مجھے اپنے من پسند کھونٹے سے باندھ کر ہی دم لیا۔ تب ہی میں نے ببانگ دہل اعلان کیا تھا کہ ایک شادی آپ سب کی مرضی سے ہوئی۔ اب اگلی شادی میں اپنی پسند اور خوشی سے کروں گا۔

ہانیہ کا مجھ سے اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ میری روم میٹ ہے۔ اس سے زیادہ مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں اور جہاں تک مونو کی بات ہے تو وہ میرے مام ڈیڈ کا شوق ہے۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ اپنے جیتے جی اپنے پوتے کو دیکھ سکیں اور میرے وہ ماں باپ جنہوں نے تمام عمر میری ہر خوشی کا خیال رکھا میں ان کی اس آرزو کو کیسے نہ پورا کرتا۔ ہاں اگر تم مجھے

کچھ ٹائم پہلے ملی ہوتیں تو یہ اعزاز بھی میں اس کے حصے میں نہ ڈالتا۔ لیکن میرا تم سے یہ وعدہ ہے مونو کے باقی بہن بھائیوں کی ماما صرف تم ہی ہو گی۔" سبطین اعوان بے باکی سے ہنستا یقین دہانی کروا رہا تھا۔

"پلیز کچھ تو شرم کریں۔" وہ بری طرح بلش کرتی اسے ٹوک گئی۔ آج کتنے دن بعد اس سے بات ہو رہی تھی۔ اس رات اس نے فون بند کر کے اک کونے میں پھینک دیا تھا۔ وہ دکھ ہی اتنا شدید تھا کہ اسے سنبھلنے میں کچھ وقت لگا۔ اسے تو اپنی ذات کی ارزانی کے صدمے نے بیمار ہی کر ڈالا تھا۔ ہر طرف سے جی اچاٹ ہو گیا۔ نا یونی نا کوئی اور سرگرمی۔ اس کی چپ نے ثمرین کو تو فکرمند کیا ہی لیکن بی جان تو گویا جان کو ہی آ گئیں۔ ان کے دن رات کے سوالوں نے اس قدر دق کیا کہ عافیت اسی میں جانی کہ خود پر "سب ٹھیک ہے" کا لیبل لگا کر پھرے۔ اور اس نے یہی کیا۔ سیل فون بھی کتنے دن بند رکھتی۔ جسے آن کرنے پر اس کے بے شمار ٹیکسٹ اور کالز کا تانتا بندھ گیا تھا۔ پہلے تو وہ نظر انداز کرتی رہی۔ آخر وہ بھی کب تک۔ وہ مجرم تھا۔ اور اس کا سادہ اور معصوم دل ایک بار اسے صفائی کا موقعہ دینے کی سفارش کر رہا تھا۔ اور یہ دل ہی تو ہے جو عقل کو بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس نے بھی ہار مان لی۔ سب خدشے وا ہمے اندیشے منہ چھپا کر کہیں دور جا سوئے۔ سبطین اعوان ایک بار پھر اس کے حواسوں پر چھا رہا تھا۔ اس کا ہاتھ تھامے وہ پھر سے خوابوں کی سنہری رتھ پر سوار ہو چکی تھی۔ اونچی اور اونچی اڑان بھر لی وہ وہیں جا پہنچی تھی جہاں سے ربط ٹوٹا تھا۔

☆☆☆

اگلے مہینے بابا آ رہے تھے۔ بہت خوشی کی اطلاع تھی۔ ثمرین ان کی آمد کی تیاریاں کافی دن پہلے سے ہی شروع کر دیتیں۔ گھر کی تفصیلی صفائیاں، مینو وہ سب ترتیب دے لیتیں۔ تاکہ ان کے آنے پر کسی بوکھلاہٹ کا شکار نہ ہوں اور اس بار تو ان کا کام کچھ زیادہ بڑھنے کا قوی امکان تھا۔ کیونکہ اس مرتبہ وہ اک خاص ذمہ داری سے بھی عہدہ برآ ہونے کا ارادہ رکھتے تھے اور جس کی بابت وہ انہیں مختصراً بتا چکے تھے۔ تب ہی ان کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے اور جب اسے علم ہوا تو کچھ لمحے تو جہاں کی تہاں رہ گئی۔ کیا انہوں نے صرف رسماً ہی اس کی رائے لینا چاہی تھی؟ کیا فیصلہ ہو چکا؟ نہیں وہ اس کے ساتھ ایسا بالکل بھی نہیں کر سکتے۔ وہ تن فن کرتی بی جان کے سر پر جا پہنچی تھی۔ یہ سارا کھڑاگ انہی کا تو پھیلایا ہوا تھا۔ اس لیے دوٹوک جواب بھی انہی کو دینا بنتا تھا۔ جو اس نے بے دھڑک دیا بھی۔ وہ ہکا بکا منہ اٹھائے اس کے لفظ سمجھنے کی کوشش میں تھیں۔

"کیا کہا تم نے؟"

"وہی جو آپ نے سنا۔ مجھے آپ کی بڑی آپا کے اس نمونے نواسے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ اور بابا میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔ میری طرف سے اس رشتے کے لیے صاف انکار ہے۔" بی جان نے ہاتھ میں تھامی تسبیح سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر عینک اٹھا کر آنکھوں پر لگائی۔ اور بغور اس کے ہٹ دھرم اور باغیانہ انداز کو دیکھا۔

"اچھا تو تمہیں اس رشتے سے انکار ہے؟ مگر بی بی میں نے تو تم سے تمہاری رائے نہیں مانگی۔ یہ بے وقوفی تمہارے باپ نے کی ہے تو جاؤ اسے بتاؤ جا کر۔ میرے پاس کیا کرنے آئی ہو۔"

"آپ کے پاس اس لیے آئی ہوں کہ یہ سارا فساد آپ کا اٹھایا ہوا ہے۔ یہ شوشا آپ نے ہی چھوڑا تھا۔ میں جانتی ہوں ابھی بابا کو ایسی کوئی فکر نہیں تھی۔ ابھی تو میرے پیپرز بھی نہیں ہوئے۔ اور میں نے ان سے کہا تھا کہ میں مزید پڑھنا چاہتی ہوں۔ اور اس کے بعد تو مجھے ان کی کوئی کال بھی نہیں آئی۔ آپ ہی ہیں جو روز انہیں نئے سبق پڑھاتی ہیں۔" وہ رنج اور جھنجلاہٹ میں کچھ زیادہ ہی بدلحاظ ہو گئی تھی۔ بی جان کو تو غصہ ہی آ گیا۔

"جو علم حاصل کر کے تم نے یہ تمیز سیکھی ہے تو بیٹی

مزید تعلیم کو رہنے ہی دو۔ کیا فائدہ تم پر اتنا خرچ کرنے کا جب تم ہمارے ہی سامنے تن کر کھڑی ہو جاؤ۔ اس کا مطلب ہمارا فیصلہ بالکل درست ہے۔ اور بے فکر رہو۔ ابھی صرف نکاح ہوگا۔ شادی تمہارے امتحانوں کے بعد ہی ہوگی۔" انہوں نے عینک اتار کر پھر سے تسبیح پکڑلی۔

"نکاح نہ شادی۔ میں کہہ رہی ہوں نا آپ سے۔ آپ کو سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی میری بات۔" ان کے بے لچک لہجے پر وہ روہانسی ہوگئی۔ وہ ہمیشہ سے اپنے ارادوں میں کتنی اٹل ہیں۔ خوب اندازہ تھا۔ بابا سے اپنے دل کی وہ مر کر بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ مگر انہیں بتانا ضروری ہوگیا تھا۔ اس بھنور سے بس وہی نکال سکتی تھیں اسے۔ اب تو انہی سے امید تھی۔ اور انہوں نے اک کینہ توز نظر اس پر ڈالی۔

"میرے یہ بال نزلے سے سفید نہیں ہوئے تابعہ توثیق! ایک عمر گزاری ہے میں نے۔ تمہاری تمام باتیں میں اچھی طرح سے سمجھ رہی ہوں۔ تمہارے بدلے اطوار کافی دن سے دیکھ رہی ہوں۔ تمہارا انکار، نکاح اور شادی سے نہیں صرف اس رشتے سے ہے اور کیوں؟ وہ اب تم مجھے خود ہی بتادو۔ کون ہے وہ؟" اور ان کے اس قدر درست اندازے پر وہ دنگ ہی رہ گئی۔ کتنے لمحے تو زبان ہی گنگ رہی۔

لیکن اگر قسمت کی یاوری سے اک موقع مل رہا تھا تو اسے ضائع نہیں کر سکتی تھی۔ اور جو راہ محبت پر چل پڑتے ہیں۔ ان کا خوف اور بزدلی سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہتا۔ جی داری (مطلب بدلحاظی) وہ پہلا وصف ہوتا ہے جو انہیں بطور انعام عطا ہوتا ہے۔ پھر جس عمر اور جن نئے نویلے جذبوں کے گھیرے میں وہ گھری ہوئی تھی۔ وہ تو یوں بھی حواس سلب کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ وہ بھی بلا جھجک نام لے گئی۔

"کون ہے کیا کرتا ہے۔ اس کا خاندان۔ کوئی اتا پتا؟" بی جان کے ہاتھ اک لمحے کو ساکت ہوئے۔ سوالات کا انبار اس کے سامنے رکھتے پھر سے تسبیح گھمانے لگیں۔ وہ انگلیاں مروڑتی مختصراً بتاتی چلی گئی۔ وہ سرد نظروں سے اسے دیکھے جارہی تھیں۔ آنکھوں کی بڑھتی سرخی سے ان کی اندرونی کیفیت کا باخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ وہ اس وقت کڑے ضبط سے گزر رہی تھیں اور اس پل تو طنابیں ہی چھوٹ گئیں جب سبطین اعوان کا مکمل تعارف بیان کرتے وہ حقیقت بھی بتا ڈالی جسے کئی دن وہ خود بھی قبولنے میں متامل رہی تھی۔

"کیا......" ان کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ گئی۔ اسے یوں دیکھا گویا پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ "کک......کیا کہہ رہی ہو لڑکی؟ ارے وہ موا ایک بچے کا باپ ہے۔"

"پلیز بی جان ایسا تو نہ کہیں۔" وہ تڑپ کر بے اختیار انہیں ٹوک گئی تھی اور اگلا لمحہ اس کے لیے مزید شاکنگ ثابت ہوا جب ان کا ہاتھ اس کے چہرے پر پڑا۔

"بے حیا۔ نا ہنجار۔ نا خلف اولاد۔ اری کم بخت تجھے اندازہ بھی ہے۔ کیا بک رہی ہو۔ ہم نے تمہارے لیے خاندان کا سب سے بہترین لڑکا چنا۔ وہ جس کی اس وقت پوری برادری میں کہیں مثال موجود نہیں اور ادھر تم پاگل ہو رہی ہو۔ اک بچے کے باپ کے عشق میں۔ تف ہے تم پر۔ دیکھو بی تمہارا دماغ الٹ گیا ہے لیکن الحمد للہ، ہم ابھی درست حالت میں ہیں اور خبردار میرے ساتھ یہ بات پھر مت کرنا۔ ورنہ کل کی کرتی میں آج ہی رخصت کر دوں گی تمہیں۔ آئی سمجھ۔ اب جاؤ۔ دور ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔" ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کی گردن مروڑ ڈالیں۔ وہ گال پر ہاتھ رکھے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"خاندان کا بہترین نمونہ آپ رکھیں اپنے پاس سنبھال کر۔ میں شادی کروں گی تو صرف سبطین اعوان سے۔ سنا آپ نے۔" وہ روتی ہوئی دروازہ پار کر گئی تھی۔ بی جان کی تسبیح کب کی ساکت تھی۔

UUNOVELS.COM

کپکپاتے ہوئے لب جانے کیا بڑبڑا رہے تھے۔ آنسوؤں کی اک لکیر تھی جوان کے رخساروں سے بہتی ہوئی سفید دوپٹے میں جذب ہوتی جارہی تھی۔ جانے کتنے پل بیتے۔ وہ اسی طرح بت بنی بیٹھی تھیں۔

☆☆☆

''ہاں میاں تو پھر کیا کرتے ہو تم؟ علاوہ اس موئے فون کا استعمال کرنے کے۔'' بھگو کر جوتے مارنا تو کوئی بی جان سے سیکھتا۔ سبطین اعوان کے انٹرویو کا آغاز ہی ایسے سوال سے کیا کہ وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ (ہونہہ۔ ڈھیٹ۔) وہ کلس کر رہ گئیں۔ جبکہ ان کے سامنے ہی دونوں گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر بیٹھی تابعہ بھی مسکرادی تھی۔

اف۔ اس رات جوش جذبات میں وہ ان کے سامنے سب کہہ تو گئی۔ مگر ساری رات اس خیال سے دم نکلتا رہا کہ اب مما اور ان سے بڑھ کر بابا کے سوالوں کے کیا جواب دے گی۔ اوکھلی میں سر دے تو دیا تھا مگر اب موصلوں کا سامنا کیوں کر ہو سکے گا؟ تن تنہا کیسے نبٹے گی وہ سب حالات کو۔ خصوصاً بابا کو فیس کرنا بہت ہی کٹھن ہوگا۔ سبطین اعوان میں کوئی کمی نہ تھی۔ لیکن جو تھا۔ اس پر سب کے اعتراضات کیسے دور کرے گی۔ بے شمار دلیلیں اور تاویلیں پیش کرتا ہوں گی اور جس کے لیے وہ خود کو تیار کرتی رہی۔ اسی عالم اضطراب میں بی جان کا سامنا کرنے سے بھی بچتی رہی۔ اگلی رات ان کے کمرے میں دودھ لے کر بھی نہیں گئی مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب وہ خود چلی آئیں اور وہ مژدہ جاں فزا سنایا جسے سن کر وہ اڑتی ہوئی ان سے جالپٹی۔

''اوہ میری پیاری بی جان۔ آپ کتنی اچھی ہیں۔ مجھے یقین تھا۔ آپ ضرور میری بات مانیں گی۔'' اور انہوں نے اس کے بازو گلے سے نکالتے ہوئے سنجیدگی بھرے لہجے میں کہا۔

''میں نے ابھی نہ تمہاری کوئی بات مانی ہے اور نہ ایسا کوئی وعدہ کیا ہے۔ میں صرف اتنا کہہ رہی ہوں۔ میری اس سے بات کرواؤ۔''

''جی۔ جی ضرور۔ جب آپ چاہیں۔'' وہ بے انداز خوش تھی۔ جب بی جان اس سے بات کرنے پر راضی ہوگئی ہیں تو اگلے مرحلے بھی آسان ہو جائیں گے اور سبطین اعوان کا لب ولہجہ۔ اس کی شخصیت اس کا رکھ رکھاؤ ہرگز بھی ایسا نہیں جو کوئی نظر انداز کر سکے۔ وہ ہر طرح سے بہترین تھا۔ وہ مطمئن تھی۔ اب وہ انہیں بتا رہا تھا۔

''تو میاں صاحبزادے جب اللہ نے تمہیں ہر نعمت سے نواز رکھا ہے تو تمہیں کیا ضرورت پڑی ہے ایک اور ذمہ داری اپنے گلے ڈالنے کی؟'' اور ان کے اس سوال کے جواب میں اس نے وہی سب کہا۔ جو تابعہ سے بھی کہہ چکا تھا۔

''جانے کیوں ہمارے معاشرے میں دوسری شادی کرنے والے کو ٹیڑھی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ لوگ اس عمل کو اچھا نہیں سمجھتے۔ جبکہ یہ حکم خدا بھی ہے اور سنت انبیاء و اولیا کرام بھی۔ پھر جب میں اس ذمہ داری کو بہ حسن خوبی اٹھا سکتا ہوں تو کیا مجھے سب کے لیے مثال نہیں بننا چاہیے؟ آپ ہی بتایئے بی جان کیا ایسا کرنا غلط ہے؟''

''ارے نہیں بیٹا۔ بالکل بھی نہیں۔ تمہاری سوچ تو قابل تحسین ہے۔ ماشاء اللہ۔'' انہوں نے سراہا۔ جہاں سبطین خوش ہوا۔ وہیں تابعہ کا خون بھی بڑھ گیا۔ اسے یقین تھا۔ وہ اپنے کلام فن سے انہیں قائل کرلے گا اور وہی ہوا۔ بی جان کہہ رہی تھیں۔

''تمہاری نیت بہت اچھی ہے بیٹا۔ تم اس معاشرے میں ایک مثال قائم کر کے بڑا اجر کماؤ گے۔ اللہ تمہارے اس اخلاص کو پھل لگائے۔ دیکھو بیٹا جب بات اللہ کے حکم کی آجاتی ہے نا تو اسے کبھی آدھا ادھورا نہیں رکھتے۔ بلکہ اسے ہمیشہ پورا اور مکمل لیتے ہیں۔ اور جب اللہ نے تمہیں چار کی اجازت دی ہے تو پھر صرف دوسری ہی کیوں؟ تم تیسری اور چوتھی شادی بھی ضرور کرنا۔''

''بی جان۔'' سبطین تو ان کی بات پر خوب

خوش ہوا تھا جبکہ تابعہ نے جھنجلا کر ان کا گھٹنا ہلا ڈالا۔ یہ کیا فضول مشورہ دے رہی تھیں وہ اسے۔ وہ اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھیں۔

''اور سب سے بہترین اور دنیا میں ہی جنت اپنے نام کرنے والا عمل یہ ہوگا کہ تم تیسری اور چوتھی شادی بیوہ یا مطلقہ خواتین سے کرو۔ اور یہ ایسی مثال ہوگی۔ اس سڑاند بھرے معاشرے میں جس کی نظیر ملنا مشکل ہے اور ہاں اگر اس معاملے میں میری مدد درکار ہو تو بلا جھجک بتانا۔''

''بی جان! بس کر دیں پلیز۔'' تابعہ کا حوصلہ اتنا ہی تھا۔ چڑ کر سیل فون کھینچ لیا۔ سبطین کی قل قل کرتی ہنسی اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ مارے غصے کے کال ہی کاٹ دی۔

''اے لو۔ یہ کیا کیا؟ ابھی بات کر رہی تھی میں اس سے۔''

''یہ کوئی بات تھی کرنے والی۔ بی جان۔ حد کرتی ہیں آپ بھی یہ کیسے مشورے دے رہی ہیں؟ آپ میری دادی ہیں کہ دشمن۔''

''یہی تو ساری مصیبت ہے لڑکی۔ تم بے خبر کیا جانو، کون سجن ہے کون دشمن۔ ارے اس دورِ فتنہ ساز میں لوگوں نے دینی معاملات کو بھی مذاق بنا رکھا ہے۔ کم علمی کا یہ عالم ہے کہ بس جو سنا اسے پورا جان لیا۔ کبھی کچھ کھول کر پڑھا ہو تو پتا بھی چلے کہ اصل روح کیا ہے۔ خود سے کچھ جاننا' تحقیق کرنا تو عبث ہے۔ کسی فیشنی پریڈ کے بارے میں پوچھ لو آج کی نسل سے۔ سب خبریں ہوں گی۔ لیکن کوئی شرعی مسئلہ؟ توبہ کرو الف بے کا بھی پتا نہیں ہوتا۔ اب ایسے آپادھاپی کے وقت میں جب کوئی جوان نیکی کی بات کرے گا۔ تو میں تو اسے مزید اسی طرف راغب کروں گی نا۔ اس میں کیا برائی ہے بھلا۔ جب وہ خوب صورت' صحت مند' پڑھی لکھی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کر سکتا ہے۔ تو اسے تیسری لانے میں کیا قباحت ہے؟ ارے بھئی اس کی بیوی تمہیں برداشت کرے گی نا۔ تو تم بھی اس کی عاقبت کی خاطر دل بڑا کر لینا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بول رہی تھیں۔ وہ ان کی مبہم کچھ سرد سی نظروں سی خائف ہوتی یوں لاجواب ہوئی کہ وہاں سے اٹھنے میں ہی بہتری جانی۔

''واہ جی واہ۔ کیا مزے کی باتیں کرتی ہیں بی جان۔ سچ میں انہوں نے تو میرا سیروں خون بڑھا دیا۔ میں بار بار ان سے بات کرنا چاہوں گا۔'' سبطین اعوان کی کھلکھلاتی فرمائش نے اس کی ہزاروں کیلوریز جلا ڈالی تھیں۔

''ہاں آپ تو خوش ہوں گے ہی۔ آپ کے مطلب کی جو باتیں کر رہی تھیں۔'' وہ جل کر خاک ہوئی تھی۔

''ہاہاہاہا۔ دادی ہوں تو ایسی۔ یو آر سو لکی یار۔ کاش میری بھی ایسی کوئی دادی ہوتیں۔ بٹ نو پرابلم اب تمہارے تعلق سے وہ میری بھی تو دادی ہوئیں نا۔ مجھے لگ رہا ہے ان سے خوب جمے گی۔ میرا تو ان کی باتیں سن کر ان سے ملنے کو شدت سے دل چاہ رہا ہے۔''

''ہاں تو آ جائیں۔ مل لیں آ کر۔ مگر اس سے پہلے نہج البلاغہ' کشف المحجوب اور بہار شریعت رٹ کر آئیے گا۔''

''ہیں یہ کیا چیزیں ہیں بھئی۔'' وہ حیران ہوا تھا۔

''چیزیں۔ اللہ کا نام لیں کہیں غلطی سے بھی بی جان کے سامنے چیزیں نہ کہہ دیجیے گا۔ یہ تو میں نے آپ کو ان مشہور و معروف کتب کے نام بتائے ہیں۔ جو ہمہ وقت ان کی سائڈ ٹیبل پر موجود ہوتی ہیں۔''

''آ...... اچھا...... آ...... سوری مجھے پتا نہیں تھا۔ تھینک یو میری جنرل نالج بڑھانے کا۔'' وہ خفت مٹانے کو ممنون ہوا۔ اور جتنا وہ پہلی بار ان سے گفتگو کے بعد مسرور ہوا تھا۔ اتنا ہی اگلی بار۔

''ایک بہت ضروری بات کرنا تھی بیٹا تم سے۔ کیا کچھ وقت ہے تمہارے پاس۔''

"جی۔ جی کہیے بی جان میں سن رہا ہوں۔" وہ ہمہ تن گوش ہوا۔

"ارے بیٹا تم سے بات کرنے کی اتنی بے چینی تھی کہ میں نماز پڑھتے پڑھتے اٹھ آئی۔ کیا کروں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ بھولنے کی بیماری لگ گئی ہے۔ اب جب میری بات ختم ہو جائے گی نا تو مجھے یاد کروا دینا۔ کہ مجھے ابھی وتر ادا کرنا ہیں اور وتر کی کتنی رکعتیں ہوتی ہیں۔ اس روز تمہارے خیالات سن کر تو مانو دل پھول جیسا ہلکا ہو گیا۔ بھئی آج کل کے زمانے میں تم جیسے نوجوان تو کامیاب ہیں۔ سو ماؤں میں سے ایک ماں جنتی ہے تم جیسا ہیرا۔ ایسے عمدہ اوصاف والا بچہ گھر میں ہی مل جائے تو ہمیں کیا ضرورت اپنے مسائل کا حل کسی اور سے پوچھنے کی۔ کیوں بیٹا؟" انہوں نے اس سے تائید چاہی تھی۔ جو اپنی تعریف سنتے پھول کر کپا ہو رہا تھا۔ مگر اس کے منہ کھولنے سے بھی پہلے وہ پھر سے سلسلہ کلام جوڑ چکی تھیں۔

"اچھا خیر سنو میں یہ کہہ رہی تھی کہ میری ایک بہن ہیں۔ ماشاء اللہ سے بڑی ہی سمجھ دار خاتون ہیں۔ اللہ پاک نے بے شمار نواز بھی رکھا ہے۔ پورے پندرہ تولے سونا ہے ان کے پاس۔ اور وہ ہر سال باقاعدگی سے زکوٰۃ بھی نکالتی ہیں اور تم تو جانتے ہو گے بیٹا جس صاحب حیثیت کے پاس سونا ساڑھے سات تولہ ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔ مگر اس بار مسئلہ یہ ہے کہ ایک تو مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے۔ دوسرے کچھ مجبوری کی بنا پر دو ماہ قبل انہوں نے ڈیڑھ تولہ اور کچھ رتی سونا بیچ دیا تھا۔ اب مجھے تم یہ بتاؤ کہ ان کے پاس پندرہ تولہ میں سے کتنا سونا بچ رہا؟ اور اس سال کے نصاب کے مطابق اس پر کتنی زکوٰۃ ادا کرنا ہو گی؟" وہ تو سوال کر کے چپ ہو رہیں مگر سبطین اعوان کی بیچ میں بتی گل ہوئی تھی۔ اک لمحے کو تو دماغ ہی گھوم گیا۔ کتنی مہنگی یونی ورسٹی کا ڈگری ہولڈر تھا وہ۔ اور اس لمحے یقیناً دل چاہا ہو گا۔ لعنت بھیجنے کو۔ کیا فائدہ ایسے تعلیمی اداروں کا جو دنیا بھر کا علم تو سکھا سکتی ہیں لیکن اگر کچھ نہیں سکھا سکتیں تو وہ سوال جو اکثر ہماری زندگی کے لازمی سوالوں میں سے ہو سکتے ہیں۔

اس کی مسلسل چپ پر انہوں نے تابعہ کی طرف کچھ جتلاتی نگاہ سے دیکھا تھا۔ جو ان کی تمام گفتگو سنتی جز بز ہو رہی تھی۔

"اچھا چلو تم یوں کرو۔ سارا حساب کتاب کر کے پھر مجھے بتا دینا۔ اور ہاں میں کیا پڑھتے اٹھ کر آئی تھی؟" اس کی مشکل آسان کرتے کرتے بھی اک اور سوال کر گئیں۔ سبطین نے حواس بحال کیے۔

"وہ۔ بی جان آپ۔ ہاں۔ وہ آپ کو وتر ادا کرنا تھے۔"

"ارے ہاں۔ لو یہ تو حال ہے میرا۔ بھول ہی گئی تھی۔ اور یہ بھی بتا دو۔ کتنی رکعتیں ادا کروں۔" اور سبطین اعوان کے ہوش ایک بار پھر سے اڑے تھے۔

"اُفوہ۔ بی جان کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ اپنے بچپن کے تمام قصے ازبر ہیں آپ کو ابھی تک۔ پہلے تو کبھی کوئی بات نہیں بھولیں آپ۔ آج کیا ہو گیا ہے۔ وتر کی تین رکعتیں ہوتی ہیں اب ٹھیک۔ اب لائیں فون ادھر دیں مجھے۔" تابعہ جھنجلاتی ہوئی سی بول پڑی۔ بی جان کے چہرے پر اک عجب سی خاموشی تھی۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ نماز کی نیت باندھ لی تھی۔

☆☆☆

آج کتنے دن بعد وہ فرصت سے آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو پتا چلا کہ اس کے بے داغ خوب صورت چہرے کی اصل رونق اس کی آنکھیں کتنی تھکی تھکی سی لگ رہی ہیں اور آنکھوں کے گرد نمایاں ہوتے سیاہ دائروں نے تو پریشان ہی کر ڈالا۔ یہ سب یقیناً نیند پوری نہ ہونے کا شاخسانہ تھا۔ رات دیر تک جاگنے سے اسے ایک نہیں بلکہ کئی ایک مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ صبح جیسے تیسے اٹھ کر یونی بھاگنا' کلاس کے دوران جھومتے رہنا' پھر گھر آ کر

کھانے پینے کی فکر میں پڑے بغیر ساری دوپہر دھت ہو کر سونا۔ اس کی پڑھائی تو متاثر ہو ہی رہی تھی۔ مگر صحت بھی اور یہ ایک تشویش ناک امر تھا۔ پہلے مسئلے کو تو وہ نبٹ ہی لے گی۔ مگر یہ دوسرا ایشو؟ اس کے لیے تو باقاعدہ پلاننگ کی ضرورت پڑے گی۔ نہ صرف بیرونی بلکہ اندرونی بھی اور جس پر اسے آج ہی سے دھیان دینا ہوگا۔ یہی سوچ کر اس کا رخ کچن کی جانب ہوا تھا۔

''خیر سے آنکھ کھل گئی ہماری راج کماری کی۔''

لاؤنج میں موجود بی جان نے بھرپور انداز سے اس کا سواگت کیا تھا۔

''بھئی آج کل کے تو بچے ہی عجیب ہیں۔ دن کو سوتے اور رات میں جاگتے ہیں۔ مانو الو اور چمگادڑ ہی بن گئے سب کے سب۔ انسانوں والی تو کوئی بات ہی نہ رہی۔ تب ہی تو ایسی شکلیں نکل آتی ہیں کہ دیکھ کر ہول پڑنے لگیں۔ اے لڑکی دو چھپاکے پانی کے ہی مار لو منہ پر۔ اس اتنے بڑے گھر میں مجھے بھی لگے کہ میرے علاوہ بھی کوئی انسان ہے۔'' ایک تو وہ پہلے ہی فکرمند ہوئی تھی کہ اس پر ان کی گل افشانیاں۔ وہ ہولتی ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''کیا میرا چہرہ زیادہ ہی بدلا ہوا لگ رہا ہے بی جان؟''

''نہیں کچھ ایسا زیادہ بھی نہیں۔ بس تمہاری آنکھیں تھوڑی بے دید ہوگئی ہیں ان کا پانی ڈھل گیا ہے۔ ان میں اگر تمیز و مروت کے ساتھ شرم و حیا کے سرمے کی دو سلائیاں بھر کر لگا لو تو معاملہ قدرے ٹھیک ہوسکتا ہے۔'' اس کا ناقدانہ نظروں سے جائزہ لیتے جو انہوں نے کہا وہ تابعہ توثیق کو خوب اچھی طرح سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ زچ ہوتی دھپ سے صوفے پر گری۔

''سب کہاں ہیں کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا؟''

''عمارہ تو اکیڈمی گئی ہے۔ اور تمہاری ماں اور توقیر مارکیٹ تک گئے ہیں کچھ ضروری سامان لینے۔ کچھ ہی دن تو رہ گئے ہیں توثیق کے آنے میں۔ بس اسی سلسلے میں مصروف ہے وہ۔''

''کب آ رہے ہیں بابا؟'' اسے کھانا پینا بھول کر اک اور فکر لگی۔

''آ جائے گا اللہ خیر کرے۔ تم کاہے کو پریشان ہوتی ہو۔ جاؤ کچھ کھا پی لو۔ صبح بھی اٹھ کر یونہی سوکھے منہ بھاگ جاتی ہو۔ واپس آ کر بھی تمہیں صرف سونے کی پڑی ہوتی ہے۔ نہ وقت پر کھانا نہ سونا جاگنا۔ صحت کا ستیاناس کر لیا ہے تم نے۔ کچھ اپنی پروا بھی کر لو باپ آ کر یہ بوتھی دیکھے گا تو کیا بتاؤ گی اسے۔'' وہ بھلا کب معافی دینے والوں میں سے تھیں۔ لگے ہاتھوں کلاس ہی لے ڈالی۔

''اور سنو۔ وہ کیا نام ہے اس لڑکے کا؟ ہاں یاد آیا۔ سبطین۔ اس سے کہو اگر وہ تمہارے لیے سچ میں سنجیدہ ہے تو اپنے والدین کے علاوہ اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے کر آئے تمہارے رشتے کے لیے اور اس کے بنا آنے کی غلطی نہ کرے کیونکہ میں پہلے ہی پھیرے پر انکار کر دوں گی۔ اچھی طرح سمجھا دینا اسے۔ اور وہ یہ کام توثیق کے آنے سے پہلے ہی کر لے۔ کیونکہ وہ میرا بیٹا ہے۔ اسے تو میں سمجھا لوں گی۔ لیکن تمہاری ماں۔ اف۔ پتا ہے نا اسے کوئی بات سمجھانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ سب سے زیادہ اعتراضات وہی اٹھائے گی۔ اسی لیے میں نے ابھی تک اسے بھنک بھی نہیں پڑنے دی اس سارے معاملے کی۔ سمجھ رہی ہو نا تم۔'' یہ تو سچ میں بڑی ہی نیکی تھی ان کی۔ ورنہ ثمرین سے وہ اکیلے کہاں نبٹ سکتی تھی۔ وہ تو جانے کیا حشر اٹھائیں گی۔ اسے سوچ کر ہی جھرجھری آ گئی۔ اور ان پر بے اختیار ہی پیار آیا تھا جس کے فوری اظہار کو قدم بڑھائے کہ اس کا ارادہ بھانپتے انہوں نے ہاتھ اٹھا کر وہیں روکا۔

''بس۔ بس یہ نحوست ماری شکل لے کر میرے قریب مت آنا۔ مجھے نہیں ضرورت تمہاری اس چاپلوسانہ لگاوٹ کی۔ رکھو اپنے پاس ہی۔ بس

اتنا کرو یہ چھلے ہوئے مٹر لے جاؤ۔ تمہاری ماں ہلکی آنچ پر قیمہ چڑھا گئی ہے۔ اس میں ڈال کر بھون لو۔ کبھی کبھی کام کرنا بھی صحت کے لیے اچھا ہوتا ہے۔ اور یوں بھی شادی کے بعد لڑکی نے اور کرنا ہی کیا ہوتا ہے۔ صرف کام ہی تو لیتے ہیں اگلے۔ سامنے بٹھا کر صدقہ کوئی بھی نہیں اتارتا۔ اب وہ چاہے ماں باپ کی مرضی سے لے کر جانے والے ہوں یا پھر اپنی مرضی سے۔ بخشش کہیں نہیں ہے بی بی۔ اس بات کو اچھی طرح جان لو تو اچھا ہے تمہارے حق میں۔''

''اُفف...... ٹانٹ کرنا تو جیسے ہابی ہے آپ کی۔ کبھی اچھی بات نہ کیجیے گا میرے ساتھ۔ ہمیشہ جی ہی جلائیں بس۔'' وہ بری طرح چڑ گئی۔

''اور جو جی تم نے میرا جلایا ہے اس کا کیا؟''

ان کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔ وہ ان سے بحث کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ چپ چاپ ٹوکری اٹھا کر کچن کی جانب چل دی۔

اس نے اسی رات بی جان کا پیغام اسے ٹیکسٹ کیا تو فوراً سبطین کی کال آ گئی۔

''جی جناب سبطین اعوان۔ کیسے فرصت مل گئی آپ کو ہم سے ہم کلام ہونے کی؟'' تابعہ کے لب ہی نہیں لہجہ بھی مسکراہٹوں سے معمور تھا۔ جبکہ ادھر سے جھنجلائی ہوئی سی آواز آئی۔

''یہ کیا فضول حکم نامہ ہے یار۔ آخر کس بات کی جلدی ہے تمہاری بی جان کو؟ میں کہیں بھاگا جا رہا ہوں کیا؟'' اور وہ متحیر ہوئی تھی۔ اس کے لہجے پر ہی نہیں اس کی بات پر بھی۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا یہ فضول بات ہے اور آپ کو بتایا تھا کہ جلدی کی وجہ کیا ہے۔ بابا آ رہے ہیں چند دن تک اور ان کی خواہش کیا ہے یہ بھی بتایا تھا میں نے آپ کو اور پھر بھی آپ؟'' بے اختیار لہجہ بھیگ گیا تھا۔ ادھر اس کی جھنجلاہٹ بوکھلاہٹ میں تبدیل ہوئی۔

''اوہو۔ اچھا نا بابا۔ ٹھیک ہے۔ اب اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ سمجھ میں آ گیا ہے مجھے۔''

''میں اس قدر ایکسائیٹڈ تھی اور آپ ہیں کہ......'' تابعہ سے مزید بولا ہی نہ گیا۔ اب تو آنکھیں ہی چھلک پڑی تھیں۔ اتنی بڑی خوشخبری پر ایسا رسپانس۔ اسے سچ میں تکلیف پہنچی تھی۔

''اوہ یار۔ آخر میں نے ایسا بھی کیا کہہ دیا۔ ایک تو تم لڑکیاں بھی نا۔ فوراً ہی۔''

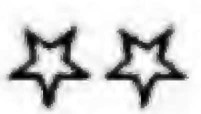
''کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا ہم لڑکیاں؟ کتنی لڑکیوں کا تجربہ ہے آپ کو؟'' وہ اس جملے پر ٹھیک ٹھاک تپ گئی۔

''تجربہ تو ہے نا یار۔ ایک عدد بیوی رکھتا ہوں میں۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں تم لڑکیوں کی چالاکیوں کو۔ مردوں کی جان کیسے ایک پل میں نکالنا ہے۔ خوب جانتی ہو تم لوگ۔ یہ جو اللہ نے ایک ہتھیار دے دیا ہے نا تم سب کو۔ اس کا استعمال بھی۔''

''او کے پھر بات کرتے ہیں مما آ رہی ہیں۔''

اس سے زیادہ سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس نے بہانے سے کال کاٹ دی۔ کئی قطرے پلکوں سے ٹوٹ کر دامن میں جا گرے۔

''شادی شدہ مرد کی زندگی کا حصہ بننا ایسا ہی ہے جیسا کہ چھلکوں سمیت بادام چبانا۔ عورت کی پور پور زخمی ہو جاتی ہے۔ رگ رگ میں درد دوڑنے لگتا ہے اور اس درد کی دوا بھی کہیں نہیں ملتی۔ کیا سہہ لوگی اس اذیت کو؟ وقت اب بھی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں تو کہتی ہوں۔ باز آ جاؤ اس نادانی سے۔ کیوں اپنے ہاتھوں پھندا گلے میں ڈالنے پر تلی ہوئی ہو۔ اچھا بھلا لڑکا ہے آپا کا نواسا۔ اور پھر......'' بی جان نے ہامی تو بھر لی تھی مگر اسے سمجھانے سے پھر بھی نہ رکی تھیں۔ آج صبح ہی تو انہوں نے کہا تھا اور وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی تھی اور اب اس کے ہونٹوں سے نکلے لفظ مثل آگ بن گئے تھے۔



(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



نعیمہ ناز

صفائی مہم

پپو ہمیشہ کی طرح موبائل ہاتھ میں لیے اپنے پسندیدہ کونے میں گھسا بیٹھا تھا۔ جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ باآسانی کسی کو نظر نہیں آتا تھا اور کسی کی آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ کانوں میں ٹونٹیاں جو گھسیڑ کے بیٹھتا تھا۔ پپو کے سامنے والے کونے میں ڈولی ہوئی اور بوبی دونوں ریموٹ ہاتھ میں لیے ٹی وی کم دیکھ رہے تھے۔ چینلز زیادہ بدل رہے تھے، کسی ایک چینل پر دونوں کا اتفاق ہی نہیں رہا تھا۔ دونوں کے دونوں حکومت اور اپوزیشن بنے بیٹھے تھے۔ باہر صحن سے اٹھا پٹخ کی آوازیں آرہی تھیں مگر وہ کمرے میں کسی کو نہیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہاں کچن میں موجود شائستہ بیگم نے اس کھڑکی سے جھانک کر ضرور دیکھا جو صحن میں کھلتی تھی اور انہیں جو منظر نظر آیا وہ یہ تھا کہ ان کی جٹھانی عقیلہ بیگم صحن کے بیچوں بیچ کھڑی تھیں۔ سر پر دوپٹا بندھا ہوا، ایک ہاتھ میں جھاڑو اور دوسرے میں موبائل، جس کے ذریعے وہ گھوم گھوم کر صحن کی مووی بنارہی تھیں اور ان کے شوہر نامدار رننگ کنٹری میں مصروف تھے۔

"ناظرین آپ دیکھ رہے ہیں، اس صحن کی حالت میں جس دنیا جہان کا کاٹھ کباڑ اور کوڑا کرکٹ جمع ہے۔ اس صحن کو صاف کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے مسٹر اینڈ مسز شبراتی میاں نے۔ اگر آپ ہماری اس کوشش کو سراہنا چاہیں اور ہماری حوصلہ افزائی کرنا چاہیں تو شوق سے کیجیے۔ اپنی لائکس بھیجنا نہ بھولیے اور......"

شبراتی میاں نے اپنی تقریر دل پذیر ختم کی۔ ان کی بیگم نے موبائل آف کیا۔

"آپ کہاں چلے، کام کون کروائے گا میرے ساتھ۔" مجازی خدا کو اندر لپکتا دیکھ کر بیگم نے انہیں روکا اور ٹوکا۔

"لو، بھلا میں کیا کروں گا۔ یہ میری ذمہ داری تو نہیں، جس کا کام ہے اسے بلاؤ نا۔ اپنے ساتھ لگا کر کروالو صفائی۔" شبراتی میاں گڑبڑا گئے۔ پکے حکومتی رکن لگتے تھے، تقریر آسان تھی، کام کرنا مشکل۔

"یہیں ہوگا باہر۔ گیٹ کے باہر بیٹھا بیٹھا جمائیاں لیتا رہتا ہے یا سوتا رہتا ہے۔ آواز دیں، ابھی آجائے گا۔"

"بن...... او بن صاحب! اندر تشریف لائیے۔" شبراتی میاں کا لہجہ طنزیہ ہوا۔

"جی حضور! کس کارِ لائقہ سے یاد فرمایا؟" بن میاں اپنی سلیس اردو اور جمائیوں سمیت اندر آگئے۔

"ابے او کار لائقہ کے نالائق بچے! تجھے ابا حضور نے اس صحن کی صفائی ستھرائی کے لیے رکھا تھا۔ تو گیٹ کے باہر بیٹھا سوتا رہتا ہے اور مہینے کے مہینے تنخواہ اور روزانہ جمائیاں لیتا رہتا ہے۔" شبراتی میاں نے اسے ٹھیک ٹھاک لتاڑ دیا۔ مگر بن میاں کے لیے یہ لفظی خوراک ایسی ہی تھی جیسے چکنے گھڑے

پر پانی کی بوندیں یا حکومتی گنجے سر پر عوام کا واویلا، سب پھسل پھسل کر گرتا رہتا ہے۔

"تو حضور کیا کروں؟ نوکری پر رکھا ہے تو مجھے سامان اور سہولتیں تو دیں۔ ان کے بغیر کیسے کام کروں گا؟" ببن میاں نے اپنا سر کھجایا۔

"کیا سہولتیں چاہئیں تجھے۔" اس بار بیگم شبراتی نے اسے گھورا۔ "مواسنڈا! اگر اپنی ذمہ داری، ایمان داری اور تندہی سے ادا کرتا تو آج انہیں یوں جھاڑو اٹھا کر کھڑا نہ ہونا پڑتا۔"

"کچھ ہیلپر، کچھ جھاڑوئیں..... یہ سارا کاٹھ کباڑ اور کچرا اٹھانے کے لیے ٹرالیاں، وغیرہ وغیرہ۔" ببن میاں نے کھڑے کھڑے فہرست گنوادی۔

"ان سب کے لیے تو اباجان نے اا گ سے فنڈ دیا تھا تجھے۔" شبراتی میاں کو معایاد آیا۔

"کن زمانوں کی بات کر رہے ہیں حضور! ان کی جو جھاڑوئیں، ٹرالیاں اور دیگر سامان آیا تھا، وہ تو خود مدتوں سے کچرا بنا اس صحن میں موجود ہے۔"

ببن میاں کے انداز میں ایک شان استغنا موجود تھا۔ اب ان کی انگلیاں سر کھجا کھجا کر بور ہوئیں تو ناک میں گھس گئیں۔

"اچھا یہ ٹرالی ورالی بعد میں دیکھیں گے، پہلے تو



صفائی کروا میرے ساتھ۔"
بیگم شبراتی نے اسے گھرک کر حکم دیا اور خود پورے صحن کا جائزہ لینے لگیں۔ اتنا وسیع و عریض صحن کچرے سے اٹااٹ بھرا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ صفائی کہاں سے شروع کریں پھر آخران کی سمجھ میں آہی گیا۔ انہوں نے آغاز اس جگہ سے کیا جہاں ان کا پورشن موجود تھا۔
"توبہ توبہ، نہ کھڑکی کھول سکتے ہیں نہ دروازہ۔ بدبو کے مارے برا حال ہو جاتا ہے۔" منہ پر ڈھاٹا باندھ کر بڑبڑاتے ہوئے انہوں نے صفائی کا آغاز کیا۔
ببن میاں مارے باندھے ان کے ساتھ شریک تو ہوگئے مگر جلد ہی تھک گئے۔ کام کی عادت ہی کہاں رہی تھی انہیں۔ وہ تو گیٹ کے باہر بیٹھے پہلی تاریخ کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ اندر صحن میں ان کی بلا سے بوم بسے یا ہما، انہیں کیا۔
دو گھنٹے بعد تو بیگم شبراتی بھی تھک گئیں۔ بڑی مشکلوں سے ایک ذرا سے حصے سے کاٹھ کباڑ اٹھا اٹھا کر کونے میں رکھا تھا اور کچرا تھیلیوں میں باندھ کر وہ بھی ایک کونے میں ہی رکھ دیا۔
ببن میاں نے صاف کہہ دیا تھا کہ ان کا کام صفائی کرنا ہے فقط، کچرا اٹھا کر پھینکنا ان کے ہیلپر کا کام ہے۔ اب وہ ہیلپر ایسے ہی ناپید تھا جیسے ملکی معیشت میں استحکام۔ سو کونے میں پڑا کاٹھ کباڑ اور کچرے کے تھیلے اپنی قسمت پر نازاں تھے کہ یہاں سے ان کا دیس نکالا نہیں ہوا۔ ہاں اس عرصے میں یہ ضرور ہوا کہ ان کے پورشن کے آگے تھوڑا حصہ صاف ہوگیا تھا اور اس دوران صفائی کی، کچرے کے ڈھیر، پہلے اور بعد کی تصاویر۔ بیگم شبراتی کی صفائی کرتے، جھاڑو پکڑے ڈھیروں ڈھیر پکس، ذرا سی دیر میں ان کے بک اکاؤنٹ کے ذریعے دنیا بھر میں پھیل گئیں۔

☆☆☆

"اے ہاے، پپو کے ابا! دیکھا تم نے؟" شوہر نامدار کے آگے کھانا رکھتے ہوئے ان کی بیگم گویا ہوئیں۔
"ہاں......ا......ا......دیکھ رہا ہوں۔" آدھے دریائے سندھ کے برابر شوربے میں تیرتے آلو کے دو تین ٹکڑوں کو انہوں نے بڑی حسرت سے دیکھا۔ دال اور آلو کے علاوہ کوئی اور ڈش پکانا ان کی بیگم کے لیے اتنا ہی مشکل تھا جتنا کہ ڈالر کی قدر اور سونے کی قیمت میں کمی ہونا۔ ان کی بیگم سے اچھی تو یہ حکومت تھی' جتنے دن میں وہ کھانے کا مینو نہیں بدلتی تھیں، یہاں ایک کے بعد ایک وزراء بدل جاتے تھے۔
"کہاں دیکھ رہے ہیں؟ صحن کی بات کر رہی ہوں۔"
"ہاں۔ وہ بھی معلوم ہے۔ پوری دنیا کو معلوم ہوگیا ہے کہ بھائی صاحب اور بھابھی نے آج صفائی کی ہے۔" لقمہ توڑتے ہوئے وہ بیزاری سے بولے۔
"میں سوچ رہی تھی کیوں نہ اگلے ہفتے ہم بھی تھوڑی صفائی کرلیں صحن کی۔ اچھا نہیں لگتا نا، جو بھی آتا ہے ٹوکتا ضرور ہے۔"
"اچھا، ٹھیک ہے۔"
ان کی پرسکون ازدواجی زندگی کا راز یہ تین جادوئی الفاظ جنہیں اس وقت بھی استعمال کرکے انہوں نے اپنے سر سے بلا ٹالی۔ ورنہ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ صفائی سے زیادہ جٹھانی صاحبہ کی حرص ہے۔ اب جھاڑو ہاتھ میں اٹھایا ہے، ان کی تصاویر جب تک پوری دنیا میں سفر نہیں کرلیتیں، انہیں سکون نہیں ملے گا۔
اگلی چھٹی کا دن اب کچرے کے ڈھیر کے پاس رمضانی صاحب اور بیگم رمضانی کھڑے تھے۔ جھاڑو ئیں ہاتھ میں پکڑے، تعفن اڑاتے کچرے کی دھڑا دھڑ پکس لی جا رہی تھیں پھر صفائی کا مرحلہ شروع ہوا۔
"یہ آخر ببن کس مرض کی دوا ہے؟ جب یہ کسی کام کا ہی نہیں تو ابا جان نے رکھا ہوا کیوں ہے؟ بے کار میں تنخواہ دیتے رہتے ہیں ہر ماہ۔" بیگم رمضانی

نے کچرے کو اٹھا اٹھا کر بڑے سے تھیلے میں بھرتے ہوئی ناک منہ چڑھائے۔

"مرضی ابا جان کی۔ عقل کل ہیں وہ، ان سے کوئی کیا کہے؟" رمضانی صاحب اپنی بیگم سے خصوصاً اور ہر دو جہاں سے عموماً بےزار ہی رہتے تھے۔

"ذرا دیکھو، کیسے صاف منہ پر انکار کر گیا کہ بغیر سامان کے کام نہیں کروں گا۔" بیگم صاحبہ سلگ سلگ گئی تھیں، مگر بن میاں کو کوئی کیا کہہ سکتا تھا۔

دو تین گھنٹے مارے باندھے انہوں نے صفائی کی پھر بچوں کو بھی بلا لیا۔ پچاس پچاس روپے کے لالچ میں پپو، ڈولی اور بوبی ٹی وی موبائل کا پیچھا چھوڑ کر صفائی مہم میں شامل ہو گئے تھے۔ پوری فیملی کی تصویر جو صفائی مہم میں شامل ہو، ان کی جٹھانی کی تصاویر سے زیادہ لائکس لیں گی، انہیں یقین تھا۔

"یہاں کیوں پھینک رہے ہو کچرا۔ یہاں سے تو کل بھائی صاحب اور بھابھی نے صفائی کی ہے۔" رمضان صاحب نے پپو کو ٹوکا۔

"اے ہائے چھوڑو، اور کوئی جگہ کہاں ہے کچرا ڈالنے کی۔ پورا صحن ہی کوڑے کرکٹ سے بھرا پڑا ہے۔" بیگم صاحبہ نے چمک کر بیٹے کی حوصلہ افزائی کی۔

"تھیلے میں بھر لو کچرا۔" بوبی نے مشورہ دیا۔

"یہ کہاں سے آ گئی عقل کل کی افلاطون۔" اس بار انہوں نے بیٹی کو گھورا۔

ادھر سے، جٹھانی صاحبہ کی کھڑکی کھلی تھی جائزہ لینے کے لیے اور جائزہ لیتی ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ کھٹاک سے انہوں نے کھڑکی بند کی اور دروازہ کھول کر باہر صحن میں آ گئیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" کمر پر ہاتھ رکھے انہوں نے سوال کیا۔

"نظر نہیں آ رہا، صفائی کر رہے ہیں۔" دیورانی نے ترنت جواب دیا۔

"صفائی کر رہے ہو یا جو پہلے سے صاف ہے، اسے گندا کر رہے ہو۔ یہ ہمارے پورشن کے آگے کوڑا کس نے پھینکا۔ کل تو صفائی کی تھی ہم نے۔" جٹھانی دم خم سب ٹھونک کر میدان میں آ گئیں۔

"پورا صحن تو کچرے سے اٹا پڑا ہے، ہوا سے اڑ کر آ گیا ہو گا۔" دیورانی صاحبہ اپنی حرکت سے صاف مکر گئیں۔ ادھر رمضانی صاحب نے پپو کو اشارہ کیا کہ وہ یہاں سے کچرا اٹھا کر تھیلے میں ڈالے۔ پپو نے بڑی سعادت مندی سے ان کا حکم مان لیا اور جلدی جلدی کچرا اٹھا کر جگہ صاف کر دی۔ ورنہ آج اسی صحن میں جنگ عظیم کا میدان سج جاتا۔

پپو اینڈ فیملی نے چند گھنٹے لگا کر اتنا حصہ تو صاف کر ہی دیا تھا، جو ان کے پورشن کے آگے تھا۔ اب سوال تھا ان تھیلوں کا جن میں کچرا تھا۔ کچھ کاٹھ کباڑ تھا۔

"باہر رکھ دیں، بن پھینک آئے گا۔" بیگم نے مشورہ دیا۔

"قیامت تک بھی نہ پھینکے گا، جسے آرام کرنے کی تنخواہ مل رہی ہو وہ کام کرنے کی حماقت کیوں کرے گا؟" مجازی خدا نے تبصرہ کرتے ہوئے سارا کباڑ اور کچرے کے تھیلے ایک کونے میں منتقل کیے۔ "میں خود ہی تھوڑا تھوڑا کر کے پھینک آؤں گا۔" ان کی طرح یہی دعوا شبراتی صاحب نے بھی کیا تھا مگر وہ بھی الیکشن سے قبل پی ٹی آئی کے دعوے اور وعدے کی طرح نکلا۔ بودا اور بس پھسا۔

قریباً ایک ڈیڑھ ماہ بعد یہ حال ہوا کہ کچرے کی جو تھیلیاں باندھ باندھ کر صحن کے گوشوں اور کونوں میں سجائی گئی تھیں۔ وہ بلی کے منہ مارنے اور چوہوں کے کترنے سے ایسی پھٹ پڑیں جیسے اپوزیشن جب ان کے لیڈرانِ کرام کو کرپٹ اور چور کہا جاتا۔ تو سارا کچرا سارا کاٹھ کباڑ ایک بار پھر پورے صحن کی زینت بنا ہوا ہے۔ بن میاں ہنوز لاتعلق اور غیر ذمے دار اور شبراتی میاں اور رمضانی صاحب کی بیگمات کو جب بھی شوق اٹھے گا' تصاویر اپ لوڈ کرنے اور شہرت حاصل کرنے کا، تو ایک بار پھر وہ جھاڑو اٹھا لیں گے۔

☆☆

نگہت عبداللہ

سالگرہ نمبر

ہوائیں رخ بدل گئیں

حیدر علی اور احمد علی دو بھائی تھے۔ حیدر علی بڑے تھے۔ چھوٹے بھائی احمد علی کے لیے وہ مشفق باپ تھے۔ احمد علی کا انتقال ہو چکا تھا اور حیدر علی جس حد تک ممکن ہوتا بھاوج اور بچوں کی مدد کرتے ہیں۔

حیدر علی کو ان کے مزاج کے برعکس بیوی ملی تھیں۔ وہ جتنے نرم خو تھے حمیدہ بیگم اسی قدر تیز وطرار اور کسی حد تک بدزبان بھی۔ احمد علی کی بیوی فاخرہ ان ہی کی طرح نرم مزاج اور درگزر کرنے والی تھیں۔

حیدر علی کی تین بیٹیاں سبینہ، خزینہ اور شہرینہ تھیں جبکہ احمد علی کے دو بچے حمزہ اور بیلا تھے۔

سبینہ کی شادی ہو چکی ہے۔ خزینہ اپنے باس تیمور غزنی کو پسند کرتی ہے جبکہ خزینہ کا خالہ زاد اشر جلیل اس کو چاہتا ہے۔ حمزہ اور شہرینہ کا رشتہ، حیدر علی نے حمیدہ بیگم کی مرضی کے خلاف بھائی کی زندگی ہی میں ان کی کم عمری ہی میں کر دیا تھا جو وقت کے ساتھ ان کے دلوں میں بھی مضبوط ہو چکا ہے۔

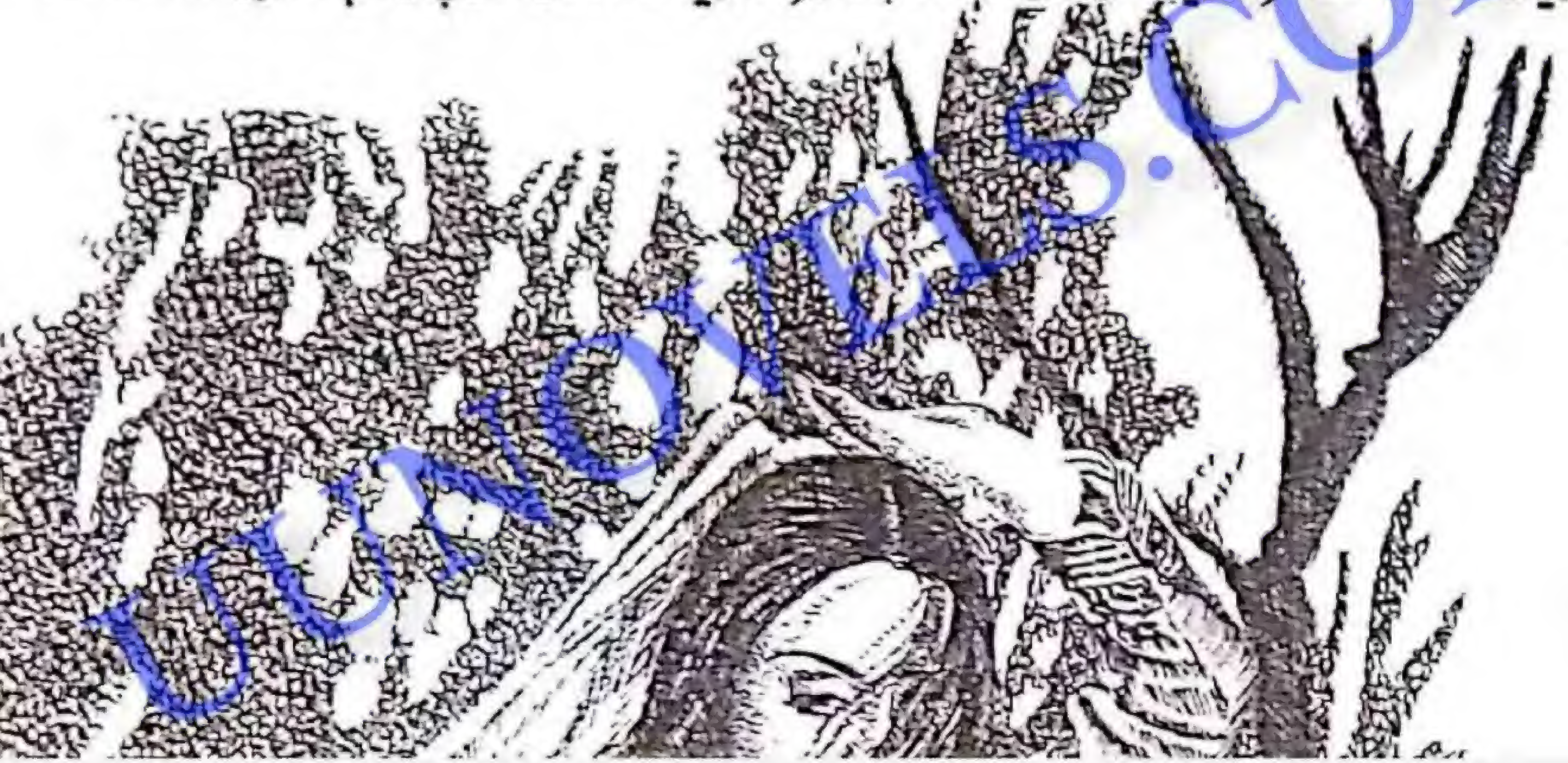
حیدر صاحب کا آفس میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو جاتا ہے۔ حمزہ کو جاب مل جاتی ہے لیکن اس کے باس حسان صاحب کی بیٹی ربیکا اس کو پسند کرنے لگتی ہے جو وقتاً فوقتاً حمزہ کو اپنی باتوں سے پریشان کرتی ہے۔

تیمور غزنی اور سارہ کی کوئی اولاد نہیں ہے' سارہ مس کیرج ہونے کی وجہ سے وہ اب کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ سارہ، تیمور سے اپنی دوست زوبی کا بے بی لینے کا کہتی ہے لیکن تیمور اس بات پر دل سے رضامند نہیں ہے۔



سونیا کے مشورے پر تیمور دوسری شادی کے لیے سوچنے لگتا ہے اور خزینہ اسے بالکل موزوں نظر آتی ہے لیکن وہ خزینہ سے جھوٹی محبت کا اظہار کرتا ہے اور اسے سارہ کے بارے میں نہیں بتاتا اور کہتا ہے کہ فی الحال گھر والے راضی نہیں ہیں اس لیے وہ خزینہ سے چھپ کر شادی کرے گا اور بعد میں انہیں منا لے گا۔ خزینہ تیمور کی محبت میں رضامند ہو جاتی ہے اور حمیدہ بیگم کو بھی اس شادی پر راضی کر لیتی ہے۔ تیمور خزینہ کو ایک الگ فلیٹ میں بیاہ کر لے جاتا ہے۔

ربیکا بیلا کو اغوا کر کے حمزہ کو بلیک میل کرتی ہے اور مجبوراً حمزہ کو ربیکا سے شادی کرنی پڑتی ہے۔ شہرینہ حالات سے



سمجھوتا کر کے اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے۔
خزینہ تیمور کے ساتھ خوش گوار زندگی گزار رہی ہے۔ اس کا پہلا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تیمور بچے کو سارہ کی پاس لے جاتا ہے اور خزینہ سے کہہ دیتا ہے کہ بچہ مرا ہوا پیدا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ خزینہ کو کچھ عرصے بعد دوسرے بیٹے سے نواز دیتا ہے تو تیمور کے دل پر سے خزینہ سے اولاد چھین لینے کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔
جہانداد کی ماں نفسیاتی مریضہ ہیں۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق جہانداد ماں کو خوش رکھنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔
جہانداد کے اسکول میں شہرینہ ٹیچر ہے۔ شہرینہ کو دیکھ کر جہانداد کے دل میں انجانی خواہشات جنم لینے لگی ہیں۔ جہانداد کی ماں بیمار ہوتی ہیں تو اسکول کی ٹیچرز عیادت کے لیے ان کے گھر جاتی ہیں وہاں شہرینہ کو دیکھ کر جہانداد کی ماں اندازہ لگا کر کہتی ہیں اس لڑکی کے دل میں بڑا درد ہے اور پھر شہرینہ کے آنسو سارے بند توڑ کے بہنے لگتے ہیں۔

اٹھائیسویں قسط

بس ایک پل نظروں کا تصادم ہوا تھا۔ دل بڑی زور سے دھڑکا پھر گو کہ شہرینہ انجان بن گئی لیکن سارا دھیان جہانداد کی طرف ہی تھا۔ جب ہی تو وہ جو بولے چلی جا رہی تھی' اسے ایک دم چپ لگ گئی۔
سگنل کھل گیا تھا۔ حمزہ نے بائیک بھگا دی۔ گاڑی پیچھے رہ گئی۔ اس کے باوجود وہ محسوس کر رہی تھی کہ جہانداد کی نظریں اس پر جمی ہیں۔
''اف! پتا نہیں کیا سوچیں۔ میں نے ان سے جھوٹ بولا کہ گھر سے کال آئی تھی۔'' وہ اپنے آپ میں عجیب سا محسوس کرنے لگی۔ گھر آنے تک اس کی یہی کیفیت رہی۔ جب حمزہ نے اس کے گھر کے آگے بائیک روکی تب اترنے کے ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ اس نے حمزہ کو اپنے گھر چلنے کو کہا تھا۔ فوراً بولی۔
''بائیک بند کرو، چلو اندر۔''
''پھر...... پھر کسی دن......''
''ہیں ابھی۔ ورنہ سوچ لو۔ آج تو میں تمہارے بلانے پر آ گئی، آئندہ کبھی نہیں آؤں گی۔'' اس نے قدرے رعب سے کہا تو حمزہ نے سر اونچا کر کے آسمان کو دیکھا گویا مدد طلب کر رہا ہو۔
''ڈرو مت، میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' اس نے بمشکل ہنسی روکی۔ حمزہ نے بائیک بند کر دی پھر اس کے پیچھے چلنے لگا۔ لاؤنج میں آتے ہی وہ اونچی آواز میں پکار کر بولی۔
''امی! دیکھیں کون آیا ہے۔''
''کون ہے؟'' حمیدہ بیگم کہتے ہوئے کمرے سے نکلیں تو اس کی زبان چل پڑی۔
''حمزہ ہے۔ زبردستی لے کر آئی ہوں اسے۔ آ ہی نہیں رہا تھا۔ کہہ رہا تھا تائی جان سے ڈر لگتا ہے۔ تو ایسا کریں امی! اس کا کان مروڑ کر دو چار چماٹ مار دیں تا کہ اس کا ڈر نکل جائے۔''
حمزہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ حمیدہ بیگم شہرینہ کی باتوں پر ناگواری محسوس کرتے ہوئے حمزہ کو دیکھے جا رہی تھیں۔
''اب ایسے کیا کھڑے ہو، سلام تو کر لو امی کو۔ اس نے حمزہ کو ٹوکا تو اس نے پہلے یوں ہی سر جھکائے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا پھر ایک دم بڑھ کر حمیدہ بیگم کے ہاتھ تھام لیے۔
''تائی جان! میں نے آپ سب کو بہت تنگ کیا ہے۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ میرے لیے جیسے اماں ہیں، ویسے آپ ہیں۔ آپ ناراض ہوں گی تو میں جی نہیں پاؤں گا۔ مر جاؤں گا۔''
وہ حمیدہ بیگم کے ہاتھ آنکھوں سے لگا کر رو پڑا۔ ''مجھے معاف کر دیں...... مجھے معاف کر دیں تائی جان......!''

حمیدہ بیگم کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کریں۔ کبھی شہرینہ کو دیکھتیں، کبھی اسے...... پھر شہرینہ کے اشارے پر ہی انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''روتے کیوں ہو...... بیٹھو۔ شہرینہ اس کے لیے پانی لاؤ۔''

''جی......'' شہرینہ بھاگ کر پانی لے آئی اور گلاس اسے تھما کر حمیدہ بیگم سے کہنے لگی۔

''امی! آپ اسے بتائیں کہ ہم میں سے کوئی بھی اس سے ناراض نہیں۔ یہ اپنے آپ پتا نہیں کیا کچھ سوچ کر کر کڑھتا رہتا ہے اور ابھی پتا ہے خودکشی کرنے جا رہا تھا۔''

''ہیں......'' حمیدہ بیگم نے سچ مچ دہل کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔ پھر حمزہ پر بگڑ گئیں۔ ''پاگل ہوئے ہو کیا...... ایسا کیا ہو گیا جو مرنے کا سوچنے لگے۔ خبردار جو ایسی کوئی کوشش کی تو۔''

''میں کیا کروں تائی جان! مجھ سے آپ کی ناراضی برداشت نہیں ہو رہی۔ کسی ایک دن میں چین سے نہیں رہا۔ پتا نہیں میں کیا کر بیٹھا ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''بس جو ہو گیا، ہم نے تم سے یا کسی سے شکایت کی اور کیوں شکایت کریں۔ یہ تو سب قسمت کے کھیل ہیں۔ تم دل پر بوجھ مت رکھو۔'' حمیدہ بیگم ایسی نرم دل تو نہ تھیں، شاید اس کے رونے سے دل پسیج گیا تھا جو اس کا سر اپنے کندھے سے لگا کر بولیں۔

''تم نے مجھے ماں کی طرح سمجھا تو میں بھی تمہیں اپنی اولاد ہی سمجھتی ہوں اور اولاد سے ناراضی نہیں ہوتی۔''

''آپ کہہ دیں تائی جان کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا۔'' وہ پھر رو دینے کو تھا۔

شہرینہ کی آنکھیں نم ہو گئیں تو فوراً وہاں سے کھسک گئی۔

☆☆☆

جہانداد ماں کی طرف سے اطمینان کر کے لیونگ روم میں آ بیٹھے تھے۔ اس وقت ان کا ذہن بالکل خالی تھا۔ احساسات بھی جیسے منجمد ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے، ہم سمجھ ہی نہیں پاتے کہ ہم کیا محسوس کر رہے ہیں یا کیا سوچنا چاہ رہے ہیں۔ اس وقت وہ ایسی ہی کیفیت میں تھے۔ نظریں ادھر اُدھر بھٹکتی ہوئی گلاس وال سے ادھر جا ٹھہریں جہاں رنگ برنگے پھول لہلہاتے ہوئے گویا بہار کا جشن منا رہے تھے اور ہمیشہ تو ایسے ماحول میں وہ خود کو بہت فریش محسوس کرتے تھے پھر اب جانے کیا ہوا تھا۔ وہ سوچ بھی تو نہیں رہے تھے۔

''صاب جی! کھانا لگا دوں؟'' زیتون بی بی نے آ کر پوچھا تو وہ بنا چونکے اسے دیکھنے لگے۔

''شہرینہ بی بی تو آج جلدی چلی گئیں۔''

''شہرینہ......'' ان کے اندر باہر پھیلا سناٹا ایک چھناکے سے ٹوٹا تھا کہ وہ گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ زیتون بی بی کی بات جاری تھی۔

''کچھ بتا کر بھی نہیں گئیں۔ بیگم صاحبہ اٹھیں گی تو پہلے ان ہی کا پوچھیں گی۔''

''ہاں شہرینہ نے مجھے بتا دیا تھا۔ انہیں کسی ضروری کام سے جانا تھا۔'' جہانداد کو خود پتا نہیں چلا' ان کے ہونٹوں پر کیسی طنز آمیز تلخ مسکراہٹ پھیلی تھی۔ ''بہرحال آپ پریشان نہ ہوں، ماں کو میں بتا دوں گا۔''

''اور کھانا صاب؟''

''ابھی نہیں۔ ماں کے ساتھ کھاؤں گا۔'' وہ کہہ کر ماں کے کمرے میں آ گئے جو گہری نیند سو رہی تھیں۔ وہ چند لمحے انہیں دیکھتے رہے پھر بیٹھ کر ان کی میڈیسن چیک کرنے لگے۔ شاید ان کے اندر کہیں یہ بات تھی کہ شہرینہ اب نہیں آئے گی۔ اس لیے انہیں پھر سے ماں کی ہر چیز کا خود ہی خیال کرنا ہو گا اور یہ سارے کام کوئی اتنے مشکل نہیں تھے جتنا ماں کو سمجھانا۔ انہوں نے تمام میڈیسن اپنے حساب سے سیٹ کر کے رکھیں پھر وہاں سے

اٹھنے لگے تھے کہ ماں نے آنکھیں کھولتے ہی پکارا تھا۔
"شہرینہ......!" وہ فوراً اٹھ کر ماں کے سرہانے آ بیٹھے۔
"جی ماں۔"
"شہرینہ کہاں ہے؟" ماں ادھر اُدھر دیکھنے لگیں۔
"وہ کسی ضروری کام سے گئی ہیں، آپ سو رہی تھیں ورنہ آپ کو بتا کر جاتیں۔" انہوں نے شہرینہ کی بات دہرائی تھی۔
"ہاں بتا کر جاتی ہے۔" ماں نے اٹھ کر بیڈ کی بیک سے ٹیک لگائی تو جہانداد سرہانے سے ہٹ کر ان کے سامنے بیٹھ گئے۔
"ایک بات پوچھوں ماں! سچ بتایئے گا۔"
"کیوں؟ پہلے بھی جھوٹ بولا ہے تم سے۔" ماں نے کہا تو وہ گدی کھجاتے ہوئے بولے۔
"نہیں، آپ سچ ہی بولتی ہیں۔"
"اچھا، تم پوچھو۔ کیا پوچھ رہے تھے؟"
"جی۔ وہ میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ آپ کو میں زیادہ اچھا لگتا ہوں یا شہرینہ؟" انہوں نے کہا تو ماں ان سے پوچھنے لگیں۔
"تمہیں کیا لگتا ہے؟"
"مجھے لگتا ہے آپ کو شہرینہ زیادہ اچھی لگتی ہے کیونکہ آپ سوتے جاگتے اسی کا نام لیتی ہیں۔ اسے پکارتی ہیں۔ مجھے تو آپ بھول ہی گئی ہیں۔" وہ قصداً دل گرفتہ نظر آنے لگے۔ ماں تڑپ گئیں۔
"پاگل ہو تم۔ مجھے وہ تم سے زیادہ اچھی کیسے لگ سکتی ہے۔ تم میری اولاد ہو۔ اس لڑکی پر تو پتا نہیں کیوں مجھے پیار آ جاتا ہے۔ تمہیں اچھا نہیں لگتا؟" ماں نے پوچھا تو انہوں نے روتے بچے جیسی شکل بنائی۔
"اچھا اچھا۔ سمجھ گئی۔ تم اس سے جلنے لگے ہو۔ ہیں ناں...... یہی بات ہے ناں......" ماں ہنسنے لگیں تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولے۔
"یہ بات نہیں ہے۔"
"پھر کیا بات ہے؟" ماں جو بچوں کی طرح ہنس رہی تھیں ایک دم خاموش ہو کر انہیں دیکھنے لگیں تو وہ سمجھانے کے انداز میں گویا ہوئے۔
"میں اصل میں یہ سوچتا ہوں ماں کہ ابھی تو وہ لڑکی آپ کے بلانے پر آ جاتی ہے لیکن جب اس کی شادی ہو جائے گی تب تو وہ نہیں آ سکے گی ناں۔ میرا مطلب ہے ہو سکتا ہے اس کا شوہر اجازت نہ دے۔ آپ سمجھ رہی ہیں ناں۔"
"ہوں......" ماں سوچ میں پڑ گئیں۔
"اس لیے آپ خود کو اس کا عادی نہ بنائیں۔ چھٹی کر دیں اس کی۔" دوسری بات بلا ارادہ ان کے منہ سے نکلی تھی جس پر خود ہی جز بز ہونے لگے کیونکہ ماں ایک دم انہیں دیکھنے لگی تھیں اور ان سے فوری کوئی بات بھی نہیں بنائی گئی۔
"اس کی شادی ہو رہی ہے؟" ماں نے پوچھا تو ان کی نظروں میں کچھ دیر پہلے کا منظر آن سمایا۔ وہ جس کے ساتھ بائیک پر بیٹھی تھی، وہ کوئی انجان تو نہیں ہو سکتا تھا۔
"بتاؤ ناں، کب ہے اس کی شادی؟" ماں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا تو وہ چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔
"پتا نہیں۔ چلیں آئیں کھانا کھاتے ہیں۔ بہت بھوک لگی ہے۔"

☆☆☆

حمیدہ بیگم نے حمزہ کو گلے تو لگا لیا تھا لیکن ان کے اندر کھد بد مچ گئی تھی یعنی کھوجی طبیعت پوری طرح بیدار ہو گئی۔ شہرینہ سے تو انہوں نے کچھ نہیں کہا، نہ اس پر کچھ ظاہر ہونے دیا۔ لیکن اگلے روز گیارہ بجے جیسے ہی شہرینہ گئی وہ فوراً تیار ہو کر فاخرہ سے ملنے چل دیں۔ آخر انہیں پتا تو چلے کہ آخر ایسا کیا ہوا ہے جو حمزہ ٹھکرائے رشتوں میں پناہ ڈھونڈنے چلا آیا تھا۔ کل سے وہ اپنے آپ جانے کیا کچھ قیاس کرتی رہی تھیں اور اصل بات تو انہیں فاخرہ ہی سے معلوم ہو سکتی تھی۔ جب ہی وہ زیادہ صبر نہیں کر سکیں اور ملنے کے بہانے چلی آئیں۔ اتفاق سے گیٹ کھلا تھا۔ وہ سیدھی اندر آ گئیں۔

فاخرہ برآمدے میں تخت پر بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھیں۔

ربیکا چائے کا کپ لیے کچن سے نکل رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی حمیدہ بیگم سمجھ گئیں کہ وہ حمزہ کی بیوی ہے اور کیونکہ جب وہ خزینہ کے ساتھ خاص طور سے اسے دیکھنے آئی تھیں لیکن ربیکا ان سے نہیں ملی تھی تو اب انہوں نے بھی فوراً اس کی طرف سے دھیان ہٹا لیا تھا اور فاخرہ کو متوجہ کرنے کے لیے کھانسی کا سہارا لیا تھا۔

''ارے بھابھی آپ۔ آیئے آیئے۔'' فاخرہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں اور ان کے گلے لگ کر بولیں۔

''میں تو خود کتنے دنوں سے آپ کی طرف آنے کا سوچ رہی ہوں۔''

''ہاں، بس تم سوچتی رہا کرو۔''

''بس بھابھی وہ...... ہاں ربیکا......'' فاخرہ نے اپنے کمرے کی طرف جاتی ربیکا کو پکار لیا تو وہ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

''بیٹا! یہ حمزہ کی تائی جان ہیں۔ آؤ سلام کرو۔'' انہوں نے کہا تو ربیکا وہیں کھڑے کھڑے بولی۔

''السلام علیکم!'' حمیدہ بیگم نے اس کا سلام یکسر ان سنا کر دیا اور انتہائی نخوت بھرے انداز میں بولیں کیونکہ وہ اپنی اہانت بھولی نہیں تھیں۔

''یہ حمزہ کی دلہن ہے؟''

''جی۔ آپ بیٹھیں بھابھی۔ ربیکا! بھابھی جان کے لیے چائے پانی......'' فاخرہ حمیدہ بیگم کے انداز سے گڑبڑا گئی تھیں۔

''نہیں، کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بس تم سے ملنے آئی ہوں۔'' حمیدہ بیگم کی بات سن کر ربیکا پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''تو آئیں اندر کمرے میں چلیں۔ یہاں تو تپش آنے لگی ہے۔'' فاخرہ حمیدہ بیگم کو اپنے کمرے میں لے آئیں۔

''پنکھا چلا دو، ہلکی اسپیڈ سے۔'' حمیدہ بیگم کہتے ہوئے آرام سے بیٹھ گئیں۔

''اچھا کیا بھابھی آپ آ گئیں۔ مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔'' فاخرہ پنکھا چلا کر ان کے پاس آ بیٹھیں۔

''ہاں۔ میرا تمہاری طرف دل لگا ہوا تھا۔ بیلا کا کیا رہا، کب آ رہا ہے شائمان لندن سے۔'' حمیدہ بیگم کو باتیں بنانی تو خوب آتی تھیں۔

''خیر سے پرسوں آ رہا ہے شائمان۔''

''اچھا پھر کیا طے پایا؟''

''آپ کے بغیر کیسے کچھ طے کر سکتی ہوں بھابھی بلکہ سب کچھ آپ ہی کو طے کرنا ہے۔ میں تو نصیبوں جلی......'' فاخرہ اچانک رو پڑیں۔

''ہائیں...... یہ کیا ہوا...... ارے فاخرہ! رو کیوں رہی ہو اور تم ہمیشہ صبر شکر کرنے والی آج نصیب سے شاکی کیسے ہو گئیں۔ چپ کرو، بتاؤ کیا بات ہے؟'' حمیدہ بیگم اسی کھوج میں تو آئی تھیں۔ فاخرہ کو تسلی دلاسے دینے کے ساتھ پوچھنے لگیں۔

"حمزہ نے کچھ کہا ہے یا کوئی اور پریشانی ہے، بتاؤ؟"

"کیا بتاؤں بھابھی! مجھے تو حمزہ نے تنگ کر مارا ہے۔" فاخرہ آنسو پونچھتے ہوئے رندھی آواز میں کہنے لگیں۔ "پہلے تو اپنی مرضی سے شادی کر کے دلہن لے آیا۔ اب یہ عالم ہے کہ اسے دیکھنا ہی نہیں چاہتا۔"

"کیوں۔ لڑکی بدزبان، بددماغ ہے کیا؟" حمیدہ بیگم نے فوراً پوچھا۔

"نہیں بھابھی! ماشاء اللہ پڑھی لکھی، بڑے گھر کی لڑکی ہے۔ تمیز، تہذیب والی ہے۔ نہ کسی کے لینے میں، نہ دینے میں۔ اپنے کمرے میں رہتی ہے۔ زیادہ بات بھی نہیں کرتی۔" فاخرہ اپنے تئیں ربیکا کی تعریف کر رہی تھیں کہ حمیدہ بیگم نے ٹوک دیا۔

"بس رہنے دو فاخرہ۔ یہ کوئی تعریف نہیں ہے۔ ابھی میں نے خود دیکھا، تمہارے پکارنے پر ذرا کی ذرا رکی، سلام کیا اور کمرے میں بند ہو گئی۔ اس کا تو یہ مطلب ہے کہ وہ یہاں کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی۔"

"اس لیے کہ حمزہ جو اس سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا بلکہ اب تو بات ہی نہیں کرتا پھر بتائیں وہ کیوں کسی کو خاطر میں لائے گی۔ سارا قصور حمزہ کا ہے۔ جب اپنی مرضی سے شادی کی تو نبھائے بھی۔ وہ تو یوں لگتا ہے جیسے اس سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔ اسے سمجھائیں بھابھی! میری تو وہ سنتا ہی نہیں۔" فاخرہ پھر رونے لگیں۔

"ہمم......" حمیدہ بیگم فاخرہ کی آنکھوں سے ایک تسلسل سے گرتے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

☆☆☆

شہرینہ کیونکہ اپنے کام سے کام رکھتی تھی، اس لیے اس نے پورچ میں کھڑی جہانداد کی گاڑی پر دھیان ہی نہیں دیا تھا اور سیدھی لیونگ روم میں بیٹھی، ماں کے پاس چلی آئی۔ خلاف معمول اسے دیکھ کر ماں کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں پھیلی تھی۔ اس کے برعکس بہت خاموش نظروں سے اسے دیکھا اور دیکھے چلی گئیں۔ شہرینہ کو گھبراہٹ ہونے لگی اور اندر سے کچھ خائف بھی ہو گئی تھی کہ شاید اب وہ چیخنا چلانا شروع کر دیں گی۔ اس لیے وہ خود سے کچھ کہنے یا بولنے سے ڈر رہی تھی۔

"تو تمہاری شادی ہو رہی ہے۔" کتنی دیر بعد ماں خود ہی بولیں۔

"جی......!" شہرینہ کا "جی" حیرت لیے ہوئے تھا۔ لیکن ماں اعتراف سمجھ کر کہنے لگیں۔

"مجھے جہاناں نے بتایا تھا، تم نے کیوں نہیں بتایا۔ میں نے کوئی تیاری بھی نہیں کی۔"

"یا اللہ! یہ پھر پٹڑی سے اتر گئیں۔" شہرینہ نے دل ہی دل میں دہائی دی۔

"ابھی کچھ دن ہیں ناں، میں خوب اچھی تیاری کر لوں گی۔ تمہارا سارا جہیز......" جہاداد کے آنے سے ان کی بات ادھوری رہ گئی۔

"ماں۔" جہانداد آتے ہی پکار کر جانے کیا کہنے جا رہے تھے کہ شہرینہ کو دیکھ کر نہ صرف خاموش ہوئے بلکہ حیران بھی کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ اب نہیں آئے گی۔ اور وہ کیوں نہ آتی، اس کا جہانداد کے ساتھ کوئی ایسا ناتا تو نہیں تھا جو حمزہ کے ساتھ دیکھ لیے جانے پر وہ ان سے نظریں چراتی یا چھپتی پھرتی۔ پورے اعتماد سے انہیں دیکھ کر سلام کیا تو چونک کر جواب کے ساتھ وہ پوچھ گئے۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں، البتہ آج......" اس نے آنکھوں سے ماں کی طرف اشارہ کیا کہ یہ ٹھیک نہیں لگ رہیں۔

"جی۔ میں اسی لیے آج آفس نہیں جا سکا۔" انہیں اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کا موقع مل گیا۔ یعنی جیسے شہرینہ ظاہر کر رہی تھی کہ حمزہ کے ساتھ دیکھ لیے جانے کا اس نے نوٹس نہیں لیا۔ نہ اسے کوئی فرق پڑا ہے تو انہیں بھی ایسا ہی ظاہر کرنا پڑا ورنہ

حقیقت یہ تھی کہ انہیں فرق پڑا تھا کیونکہ انہوں نے اس لڑکی کے لیے بہت کچھ سوچ لیا تھا کہ جب ماں ٹھیک ہو جائیں گی، تب وہ ان کے ساتھ اس کے گھر جائیں گے اور پھر اسے ہمیشہ کے لیے اس گھر میں لانے کی بات ہوگی۔

''اب تو میں آ گئی ہوں۔ آپ جا سکتے ہیں۔۔۔ آئی مین آفس یا پھر مجھے اجازت دیں۔'' شہرینہ نے سہولت سے کہا تھا۔ جہانداد کو لگا اسے ان کی موجودگی برداشت نہیں ہوتی یا وہ ان سے بھاگنا چاہ رہی تھی اور آفس میں تو وہ منع کر چکے تھے۔ فون پر منیجر کو ضروری کام بتا دیے تھے، اس لیے اس سے براہ راست جانے کو تو نہیں کہا۔ ماں پر بات ڈال دی۔

''آپ ماں سے پوچھ لیں۔''

''ٹھیک ہے آنٹی! میں پھر آؤں گی۔'' شہرینہ پوچھنے کے بجائے کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ گویا ایک طرح سے جتا دیا کہ میں آنے جانے کے لیے کسی کی پابند نہیں ہوں۔

☆☆☆

''ارے، تم کیسے آ گئیں۔ اکیلی آئی ہو یا امی بھی ساتھ ہیں؟'' شہرینہ کو دیکھ کر خزینہ کو خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہوئی۔

''کیوں، تمہیں میرے اکیلے آنے پر اعتراض ہے کیا؟'' شہرینہ نے ترخ کر ٹوکا تو خزینہ ہنستے ہوئے اپنے کان پکڑ کر کہنے لگی۔

''توبہ، میں کون ہوتی ہے اعتراض کرنے والی۔ ویسے امی کو بھی لے آتیں تو اچھا تھا۔''

''میں گھر سے نہیں آ رہی۔''

''پھر......؟''

''وہی جہانداد کے پاس گئی تھی۔ آج وہ خود گھر پر موجود تھے تو میں چلی آئی۔ اچھا نہیں لگتا ناں خزی! یوں بھی اب مجھے اکتاہٹ ہونے لگی ہے۔ سوچ رہی ہوں منع کر دوں کہ اب اپنی ماں کو خود ہی سنبھالیں۔'' وہ بولتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ خزینہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

''تمہارا دھیان کہاں ہے؟''

''ہنی...... ہنی کو دیکھ رہی ہوں۔ کہاں ہے؟''

''سو رہا ہے۔''

''تو اٹھاؤ ناں۔ میں اسی کے لیے تو آئی تھی۔'' شہرینہ کہہ کر اٹھنے لگی کہ خزینہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''خبردار، جو اسے اٹھایا تو...... اتنی مشکل سے سویا ہے۔ اب تو بہت تنگ کرنے لگا ہے۔ اپنی مرضی سے اٹھے گا تو پھر ذرا فریش ہوگا۔''

''اوہو۔ اب ہنی کی بھی مرضی ہے۔'' شہرینہ ہنسنے لگی۔

''اچھا، یہ بتاؤ امی کیسی ہیں؟''

''ٹھیک ہیں۔ جب سے تم نے انہیں یہ بتایا کہ ہنی کے دادا آنے جانے لگے ہیں تو انہیں تمہاری طرف سے بہت اطمینان ہو گیا ہے اور ہاں تمہیں خاص بات بتاؤں، کل حمزہ آیا تھا۔ امی سے بہت معافیاں مانگیں، رویا دھویا، گلے لگا اور شاید اب آتا جاتا رہے گا۔'' شہرینہ بہت نارمل انداز میں بتا رہی تھی۔

خزینہ اس کی ساری بات سن کر ''اچھا'' کہہ کر رہ گئی۔

''کیا اچھا۔ کچھ کہو گی نہیں...... میرا مطلب ہے، تم بتاؤ۔ تمہارا کیا خیال ہے حمزہ کو آنا چاہیے یا نہیں۔'' شہرینہ نے ٹوک کر پوچھا تو خزینہ کیونکہ اپنی ہی الجھنوں میں تھی، اس لیے تنگ پڑ کر بولی۔

”مجھے نہیں پتا۔“
”اور میرا خیال ہے اس میں کوئی برائی نہیں بلکہ اچھا ہی ہے کیونکہ ہمارے رشتے ٹوٹنے والے تو نہیں ہیں۔ خوشی غمی میں ہم ساتھ تو ہوں گے، ہیں ناں۔“ اس نے خزینہ سے تصدیق چاہی۔
”ہم......“ خزینہ نے بس سر ہلا دیا تو وہ چڑ گئی۔
”کیا ہو گیا ہے خزی تمہیں۔ اکیلی رہ رہ کر خبطی ہو گئی ہو یا کوئی اور بات ہے۔“
”اور بات......“ چونکنے کے ساتھ خزینہ کو خیال آیا کہ کہیں بے دھیانی میں وہ اپنی پریشانی نہ اگل دے، فوراً سنبھل کر کہنے لگی۔
”کوئی بات نہیں ہے یار! اصل میں صبح سے سر میں درد ہو رہا ہے۔ اس لیے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ٹھہرو پہلے میں چائے بنا لاؤں پھر تسلی سے بات کریں گے۔“ خزینہ اٹھنے لگی کہ اس نے روک دیا۔
”تمہارے سر میں درد ہے، بیٹھو آرام سے، چائے میں بنا لاتی ہوں۔ ویسے وہ تمہاری نجمہ خالہ کہاں ہیں؟“ اس نے کچن میں جاتے جاتے رک کر پوچھا۔
”وہ شاید پکانے کا سامان لانے گئی ہیں۔“ خزینہ بتا کر ہنی کو چیک کرنے کے لیے اٹھ گئی۔
شہرینہ چائے بنا رہی تھی کہ نجمہ خالہ سامان لے کر آ گئیں۔ ان سے چائے کا پوچھ کر شہرینہ نے تین کپ بنا لیے۔ ایک کپ انہیں دیا اور ان کی دعائیں لیتے ہوئے دو کپ ٹرے میں رکھ کر خزینہ کے پاس آ گئی۔
خزینہ فون پر بات کر رہی تھی۔ اس نے دھیان نہیں دیا۔ ٹرے اس کے سامنے رکھ کر ہنی کے پاس آ بیٹھی جو آنکھیں کھولے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔
”ہاں شاباش۔ اٹھ جاؤ۔“ وہ ہنی کا ہاتھ ہلا کر اسے ہوشیار کرنے لگی۔
”اٹھو بیٹا، آنکھیں کھولو۔ بستر چھوڑو اور منہ دھولو
اتنا سونا ٹھیک نہیں ہے، وقت کا کھونا ٹھیک نہیں ہے
”اٹھ جاؤ شاباش۔ پھر نانو کے پاس چلیں گے۔“
”ابھی کہیں نہیں جا رہے۔ شام میں چلیں گے۔“ خزینہ نے فون رکھ کر کہا تو وہ اسے دیکھ کر بولی۔
”میں امی کو بتا کر نہیں آئی۔“
”میں نے بتا دیا ہے۔ ابھی امی ہی سے بات کر رہی تھی اور وہ گھر پر نہیں ہیں، چچی جان کے ہاں گئی ہوئی ہیں۔“ خزینہ نے بتایا تو وہ اچھل پڑی۔
”ہیں...... کل حمزہ آیا اور آج امی وہاں پہنچ گئیں۔“

☆☆☆

جب حمیدہ بیگم نے فون کر کے بتا دیا کہ وہ گھر آ گئی ہیں، تب خزینہ اسے یعنی شہرینہ کو چھوڑنے آئی۔ ماں سے گلے مل کر بیٹھتے ہی پوچھنے لگی۔
”خیریت امی! آپ چچی جان کے ہاں گئی تھیں۔“
”ہاں کافی دنوں سے فاخرہ آئی نہیں پھر کل حمزہ آیا تو بہت پریشان لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا، فاخرہ کی خیر خیریت معلوم کر آؤں۔“
”پھر......میرا مطلب ہے چچی جان ٹھیک ہیں؟“ خزینہ نے فوراً پوچھا۔
”ہاں، اللہ کا شکر ہے۔ ٹھیک ہے۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔“ شہرینہ کی وجہ سے حمیدہ بیگم مثبت جواب دے رہی تھیں غالباً وہ اس کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

"چلیں امی! اچھا کیا آپ ہو آئیں، اسی طرح کسی دن میرے ہاں بھی آ جائیں۔" خزینہ نے کہا تو شہرینہ بول پڑی۔

"جی نہیں۔ امی اکیلی تمہارے ہاں نہیں جا سکتیں۔ اتنے فلائی اوورز بن گئے ہیں کہ راستوں کا پتا ہی نہیں چلتا۔ امی کبھی بھی نہیں پہنچ سکیں گی۔ کیوں امی؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہو اور اب تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو۔ جا کر رات کے کھانے کا کچھ کرو۔" حمیدہ بیگم نے اس کی تائید کے ساتھ کہا تو وہ پوچھنے لگی۔

"کیا بناؤں؟"

"دیکھ لو جا کر۔ بہن بھی آئی ہوئی ہے اور رات میں اس کا میاں آ سکتا ہے۔" حمیدہ بیگم نے کہا تو خزینہ فوراً بولی۔

"نہیں نہیں۔ ہمارے لیے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بس تھوڑی دیر میں چلی جاؤں گی۔"

"کیوں بیٹا۔ اتنے دنوں بعد آئی ہو۔ رات کے کھانے پر غزنی کو بھی یہیں بلا لو۔ میں فون کرتی ہوں اسے، منع نہیں کرے گا۔" حمیدہ بیگم کی بات نے خزینہ کو پریشان کر دیا۔

"غزنی یہاں نہیں ہیں امی! میرا مطلب ہے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔" وہ بمشکل بات بنا پائی تھی۔

"بس تو پھر تم آرام سے یہیں رہو۔ جب غزنی بھائی اسلام آباد سے آ جائیں تب جانا۔ امی روکیں اسے۔" شہرینہ کہہ کر کچن میں چلی گئی۔

"ہاں بیٹا! جب میاں آ جائے تب جانا۔ یا کوئی مسئلہ ہے؟" حمیدہ بیگم نے اس کی پریشانی محسوس کر کے پوچھا۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہے امی! میں اس لیے کہہ رہی ہوں یہ نبی اپنی جگہ کے علاوہ کہیں نہیں سوتا۔"

"فکر نہ کرو، شہرینہ سلا دے گی۔"

خزینہ خاموش ہو گئی تو کچھ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد حمیدہ بیگم اسے اپنے مزید قریب آنے کا اشارہ کر کے آواز دبا کر کہنے لگیں۔

"میں شہرینہ کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتی۔ ویسے اس نے تمہیں بتایا ہوگا کہ کل حمزہ آیا تھا۔ خود سے نہیں آیا تھا۔ شہرینہ لے کر آئی تھی۔ خیر کل جو بھی ہوا مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، جب ہی آج میں فاخرہ کے پاس چلی گئی تو ادھر کے حالات تو اور بھی عجیب ہیں۔"

"کیا مطلب...... کیا ہوا ہے؟" خزینہ جو عدم دلچسپی سے سن رہی تھی، ایک دم متوجہ ہوئی تھی۔

"حمزہ اور اس کی بیوی میں بنتی ہی نہیں ہے۔ فاخرہ بتا رہی تھی کہ حمزہ شروع دن سے اس سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا اور اب تو بالکل ہی بات نہیں کرتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ایسا کیوں ہے۔ اپنی مرضی، اپنی پسند سے شادی کر کے لایا ہے حمزہ۔ سب کی ناراضی مول لے کر پھر اب ایسا کیوں کر رہا ہے۔ کہیں حمزہ اور شہرینہ میں تو کوئی......" حمیدہ بیگم کی آخری ادھوری بات میں بہت کچھ تھا کہ خزینہ کتنی دیر سناٹے میں انہیں دیکھنے لگی۔ پھر الجھ کر بولی۔

"مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا امی! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے حمزہ ایسا کیسے کر سکتا ہے کہ اپنی مرضی کی بیوی لا کر پھر اس سے بات ہی نہ کرے۔"

"یہی بات تو میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہی۔" حمیدہ بیگم زور دے کر بولیں تو خزینہ کچھ سوچ کر پوچھنے لگی۔

"آپ کی حمزہ کی بیوی سے ملاقات ہوئی تھی؟"

"ہاں، ملاقات کیا بس کھڑے کھڑے اس نے سلام کیا پھر اپنے کمرے میں جو بند ہوئی تو میرے آنے تک نہیں نکلی تھی۔ اس پر بھی فاخرہ اس کی تعریف کر رہی تھی اور اپنے بیٹے کو برا کہہ رہی تھی۔"

"تو چھوڑیں امی! یہ اس گھر کا میٹر ہے، ہمیں اس میں انوالو نہیں ہونا چاہیے۔" خزینہ نے اکتا کر کہا تو حمیدہ بیگم تنبیہی انداز میں بولیں۔

"یہ بات تم اپنی بہن کو بھی سمجھاؤ۔"

"کیوں، شہرینہ کیا کہتی ہے؟"

"کہتی تو کچھ نہیں لیکن......" شہرینہ کو آتے دیکھ کر حمیدہ بیگم نے یک دم پینترا بدلا تھا۔ بات بدل کر اونچی آواز میں بولنے لگیں۔

☆☆☆

حمزہ نے جو ایک روٹین بنائی تھی کہ رات دیر سے گھر لوٹتا تھا تو آج جانے کیسے آفس سے سیدھا گھر آ گیا تھا اور کیونکہ ریکا کو مسلسل نظر انداز کر رہا تھا۔ دیکھا ہی نہیں تھا، وہ کہاں بیٹھی، کیا کر رہی ہے۔ ابھی بھی سیدھا واش روم میں بند ہو گیا پھر شاور لے کر جیسے ہی نکلا، بیلا آ کر پوچھنے لگی۔

"بھائی! کھانا لاؤں؟"

"تم لوگوں نے کھا لیا؟"

"جی۔ میں نے اور اماں نے کھا لیا ہے۔"

"اچھا پھر لے آؤ......" وہ کہہ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کھڑا ہوا اور برش اٹھا کر آئینے میں کمرے کا جائزہ لیا۔ ریکا کہیں نظر نہیں آئی تو بلا ارادہ پلٹ کر ادھر اُدھر دیکھا پھر برش کر کے بیڈ پر آ بیٹھا۔

بیلا فوراً ہی کھانا لے آئی اور ٹرے اس کے آگے رکھ کر خود سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"بھابھی تو میکے گئی ہیں۔" حمزہ نے بس سن لیا، کچھ بولا نہیں جس سے بیلا جز بز ہو کر رہ گئی۔ پھر بتانے سے باز نہیں آئی۔

"آج تائی جان آئی تھیں۔" حمزہ نے چونک کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کب؟"

"سویرے ہی آئی تھیں۔ میرا مطلب ہے میں اس وقت کالج میں تھی، واپس آئی تو تائی جان موجود تھیں۔ بہت دیر رکیں۔" بیلا نے بتایا تو وہ طنزیہ بولا۔

"تو تمہاری بھابھی اسی لیے میکے چلی گئیں۔"

"نہیں۔ وہ ملی تھیں تائی جان سے پھر ان کے جانے کے بعد ہی گئی تھیں۔" بیلا نے فوراً ریکا کی سائیڈ لی تھی۔

"اچھا، تائی جان کیا کہہ رہی تھیں؟" وہ جاننا چاہتا تھا کہ حمیدہ بیگم نے اس کے بارے میں کیا بتایا۔

"کچھ نہیں...... میرا مطلب ہے کوئی خاص بات تو نہیں کی انہوں نے۔ بس اماں کے ساتھ ادھر اُدھر کی باتوں میں لگی رہیں۔"

"میرا نہیں بتایا۔ میں کل ان سے ملنے گیا تھا۔" اسے خود ہی کہنا پڑا۔ بیلا خوش گوار حیرت میں گھر گئی۔

"سچ بھائی۔ آپ گئے تھے، لیکن تائی جان نے تو نہیں بتایا۔"

"بھول گئی ہوں گی۔" اس نے اطمینان سے ہو کر بے نیازی برتی لیکن بیلا کو ہضم نہیں ہوئی۔

"یہ کوئی بھولنے کی بات ہے بھائی! تائی جان کو سب سے پہلے یہی بتانا چاہیے تھا۔"

"اچھا جاؤ، میں جب تک کھانا کھالوں، تم چائے لے آؤ۔" وہ بیلا کو بھیج کر کھانے میں مصروف ہو گیا اور اسی حساب سے اس کا ذہن حمیدہ بیگم کی آمد کے بارے میں سوچنے میں مصروف تھا پھر ادھر وہ کھانے سے فارغ ہوا، ادھر بیلا چائے لے آئی۔

"یہ برتن لے جاؤ۔"

اس نے بیلا کو مزید بیٹھنے کا موقع نہیں دیا۔ ٹرے اسے تھما کر پیر پسار لیے، پھر چائے پیتے ہوئے وہ خود کو ریلیکس اور آزاد محسوس کرنے لگا کہ آج رات وہ سکون سے سوئے گا کیونکہ ربیکا کی موجودگی میں وہ خاصا بے چین رہتا تھا۔ پھر اس نے سوچا صبح وہ اماں کو بھی منا لے گا۔ پتا نہیں کیسے انہوں نے دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔ کیا ربیکا انہیں اتنی عزیز ہو گئی تھی کہ اس کی وجہ سے اس سے منہ موڑے ہوئی ہیں۔ اگر انہیں پتا چل جائے کہ ربیکا کس طرح اس کی زندگی میں داخل ہوئی ہے تو کیا تب بھی.....

وہ جانے کیا سوچنے جا رہا تھا کہ ایک دم سر جھٹک دیا اور چائے کا آخری گھونٹ لے کر کپ سائیڈ کارنر پر رکھا پھر لیٹتے ہوئے موبائل اٹھا لیا۔

دوپہر میں اس نے شہرینہ کو میسج کر کے پوچھا کہ اس کے جانے کا تائی جان نے برا تو نہیں مانا۔ پھر کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد وہ کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ اب یاد آیا تو وہ میسج چیک کرنے لگا تھا کہ ربیکا کا نام پہلے آ گیا۔ اس نے چونک کر ان باکس میں جا کر دیکھا۔ ربیکا نے لکھا تھا۔

"میں تمہارا گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ ڈیڈی کے گھر نہیں جاؤں گی۔ اس لیے میرے بارے میں ان سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"واٹ۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ دوبارہ سہ بارہ ربیکا کا میسج پڑھتے ہوئے اس کا دماغ گھوم گیا تھا اور وہ جو سوچ رہا تھا کہ آج سکون کی نیند سوئے گا تو نیند تو اڑی ہی سکون بھی غارت ہو گیا تھا۔

☆☆☆

شہرینہ نے لوریاں سنا سنا کر ہنی کو سلا ہی دیا۔ اس دوران خود اسے جماہیاں آنے لگی تھیں جبکہ خزینہ آرام سے لیٹی اپنے موبائل میں مصروف رہی۔

"شکر سو گیا تمہارا لاڈلا۔" شہرینہ ہنی کو خزینہ کے برابر سلا کر کہنے لگی۔

"اسے جھولے کی عادت ہے ناں تو یہاں بھی جھولا ہونا چاہیے۔ امی سے کہوں گی، لے آئیں گے اس کے لیے جھولا۔"

"امی سے کیوں کہو گی، میں لے آؤں گی۔" خزینہ کہتے ہوئے موبائل ایک طرف رکھ کر اٹھ بیٹھی۔

"اب تم کیوں اٹھ گئیں۔ ہنی سو گیا ہے، تم بھی سو جاؤ۔"

"اور تم......؟"

"ظاہر ہے میں بھی سوؤں گی۔" شہرینہ اپنا بستر جھاڑنے لگی۔

"جی نہیں۔ ابھی ہم باتیں کریں گے۔" خزینہ فوراً اتر کر اس کے بیڈ پر آ بیٹھی۔

"یا اللہ۔ اب کیا تمہیں بھی لوریاں سنانی پڑیں گی۔" شہرینہ زچ ہوئی۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ مجھے بھی بہت نیند آ رہی ہے۔ لیکن ضروری بات کرنی ہے جو کہ امی کے سامنے نہیں ہو سکتی۔" خزینہ نے کہا تو ضروری بات کا سن کر شہرینہ خاموش ہو رہی۔ پھر لائٹ آف کر کے زیرو پاور کا بلب آن کر کے پوچھنے لگی۔

"چائے بھی بنانی پڑے گی۔"

"نہیں رہنے دو، بس آ جاؤ۔" شہرینہ اچانک متجسس ہو کر اس کے پاس آ بیٹھی۔

"کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"ہے بھی اور نہیں بھی۔ بہرحال تم جذباتی مت ہونا، آرام سے سننا۔ آرام سے بولنا، سمجھیں......اور دیکھو، جھوٹ بالکل نہیں چلے گا۔" خزینہ جانے کیا اگلوانا چاہتی تھی، شہرینہ زچ ہوئی ہاتھ اٹھا کر بولی۔

''جو کہوں گی سچ کہوں گی، اب جلدی بولو کیا بات ہے۔''
''بات یہ ہے نہیں بلکہ پہلے یہ بتاؤ حمزہ کا کیا معاملہ ہے؟'' خزینہ نے اسے اپنی نظروں کی گرفت میں لے کر پوچھا تھا۔
''حمزہ کا معاملہ...... کیسا معاملہ؟'' شہرینہ نہ سمجھی اور الجھی بھی۔
''یہی کہ اس نے ربیکا سے شادی کیوں کی اور اب اسے چھوڑنا کیوں چاہتا ہے؟'' خزینہ نے کہا تو وہ اچھل پڑی۔
''ہیں...... یہ تم سے کس نے کہا کہ وہ ربیکا کو چھوڑنا چاہتا ہے؟''
''آج امی گئی تھیں ناں فاخرہ چچی کے پاس تو انہوں نے بتایا ہے اور یہ تو تم بھی جانتی ہو کہ فاخرہ چچی غلط بیانی نہیں کرتیں۔'' خزینہ بہت دھیرج سے بات کر رہی تھی اور شہرینہ اسی قدر الجھ گئی۔
''ہاں، لیکن کیوں۔ چچی جان نے یہ نہیں بتایا حمزہ اسے کیوں چھوڑنا چاہتا ہے۔''
''انہیں نہیں پتا۔ وہ بے حد پریشان تھیں۔ رو رہی تھیں اور امی کا خیال ہے تمہیں پتا ہوگا۔''
''مجھے......'' شہرینہ بری طرح سلگ کر ہائپر ہوگئی۔ ''مجھے کیسے پتا ہوگا۔ میں کیا وہاں رہتی ہوں۔''
''وہاں نہیں رہتیں لیکن حمزہ سے تمہارا ملنا جلنا تو ہے ناں...... اور یقیناً اس نے تمہیں بتایا ہوگا کہ وہ کیا کر رہا ہے کیا کرنے جا رہا ہے۔''
خزینہ کتنے یقین سے کہہ رہی تھی، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کیا کر ڈالے۔
''بس چپ ہو جاؤ خزی! کل اگر حمزہ میرے ساتھ گھر آ گیا تو اس سے تم لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ میرا اس سے ملنا جلنا ہے۔ کیوں...... میں کیوں ملوں گی اس سے...... ہاں یہ ضرور ہے کہ اتفاقاً کہیں سامنا ہو جائے تو میں اس سے منہ نہیں موڑ سکتی کیونکہ وہ میرا چچازاد ہے اور کچھ نہیں۔ سمجھیں۔'' بولتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔
آخر میں باقاعدہ رو پڑی تو خزینہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''پاگل ہوگئی ہو۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا جذباتی مت ہونا۔''
''بس چھوڑ دو۔ بات مت کرو مجھ سے۔'' وہ جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر آنسو پونچھنے لگی۔
''کیا ہو گیا ہے شہری! ابھی تو مجھے کتنی باتیں کرنی ہیں۔''
''مجھے کچھ نہیں سننا۔'' وہ بہت رنجیدہ تھی۔
''سوچ لو۔ ابھی میری نہیں سنو گی تو کل کو سب کی سننی پڑیں گی اور تب میں تمہارا دفاع بھی نہیں کر سکوں گی۔'' خزینہ سنگ دلی دکھانے پر مجبور تھی کیونکہ حمیدہ بیگم اور فاخرہ سے ہٹ کر اس نے سوچا تو اسے لگا جیسے حمزہ کی شادی کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوئی ہے اور اس میں شہرینہ بھی شامل ہے اور جب تک وہ اصل بات تک نہیں پہنچ جائے گی، الجھتی رہے گی۔
''کیا مطلب ہے تمہارا...... تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' شہرینہ نے تڑخ کر پوچھا تھا۔
''تم آرام سے سنو تو میں کہوں...... اور دیکھو میں صرف اپنی بات کروں گی یعنی جو کچھ میں نے دیکھا، محسوس کیا اور میں سمجھی...... لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو کچھ میں سمجھی ہوں اس پر اڑ بھی جاؤں۔ نہیں...... میں غلط بھی ہو سکتی ہوں۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم سے بات کر کے اپنی الجھن دور کروں۔ خواہ مخواہ الجھتی رہتی ہوں۔'' خزینہ مدد طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگی کہ وہی اسے الجھن سے نکال سکتی ہے۔
شہرینہ نے سر جھکا کر چند لمحوں میں بہت کچھ سوچ ڈالا پھر اسے دیکھ کر کہنے لگی۔
''میں تمہاری الجھن دور کر دیتی ہوں۔ لیکن وعدہ کرو تم......''
خزینہ نے فوراً اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر گویا وعدہ کیا۔ تب گہری سانس کھینچ کر شہرینہ گویا ہوئی۔

''تم سب یہی سوچتے ہوناں حمزہ نے اپنی بچپن کی محبت کیسے ٹھکرا دی تو اس نے ٹھکرائی نہیں۔ وہ مجبور ہو گیا تھا۔ ربیکا اس کے باس کی بیٹی ہے، زبردستی اس کے گلے پڑ گئی۔ جب حمزہ نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تو اس نے حمزہ کو اپنی ضد بنا لیا۔ وہ ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتی تھی اور اس کے لیے اس نے بیلا کو اغوا کر لیا تھا۔'' شہرینہ بولتی چلی جا رہی تھی۔

خزینہ سانس روکے سن رہی تھی۔

☆☆☆

وہ جو سکون سے سونا چاہتا تھا۔ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا پھر صبح ہوتے ہی خاصے جارحانہ انداز میں فاخرہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''اماں! ربیکا کہاں ہے؟''

''میکے گئی ہے۔'' تروٹھا جواب آیا۔

''آپ سے پوچھ کر گئی تھی؟''

''بتا کر گئی تھی۔'' فاخرہ نے غلط بیانی کی۔

''کیا بتایا تھا، کہاں جا رہی ہے؟'' اس کی تفتیش پر فاخرہ تیز ہو کر بولیں۔

''میکے اور کہاں......''

''وہ میکے نہیں گئی۔'' وہ بھی چیخ پڑا۔

بیلا کچن سے بھاگی آئی اور فاخرہ جو منہ موڑے جواب دے رہی تھیں، ایک دم اسے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

''پھر کہاں گئی ہے؟''

''مجھے کیا پتا...... مجھے تو نہیں بتایا تھا اس نے۔ آپ کو بتایا تو آپ کو پوچھنا چاہیے تھا۔ کہاں جا رہی ہو، کب تک آؤ گی۔ کیوں نہیں پوچھا آپ نے۔''

''کیونکہ بھابھی بتا کر ہی نہیں گئیں۔'' بیلا بول پڑی۔

''تم چپ رہو۔'' فاخرہ نے بیلا کو بری طرح گھر کا۔

''کیوں چپ رہوں اماں! آپ غلط بات کر کے بھائی کو طیش دلاتی ہیں۔ بھابھی بتا کر نہیں گئیں بھائی! اور وہ کبھی بھی بتا کر نہیں جاتیں۔ ہمیں تو بہت بعد میں پتا چلتا ہے کہ وہ گھر میں نہیں ہیں۔'' بیلا گھر میں کشیدگی کے ماحول سے تنگ آ گئی تھی، جب ہی پھٹ پڑی۔

''ہاں نہیں بتا کر جاتی اور کیوں بتا کر جائے۔ تم نے جو اسے اس کی مرضی پر چھوڑ رکھا ہے۔'' فاخرہ ابھی بھی حمزہ کو قصوروار ٹھہرا رہی تھیں۔ ''اور تمہیں کیسے پتا کہ وہ میکے نہیں گئی۔ اس کے باپ کو فون کر کے معلوم کرو، وہ وہیں ہوگی۔''

''وہ وہاں نہیں گئی اماں! اور میں اس کے باپ کو فون کر کے پوچھوں کہ ان کی بیٹی کہاں ہے؟ تاکہ وہ مجھے اندر کروا دیں۔'' وہ کسی طرح خود پر ضبط نہیں کر پا رہا تھا۔

''ایسے کیسے اندر کروا دیں گے۔ تم کرو فون......''

''بس آپ رہنے دیں اور خدا کے لیے اس کے باپ کے سامنے یہ مت کہہ دیجیے گا کہ یہ ساری غلطیاں میری ہیں۔ بیلا تم چائے لاؤ۔'' وہ پیر پٹختا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔

اس کا ذہن بری طرح چیخ رہا تھا۔ اس نے ٹائم دیکھا، ابھی صرف سات بجے تھے۔ آفس کے لیے تو وہ آٹھ بجے نکلتا تھا لیکن آج وہ آفس جانے کے قابل نہیں تھا۔ اس قدر ذہنی ٹینشن کے باعث وہ کوئی کام کیسے کر سکتا تھا لیکن وہ گھر میں بھی نہیں رکنا چاہتا تھا کیونکہ پتا تھا فاخرہ ہر دو منٹ بعد پوچھیں گی، ''کچھ پتا چلا۔ کہاں ہے دلہن اور وہ سارا دن ایسی باتیں سن سن کر پاگل ہو جاتا۔ اس لیے وہ یہ طے کیے بغیر کہ اسے کہاں جانا چاہیے، تیار ہو کر گھر سے نکل آیا۔

اسے اب کچھ نہیں سوچنا تھا کیونکہ رات ہی سوچ لیا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ اب بس وہ ریلیکس ہونا چاہتا تھا۔ وقت گزاری کے لیے وہ ایک ریسٹورنٹ میں آبیٹھا اور ناشتا آرڈر کر کے ٹی وی دیکھنے لگا۔ انڈیا پاکستان کا میچ آرہا تھا جس نے نہ صرف اس کا دھیان بٹا دیا بلکہ وقت گزرنے کا بھی پتا نہ چلا۔ ناشتا کرنے کے بعد بھی وہ کتنی دیر وہیں بیٹھا رہا تھا جب میچ میں وقفہ آیا تب یاد آیا کہ اسے اس وقت کہاں ہونا چاہیے تھا۔ فوراً بل پے کر کے وہاں سے نکل آیا اور بائیک اسٹارٹ کرتے ہی اسپیڈ سے بھگا دی۔

تقریباً بیس منٹ بعد وہ حسان صاحب کے آفس میں ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ ابتدائی علیک سلیک کے بعد حسان صاحب پوچھنے لگے۔

"کیسے آنا ہوا؟" جواب میں حمزہ نے جیب سے موبائل نکالا اور ربیکا کا میسج اسکرین پر لا کر موبائل ان کی طرف بڑھا دیا۔

احسان صاحب نے ناسمجھی کے عالم میں موبائل لیا اور چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد موبائل اسکرین پر نظر ڈالی تو پھر جیسے وہ نظریں اٹھانا بھول گئے۔ اس قدر خاموشی کہ گزرتے لمحوں کی آہٹیں بھی محسوس ہو رہی تھیں۔

کتنی دیر بعد انہیں متوجہ کرنے کی خاطر حمزہ کو ذرا سا کھانسنا پڑا۔ حسان صاحب نے پھر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا، اس کا موبائل ٹیبل پر رکھا کر اپنا موبائل اٹھایا اور ربیکا کا نمبر پش کر کے کان سے لگا لیا۔ غالباً اتنی دیر انہوں نے سوچنے میں گزار دی تھی، جب ہی ربیکا کی آواز سنتے ہی نارمل انداز میں بات کرنے لگے تھے۔

"کیسی ہو بیٹا۔"

"کافی دنوں سے تم آئی نہیں؟"

"اچھا ٹھیک ہے، پھر ایسا کرتا ہوں میں آج شام تمہاری طرف آجاتا ہوں۔ رات کا کھانا تمہارے ساتھ کھاؤں گا اور ہاں حمزہ سے کہنا جلدی آجائے گا۔"

"کیا؟"

"پھر کہاں ہو؟"

دوسری طرف سے ربیکا کی پوری بات سننے کے بعد انہوں نے بنا کچھ کہے فون بند کر دیا پھر حمزہ کو دیکھ کر بولے تھے۔

"میں ربیکا سے ملنے کے بعد تمہیں کال کروں گا۔"

☆☆☆

بیٹیاں یوں بھی خوار کرتی ہیں۔ یہ کبھی انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ ایک ایسے شخص کے سامنے جو کبھی ان کا ملازم تھا، خود کو کس قدر ہلکا محسوس کر رہے تھے۔ وہ حمزہ کے سامنے کتنی دقتوں سے خود کو نارمل پوز کر پائے تھے۔ اس کے جاتے ہی ان کا بی پی ہائی ہو گیا تھا لیکن انہوں نے پروا نہیں کی۔ اسی وقت ربیکا کے پاس جانے کا سوچ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

تقریباً بیس منٹ میں وہ ربیکا کے بنگلے پر پہنچے تو انہیں دیکھتے ہی چوکیدار نے سیلوٹ مار کر گیٹ کھول دیا۔ انہوں نے گاڑی اندر نہیں جانے دی' ڈرائیور کو وہیں رکنے کا کہہ کر خود اتر کر اندر آگئے۔

ربیکا لاؤنج میں ہی بیٹھی تھی۔ چائے کے ساتھ تیز میوزک سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ حسان صاحب نے ایک لحظہ رک کر اسے دیکھا پھر قدم بڑھا کر اس کے سامنے آئے تو وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ڈیڈی آپ......" حسان صاحب نے بلیٹ کرڈ نیک آف کیا پھر آ کر بیٹھ گئے تو وہ پوچھنے لگی۔

"آپ کے لیے چائے لاؤں یا سوفٹ ڈرنک۔"

"نہیں، بیٹھ جاؤ۔" ٹھہرا ہوا سرد لہجہ تھا۔ وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ممی کو بھی لے آتے۔"
"کیوں۔ اب تمہیں ممی کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔ تم تو کہتی تھیں مجھے ممی سے بات نہیں کرنی۔ یہ ہائپر ہو جاتی ہیں۔"
ان کے چبھتے ہوئے طنز پر وہ جزبز ہونے لگی۔
"بہرحال تمہارے گھر چھوڑ آنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم حمزہ کے ساتھ نباہ کرنے میں ناکام ہوگئی ہو۔ مان لو کہ تم ناکام ہوگئی ہو۔ اس لیے میرا خیال ہے اس رشتہ کو زبردستی گھسیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" انہوں نے کہا تو وہ چیخ کر بولی۔
"سوری ڈیڈی! یہ میرا اور حمزہ کا میٹر ہے۔" حسان صاحب کتنی دیر اسے دیکھتے رہے پھر ایک دم اٹھ کر چل پڑے۔
"ڈیڈی! میری بات سنیں۔" وہ پیچھے بھاگی لیکن حسان صاحب نہیں رکے۔ ڈرائیور سے گھر چلنے کا کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔
کتنے آرام سے ربیکا نے انہیں اپنے معاملے سے بے دخل کر دیا تھا۔ وہ اس وقت جب وہ صرف ان کی بیٹی تھی، اسے نہیں سمجھا سکے تھے تو اب کیسے حق جتا کر بات کر سکتے تھے۔ بہرحال ان کے دل پر کاری ضرب لگی تھی۔ گھر آ کر وہ پہلے مرحلے پر ہی ڈھے گئے۔ ملازمہ نے دیکھا تو بھاگ کر ثمرہ کو اطلاع دی۔ ثمرہ بھی بھاگی آئی تھیں۔
"کیا ہوا احسان! آپ ٹھیک تو ہیں۔"
انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے تسلی دی۔
"ڈاکٹر کو کال کروں؟"
"نہیں۔ ڈاکٹر کے پاس ہر درد کی دوا نہیں ہوتی۔ اب جو درد ملا ہے اس کی کوئی دوا نہیں۔" وہ صوفے کی بیک پر سر رکھے دکھ سے بول رہے تھے۔
"کیسا درد...... کیا ہوا ہے؟" ثمرہ ٹھٹکیں۔
"ایک بات بتاؤ ثمرہ! جب بیٹیاں بیاہ دی جاتی ہیں تو پھر ان پر ماں باپ کا کوئی حق نہیں رہتا۔"
"آپ......"
"میری بات کا جواب دو۔ بتاؤ اب ہمارا اپنی بیٹیوں پر کوئی حق نہیں۔" انہوں نے ثمرہ کو کچھ بھی کہنے سے روک کر پوچھا تو وہ ان کی طبیعت کے پیش نظر بولیں۔
"شاید نہیں۔"
"تو پھر میں حمزہ سے کہہ دوں کہ ہمارا ربیکا سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ اس کے ساتھ جو مرضی سلوک کرے، مارے پیٹے، گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ لے جائے اور بے شک، زنجیروں سے باندھ کر بٹھا دے...... ہمیں پوچھنے کا کوئی حق نہیں...... کیونکہ اب وہ ہماری بیٹی نہیں، اس کی بیوی ہے۔ صرف اس کی بیوی......" ان کے دکھ میں تلخی بھی شامل ہوگئی تھی۔
"یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں...... حمزہ ہماری بیٹی پر ایسا ظلم کرے اور ہم خاموش رہیں۔ ناممکن......"
ثمرہ آپے سے باہر ہونے لگیں۔ "آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں...... کیا حمزہ نے ایسا کچھ کیا ہے...... کہاں سے آ رہے ہیں آپ...... ربیکا کہاں ہے...... بتائیں......؟"
"ربیکا جہاں بھی ہے بہت آرام سے ہے۔ بے آرامی تو ہمارا مقدر ہوگئی ہے۔" انہوں نے کرب سے آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

UUNOVELS.COM

سالگرہ نمبر



مکمل ناول

صدف آصف

پیکر وفا

چلتی گاڑی کے شفاف شیشے سے باہر جھانکتے ہوئے وہ مسحور سارہ گیا، موسم بہار کے اوائل دنوں کی ایسی نوخیز تروتازہ، مسحور کر دینے والی شاموں کا بھلا وہ کہاں عادی تھا۔

"تھینکس ٹو پاپا۔ زبردستی ہی سہی مگر آپ کی وجہ سے پہلی بار ایسے حسین نظاروں سے لطف اٹھانے کا موقع ملا۔" اس نے گاڑی کی آگے والی سیٹ پر بیٹھے باپ کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

زندگی کے پیچ وخم سے الجھتے الجھتے اس نے پہلے کبھی فضاؤں کو یوں مہکتے ہوئے محسوس کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ وہ خودترسی کا شکار ہونے لگا۔

مزے کی بات تو یہ تھی کہ اس سے قبل وہ یہاں آنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں ہو رہا تھا، مجبوراً زیان عالم کو شہر کی بلند و بالا عمارتوں اور کثافت بھری دھوئیں دیتی فضاؤں سے دور ڈنڈا ڈولی کر کے لایا گیا۔

"زیان عالم کیا ہو گیا ہے تمہیں کس طرح سے اس بے وقوفانہ عمل کا حصہ بنتے چلے ہو۔ لڑکی دیکھنا۔ دکھانا۔" اس نے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر خود کو پھٹکارا۔

"ارے۔ وہ کوئی قربانی کا جانور تو ہے نہیں جو اسے بطور خاص دیکھا جائے۔" ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں سوچنے کے ساتھ ساتھ خاموشی سے موسم کی رعنائیوں کو اپنے اندر اتارتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لیں۔

شہباز عالم صاحب کی خواہش تھی کہ بیٹی کے بعد اب بیٹے کی شادی کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں مگر وہ شاید ماں کے خیالات کی وجہ سے شادی جیسے مقدس فریضے سے الرجک ہو گیا تھا۔

نور جہاں بیگم کو بھلا زیان کی کیوں فکر ہوتی، ان کی تو اپنی خواہشات کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ جب بڑے طمطراق کے ساتھ بہو ڈھونڈنے نکلیں تو لوگوں نے حیرت سے منہ میں انگلیاں داب لیں۔ یہ انوکھی ساس تھیں، جنہیں اکلوتے وجاہت کے پیکر پڑھے لکھے بیٹے کے لیے بدصورت بہو کی تلاش تھی۔

شہباز عالم تو بیوی کی باتوں پر حواس باختہ ہوئے جا رہے تھے، اسی فکر اور سوچ بچار میں کچھ دنوں قبل جب انہوں اپنے بچپن کے دوست سے فون پر باتیں کرتے ہوئے دل کا بوجھ ہلکا کیا تو کرم علی نے کچھ سوچ کر فوراً ہی شہباز کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے ڈالی اور بتایا کہ "وہ بھی اپنی بیٹی کے لیے کوئی اچھا رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں۔"

"کیوں نہیں اگر لڑکا لڑکی نے ایک دوسرے کو

دی۔

"ارے چھوڑو یار۔ میرے زیان کی سوچ منفرد ہے۔ اگر...... ایک بار اسے آئرہ پسند آ گئی تو میں خود اپنے بیٹے سے اس مسئلے پر بات کرلوں گا تم فکر نہ کرو......" دوست کو تسلی دینے کے بعد انہوں نے رخت سفر باندھا اور یوں اب وہ سب گاڑی میں لدے پھندے شہر سے دور اس سرسبز وادی میں لڑکی دیکھنے جا رہے تھے۔

☆☆☆

زیان کا ہاتھ سر کے نیچے دبا ہوا تھا اور دبے دبے سن ہونے لگا، اس نے زاویہ تبدیل کر کے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ شدید تھکاوٹ محسوس ہوئی اور وہ، اسی انداز میں بیٹھے بیٹھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

"اوف۔ یہاں تو بہت ٹھنڈ ہے۔" خنک ہوا کا بہت تیز جھونکا آیا اور اس کے ساتھ ہی پورا ماحول سرد ہو گیا تو زیان کے برابر میں بیٹھی افراح نے جھرجھری لی اور گرم شال اپنے گرد اچھے سے لپیٹ لی۔

"جی بیٹا۔ یہ کھلا علاقہ ہے نا سر شام ہی خنکی بڑھ جاتی ہے۔" شہباز عالم نے گردن موڑ کر بتایا۔

"شیشہ بند کر دیتا ہوں؟" میراب نے بیوی کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے پیار سے کہا اور بٹن کو ہلکے سے پش کیا۔ گاڑی کے شیشے خود بخود اوپر ہونا شروع ہو گئے۔

"سالا۔ کیسے مزے سے سو رہا ہے۔" میراب نے سکون سے سوتے ہوئے زیان عالم کی طرف عصیلی نگاہ ڈالی۔ اسی مصیبت کی جڑ کی وجہ سے تو وہ اپنا کام دھندہ چھوڑ کر اتنی دور آیا تھا۔ گھنے سیاہ بال ماتھے پر بکھرائے، بلیک جینز پر بلیو لائننگ والی شرٹ کی، آستین کو فولڈ کیے، کلائی پر چوڑی پٹے والی نفیس سی واچ پہنے وہ سوتے ہوئے بھی بہت اسمارٹ دکھائی دے رہا تھا، لمبے قد کی وجہ سے اسے سیٹ پر پاؤں موڑ کر بیٹھنے پڑے تھے۔

"کچھ بھی ہے...... ظالم سوتے میں بھی بڑا ہینڈسم لگتا ہے۔" میراب نے دل میں سوچا اور مسکرا دیا۔

ڈرائیور نے موڑ کاٹا تو گاڑی کو جھٹکا سا لگا اور اسی وجہ سے ایک دم اس کی نیند ٹوٹی تھی۔ زیان عالم نے چونک کر سیدھے ہوتے ہوئے مخمور نگاہوں سے باہر جھانکا۔ پہاڑی سے بہتا ہوا آبشار کا شفاف پانی پتھروں پر گرتے ہوئے فضاء میں ایک پر کیف ترنم بکھیر رہا تھا۔ قصبے میں پھیلی ہریالی سے معصوم بچوں کی طرح لطف اندوز ہوتے ہوئے، اس اجنبی قصبے کی خوشبو کو اپنے وجود میں محسوس کرنے لگا۔ سرسبز فطری ماحول نے مزاج پر ایک دم سے خوش گوار اثر ڈال دیا، وہ کھل کر مسکرایا گئی سالوں بعد جیسے اندر کی کلفتیں دھل گئیں۔

"شکر ہے بھائی کا موڈ تو ذرا بہتر ہوا۔" افراح نے برابر میں بیٹھے شوہر کے کان میں سرگوشی کی۔

"افراح ڈارلنگ دعا کرو۔ سالے صاحب کا یہ موڈ پورے ٹرپ میں خوش گوار ہے، مزاج یار کب بگڑ جائے خبر نہیں۔"

"میر...... منہ سے اچھی بات نکالتے ہیں۔" وہ غصہ ہوئی۔

"جو بندہ خود اپنا دشمن بنا ہوا ہو۔ اسے اچھی بری بات سے کیا فرق پڑتا ہے؟" میراب نے دانت نکال کر اسے گھورا۔

"مگر اللہ نے چاہا تو بھائی کو جس کی تلاش ہے اس بار وہ مل ہی جائے گی۔" وہ دعائیہ انداز میں بولی۔

"چلو سب مل کر بولو آمین۔ ورنہ آنٹی تو کسی چڑیل کو بہو بنا کر لانے والی ہیں۔"

میراب کی بات پر زیان نے برابر میں بیٹھے بہن، بہنوئی کو غصے میں گھورا، لمحے بھر کو گاڑی میں سہمی ہوئی خاموشی چھا گئی مگر شہباز عالم نے مڑ کر زور سے "ثم آمین" کہہ دیا تو سب ہنس پڑے۔

☆☆☆

میراب احمد اور زیان عالم بچپن کے دوست تھے جو وقت کے ساتھ ساتھ میراب کی محبت اور بے غرض خلوص کے ساتھ مضبوط ہوتی چلی گئی۔ اس نے ہمیشہ زیان کی اکھڑ مزاجی کو خندہ پیشانی سے سہا۔ وہ اس کے حالات سے واقف تھا اسی لیے دل میں پلتے ہر درد کو مٹانے کا خواہش مند تھا۔

اسی طرح زیان کی پرکھ کی کسوٹی پر بھی میراب ہمیشہ کھرا اترا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ جب اسے احساس ہوا کہ افراح اور میراب ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں تو اس نے روایتی انداز میں سوچنے کی جگہ ان دونوں کو ایک کرنے کی کوششوں پر کمر کس لی۔ گڑیا سی بہن کی خوشیوں کی خاطر وہ زندگی میں پہلی بار نور جہاں بیگم کے مقابل چٹان بن کر کھڑا ہوگیا۔ نور جہاں بیگم بہت پھڑکیں، ہاتھ پیر مارے مگر شہباز عالم کا ووٹ بینک بھی ان ہی کی طرف تھا۔ یوں ان تینوں کو ایک جگہ پا کر خود اکیلی پڑ گئیں، زیان نے دونوں کو شادی کے بندھن میں بندھوا کر ہی سکون کا سانس لیا۔

میراب دوست کی ہر جائز اور ناجائز باتوں میں ساتھ دیتا، زیان اپنی اکھڑ مزاجی کے باوجود خندہ پیشانی سے اس کی اچھی بری سن لیتا تھا۔ اتنی ہم آہنگی کے باوجود دونوں کا ٹکراؤ اس وقت ہوتا جب زیان کی شادی کا ذکر چلتا۔

''لڑکی کی شکل و صورت میری پہلی ترجیح نہیں مجھے تو اچھی نیچر والی ساتھی کی تلاش ہے۔'' زیان کی منطق نرالی تھی۔

''اچھا تو بیٹا یہ بتا لڑکی کو کس مشین میں ڈال کر اچھی سیرت چیک کی جاسکتی ہے؟'' میراب چڑ کر اسے گھونسا رسید کرتا۔

''نیت ثابت تو منزل آساں، دیکھنا مجھے ایک دن نیک دل اور اچھے خیالات کی حامل لڑکی ٹکرا ہی جائے گی۔'' وہ آنکھیں بند کر کے کہتا۔

''اچھا...... میرے باپ انکل کی بات مان لے اور چل کر ان کے دوست کی بیٹی کو دیکھ لے۔''

وہ کچھ دیر بعد افراح کے اشارے پر اسے منانے لگا۔

''ہاں بھائی۔ پلیز چلیں نا۔'' افراح نے بھی ہاتھ پاؤں جوڑے۔

''یار، سمجھنے کی کوشش کرو، میرے گھر کے پیچیدہ مسائل تم سے بہتر کون جانتا ہوگا۔ ممی کے ساتھ گزارا کرنے کے لیے ایسی لڑکی کی ضرورت ہوگی جو لفظ ''کمپرومائز'' کے معنی سے بخوبی واقف ہو۔ سوچو اگر وہ لڑکی بھی خوب صورت نکلی تو کیا ہوگا؟ جانے وہ کیوں اتنی احساس کمتری کا شکار ہیں کہ اپنے اردگرد خوب صورت لوگوں کو دیکھ کران کا دم گھٹنے لگتا ہے۔''

وہ دھیرے دھیرے بولتے ہوئے بہت اچھا لگا۔

''خاص کر مجھے دیکھ کر اب بھلا ان کے وہم و گمان میں بھی ہوگا کہ قسمت سے اتنا حسین و جمیل داماد مل جائے گا۔'' میراب کی اتراہٹ دیکھنے کے قابل تھی۔

''منہ دھو رکھیے جناب...... ممی کی بیٹی خوب صورتی میں کسی سے کم ہے کیا؟'' افراح نے بھی کمر پر ہاتھ رکھ کر جتایا تو تینوں کا قہقہہ گونجا۔

''دیکھ میرے بھائی چلا چل شاید اس بار تجھے سیرت اور صورت کی خوب صورتی ایک ساتھ مل جائے۔'' کچھ دیر بعد میراب نے پھر سے اصرار کیا۔

''اور وہ ممی...... ان کا کیا کروں؟'' اس نے نیم رضامندی سے پوچھا۔

''ان کو کچھ پتا ہی نہیں چلے گا۔'' اچانک شہباز عالم چھڑی لہراتے ہوئے بیٹی کے گھر میں انٹر ہوئے تو سب ان کی جانب متوجہ ہوگئے۔ ان کی تجویز پر سب کی ہنسی چھوٹ گئی، اب زیان کے پاس بھی کوئی اور بہانہ نہ رہا تو ساتھ چلنے کی حامی بھرنی پڑی۔ اور یوں نور جہاں کے بغیر یہ سفر شروع ہوا۔

☆☆☆

''ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے، یہ سرسبز وادی جناب کو بہت راس آ گئی ہے۔'' میراب نے نظاروں میں گم زیان کو دیکھتے ہوئے جملہ کسا۔

''فضول کی بکواس نہ کر۔'' اس نے منہ بگاڑ کر اسے دیکھا۔

''اس بار تو لگتا ہے تیرا کام بن ہی جائے گا۔'' میراب کہاں پیچھا چھوڑنے والا تھا۔

''کیا آپ بھی یہ ہی سوچ رہے ہیں؟'' افراح کی آنکھوں میں حیرت اتری اور شوق ابھرا۔

''تم بھی اس پاگل کے ساتھ مل کر شروع ہو گئیں۔ یار ابھی لڑکی سے ملا بھی نہیں ہوں۔'' زیان بہن پر جھلایا۔

''یہ ٹھیک ہے سب مجھے ہی بیسن میں پیاز کی طرح لپیٹنا۔'' میراب نے منہ پھلا کر کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

''بھائی اور کتنا دور ہے؟'' شہباز عالم جو پرانے دوست سے ملنے کو بے چین تھے تھوڑی دیر بعد ڈرائیور سے ایک ہی سوال پوچھتے۔

''بس صاحب۔ ہم پہنچنے والے ہیں۔'' ڈرائیور نے موڑ کاٹتے ہوئے مودب انداز میں اس بار خوش خبری سنا ہی دی۔

''زیان۔ میں نے تمہاری لڑکی سے اکیلے میں بات کرنے کی خواہش کرم علی تک پہنچا دی ہے۔ ان لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں۔''

''ویسے پاپا۔ یہ لڑکیوں سے اکیلے میں کیا بات کرتا ہے کہ ہر جگہ سے انکار ہو جاتا ہے۔'' میراب نے پرتجسس انداز میں پوچھنا چاہا مگر زیان کے گھورنے پر گاڑی سے باہر دیکھنے لگا۔

ڈرائیور نے عالیشان ''کرم ولاز'' کے سامنے گاڑی روکنے کے بعد ایک بار محتاط انداز میں ہارن بجایا۔ خان بابا جیسے انتظار ہی میں تھے سرعت سے بڑا سا براؤن آہنی گیٹ کھول دیا۔ ڈرائیور نے تیزی سے وسیع پورٹیکو میں بلیک مرسڈیز لے جا کر روک دی۔ ادب سے دروازہ کھولا۔ سب سے آخر میں زیان عالم اترا اور زوردار انگڑائی لی۔ سر اٹھایا تو نیلگوں آسمان پر سرمئی بادلوں کی اوٹ میں سورج سنہری گیند بنا چمک رہا تھا۔ سحرزدہ سا سماں تھا وہ بے خود سا دیکھتا چلا گیا۔ ایسے میں بھلا میراب کو کیسے چین آتا فوراً ہی کان میں سرگوشی کی۔

''ویسے یہاں تو ہر سو حسن بکھرا ہوا ہے، شاید میں نے شادی کرنے میں جلدی کر دی، ورنہ کوئی گوری مجھے بھی مل جاتی۔'' اس کے مذاق پر کسی کو ہنسی نہیں آئی۔

''میر...... اگر آپ کی فضول جگتیں ختم ہو گئی ہوں تو اندر چلیں۔'' افراح نے بیگ کاندھے پر لٹکاتے ہوئے شوہر کو گھورا تو زیان ہنس دیا۔

''ہاں تو میں نے کون سا تمہارے پیر پکڑ رکھے ہیں۔ چلو نا۔'' وہ تپ گیا اور تیزی سے راہداری میں قدم بڑھائے۔

زیان عالم نے سردی سے سرد پڑتے ہاتھوں کو جینز کی پاکٹ میں ڈالا اور ایک اچٹتی سی نگاہ کئی کنال پر پھیلے وسیع و عریض ''کرم ولاز'' پہ ڈالی اور سوچ میں پڑ گیا۔ اندر سے گھر بہت وسیع اور خوب صورت تھا، سفید ماربلز سے سجا راستہ قطار در قطار جلتے ہوئے بلبوں کی روشنی میں مزید نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ دیواروں پہ سجی کتنی ہی منی ایچر پینٹنگز آنکھوں کے سامنے لہرائیں۔ وہ متاثر ہو گیا۔ بڑی سی دیوار پر آویزاں شوخ رنگوں سے مرصع تصاویر، ساتھ ہی سفید پتھر سے تراشیدہ مجسمے لان کے داخلی دروازے کے دونوں طرف سجائے گئے تھے گھر والوں کے اعلا ذوق کو ظاہر کرتے ہوئے باقی سب کو بھی مرعوب کر گئے۔

''کافی پیسے والی پارٹی لگتی ہے۔'' میراب کی زبان میں ایک بار پھر کھجلی ہوئی۔

''شٹ اپ...... میر۔'' زیان عالم نے ناگواری سے بہنوئی کو جھاڑا۔

''بھائی اس بار پھر ایسی کوئی بات نہیں کر دینا جس کی وجہ سے لڑکی والے انکار کر دیں، مجھے تو یہ وادی پسند آئی ہے، آپ کا سسرال بن گیا تو ہم یہیں چھٹیاں گزارنے آئیں گے۔'' افراح کی بات پر اس کے چہرے کے تاثرات میں ناگواری گھل گئی۔

"تم جیسی عورتوں نے ہی لڑکوں کا دماغ خراب کرر کھا ہے۔" میراب نے طنز کیا۔
"یہ عورت کس کو کہا؟" وہ تپ گئی۔
"تم کو...... اور کس کو۔ اب سالے صاحب کو تو بول نہیں سکتا۔" میراب کے انداز پر زیان کی ہنسی نکل گئی۔
"تمہارے بڑے دانت نکل رہے ہیں۔ ایک بار شادی ہو جانے دو پھر پوچھوں گا۔"
"بھائی۔ آپ ان کو کچھ بولتے کیوں نہیں۔ ہر وقت میرا مذاق اڑاتے ہیں۔" افراح نے شوہر کو منہ چڑاتے ہوئے شکایت لگائی۔
"میں تو صرف ایک بات ہی کہوں گا۔ اللہ ملائی جوڑی ایک اندھا ایک کوڑھی۔" زیان کا انداز شرارتی ہوا۔
"کیا مطلب؟" وہ دونوں یک زبان ہو کر نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔
"مطلب...... یہ میرے بچوں کہ دونوں ایک چنے کی دو دال ہو۔ خاص طور پر ایک دوسرے پر طنز کرنے میں بالکل برابر ہو۔" اس کی با محاورہ زبان پر دادی اماں کی روح قبر میں پھڑک اٹھی۔
"انکل...... دیکھا۔ آپ کے دونوں بچے مل کر میری درگت بناتے ہیں۔" میراب نے سسر کی طرف شکایتی انداز میں دیکھا
"افراح! بری بات۔ میراب بہت اچھا لڑکا ہے۔" وہ متانت سے مسکراتے ہوئے بولے تو اس نے فرضی کالر اونچا کیا۔
"سر اس دروازے سے اندر چلیں۔" اس سے قبل کہ کوئی اور بات ہوتی، ملازم کے اشارے وہ لوگ بڑے ہال کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔
نوکر کی راہنمائی میں وہ سب آگے بڑھے۔ اس نے انہیں عالی شان ڈرائنگ روم تک پہنچا کر عزت و تکریم کے ساتھ بٹھا دیا اور مالکوں کو خبر کرنے اندر کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

"ہم تو گھڑی دیکھ دیکھ کر تھک چکے تھے کہ کب آپ لوگ یہاں پہنچیں اور ہمیں اپنے یار کا دیدار نصیب ہو۔" کرم علی کی محبتوں پر شہباز عالم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔
"بس بھائی شہر کی مصروفیت نے کہیں کا نہیں چھوڑا اور نہ میرا بس چلے تو روز آ جاؤں۔" شہباز نے سرد آہ بھری۔
"کیوں نہیں۔ جم جم آؤ۔" وہ صوفے پر دوست کے مقابل بیٹھتے ہوئے خوش دلی سے بولے۔
صحت مند گوری چٹی بیگم فضاء کرم اندر داخل ہوئیں اور سب سے فرداً فرداً بڑی خوش دلی سے ملیں اور فوراً ہی ملازموں کو اشارہ کیا جنہوں نے منٹوں سیکنڈوں میں پر تکلف چائے ناشتے کا انتظام کر دیا۔
"بھابھی کو بھی لے آتے تو اچھا لگتا۔" فضاء کرم کے پوچھنے پر لمحے بھر کو روم میں سناٹا چھا گیا۔
"وہ۔۔اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ بس اس لیے۔ اللہ کی مرضی ہوئی تو وہ بھی آئے گی ضرور۔" ٹشو سے ماتھے پر آیا پسینہ پونچھتے ہوئے شہباز صاحب نے دبی دبی آواز میں جواب دیا۔ کچھ دیر کے لیے جیسے ماحول ان دیکھے سناٹے کی نذر ہو گیا۔ زیان کے چہرے کے عضلات تن سے گئے۔
"کوئی بات نہیں۔ ان شاء اللہ ابھی تو بہت موقع آئیں گے۔" کرم علی انجان نہ تھے، مسکرا کر بات بدلی۔
"پاپا۔ انکل سے آرہ کو بلانے کا بولیں نا۔" افراح نے جلدی سے کافی ختم کی اور باپ کے کان میں سرگوشی کی۔
"جی۔ بٹیا پریشان نہ ہوں، وہ آرہی ہیں۔" مسز فضاء کرم کے شفقت بھرے انداز اور اپنی جلد بازی پر افراح شرمندہ سی ہو گئی۔
"یہ لڑکی بھی نا۔" زیان نے بہن کے بے صبرے پن کو تنبیہی انداز میں گھورا تو افراح منہ

لٹکائے فرش پر نگاہیں جما کر بیٹھ گئی۔
آئرہ علی ماں کی سنگت میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو گویا چہار سو اجالا سا بکھر گیا۔ افراح نے مبہوت انداز میں سر وقد لڑکی کو اندر آتے ہوئے دیکھے، جس کی خوب صورتی میں واقعی کوئی کلام نہیں تھا۔ نیم سنہرے دوپٹے کے ہالے میں مہک اٹھا سے بھرا گلابی چہرہ، کٹیلے نقوش، بڑی بڑی جگنو آنکھیں، جس میں روشنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، سیاہ گھنے بالوں کی لٹیں دوپٹے سے نکل نکل کر دیکھنے والی آنکھ پر قیامت ڈھا رہی تھیں۔ سرخ کرتی پر سفید گھیر دار شلوار، جس پر طلائی رنگ سے بنائے نقش و نگار بہت جچ رہے تھے۔
''شکر ہے ساسو ماں نہیں آئیں، ورنہ جل بھن کر پہلی فرصت میں انکار کر دیتیں۔'' میراب نے آئرہ پر پسندیدگی کی نگاہ ڈالتے ہوئے دل میں سوچا۔
''میری طرف سے تو اوکے ہے۔'' افراح نے بھائی کے کان میں سرگوشی کی اس کے چہرے پر جوش و خوشی کے ملے جلے جذبات ابھرے
''بھائی۔ بولیں نا۔ کیسی لگی؟'' اس نے جواب نہ ملنے پر ٹہوکا دیا، مگر زیان آئرہ سے زیادہ کانی کی طرف متوجہ تھا۔
''صاحب بہادر کے نخرے ہی کم نہیں ہوتے۔ ایسی حرکتوں کی وجہ سے ہر جگہ سے انکار ہوتا ہے۔'' میراب ان دونوں کو دیکھتے ہوئے جل بھن کر بڑبڑایا۔ مگر وہاں پروا کس کو تھی۔ ایسے سب پر سپ لیے جا رہے تھے، جیسے زندگی میں میں پہلی بار کافی چکھی ہو۔
آئرہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی کن انکھیوں سے زیان کی طرف دوبارہ دیکھا...... بڑوں کی باتوں پر بڑے باوقار انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی مردانہ وجاہت متاثر کن تھی۔ ایک بار نگاہوں کا ٹکراؤ ہوا تو آئرہ کے چہرے پر خون ابل آیا۔ گلابی رنگت شرم سے سرخ پڑ گئی۔

''چلو بھئی یہ باتیں تو چلتی رہیں گی لیکن اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو......'' شہباز عالم کچھ بولتے ہوئے جھجک گئے۔
''آں۔ کیوں نہیں۔'' کرم علی سمجھ گئے، بیگم کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا۔
''آئرہ۔ بیٹا۔ آپ دونوں باہر لان میں بیٹھیں، میں گرم چائے بھجواتی ہوں۔'' مسز فضاء کرم نے مسکرا کر اشارہ کیا۔
''جی۔ مما......'' اس نے دھیرے سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
''جاؤ بیٹا...... اور سنو اس بار پلیز کوئی گڑبڑ نہیں کرنا۔'' شہباز نے بظاہر خوش دلی سے بیٹے کی طرف دیکھا اور کان میں سرگوشی کی۔
ایک طویل سانس بھرتے ہوئے زیان اٹھ کھڑا ہوا اور آئرہ کی تقلید میں پیچھے چل پڑا۔
''دونوں ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہوئے کتنے اچھے لگ رہے ہیں نا۔۔ میر۔'' افراح کچھ زیادہ ہی خوش گماں تھی، شوہر کو اشارہ کیا۔
''یہ جلد بازی کی باتیں نہیں ہیں کیا؟'' اس نے بیوی کو گھورا۔
زندگی کی ناہمواریوں کی وجہ سے تو یہ شخص اتنا منفی ہو گیا ہے کہ خوشیوں سے ڈر جاتا ہے۔ میراب نے خالی نگاہوں سے ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔

☆☆☆

ملگجا سا اندھیرا شام ڈھلنے سے پہلے لان کے گرد آ کھڑا ہوا، اس کے دل میں ٹھنڈی پیلی اداسی ہویدا ہونے لگی۔ وہی مانوس اداسی جو بچپن سے اس کے دل کو قبضے میں لیے ہوئے تھی، ڈھیروں ڈھیر ایورگرین پلانٹس اور مختلف اقسام کے پھولوں کے پودوں کے درمیان معلق سی ہو گئی، زیان نے سر جھٹکا اور اپنی کیفیت سے باہر آنے کی کوشش کی۔
''پلیز...... بیٹھیں نا۔'' اس کی مہین سی آواز اور اپنائیت بھرا لہجہ کانوں میں یوں سرسرایا کہ بند مٹھی

میں تارہ کسمسایا۔

"نائس گارڈن۔" زیان نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا، بات شروع کرنے کو کچھ تو کہنا تھا۔

"تھینک یو۔ یہ سب ہماری اور مالی بابا کی محنت کا نتیجہ ہے۔" وہ بے ساختہ خوش ہو کر بولی۔

"گڈ۔" کچھ دیر کے لیے پھر سے خاموشی چھا گئی، آرزہ سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔

"آرزہ آپ کو عجیب نہیں لگتا یوں طویل زندگی گزارنے کے لیے، پانچ منٹ میں بیٹھ کر فیصلہ کرنا۔"

"جی۔ کیا مطلب؟" آرزہ نے نا سمجھنے والے انداز میں پلکیں جھپکائیں۔

"یہ جو مختصر سا ٹائم ملا ہے، کیا اس میں کسی کو پرکھا جا سکتا ہے؟" اس نے دلکشی سے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ہونہہ۔ مگر ضروری تو نہیں کہ ہماری طرف سے ہاں ہی ہو۔" آرزہ کا اعتماد بحال ہوا تو اس نے بھی شرارت کی۔

"ایگری..... تو پھر اندر واپس چلیں؟" وہ اپنے جون میں واپس آیا اور خشک لہجے میں بولا۔

"سوری۔ ہمارا وہ مطلب نہیں تھا۔" طویل خاموشی کو توڑتے ہوئے اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

"اپنے بارے میں بتاتے ہوئے، ہم ایک دوسرے سے غلط بیانی نہیں کریں گے۔" زیان نے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں ہمیں جھوٹ بولنا پسند نہیں۔" وہ بھی تھوڑا اوور ہوئی۔

"مجھے بھی سچ پر ہی یقین ہے۔" وہ بولتے ہوئے بالکل نہیں جھجکا حالانکہ اس کا الٹ کرنے جا رہا تھا۔

"تو چلیں۔ اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟" زیان کی سوالیہ نگاہیں اس کی طرف اٹھیں۔

"نہیں۔ پہلے آپ۔" آرزہ کے لبوں کے ساتھ آنکھیں بھی مسکرائیں۔

"پہلے آپ—— پہلے آپ کے چکر میں کہیں یہ وقت نہ گزر جائے تو مابدولت ہی اپنا تعارف پیش کرتے ہیں ویسے تو انکل سے آپ کو میرے بارے میں ساری انفارمیشن مل گئی ہوں گی نا؟" اس نے کنفرم کرنا چاہا کہ کہیں پھنس نہ جائے۔

"نہیں۔ زیان صاحب۔ ہمارا گھرانہ کافی روایتی سا ہے تو ہم نے ماما پاپا سے اس حوالے سے کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی انہوں نے۔ کچھ بتایا۔ اب یہ نہیں بولیے کہ اکیلے میں یہ ملاقات تو جناب اس کی وجہ انکل کا اصرار اور پاپا کی پرانی دوستی ہے۔" آرزہ نے رسیلے لہجے میں کانوں میں رس گھولا۔

"اوکے۔ سمجھ گیا۔ ویسے میں زیان عالم گھر کا واحد کفیل سو ماسٹرز کرتے ہی جاب پر لگ گیا تھا۔"

"گڈ۔ میں آرزہ علی۔ لندن سے ماسٹرز کیا ہے۔ اب یہاں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کر رہی ہوں۔" اس نے بھی سادگی سے بتایا۔

"واؤ۔ گریٹ۔ مجھے بھی باہر جا کر پڑھنے کا شوق تھا مگر حالات۔" اس نے ہونٹوں کو دباتے ہوئے ہمدردی حاصل کرنا چاہی۔

"کیوں—— ایسا کیا ہو گیا؟" آرزہ کے لہجے میں تجسس در آیا۔

"میرا تعلق مڈل کلاس گھرانے سے ہے جہاں اگر ضرورت سے بہت زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ مگر باہر جا کر پڑھنا عیاشی کے زمرے میں آتا ہے سو نہیں پڑھ سکا۔" اس نے آرزہ کے تاثرات کو جانچتے ہوئے مظلوم چہرہ بنایا۔

"اوہ۔ اچھا۔ مگر شاید انکل کا تو اپنا بزنس تھا۔" وہ کچھ کنفیوز ہوئی۔

"جی۔ ان کا چھوٹا سا بزنس تھا۔ مگر مسلسل نقصان کی وجہ سے گھاٹے میں چلا گیا۔"

"اوہ۔ سیڈ۔ مگر شکر کریں۔ آپ کو جاب مل گئی۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ہاں مگر پچھلے مہینے وہاں سے بھی جواب مل گیا، اب دوبارہ سے نوکری کی تلاش میں مارا مارا

پھر رہا ہوں۔'' اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے غم زدہ دکھائی دینے کی سرتوڑ کوشش کی۔

''اوہ۔ پریشان نہ ہوں۔ اوپر والا سب ٹھیک کر دے گا۔'' آئرہ کا تسلی دینا انداز اتنا سادہ اور پیارا تھا کہ زیان لمبے بھر کو اس کی گرتی اٹھتی پلکوں میں الجھ کر رہ گیا مزید غلط بیانی کرنا مشکل ہونے لگا۔

''آپ کیا ایسے لڑکے کے ساتھ گزارا کر لیں گی، جس کا اپنا مستقبل محفوظ نہیں؟'' اس کی بات پر وہ خاموش ہو گئی۔

''اب یہ دوسری لڑکیوں کی طرح اٹھ کر چلی جائے گی اور یہاں سے بھی انکار ہو جائے گا۔'' اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے طنزیہ انداز میں دیکھا۔

''کاش یہ دوسروں جیسی نہ ہو۔'' اس نے پہلی بار کسی کے لیے دل سے دعا مانگی۔ آئرہ کسی سوچ میں گم، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں پر تیزی سے پلکیں جھپکاتی ہوئی اچانک اٹھ کھڑی ہوئی اور اندر کی جانب چل دی۔

''چلو۔ یہ بھی گئی۔'' کسی نے جیسے اس کا دل مٹھی میں جکڑا۔ اتنے میں جینز کی پاکٹ میں رکھے، موبائل کی میسج ٹون بجی۔

''میراب کو بھی چین نہیں۔'' زیان نے نہ چاہتے ہوئے سیل فون نکالا اور بے دلی سے پیغام پڑھا۔

''کیپ اٹ اپ۔ اس بار جیت تیرا مقدر بنے گی۔'' میراب نے فنی فیس کے ساتھ پیغام بھیجا تھا۔

''ہارنے پر جیتنے کی نوید ملنا۔ آہ...... کتنا دشوار ہوگا سب کو فیس کرنا۔''

شام ڈھلنے کو تھی وہ شکست خوردہ کیفیت سے لڑتے ہوئے اندر جانے کا سوچ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ اچانک اس نے، دیکھا گھر کا ملازم ٹرالی گھسیٹتا ہوا مودب انداز میں اسی کی طرف آرہا تھا۔

☆☆☆

نور جہاں بیگم اپنے گھر کے کچن میں کھڑی چائے بناتے ہوئے موبائل فون کان اور کندھے کے بیچ میں اٹکائے ہوئے باتوں میں مشغول تھیں۔

دوسری طرف کی بات سننے کے بعد جیسے ان کے چہرے پہ شادمانی کی لہر سی دوڑ گئی۔

''بس تم سمجھو میری برسوں پرانی خواہش پوری ہونے کا وقت آگیا ہے۔'' وہ پرجوش لہجے میں بولیں۔

''آئے زیان۔ کرتا کیا ہے۔ لو بتایا تو تھا۔ ایک باہر کی کمپنی میں بہت بڑے عہدے پر فائز ہے۔ تنخواہ بھی بہت زیادہ ہے۔ ماشااللہ باہر سے وہ کیا کہتے ہیں ایم بی اے کیا ہے۔'' لہجے میں اتراہٹ آئی۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔ میں کل ہی زیان کی کوئی تصویر تمہیں بھجواتی ہوں۔'' وہ چولہے کی آنچ ہلکی کرتے ہوئے بولیں۔

''بس۔ ایک بات کا دھیان رکھنا، میرے کوئی دو چار لڑکے تو ہیں نہیں، اس گھر میں بہو بھی ایک ہی آئے گی، تو لڑکی ایسی دکھانا کہ پورا گھر بھر دے۔'' وہ دوسری جانب کی بات سننے کے بعد پرسوچ انداز میں بولیں۔

''آئے نہیں۔ شکل کی تو کالی کلوٹی بھی چلے گی بلکہ میں تو کہتی ہوں کسی امیر گھر کی بدصورت لڑکی ڈھونڈ نکالو، اپنی بیٹی کا عیب چھپانے کے لیے وہ منہ مانگا جہیز تو دیں گے۔'' نور جہاں لہک لہک کر بولیں مگر دوسری جانب کی بات سن کر ایک دم تیور بدلے۔

''ہائے۔ جہیز کیوں نہیں لوں گی۔ اس دن کے لیے تھوڑی پڑھایا لکھایا اور اس قابل بنایا کہ کنگلوں میں بیاہ دوں۔'' نور جہاں کے لالچی پن پر بتول نے موبائل کس کر تھاما اور دانت کچکچائے۔

''نہیں بی بی۔ ان لوگوں کو کل نہیں لانا۔ ابھی میں گھر میں اکیلی ہوں۔ باقی لوگ چند دنوں کے لیے پہاڑوں پر گھومنے گئے ہیں۔'' وہ کچھ منہ بنا کر بولیں۔

''ہائے۔ مجھے کیوں چھوڑ کر جاتے، سو بار ساتھ چلنے کی ضد کی افراح کے پاپا نے، مگر مشکل یہ ہے کہ مجھے اونچائی سے خوف آتا ہے گاڑی جیسے ہی اونچائی کی طرف جاتی ہے متلی اور چکر آنے لگتے ہیں، بس اسی لیے ساتھ نہیں گئی۔ منع کردیا۔'' بتول کے کریدنے پر نور جہاں نے عادت کے مطابق تفصیل بتائی۔

''ہاں۔ ٹھیک ہے جیسے ہی زیان اور میری بیٹی داماد واپس آتے ہیں۔ میں لڑکی والوں کو مدعو کروں گی۔ بس خیال رکھنا لڑکی شکل وصورت کی بھلا ہی ہو، مگر لوگ بہت پیسے والے ہوں۔۔ جہیز میں ایک کٹھی تو ضرور دیں اور ہاں شادی کے موقع پر شگن کے طور پر ساس کو سونے کے کڑے بھی چڑھائیں۔'' ان کا فرمائشی پروگرام جاری تھا۔ بتول دل ہی دل میں انہیں گالیوں سے نوازتے ہوئے زبانی مسکہ لگاتی رہی۔

''چلو۔ ٹھیک ہے۔'' بتول کی یقین دہانی پر نور جہاں نے ہنستے ہوئے لائن کاٹ دی۔

''توبہ ہے۔ بڑی ہی مکار بی بی ہیں۔ بیٹے کو بیاھنا نہیں بیچنا چاہتی ہیں۔ ان کو تو اخبار میں اشتہار دے دینا چاہیے کہ ''دلہا بکتا ہے۔''

بتول نے غصے سے موبائل میں جھانک کر لعنت بھیجی۔ اس نے کئی گھرانوں کے رشتے لگائے تھے مگر نور جہاں جیسی لالچی اور تیز طرار عورت سے اس کا واسطہ پہلی بار پڑا تھا۔ بڑبڑاتے ہوئے موبائل صاف کر کے پرس میں ٹھونسا اور برقعہ پہن کر باہر کی طرف چل دی۔

☆☆☆

آئرہ اپنا لمبا دوپٹا گھسیٹتی ہوئی ملازم کے پیچھے ہی باہر آئی تو وہ واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تو محترمہ چائے کا انتظام کرنے گئی تھیں۔''

اس نے اپنے اندر ایک اطمینان اترتے محسوس کیا۔

''چینی کتنی؟'' وہ بڑے اعتماد سے اس کے مقابل آ کر بیٹھی اور ملازم کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے چائے بنانے لگی۔

''ایک چمچہ۔'' زیان عالم نے جواب دیا۔ مقابل بیٹھی لڑکی کے لیے دل میں نغمگی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ کچھ تو الگ سا تھا آئرہ کے حسن کی دل فریبی میں کہ پہلی بار من میں محبوبیت سی پیدا ہونے لگی۔

''کیا یہ ہی میری رائٹ چوائس ہوگی؟''

خوشبودار چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے اس نے نگاہ چرانا چاہی مگر ہوا کے جھونکے نے سنہری آنچل کو سر سے گرا دیا تھا۔ وہ مبہوت سا سیاہ ریشم کے لچھے جیسی لمبی سی چٹیا کو تکتا رہ گیا۔

''کسی کے بال اتنے لمبے اور حسین بھی ہو سکتے ہیں۔'' پہلی بار صنف نازک کی خوب صورتی نے اس کا دل موہ لیا۔

''اور کیا پوچھا پوچھی ہوتی ہے؟'' آئرہ نے اس کی نگاہوں کے ارتکاز سے گھبرا کر کہا۔

''آئرہ۔ آپ جاب کے علاوہ کیا کرتی ہیں؟'' اسے بھی اپنی بے خودی پر غصہ آیا تو سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہم آرٹسٹ ہیں، پینٹنگز بناتے ہیں۔'' انگلی میں پہنی رنگ گھماتے ہوئے بولی۔

''اوہ......کول.......اس کا مطلب ہے وہ جو باہر تصاویر سجی ہوئی ہیں۔ وہ آپ کے اعلا ذوق کی نشانی ہیں؟'' اسے سچ مچ خوشی ہوئی۔

''آپ کو کیسے پتا چلا؟'' اس کی آنکھوں میں حیرت اتری اور شوق سے پوچھا۔

''آتے ہوئے دیکھا تھا نا۔'' وہ مسکرایا۔

''جی۔ اس میں سے کچھ ہم نے بنائی ہیں اور کچھ مختلف ایگزیبیشن سے خرید کر لائے تھے۔''

''واؤ۔ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ میرے سامنے اتنی بڑی آرٹسٹ بیٹھی ہے۔'' اس کا سراہنے والا انداز آئرہ کو اچھا لگا۔

''اب کہاں کے آرٹسٹ ہیں۔ جاب نے اتنا بزی کر دیا ہے کہ کسی اور جوگا چھوڑا نہیں مگر جب بھی

کوئی حسین منظر دکھائی دیتا ہے تو دل چاہتا ہے کہ دفتر کی روٹین چھوڑ چھاڑ کر اسی اینگل پر بیٹھ جائیں اور ایزل سیٹ کرتے ہوئے منظر کو من پسند رنگوں سے مرصع کر کے اپنے پاس تصویر کی شکل میں مقید کر لیں۔ یا بھی کبھی ہمارے ہاتھ اپنے ٹولز اٹھانے کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں پتھروں کو تراش خراش کر ایک خاص شکل میں ڈھالنے کا بھی اپنا ہی مزا ہے۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولتی ہوئی اس کے دل میں اترتی چلی گئی۔

"اوہ۔ تو کیا آپ نے تصویریں بنانا چھوڑ دیں؟" اسے افسوس ہوا۔

"جب سے کارپوریٹ سیکٹر میں شامل ہوئے ہیں لگتا ہے پیسہ کمانا ہی اصل ہنر ہے، کام کرنے کی مشین بن گئے ہیں۔ حالاں کہ پہلے ہم سمجھتے تھے کہ ایک دن بھی پینٹنگ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، یہ فن ہمارے احساسات کی ترجمانی کرتا تھا، ہمیں جو منظر بھاتا، وہ اپنی مہارت کے ساتھ کینوس پر پینٹ کرتے چلے جاتے...... مگر اب تو...... یہ سب باتیں خواب ہو گئی ہیں۔" اس نے اداسی سے زیان کی جانب یوں دیکھا کہ اس کا من پگھلنے لگا۔

نہیں۔ میں اس خواب کو میں حقیقت کا روپ دوں گا۔ ایک فیصلے پر پہنچ کر زیان عالم نے جاندار انداز میں مسکراتے ہوئے سوچا۔

"آپ بھی ہمیں پاگل سمجھ کر مسکرا رہے ہیں۔"

آئرہ نے ناراضی سے ہونٹوں کو پھیلا کر سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں...... بالکل نہیں۔" اُس کے دیکھنے کے انداز میں ایک خاص تاثر نمایاں تھا اپنائیت بھری محبت و حلاوت کا...... چاہت کی چاشنی اور اپنا پن......

آئرہ علی کے دل کو ایک بار پھر کچھ ہوا۔ نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔

☆☆☆

رات کا آخری پہر ختم ہو چکا تھا صبح کی سپیدی اور پاکیزگی چار سو پھیل چکی تھی۔

وہ نماز کی ادائیگی کے بعد واپس لوٹا تو سارے گھر میں ہلچل اور خوشگواریت پھیل رہی تھی۔

ناشتے کے بعد اچانک سب نے مل کر اس کے کمرے پر دھاوا بول دیا۔

"آئرہ پسند آ گئی نا۔ ہمیں پتا تھا۔" افراح اترائی۔

"ان لوگوں کی طرف سے ہاں ہی ہے۔" میراب بھی چہکا۔

"ہم تمہارا معاملہ فائنل کرنے جا رہے ہیں۔" شہباز عالم نے بتایا۔

"اب لڑکے کی نہیں سنی جائے گی۔ سب مل کر ایک ساتھ بولتے چلے گئے۔" زیان منہ کھول کر دیکھ رہا تھا۔

"بس...بس...ایک ایک کر کے بولیں تاکہ بات سمجھ میں آئے۔" زیان کے کچھ سمجھ میں نہ آیا تو کانوں پہ ہاتھ رکھ کر ان سب کو خاموش کرایا۔

"اچھا بیٹا سنو، میں کرم علی کو ہاں کرنے جا رہا ہوں کیوں کہ ہم واپس چلے گئے تو معاملہ بگڑ جائے گا جانتے ہو نا وہاں تمہاری ماں کس قدر خطرناک ارادے لیے بیٹھی ہیں۔" شہباز عالم نے سب کو چپ کرانے کے بعد متانت سے فیصلہ سنایا۔

"پاپا۔ کیا ہو گیا ہے۔ اتنی جلدی؟" وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

"سالے صاحب...... پلیز۔ نو مور نخرے۔"

"بیٹا جی۔ میرا بس چلے تو آج ہی آئرہ کو اپنی بہو بنا لوں۔"

"میرا بھی بس چلے تو انہیں فوراً بھابھی بنا لوں۔" افراح کیسے پیچھے رہتی۔

سب کی باتوں کو سنتے ہوئے اس نے سرد آہ بھر کے میراب کو دیکھا۔ جو ان لمحات کو انجوائے کرتے ہوئے دوست کی خوشیوں کے لیے دعا گو تھا۔

"ویسے ممی بھی آ جاتیں تو کتنا مزا آتا۔ ہم تو نکاح کیے بنا نہیں جائیں گے۔" افراح کے منہ سے

UUNOVELS.COM

بے ساختہ نکلا۔

"ایسے خوشی کے موقع پر ان کا ذکر نکالنا ضروری تھا؟" میراب نے جھلا کر بیوی کو آنکھیں دکھائیں۔

وہ بے چینی سے سب کی باتیں سن رہا تھا۔اس کی کیفیت کچھ عجیب ہو چلی۔ایسا نہیں تھا کہ آترہ اسے پسند نہیں مگر اتنی جلدی۔سب کچھ۔

"یار میر۔سمجھاؤ نا۔نکاح بہت بڑی ذمے داری ہوتی ہے۔" اس نے دوست سے مدد مانگی۔

"جیسے تمہارے علاوہ تو کسی اور نے یہ ذمے داری اٹھائی ہی نہیں؟" میراب نے غصہ میں مکا مارا۔

"معاف کیجیے گا۔" زیان نے اس کے بدلتے پھنویں اچکا کر طنز کیا۔

"پہلے گناہ تو کیجیے گا۔" میراب نے بھی کاندھے اچکا کر قافیہ ملایا۔

"بھائی۔پلیز مان جائیں نا۔آترہ بہت اچھی لڑکی ہے۔" افراح نے دوسری جانب سے اس کا بازو تھاما۔

"مگر پاپا۔ممی کے بغیر یوں۔شادی کا فیصلہ کرنا مناسب نہیں؟" اس نے مدد طلب نگاہوں سے شہباز عالم کو دیکھا۔

"بیٹا جی۔شادی نہیں،ابھی صرف نکاح ہو رہا ہے۔رخصتی نور جہاں کی موجودگی میں ہی کروائیں گے ان شاءاللہ۔" شہباز عالم مسکرا کر بیٹے کو تسلی دینے لگے۔

"مگر چند دن ٹھہر جاتے اور ممی کو یہاں بلوا لیتے تو......" اس کا دل نہیں مان رہا تھا وہ جیسی بھی سہی ایک رشتہ تو تھا نا۔

"مان جاؤ یار۔رخصتی پر باقی کے ارمان پورے ہو جائیں گے۔ویسے بھی اس وقت مصلحتاً ان کا یہاں نہ ہونا ٹھیک رہے گا۔" میراب نے اتنی محبت سے کہا کہ اس نے سر جھکا دیا۔

"ہمارا مان رکھنے کا شکریہ۔" شہباز عالم نے بیٹے کا ماتھا چوما اور چھڑی لہراتے ہوئے دوست کو خوش خبری سنانے چل دیے۔

☆☆☆

سنا ہے کہ چیزیں ٹھوکر لگنے سے ٹوٹ جاتی ہیں مگر انسان ٹھوکر لگنے سے سنبھل کر چلنا سیکھتا ہے۔ تاہم نور جہاں کا کیس کچھ منفرد سا تھا۔اس گھمنڈی عورت نے ساری عمر اپنی ضد اور انا کے تابع ہو کر گزاری۔ہر ٹھوکر پر سنبھلنے کی جگہ اکڑ بڑھتی ہی چلی گئی۔قدرت نے ایسی شکل و صورت سے نوازا کہ جو ایک بار دیکھتا دوسری نگاہ ڈالنا گوارا نہیں کرتا۔اس کے باوجود دماغ ساتویں آسمان پر رہتا، مزاج کا طنطنہ ایسا کہ نہ خود خوش رہیں اور نہ دوسرے کو رہنے دیا۔اسی وجہ سے پہلے بچپن کی منگنی ٹوٹی، خدا خدا کر کے جب شہباز عالم سے شادی ہوئی تو اپنی بد زبانی اور بدفطرتی کی وجہ سے میاں کے دل میں وہ مقام حاصل نہ کر سکیں جو مرنے کے بعد بھی نزہت آرا کو حاصل تھا۔جانے مزاج میں کیسا کینہ چھپا تھا کہ ارد گرد پھیلی خوب صورتی ان کو احساس کمتری میں مبتلا رکھتی یہ ہی وجہ تھی کہ لاشعوری طور پر وہ بہو اور داماد بھی بد شکل لانے کی خواہش مند تھیں تاکہ وہ ان سے دب کر رہیں۔اسی وجہ سے میراب سے شادی کی مخالفت کی اور افراح کی خوشیوں کے آڑے آئیں۔ اتنا جھگڑا کیا کہ وہ ماں سے متنفر ہو گئی اور نور جہاں کے مقابلے میں بھائی اور باپ کے قریب ہوتی چلی گئی تھی۔داماد سے پہلے ہی نہیں بنتی تھی،اب شاید زیان کو کھونے کا وقت آ چلا تھا۔

☆☆☆

زیان عالم ساری زندگی خوشیوں کے لیے یوں ترسا، جیسے کوئی پیاسا خشک ہونٹوں کے ساتھ بوند بوند پانی کے لیے تڑپا ہو۔اسے پہلی بار پتا چلا کہ خوشیاں منانے کے لیے ہوتی ہیں جب نکاح کے بعد آترہ کو لا کر اس کے برابر میں بٹھایا گیا۔بھینی بھینی سی خوشبو آس پاس پھیلتی چلی گئی۔زیان عالم نے طویل سانس لے کر وہ خوشبو اپنے اندر اتاری تو جذبات میں

UUNOVELS.COM

خوشگوار یت سی پھیلتی چلی گئی۔
"میرا یار بنا ہے دولہا اور پھول کھلے ہیں دل کے۔" میراب کی چھیڑ چھاڑ جاری تھی۔
"اللہ جوڑی سلامت رکھے۔" افراح نے بلائیں لیتے ہوئے بھابھی کو سونے کی رنگ پہنائی جو بڑی ماں کی نشانی تھی۔
"اللہ نظر بد سے بچائے۔" فضاء بیگم نے بھی خوشی سے نہال ہوتے ہوئے بیٹی داماد پر سے پیسے وار کر اسی وقت بوڑھی ملازمہ کو پکڑائے اور کالے بکروں کا صدقہ دیا۔
"بیٹا۔ معاف کر دینا، میری وجہ سے تم نے بہت کچھ سہا ہے۔" زیان کا ماتھا چومتے ہوئے شہباز عالم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔
"پاپا۔ پلیز۔" اس نے کھڑے ہو کر باپ کو گلے سے لگا لیا۔
"بھئی بیگم۔ منہ تو میٹھا کرائیں۔" کرم علی کی گونج دار آواز پر فضاء بیگم نے مسکرا کر سر ہلایا۔
"یہ کہاں رکھوں بی بی جی؟" ان کی ہدایت پر بوڑھی خادمہ سرخ کپڑے سے ڈھکے چاندی کے تھال میں انواع و اقسام کی مٹھائیاں سجائے لے آئی۔
"رکھنا کہاں ہے بی بی۔ سب کو کھلائیں۔" وہ چہک کر بولیں تو سب کا منہ میٹھا کرایا گیا۔
"چلو بچیوں تھوڑا گانا بجانا ہو جائے۔" ایک بوڑھی رشتے دار خاتون کی فرمائش پر آرہ کی سہیلیوں نے ڈھولکی کی تھاپ پر شادی بیاہ کے گانے گائے۔ اب لڑکے والوں سے فرمائش کی گئی۔ جس پر افراح نے بہن ہونے کا ثبوت دیا اور میراب کے ساتھ مل کر وہ تان اٹھائی کہ رات جھومنے لگی۔ پورے چاند کی چاندنی بھیگ رہی تھی۔ آرہ کو دیکھ کر زیان کے اندر احساسِ تفاخر انگڑائی لے کر بیدار ہوا، مستی بھرے گلابی جذبے حاوی ہونے لگے۔
کھانے کا انتظام دوسرے ہال میں تھا جب ملازم نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو مہمان اٹھ کھڑے ہوئے اور سب اندر ہال کی طرف چل دیے۔
کھانا شروع ہو چکا تھا سب لوگوں کی میزوں پر ہر چیز پہنچ رہی تھی کھانے کی اشتہا انگیز خوشبوئیں سارے ہال میں چکراتی پھر رہی تھیں۔
"چلیے۔ مسز زیان عالم۔ کس سوچ میں گم ہیں۔" اس بڑے استحقاق سے تھوڑا سا جھک کر اپنی دلہن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
"مسز زیان عالم۔" اس جملے کی بڑی دلفریب سی بازگشت اس کے کانوں میں گونجتی رہی۔ گوٹے کرن سے سجے آنچل کو چٹکی سے پیچھے کرتے ہوئے آرہ نے چہرہ اٹھایا تو من میں احساسِ تشکر بیدار ہوا۔
براؤن کرتا پاجامے پر فان کلر کی واسکٹ، پیروں میں فان کڑھائی والا کھسہ اس کے لمبے چوڑے وجود پر بہت بج رہا تھا، وہ دولہا بن کر بہت ہینڈسم لگ رہا تھا، وہ جواب اس کا تھا، بہت اپنا، لمحے بھر کی جھجک کے بعد آرہ نے طویل سانس اپنے اندر اتاری اور نئی زندگی کی جانب ایک قدم بڑھاتے ہوئے اپنا گلابی کپکپاتا ہوا نازک سا ہاتھ سانولے مضبوط مردانہ ہاتھوں میں تھما دیا۔ آرہ زیان زرتار دوپٹا سنبھالتی ہوئی کھڑی ہوئی تو اس کے وجود کے سامنے خود کو شیشے کی گڑیا محسوس کرنے لگی۔۔

☆☆☆

زیان کے نکاح کا سنتے ہی نور جہاں کا جلال عود آیا، وہ تو جیسے زمین سے اچھلیں اور چھت سے جا لگیں۔ "کسی کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھیں۔ ایسا شور و ہنگامہ مچایا کہ شہباز عالم کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔
"بس۔ میں نے کہہ دیا نا میں اس رشتے کو نہیں مانتی۔"
"ایک منٹ تم میری بات سنو تو......" شہباز نے سمجھانا چاہا تو وہ شوہر کے سامنے کمر پر ہاتھ رکھ کر تن کر کھڑی ہو گئیں۔
"میاں تم میری مرضی کے بغیر ایسا کیسے کر سکتے ہو؟"

''بیگم کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ بیٹے کا نکاح ہی کیا ہے کوئی گناہ تھوڑی۔ اب آئرہ اس گھر کی بہو ہے۔''

''کون سا نکاح...... کیسی بہو...... دور رکھو اس آرے کو مجھ سے۔'' وہ حلق کے بل چلائیں۔

''نور جہاں نیچی آواز میں بات کرو۔ زیان آنے والا ہے اگر اس نے سن لیا تو کیا سوچے گا۔ آخر اب وہ اس کی منکوحہ ہے۔''

''مجھے کسی کی پروا نہیں۔ مجھے جہیز میں لاکھوں کا سامان اور ایک بڑا سا گھر چاہیے۔ بس۔''

''زیان ہماری اولاد ہے کوئی بازار میں بکنے والی شے نہیں جس کے تم ہر وقت دام کھرے کرنے میں لگی رہتی ہو۔''

''ہاں تو ساری عمر پیٹ کاٹ کاٹ کر اس کی پرورش پر اتنا خرچا کیا ہے۔ پڑھنے کے لیے باہر بھیجا۔ اب کیا وصولوں گی نہیں؟''

''تم شاید بھول رہی ہو کہ وہ بھی میری اولاد ہے۔ میرے پیسوں پر اس کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا افراح کا۔'' وہ سر پہ ہاتھ رکھ کر بولے۔

''ارے جاؤ میاں۔ یہ میرا ہی حوصلہ ہے جو سوکن کے بچے کو سینے سے لگا کر پال پوس کر اس قابل بنایا ہے کہ دنیا اسے رشک بھری نظروں سے دیکھ سکے ہے۔ اب صلہ ملنے کا وقت آیا تو تم چپکے چپکے اس کا نکاح کر آئے۔''

''تمہاری بیچ سوچ اور ایسی گھٹیا باتوں کی وجہ سے میں نے مجبور ہو کر تمہارے بغیر یہ قدم اٹھایا ہے۔''

''یہ گھر میرا ہے شہباز عالم۔ تم مجھے اتنی آسانی سے دودھ میں پڑی مکھی کی طرح نکال کر نہیں پھینک سکتے۔ مجھے تو ایسی بہو چاہیے جو میرے ہاتھوں میں سونے کے کنگن پہنائے۔''

''سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ زیان ان رسومات سے نفرت کرتا ہے۔ اس نے نکاح ہی اس شرط پر کیا کہ کرم علی سے جہیز کے نام پر سوئی بھی نہیں لے گا۔''

''ہائے اللہ۔ میری زندگی میں ان جیسے بے دتوفوں کو ہی لکھنا تھا۔'' نور جہاں نے ہٹ دھرمی سے ماتھا پیٹ لیا۔

''دعا کرو ہماری بہو کے نصیب سے بیٹے کو اتنا ملے کہ وہ تمہیں اپنی کمائی سے بڑا سا گھر اور گاڑی دلائے۔'' شہباز نے نرم لہجے میں سمجھایا۔

''بہت ہو گیا۔ اچھائی کا ڈرامہ۔ اب میں مزید برداشت نہیں کروں گی۔ اگر زیان کی شادی میری مرضی سے ہوتی تو میں بہو کو خوشی لے کر آتی۔ مگر اب نہیں۔'' وہ ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

''فضول کی بک بک نہ کرو۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے جلدی ہی بہو کو رخصت کرا کر گھر لے آؤں۔'' شہباز عالم کا انداز فیصلہ کن ہوا تو نور جہاں کے اندر سے غصے کا لاوا ابل کر باہر نکلنے کو تیار ہو گیا، ادھر ادھر دیکھا کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو میز پر رکھے گل دان کو اٹھا کر زمین پر زور سے دے مارا ایک دھما کا ہوا اور دور دور تک کانچ بکھرتا چلا گیا۔

افراح جو کچن میں کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ اندر ہونے والے دھماکے پر چھری اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

''یا اللہ۔ خیر امی کو قیامت ڈھائے بغیر چین نہیں آئے گا۔'' اس کے ہاتھ کانپنے لگے، کام کو ایسے ہی چھوڑا اور باہر کی طرف بھاگی۔

افراح جانتی تھی کہ بھائی کو کھانے میں کیا پسند ہے، اس لیے گوشت میں لوکی ڈالنے کا ارادہ تھا۔ ساتھ ہی مٹر چاول پکائے وہ اس سالن کے ساتھ بہت مزا دیتے تھے۔ چھٹی کی وجہ سے وہ رات سے ہی میکے میں رکنے آ گئی تھی، تاہم صبح سے ماں باپ کے درمیاں وقفے وقفے سے جاری جھڑپوں نے اس کا دماغ پکا کر رکھ دیا تھا۔

افراح نے پچھلے کئی دنوں سے بہانے سے ماں کے سامنے آئرہ کی بڑی تعریفیں کیں مگر مجال ہے جو ان کی سختی میں ذرا بھی کمی آئی ہو۔

''سگی بیٹی ہو کر بھی تو سوتیلے بھائی کا ساتھ دے رہی ہے۔'' ماں نے الٹا اسے برا بھلا کہنا شروع

کردیا۔

"یااللہ میری ماں کو کب عقل آئے گی افراح نے اندر کا منظر دیکھا تو سر تھام کر سوچا۔

"بس رہنے دو میاں۔ میں تم سب کی چالوں کو خوب سمجھتی ہوں۔" شوہر کو لتاڑا۔

شہباز نے بتانے کی کوشش کی کہ لڑکی بڑی سادہ اور معصوم سی ہے مگر وہ ذرا بھی متاثر نہ ہوئیں۔

"فضول کی بحث ہے بھائی کا نکاح تو ہو ہی چکا ہے۔" اس نے دکھ سے سوچا۔

"نکاح ہی ہوا ہے نا۔ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔" بیٹی کی سوچ کا جواب نور جہاں نے فوراً ہی زبان سے دیا۔

"یااللہ خیر۔ ممی کا دل بھائی کے لیے نرم کیوں نہیں پڑتا۔ کتنے اچھے ہیں وہ۔" افراح نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا اور نم آنکھوں کو پونچھا۔

"تم...... تم...... پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ شریف گھرانوں میں بھلا ایسا کہیں ہوتا ہے؟" شہباز نے گھبرا کر بیوی کی طرف دیکھا۔

"اللہ کرے بھائی لیٹ ہو جائے۔" وہ نہیں چاہتی تھی کہ ماں کے تلخ جملے زیان کے کانوں تک جا پہنچیں اور اس کا دل برا ہو۔

گیٹ کھلنے کی آواز پر افراح نے پریشانی سے باہر جھانکا۔ زیان کی گاڑی کے ہارن کی آواز پر اس کا جسم پسینے سے تر ہو گیا۔ وہ ماں کو خاموش کرانے کے لیے اندر جانے کا سوچ رہی تھی کہ زیان نے اس کے برابر میں کھڑے ہوتے ہوئے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اندر جانے سے روکا۔ وہ کمرے کی دہلیز پر کھڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اندر ہونے والی جنگ و جدل دیکھنے اور سننے لگا۔

☆☆☆

آئرہ علی بال سلجھاتے ہوئے مسلسل اُلجھ رہی تھی، اپنے آپ سے......زندگی سے یا پھر دل میں پلتی زیان کی محبت سے۔

"آئرہ۔ بیٹا تمہارے پاپا زیان کے گھر والوں سے رخصتی کی تاریخ کی بات کرنا چاہ رہے ہیں۔"

ماں کی بات نے اس کے ہاتھوں کی گردش کو جیسے روک سا دیا۔

"ماما۔ اس قدر جلدی کیا ہے؟" وہ روکھی سی ہوئی، ایک خوف نے جیسے دل میں پنجہ گاڑا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ آپ جتنی جلدی ہو سکے اپنے گھر کی ہو جائیں۔" وہ نرمی سے بولیں۔

"ماما۔ ہم ابھی ذہنی طور پر رخصتی کے لیے تیار نہیں ہیں۔" اس کی نگاہوں میں نکاح نامے کی دستاویز گھومی تو دل پر گھونسا پڑا۔

آئرہ کیا بات ہے ہم محسوس کر رہے ہیں کہ پچھلے ایک ہفتے سے آپ کچھ چپ چپ اور پریشان ہیں؟

"اتنا بڑا دھوکا کیا گیا ہمارے ساتھ۔ اب کیا پریشان بھی نہ ہوں؟" وہ ماں کی طرف دیکھ کر سوچنے لگی مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔

"زیان کی کال بھی آتی ہے تو بات نہیں کرتیں بہانہ بنا دیتی ہیں۔ ہوا کیا ہے بچے؟" انہوں نے بیٹی کے چہرے کے تاثرات کو جانچتی نگاہوں سے دیکھا۔

"ماما۔ ایسی بات نہیں، مگر سوال یہ ہے کہ ہماری زندگی پر ہمیں کب اختیار ملے گا۔ یاد ہے نا کہ ایجوکیشن میں بھی ایسا ہی ہوا، فائن آرٹس کی طرف جانا چاہا مگر پاپا کی ضد پر باہر جا کر پڑھائی مکمل کرنی پڑی۔۔ پھر جاب کا ٹائم آیا تو پاپا کی ضد پر ان کے دوست کی کمپنی جوائن کرنی پڑی۔ اب پاپا کی خواہش پر ان کے دوست کے بیٹے کے ساتھ نکاح کرنا پڑا۔ وہ بھی کچھ جانے بوجھے بغیر۔ ایک بتائیں کیا پاپا کو ہم سے ذرا بھی پیار نہیں؟" وہ بہت حساس ہو رہی تھی نم لہجے میں بولی۔

"آئرہ۔ آپ کے پاپا دشمن نہیں ہیں۔ انہوں نے جو بھی کیا اس میں آپ کی بھلائی چھپی ہوئی ہے؟" فضاء کرم نے پیار سے بیٹی کا چہرہ پکڑ کر اپنی طرف گھمایا اور منانے کی کوشش کی مگر اس کا منہ پھولا

رہا۔

''اٹس ناٹ فیئر۔آپ جانتی ہیں نا کہ پینٹنگ کرنا ہمارا جنون تھا،رنگوں سے ہمیں عشق تھا،پتھروں کو تراشنے میں ہمیں عجیب سا سکون ملتا تھا مگر سب کچھ چھڑوا دیا گیا۔'' وہ ناراض ناراض سی اصل بات کی جگہ ادھر ادھر کی بات کیے جارہی تھی۔

''ہم آپ کو مضبوط دیکھنا چاہتے تھے،کسی کا محتاج نہیں۔فنکار تو ویسے ہی جذباتی اور حساس ہوتا ہے اور یہاں کے حالات ہمارے خاندان کے موافق نہیں ہیں،ایک مسئلہ حل ہوتا نہیں کہ آپ کے چاچا لوگ دوسرا کھڑا کر دیتے ہیں۔'' وہ ماتھے پر سے اس کے بال ہٹاتے ہوئے بولیں۔

''ہم اندر سے کمزور نہیں ہیں،بہت اسٹرونگ ہیں مگر پاپا کو کس بات کا ڈر رہتا ہے؟'' اس نے جھلا کر پوچھا۔

''اب کیا کہیں کچھ باتیں آپ کو پتا ہیں اور کچھ ہم نے آپ کی پریشانی کا سوچ کر چھپائے رکھا۔'' فضا کے وجود میں لرزش سی ہوئی۔

''ماما...... پلیز...... بتائیں نا کیا بات ہے؟''

وہ اپنی پریشانی بھول کر والدین کی فکر میں پڑ گئی۔

''اپنے چاچا اور ان کے بچوں کی زمین جائیداد کے لیے لالچ کا تو آپ کو پتا ہے نا۔انہیں اپنے جوان بیٹوں پر بڑا مان وفخر ہے اور قسمت نے ہمارے نصیب میں کوئی بیٹا نہیں لکھا۔اب ان کی نگاہیں ہماری جائیداد پر لگی ہوئی ہیں۔وہ اس پر اپنے بیٹوں کا حق سمجھ کر دشمن بنے ہوئے ہیں۔کرم علی نے ان کو ان کے حصے سے بھی زیادہ زمین دے دی ہے مگر اب وہ ہماری جائیداد بھی ہتھیانے کے چکر میں ہیں۔اسی چکر میں خون خرابا بھی ہو چکا ہے،زمین حاصل کرنے کے لیے ہمیں جھوٹے مقدمے میں پھنسایا گیا اور پیسے کھلا کر فیصلہ بھی ہمارے خلاف لکھوالیا گیا۔حالات ایسے ہو گئے کہ ہم نے آپ کو اپنے سے دور کر دیا پڑھائی کے بہانے باہر بھیج دیا تاکہ بڑے نقصان سے بچا جا سکے۔بہت سوچ بچار کے بعد یہاں کے جھگڑوں سے دور شادی بھی ایسے خاندان میں کروادی جہاں آپ کی زندگی کا سکون ہمیشہ قائم رہے گا تو بتائیں کچھ غلط کیا؟'' وہ سرد آہ بھر کر بولیں۔

''آپ لوگوں کے ساتھ اتنا کچھ ہوتا رہا اور ہمیں بتایا ہی نہیں کسی نے۔ماما پلیز،پاپا سے کہیں نا سب کچھ بیچ کر یہاں سے کہیں دور چلتے ہیں۔'' اس نے گھبرا کر ماں کا ہاتھ تھاما اور ضد پکڑ لی۔

''بیٹا۔۔اتنا آسان نہیں۔یہاں ہمارا گھر ہے،آباؤ اجداد کی قبریں ہیں پھر ہماری زمینوں سے کتنے لوگوں کا روزگار جڑا ہوا ہے۔آپ کے پاپا یہاں سے جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔وہ حق پر ہیں،زندگی کی آخری سانس تک یہ لڑائی لڑنے کے موڈ میں ہیں مگر اس میں اپنے بیٹی داماد کو گھسیٹنا انہیں گوارا نہیں۔اسی لیے جلد از جلد آپ کی رخصتی کروانا چاہتے ہیں۔سال چھ مہینے میں ہم دونوں خود ہی کبھی کبھی وہاں آکر آپ سے مل لیا کریں گے۔'' فضا،کرم کی آنکھوں سے بے چارگی کے آنسو ٹپکنا شروع ہوئے تو رکنا مشکل ہو گئے۔آرہ نے بڑھ کر ماں کو گلے سے لگایا اور خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔وہ آج تک اپنے باپ کو کتنا ظالم اور سخت دل سمجھتی آئی تھی۔

☆☆☆

آنکھوں اور آنسوؤں کا ساتھ بھی ویسا ہی ہے جیسا خوشی اور غم کا۔ہم خوش ہوتے ہیں تب بھی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں،ہم دکھ اور صدمے کی کیفیت سے دوچار ہوں تب بھی یہ آنسو ہمارا ساتھ دینے چلے آتے ہیں۔دنیا چاہے ہمارا ساتھ دے یا نہ دے مگر یہ آنسو ہمارا ساتھ آخر تک نبھاتے ہیں سکھ میں بھی اور دکھ میں بھی۔

''بھائی۔آپ فریش ہو جائیں میں کھانا لگاتی ہوں۔'' افراح نے اپنی نم آنکھیں صاف کیں۔

''اوکے۔میں آتا ہوں۔'' وہ دھیرے سے بولتا ہوا اندر کی طرف بڑھ گیا،میراب ٹیبل پر برتن

لگانے میں بیوی کی مدد کرنے لگا۔
بھائی تو اتنے سوئٹ ہیں پھر بھی لوگ ان کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔" افراح نے سلاد کی پلیٹ میز رکھتے ہوئے شوہر کی طرف دیکھا۔
"جب لوگ پیچھے ہوں تو سمجھ جاؤ کہ وہ ان سے ایک قدم آگے ہے، ویسے بھی زیان دوستوں سے پہچانا جاتا ہے دشمنوں سے نہیں۔" میراب کی بات پر اس کے دل میں سکون پھیلتا چلا گیا۔
گرم ماحول میں گرما گرم کھانا میز پر سج گیا تو افراح نے سب کو آوازیں دے کر بلایا۔ زیان بھی بہن کی پکار پر اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے، چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے دونوں ہاتھ رگڑتے ہوئے ڈائننگ روم میں داخل ہوا۔ میز پر بیٹھے شہباز عالم نے شرمندگی سے بیٹے سے نگاہیں نہ ملائیں۔ باقی سب بھی اسی کی جانب دیکھ رہے تھے، وہ اس اپنائیت پر مسکرایا، ہر ایک نے اس مسکراہٹ میں چھپی تکلیف اپنے دل پر محسوس کی سوائے نور جہاں کے جو "پرواہ نہیں" کی تفسیر بنی ہوئی تھیں۔
اپنی پلیٹ میں ڈھیر سارا مٹر پلاؤ نکالا۔ سالن کے ڈونگے میں سے بوٹیاں چن چن کر نکالیں اور مزے لے کر کھانا شروع کر دیا۔ زیان نے بھی باپ کے اشارے پر دل نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول ڈالے اور بے دلی سے کھانا شروع کر دیا مگر اس کا ذہن کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔
"زیان۔ تم یہ بتاؤ اس لڑکی کو طلاق نامہ کب بھجوا رہے ہو؟" نور جہاں نے آخری لقمہ حلق سے اتارا اور پانی کا گلاس حلق سے اتارنے کے بعد اچانک بڑے سفاکانہ انداز میں پوچھا۔
"ماما۔ پلیز۔" زیان چوڑے سینہ کو ہاتھ سے سہلانے لگا، جہاں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔
"دماغ خراب تو نہیں ہو گیا، میرے جیتے جی تو ایسا نہیں ہو سکتا؟" شہباز عالم بھی لپسانہ ہوئے بیٹے کی جگہ تڑخ کر جواب دیا۔
"بھائی......" افراح نے اس کے بازو کو تھام کر تسلی دینا چاہا مگر اس نے منہ پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔
"دماغ تو تم سب کا خراب تھا۔ نور جہاں کو بہت ہلکا لے لیا۔ میاں، اب یہ سب اتنا آسان بھی نہیں۔"
"کہاں بیگم۔ تم تو شادی کے پہلے دن سے ہم پر بھاری پڑی ہو۔"
"ہاں تو دل پر نزہت آرا جو چھائی رہیں، مجھ جیسی نے بھاری ہی پڑنا تھا، اسی لیے مجھے لے کر نہیں گئے بیٹے کے نکاح پر۔" نور جہاں نے چبا چبا کر زیان کی ماں کا نام لیا تو اس نے دانت پر دانت جما کر خود پر قابو پایا۔
"تمہارے لالچ اور بد مزاجی کی وجہ سے کوئی خاندان ہمارے بیٹے کو لڑکی دینے کو تیار نہیں ہو رہا تھا، اگر تمہیں وہاں لے جاتا تو انکار ہی سننے کو ملتا۔" وہ بلبلا اٹھے۔
"ہمارے کیوں، اپنا بیٹا کو کہو نا۔ میں تو ٹھہری سوتیلی ماں۔" نور جہاں کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔
"کم عقل عورت۔ افراح تو ہماری سگی بیٹی ہے نا۔ اس کے معاملے میں شکر کرو کہ زیان کے دوست میراب کا رشتہ آ گیا، ورنہ تم جس طرح کا داماد ڈھونڈنے پر کمربستہ تھیں، بیٹی بھی ساری عمر میکے کی دہلیز پر بیٹھی رہ جاتی۔" شہباز عالم افسردگی سے بولتے چلے گئے۔
"ارے۔ ایسے فقطے سے شادی کرنے سے بہتر تھا کہ وہ میکے میں ہی رہتی۔"
ماں کی بات پر افراح نے لرزا کر گھبرا کر میراب کی طرف دیکھا جو کھانے کی میز سے اٹھ کر لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر کی جانب چل دیا۔ افراح بغیر چپل کے اس کے پیچھے دوڑی۔
"نور جہاں۔ کبھی تو منہ کھولنے سے پہلے سوچ لیا کرو۔" شہباز نے بیٹی داماد کو یوں جاتا دیکھ کر غصے سے کہا۔
"بھئی سچ تو سچ ہے نا۔" انہوں نے کاندھے

اٹک گئے۔ زیان نے فون نکال کر میراب کا نمبر ملایا مگر وہ بار بار لائن منقطع کر رہا تھا۔

"فضول باتیں مت کرو۔ اب بیٹی کا گھر بھی خراب کرو گی کیا......؟ میراب شریف اور پڑھا لکھا بچہ ہے اچھا خاصا کما لیتا ہے مگر تمہارے لالچ کی تو کوئی حد نہیں۔ مجھے تو یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ تم نے مجھ جیسے مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے انسان کے ساتھ کیسے زندگی گزار دی؟"

"میاں۔ ان ہی محرومیوں سے چھٹکارا پانے کے لیے سوچا ہے کہ زیان کی شادی وہاں کروں گی جہاں سے گاڑی بنگلا سب ملے گا۔" وہ خواب ناک لہجے میں بولیں۔

"کرم علی رخصتی کی تاریخ مانگ رہا ہے۔ کچھ تو میری عزت کا خیال کرو۔" وہ زچ ہو کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولے تو زیان کا دل خراب ہونے لگا۔

"چلو۔ میں رخصتی کروانے کو تیار ہوں مگر ایک شرط پر۔" نور جہاں کے ہونٹوں پر عیارانہ مسکراہٹ ابھری۔

"مجھے تمہاری ساری شرطیں منظور ہیں۔۔ بس ایک بار چل کر بہو کو عزت سے رخصت کروا کر لے آؤ۔" وہ جلدی سے بولے۔

"پہلے شرط تو سن لو۔" نور جہاں کی مکاری میں بہت کچھ چھپا تھا، شہباز عالم کے ساتھ زیان کے اندر خطرے کی گھنٹی بجی۔

☆☆☆

ٹپ ٹپ...... ہلکی ہلکی رم جھم شروع ہو گئی تھی۔ اس نے درختوں اور مٹی کی بھیگی سوندھی سی خوشبو اپنے اندر سرشاری سے اتاری اور سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو آسمان پر بننے والا قوسِ قزح کا نیم دائرہ مبہوت کر گیا۔ وہ ماں کے ساتھ واک پر نکلی تھی۔ فضا کرم نے بوندا باندی کے شروع ہوتے ہی ہاتھ میں تھاما چھاتا کھولتے ہوئے اس کے سر پہ تانا اور ایک بار پھر وہ ہی ذکر نکالا۔

"ماشاءاللہ...... ہماری گڑیا بہت قسمت والی ہے...... زیان جیسا شریک حیات ملا۔"

"آپ کو کیا پتا ہو سکتا ہے انہوں نے بھی جائیداد کی لالچ میں یہ نکاح کیا ہو۔" آئزہ چڑ کر بولتے ہوئے بولی۔

"آپ ایسا کیسے سوچ سکتی ہیں؟ ہمیں اپنی تربیت پر شبہ ہونے لگا ہے کہ کہیں کوئی کمی رہ گئی ہو۔" فضا نے گیلی مٹی پر احتیاط سے قدم جماتے ہوئے غصے سے کہا تو لمحے بھر کو آئزہ ساکت ہو گئی۔

"وہ شریف لوگ ہیں بالکل بھی لالچی نہیں، خاص طور پر تمہارا بابا جان بہت ہی خوددار ہے۔ آپ کو پتا ہے زیان نے نکاح کے لیے کیا شرط رکھی ہے؟"

آئزہ نے ماں کے پوچھنے پر منہ سے کچھ نہیں کہا، دھلی سرسبز ڈال پر سے پتے نوچتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

"وہ آپ کو چند کپڑوں میں بیاہ کر لے جائیں گے۔ جہیز کے نام پر انہیں ایک روپیہ بھی نہیں چاہیے۔" ماں کی بات پر وہ تھوڑا شاک رہ گئی۔

"ماما۔ پہلے سب ایسے ہی مہان بنتے ہیں مگر بعد میں ٹرک بھر بھر کر جہیز مانگتے ہیں اور یہاں تو زمین جائیداد کا بھی معاملہ ہے۔" فضا کو اس طرح کی چھوٹی باتیں کرتی ہوئی وہ کوئی اور ہی لگی۔

"لوگ ایسا کرتے ہوں گے مگر ہمارے زیان کا شمار ان لوگوں میں نہیں۔" وہ پرزور تردید کرتی رہیں

"ماما۔ آپ اور پاپا دونوں بہت بھولے ہیں اور یہ دنیا بڑی چالاک۔" ان کی تردید پر بھی وہ ویسی کی ویسی ہی کھڑی رہی۔

"پتا ہے جب آپ کے پاپا نے جہیز دینے کی ضد کی تو زیان بولے کہ پھر وہ رخصتی نہیں کرائیں گے۔" ماں کے پے در پے انکشافات بھی اس کا دل صاف نہیں کر پا رہے تھے۔

"اگر وہ اتنی ہی خوبیوں کے مالک ہیں، تو پھر انہیں ایسی کون سی مجبوری آڑے آ گئی جو اپنے سے عمر

میں بڑی لڑکی سے نکاح کرنا پڑا۔" آئرہ نے جو گرز کے تسمے باندھنے کے بعد کھڑے ہوتے ہوئے تخی سے پوچھا۔

"مجبوری ان کی نہیں ہماری تھی بیٹا۔" وہ بڑبڑائیں۔

"اور آپ نے بھی نکاح سے پہلے ہم سے یہ بات چھپائی۔ کیا ہمارا وجود اتنا بھاری ہو گیا تھا۔" اس نے ماں کی خاموشی پر ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے نم لہجے میں دل کی جلن عیاں کی۔

☆☆☆

حقیقت ہے کہ اسے بات بہت چبھی تھی۔ عجیب سی تضحیک کا احساس ہوا شاید یہی لمحہ تھا جب دل پر باریک سی خراش آ گئی تھی ویسے ہی جیسے شفاف شیشہ بظاہر ثابت ہو مگر تڑختے پر اس پر جو بال آ جائے وہ خوب صورتی میں گہن لگا دے۔

اس نے جب سے افراح کا ہاتھ تھاما تھا وہ نور جہاں کی کڑوی کسیلی باتوں کو نظر انداز کرنے کا عادی ہو گیا تھا کچھ اپنی لاپروا طبیعت اور کچھ محبت نبھانے کی خاطر کیوں کہ زیان نے شادی سے قبل ہی گھر کے حالات سے مکمل طور پر آگاہ کر دیا تھا مگر جانے کیوں اپنے لیے ان کے منہ سے حقارت سے نکلنے والا لفظ 'حقا'' تیر بن کر گڑ گیا۔ دل نجانے کیوں ملال سے بھر گیا۔ وہ وہاں رک نہ سکا ورنہ کوئی گستاخی ہو جاتی۔

وہ آوازیں دیتی، ننگے پاؤں شوہر کے پیچھے بھاگی۔ اس کے باوجود میراب لمحہ بھر کو بھی نہ رکا اسے نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ افراح نے آگے بڑھ کر اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے اپنی جانب متوجہ کیا مگر چہرے پر چھائی گہری سنجیدگی نے اسے دہلا دیا۔

"میں گاڑی میں ہوں جلدی آ جاؤ۔" وہ اُس کا جواب سنے بغیر گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا تو افراح نے بھی پھرتی دکھائی کہ کہیں چھوڑ کر نہ چلا جائے۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا جب سیل فون بجنے لگا، زیان کی کال تھی مگر اس نے لائن کاٹ دی۔

سارا راستہ خاموشی کی نظر ہو گیا میراب کے چہرے کے تاثرات سے خائف ہو کر افراح نے بھی کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اس کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ایک دو بار افراح نے کچھ کہنے کے لیے اپنے ہونٹ وا کیے مگر میراب کے انداز میں اتنی رکھائی اور اجنبیت تھی کہ وہ لب بھینچ کر رہ گئی۔ وہ اُسے یوں نظر انداز کر رہا تھا جیسے افراح اس کے ساتھ بیٹھی ہی نہیں ہو دونوں اپنے اپنے خیالوں میں گم ہو گئے۔

اب اسے اپنی جلد بازی پر پچھتاووں نے گھیرا جو ایسے حالات میں زیان کو تنہا چھوڑ آیا۔

میراب موڑ کاٹتے ہوئے مسلسل اُلجھ رہا تھا۔ اپنے آپ سے یا وقت کے اس وار سے۔ جس نے ایک بار پھر اس کے پیارے دوست کی خوشیاں چھیننے کی کوشش کی تھی۔ بھائی کا دکھ بھی افراح کے اندر گہرائی تک اترتا چلا گیا۔ وہ کس قدر پرخلوص اور محبت کرنے والا انسان ہے مگر قسمت ہر موڑ پر اس کے ساتھ دغا کرنے پر تل جاتی ہے۔ ٹز...... ٹز...... ٹز...... ایک سوال اس کے دماغ پر ہتوڑے کے وار کی طرح پڑ رہا تھا۔

"کیا ممی... آئرہ اور زیان کو ایک دوسرے سے الگ کر دیں گی؟" افراح نے دونوں ہاتھوں سے گھومتے ہوئے سر کو تھام لیا۔

☆☆☆

زیان عالم ذہنی طور پر اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ اُسے کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی شادی اتنا بڑا مسئلہ بن جائے گی کہ بات والدین کی شادی شدہ زندگی کے خاتمہ تک جا پہنچے گی۔ لاعلمی کتنی بڑی نعمت ہے اسے اب احساس ہوا۔

شکر ہے میرے مالک تو نے لوگوں کے خیالات، پردے میں چھپائے رکھے ہیں جو اگر یہ بے نقاب ہو جاتے تو کتنوں کا جینا محال ہو جاتا۔ اس

نے نور جہاں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔
اچھائی اور برائی لوگوں کے دلوں میں ہوتی مگر آ گہی کسی کی بھی ذہنی حالت کو بدلنے میں ہر پل مستعد رہتی ہے۔ زیان کو بھی ایک لمحہ لگا، جب نور جہاں نے اپنا فیصلہ سنایا، اس کا دل سکڑا اور پھر پرسکون ہوتا چلا گیا۔
''اچھا بھی تو سنو دلہن کو میں اس شرط پر رخصت کرانے جاؤں گی جب وہ اس گھر میں قدم نہیں رکھے گی۔'' الفاظ تھے یا دھما کا خیز مواد اس کے پرخچے نہ اڑے مگر دکھائی نہ دینے والی ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو گیا۔
''کیا...... کیا...... مطلب ہے تمہارا؟'' شہباز عالم ایک دم کرسی سے کپکپاتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔
''بول دیں اپنے بیٹے سے کہ کہیں اور ٹھور ٹھکانا ڈھونڈ لے۔ میں نے ساری عمر نباہ دیا۔ اب میرے گھر میں اس کی جگہ نہیں ہے۔'' ان کے سفا کانہ لہجے پر۔ زیان نے کس کر میز کا کونا پکڑ کر خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا۔
''دماغ خراب تو نہیں ہو گیا ہے تمہارا...... زیان کہیں نہیں جائے گا۔ یہ اس کا بھی گھر ہے، بہو بھی یہیں رخصت ہو کر آئے گی۔'' شہباز عالم سینہ مسلتے ہوئے دوبارہ کرسی پر ڈھ سے گئے۔
''پاپا۔'' زیان اذیت سے کراہا اور باپ کی بگڑتی حالت پر پیٹھ سہلانے لگا۔
''ارے تمہاری لاڈلی بہو یہاں قدم رکھ کر تو دکھائے۔ ایسی بے عزتی کر کے نکالوں گی کہ ساری عمر یاد رکھے گی۔'' نور جہاں نے کمر پر ہاتھ رکھ کر فیصلہ کن انداز میں جتایا۔
''تو تم بھی ایک بات کان کھول کر سن لو اگر میرا بیٹا یہاں نہیں رہے گا تو میں تمہیں بھی نکال باہر کروں گا۔ طلاق دے دوں گا۔'' وہ چلائے۔
''پاپا...... پلیز......'' زیان نے بڑھ کر باپ کے منہ پر ہاتھ رکھ کر نفی میں سر ہلایا۔ وہ اس عمر میں ان کا گھر کیسے ٹوٹنے دیتا۔
''ارے۔ ساری عمر اس عورت کی بدمزاجی اور ناانصافی صرف اسی لیے برداشت کی کہ میرے یتیم بچے کو ماں کے نام کا تحفظ حاصل رہے چاہے جھوٹا ہی سہی۔'' وہ جوش میں بولتے ہوئے ایک دم کھانسنے لگے۔
''پانی پی لیں۔'' زیان نے جگ میں سے گلاس میں پانی انڈیلا اور باپ کو پلایا۔
''اب میرا زیان خودمختار ہو گیا ہے اسے کسی جھوٹے بہانے کی ضرورت نہیں بہت سہہ لیا ہم نے۔ نور جہاں بیگم اب تم نکل جاؤ میرے گھر سے۔'' حلق تر ہوا تو وہ چیختے ہوئے بیوی کو باہر کا راستہ دکھانے لگے۔
''اچھا ہوا تم نے یہ شوق بھی پورا کر لیا تو۔ چلو پھر تم اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑو اور نکلو یہاں سے۔'' وہ بڑی دلیری سے دروازے کی طرف انگلی کر کے بولیں۔
''یہ عورت اتنی آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گی بیٹا۔'' شہباز نے بیٹے کو دکھی نگاہوں سے دیکھا۔
''میاں۔ شاید بھول گئے ہو کہ یہ گھر تم نے شادی کے وقت میرے نام لکھ دیا تھا۔ ورنہ کیا میں ایسے ہی بغیر کسی فائدہ کے تم جیسے ایک بچے کے باپ سے شادی کر لیتی۔'' نور جہاں کی بات پر زیان پر ایک اور دکھ آ پڑا جس کو وہ اپنا گھر سمجھ کر حق سے رہتا تھا وہ تو کسی اور کا مکان نکلا۔
''یہ میرے ہی گناہ ہیں۔ جو میرے سامنے آ رہے ہیں، نزہت جیسی وفا شعار بیوی کی قدر نہیں کی وہ بے چاری دکھ سہتے سہتے، مر گئی تو بدلے میں اللہ نے عذاب کی صورت میں مجھ پر اس بدزبان عورت کو مسلط کر دیا۔'' شہباز نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے ہاتھ باندھ لیے۔
''اور پرنہیں میری طرف دیکھو وہ بے چاری مدد کو آنے والی نہیں ہے۔'' طنز سے مسکراتی ہوئی

UUNOVELS.COM

نور جہاں مزید بدصورت لگنے لگیں۔

"ممی۔ اپنی مرحومہ ماں کے بارے میں اب میں مزید ایک لفظ نہیں سنوں گا۔" زیان کی سنجیدگی سے نور جہاں کو لمحے بھر کو خوف آیا، چہرہ سیاہ پڑ گیا۔

"جانے اس کا نام کیا سوچ کر نور جہاں رکھا گیا ہے۔" شہباز نے تنفر سے بیوی کو دیکھا۔

"اور آئندہ باہر کا راستہ دکھاتے ہوئے سوچ لینا کہ اس گھر کی مالکہ میں ہوں تم نہیں۔" وہ زیان کو نظرانداز کر کے شوہر سے مخاطب ہوئیں۔

"ٹھیک ہے۔ میں اور زیان اب یہاں نہیں رہیں گے۔ چلو بیٹا۔" وہ لڑکھڑاتے ہوئے کھڑے ہوئے۔

"پاپا...... پلیز...... آپ کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ کہاں جا رہے ہیں؟" زیان نے باپ کو سمجھانا چاہا۔

"تم رہو اس گھر میں اکیلی۔ دیکھنا ایک دن پچھتاؤ گی مگر وقت ہاتھ سے نکل چکا ہوگا۔" وہ بولتے ہوئے کپکپائے تو زیان نے باپ کو سہارا دیا۔

"ارے جاؤ میاں۔ دیکھتی ہوں اس عمر میں کون ساٹھکانا ملے گا۔" ان کا طنطنہ کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"پاپا۔ پلیز۔ آپ کہیں نہیں جا رہے ہیں۔ میری رخصتی کے معاملے کو لے کر مزید کوئی بحث نہیں ہوگی۔ ممی کی بات جائز ہے۔" وہ دھیرے سے تسلی دیتے ہوئے فیصلے پر پہنچ گیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو زیان؟" شہباز نے چونک کر بیٹے کو دیکھا۔

"دیکھا۔ تم سے عقل مند تو زیان نکلا۔" نور جہاں کو لگا ان کی دھمکیاں کام آ گئیں۔

"ایک منٹ ممی! میں نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ شادی کے بعد الگ گھر لے کر رہوں گا۔ ہمیں بھی اپنی زندگی اپنے انداز میں گزارنے کا حق ہے یا نہیں؟" زیان نے بھی دھماکا کر دیا۔ جہاں شہباز نے پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھا، وہیں نور جہاں کا جوش و خروش ماند پڑ گیا۔ چہرہ بجھ کر مزید سیاہی مائل ہو گیا۔ وہ تو سمجھ رہی تھیں کہ اپنی جذباتی بلیک میلنگ سے کچھ نہ کچھ حاصل کر ہی لیں گی مگر یہاں تو کماؤ لڑکا ہی ہاتھ سے نکل رہا تھا۔

☆☆☆

رات کو میراب، افراح سے کوئی بات کیے بنا کمرے میں آ کر سو گیا۔ وہ دونوں نجانے کب تک سوتے رہے۔ صبح دیر تک سونے کی وجہ سے میراب کے تنے ہوئے کشیدہ اعصاب کسی حد تک پُرسکون ہو چلے، افراح کا سر کا درد بھی کم ہو گیا۔

میراب کی آنکھ کھلی تو وہ وہیں چند ثانیے چت لیٹا رہا پھر کروٹ بدل کر اپنے برابر میں سوتی بیوی پر نگاہ ڈالی جس کی روئی روئی آنکھیں سوتے میں بھی بھیگی بھیگی سی لگیں۔ اس نے بے اختیار بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیریں۔ کل کے ناخوش گوار واقعات یاد آئے تو زیان کا خیال ذہن میں دوڑا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دوست کو فون ملایا تو اسے ساس کی بے ہودہ شرط کا پتا چلا۔ دماغ کھول کر رہ گیا۔

نور جہاں کی شرط نے جیسے افراح کی قوت گویائی ہی چھین لی۔ افراح کا بس چلتا تو زمانے کی ساری خوشیوں کا گلدستہ بنا کر بھائی کے ہاتھوں میں تھما دیتی۔ میراب نے بھی محسوس کیا تھا کہ جب سے زیان واپس لوٹا تھا تو ایک سرشاری ساتھ لیتا آیا تھا۔ شاید آئرہ کا حسن، معصومیت اور روح کی سچائی نے اسے اوران الوہی لمحات کی اجنبی سی اپنائیت دی تھی جو اسے سرشار بھی کر رہی تھی اور دل میں نفرت کی جگہ محبت اپنے پنجے گاڑ چکی تھی۔ اس کی اکھڑ مزاجی نرم مزاجی میں ڈھل گئی تھی۔ اسے ہنسنے کا سلیقہ آ گیا تھا۔

زیان اس سے دل کا حال شیئر کرتے ہوئے سرشاری سے بتاتا کہ وہ "خود بھی اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھا۔ کبھی کبھی آئرہ سے فون پر بات کرنے کے بعد جہاں اسے چین ملتا وہیں بے چینی بھی گھیرے میں لے لیتی۔ تارے گنتے گنتے بقیہ رات آنکھوں میں کٹتی۔ وہ تو سرتاپا بدل گیا تھا۔ اس نے

کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس طرح سے کسی کی محبت میں گرفتار ہو جائے گا کہ نیندیں اڑ جائیں گی۔

افراح بھائی میں پیدا ہونے والی خوش گوار تبدیلیوں پر بہت خوش تھی۔ آئرہ چونکہ پڑھی لکھی لڑکی تھی اس لیے اسے بھابھی پر پورا اعتماد اور بھروسا تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی تدبیر سے ماں کے دل میں اپنی جگہ بنا ہی لے گی۔ گھر کے ہر معاملے کو اپنی عقل و دانش اور اپنی صلاحیتوں کی بدولت زیادہ اچھے طریقے سے سنبھال لے گی۔ دوسری اہم وجہ آئرہ بہت حسین اور دلکش نظر آتی تھی۔ اسے اپنی بات کرنے کا سلیقہ تھا، اُس کی غیر معمولی صلاحیتوں نے افراح کو چند دنوں میں ہی اپنا گرویدہ بنالیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ نور جہاں جیسی سخت دل خاتون بھی بہت دنوں تک اس پیاری سی لڑکی سے ناراض نہیں رہ سکیں گی۔ مگر انہوں نے تو آنے سے پہلے ہی اس پر گھر کے دروازے ہی بند کردیے۔

☆☆☆

''نور جہاں باجی۔ وہ لڑکی والے پوچھ رہے ہیں کہ آپ وہاں کب جائیں گی؟'' بتول نے تھیلا زمین پر رکھ کر پھسکڑا مار کر بیٹھتے ہی پوچھا۔

''ہائے میں تو لٹ گئی...... برباد ہوگئی...... میری تو قسمت ہی خراب ہے۔...... یہ زیان تو اپنی ماں کے سارے بدلے گن گن کر مجھ سے لے رہا ہے۔'' وہ سر پہ ہاتھ رکھ کر دہائی دینے لگیں۔

''ہائے ہائے۔ ایسا کیا کردیا زیان بابا نے؟'' بتول کا اس گھر میں شروع سے آنا جانا تھا اس لیے حالات سے کافی آشنا تھی۔

''اے لو پوچھتی ہیں کیا کردیا۔ ارے پہلے تو اپنے کنگلے دوست سے میری بچی افراح کو بیاہ دیا۔ اب خود بھی جانے کن فقیروں کی بیٹی بیاہ کر لا رہا ہے۔ سنا ہے جہیز کے نام پر ایک کوڑی بھی لینے سے انکار کردیا ہے۔'' ان کا غم کم ہی نہیں ہورہا تھا، وہ کرم علی کی فیملی کے حوالے سے ابھی تک لاعلم تھیں۔

''ایسے تو نہ بولیں...... میراب...... بابا...... اتنے اچھے تو ہیں نوکری بھی ہے۔ گاڑی ہے پھر آپ لوگوں کا اپنا گھر بھی ہے۔''

''ہونہہ...... اس کھٹارا کو تم گاڑی کہتی ہو اور جس کو تم گھر کہہ رہی ہو وہ کبوتر کے کابک جیسا چھوٹا سا مکان ہے۔''

میراب جو بڑی مشکل سے دل کو منا کر زبان کے بلاوے پر سسرال آیا تھا گھستے ہی، ساس کی لن ترانیوں پر اس کے تیوری پر بل پڑ گئے۔

''آنٹی جی...... شکر ادا کریں کہ حق حلال کی کمائی میں چھوٹا سا سہی اپنا گھر تو ہے اور کھٹارا ہے تو کیا ہوا چلتی کا نام گاڑی ہوتا ہے۔'' میراب نے غصے سے ساس کو سناتے ہوئے اس دن کا بدلہ اتارا اور زیان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ منہ کھول کر اسے جاتا دیکھ رہی تھیں۔

میراب کمرے میں داخل ہوا تو حیرت سے زیان کو موبائل فون کو ماتھے سے لگائے مسکراتے ہوئے دیکھا۔

''میرے اللہ اس شخص کو ان لمحوں میں قید کردے تاکہ یہ سدا مسکراتا رہے۔'' آج بہت دنوں بعد سالے صاحب کو خوش دیکھا تو منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''کیا؟ بھابھی جان کا فون تھا......'' شرارت بھرے انداز میں سوال کرتے ہوئے خوشی سے چمکتے چہرے کو بغور دیکھا۔

''تو کب آیا؟'' اس نے مسکراتے ہوئے مڑ کر اسے گلے لگایا۔

''جب تو بھابھی سے راز و نیاز میں مصروف تھا۔'' میراب نے پھر چھیڑا مگر اس نے بھی سچ بول کے نہ دیا۔

''سنا ہے سالے صاحب شہر میں نیا گھر ڈھونڈتے پھر رہے ہیں؟'' جواب نہ ملنے پر بیڈ پر پھیل کر لیٹتے ہوئے طنز کیا۔

''صحیح سنا ہے بہنوئی صاحب۔'' اس نے جان بوجھ کر ہلکا پھلکا انداز اپنایا۔

''یار۔ یہ آنٹی نور جہاں کس قسم کی خاتون ہیں۔ شادی کے اتنے سالوں میں بھی میں نہیں سمجھ سکا'' اس نے منہ بنایا۔

''بری بات۔ وہ میری اور افراح کی ماں ہیں اس تعلق سے تمہاری بھی کچھ لگتی ہیں۔'' زیان کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ویسے مجھے تو انکل شہباز پر حیرت ہے۔ وہ تو تمہارے سگے باپ ہیں۔ پھر بھی ہتھیار پھینک دیے۔'' میراب نے دکھی انداز میں کہا۔

''نہیں یار! پاپا نے تو بہت روکا مگر میں اس عمر میں ان کا گھر اور تیرا سسرال خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔'' سنجیدگی سے بات کرتے کرتے وہ شوخی پر اتر آیا۔

''پھر بھی۔ خیر ایسا کر میرے غریب خانے پر شفٹ ہو جا' اوپر والا فلور خالی پڑا ہے افراح تیرے لیے سجانے کا کہہ رہی ہے۔'' میراب نے محبت سے آفر دی۔

''نہیں۔ بھئی ہمارے یہاں تو بیٹیوں کے گھر کا پانی بھی نہیں پیتے۔'' اس نے شرارت سے نفی میں سر ہلایا۔

''کوئی نہیں...... ایسا کرنا تو جوس پی لیا کرنا۔'' میراب بھی شرارتی ہوا تو دونوں کا قہقہہ گونج اٹھا۔

''ایک بات بتاؤ۔ تم اسی وجہ سے شادی سے بھاگتے تھے نا؟'' میراب کے سوال پر اس نے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

''مگر دوسرا سوال یہ ہے کہ ہر لڑکی تمہیں کیوں ریجکٹ کرتی تھی؟'' وہ شرارتی ہوا۔

''کیوں کہ میں ان کو آزمانے کے لیے جھوٹ بولتا تھا کہ جاب نہیں ہے۔ حالات خراب ہیں۔ شادی کے بعد انہیں بھی قربانی دینی پڑے گی وغیرہ وغیرہ۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''او مائی گاڈ۔ تو اسی لیے ہر طرف سے انکار ہو۔ ہا تھا۔'' اس نے دوست کی عقل پہ ماتم کیا۔

''یار! سکھ میں تو سب ہی ساتھ دیتے ہیں مگر آئرہ زیان ہی وہ لڑکی ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر میرا ساتھ دے گی۔ اس نے پروف کیا کہ وہ نہ صرف شکل وصورت میں یکتا ہے بلکہ اس کی سیرت بھی اعلاترین ہے۔'' زیان کے لہجے میں فخر بول اٹھا۔

''ویسے بھابھی سے بات کرنے کے بعد تیری عقل مندی میں اضافہ ہوا ہے۔'' وہ چھیڑنے سے باز نہیں آیا۔

''یار تیری بھابھی کی کال نہیں تھی بلکہ سسر جی نے حاضری کا سندیسہ بھیجا ہے۔''

''اچھا سن۔ میں دو دن کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہوں تو پاپا کا خیال رکھنا۔'' زیان نے عجلت میں بتایا۔

''اب ایسی بھی کیا بے قراری۔ سسرال کے چکر لگانا ضروری ہیں۔ رخصتی میں دن ہی کتنے رہ گئے؟'' میراب نے رعب سے گھورا۔

''جناب اپنا وقت بھول گئے جب مجھ سے ملنے کے بہانے یہاں کے دن میں کئی کئی چکر لگاتے تھے۔'' اس نے بھی گھور کر یاد دلایا۔

''انسان تجربے سے ہی سیکھتا ہے۔ تو بھی بیوی کو قابو میں رکھنا چاہتا ہے تو میری طرح سر پہ نہ چڑھانا۔'' وہ کھلکھلایا۔

''مجھے بھی یوں رخصتی سے قبل سسرال جانا پسند نہیں مگر کیا کروں اگر نہیں گیا تو وہ میڈم رخصتی ہی نہیں کرائیں گی۔ پتا نہیں کتنا غبار دل میں جمع کیے بیٹھی ہیں۔'' سوچتے ہوئے اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر میراب کی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہوئی مسکراہٹ چمکی۔

☆☆☆

اس روز سورج نکلا تھا پر گھور گھٹا کے ساتھ اس کی چھپا چھپی چل رہی تھی۔ جیسے جیسے دن گزر رہا تھا، ہوا کی خنکی بڑھنے لگی۔ مشکبار فضا میں سبزے کی رسیلی باس من موہے جا رہی تھی باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ زیان عالم نے چھتری لی، حفاظتی بوٹ پہنے اور ملازم کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا شروع

کیا تو ایک ٹھنڈا یخ ہوا کا جھونکا جو قدرے گیلا سا تھا اس کے چہرے کو چھو گیا۔ خوش گواریت نے طبیعت کے بوجھل پن کو جیسے سرے سے غائب کر ڈالا اُس کی تلخی...... اُس کا اضطراب کہیں دور جا سوئے دیدار یار کے لیے آنکھیں بے قرار ہوئیں۔ ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر آرہ کی تلاش میں اس نے تاحد نظر نگاہ دوڑائی تو ایک مکمل اور جاندار منظر اُس کی ساری توجہ اپنی جانب مبذول کروا گیا۔

وہ دریا کے کنارے گیلی مٹی پر کھڑی بڑی دل جمعی سے کھلے بالوں کو شولڈر کے ایک طرف ڈالے پینٹنگ بنانے میں مصروف تھی اس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں گم تھیں، دھلے دھلائے چہرے کے ساتھ سیاہ لباس میں وہ خود قدرت کی بنائی ہوئی دلکش تصویر دکھائی دے رہی تھی۔

متاع جاں کی طرف بڑھتے ہوئے زیان عالم کو کڑے ضبط سے گزرنا پڑا۔ ادب کو ملحوظ خاطر رکھنا تھا ورنہ دل یہیں سے رخصتی کی گردان میں مصروف ہو گیا۔ وہ بنا آہٹ کیے آرہ کے پیچھے جا کر کھڑا ہوا اور اسے بڑے سے کینوس پر وادی کے حسین مناظر پینٹ کرتے دیکھنا بڑا اچھا لگا۔

"ہمارے فن کا امتحان لینا ہے کیا؟" اس نے بڑے اطمینان سے مڑ کر زیان کو دیکھا اور کپڑے سے برش کو صاف کرتے ہوئے سوال کیا۔

"امتحان میں تو آپ نے ہماری زندگی ڈال دی ہے۔" زیان عالم نے نچلا ہونٹ دباتے ہوئے منکوحہ کی اسمارٹنس کو سراہا۔

"صرف ایک بات بتا دیں۔۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم عمر میں آپ سے ایک سال بڑے ہیں، یہ نکاح کس مجبوری کے تحت کیا؟" وہ سیدھے مدعا پر آئی۔

"اچھا ایک بات کا جواب دیں۔۔ آپ کو کسی سے پیار ہو جائے، اس کے ساتھ زندگی کا ساتھ آسان ہو جائے، مگر وہ تھوڑی سی جھلی ہو تو کیا محبت سے دل موڑ لینا چاہیے؟" اس نے الٹا سوال کیا۔

"ہمارا سوال کچھ اور تھا۔" وہ ناراض لہجے میں بولتی ہوئی دل میں اترتی جا رہی تھی۔

"دیکھیں آرہ۔ اپنے دل سے ہر قسم کے شک وشبہ کو نکال دیں، اس نکاح میں نہ کوئی سمجھوتا ہے نہ کوئی لالچ۔ بس محبت ہے۔ میں نے اپنے دل کی پوری رضا مندی سے آپ کو اپنی منکوحہ بنایا ہے۔" اس نے بڑی سہولت سے آرہ کا ہاتھ تھام کر یقین دلایا۔ "جہاں تک بات عمروں کی ہے تو ایک منٹ ادھر آئیں یہ دیکھیں اور بتائیں کہ ہم دونوں میں سے کون بڑا ہے؟" زیان نے دریا کے کنارے کھڑے ہو کر پانی میں ڈولتے ہوئے ان دونوں کے عکس کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ وہ اس کے لمبے چوڑے وجود کے ساتھ برابر میں کھڑی گڑیا سی لگ رہی تھی۔

"سب کو یہ بات پتا تھی کہ ہم آپ سے ایج میں بڑے ہیں مگر کسی نے پوچھنے یا بتانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ وہ تو جب ہماری نگاہ نکاح نامے میں درج آپ کی تاریخ پیدائش پر گئی تو پتا چلا ہے۔ کیا زندگی پر ہمارا اتنا بھی حق نہیں تھا۔" وہ ایک دم رونکھی ہو گئی۔

"اچھا۔۔ چلیں۔۔ ٹھیک ہے۔۔ اب میں پوچھتا ہوں ۔۔۔ کیا آپ کو ساری عمر کے لیے میرا ساتھ قبول ہے۔" زیان نے گھٹنوں کے بل جھک کر ایک ہاتھ بڑھایا اور بڑی محبت سے پرپوز کیا۔ وہ چپ چاپ اس کو دیکھتی رہی۔

"اگر الگ ہونا چاہیں گی تو یقین جانیں بندہ اف کیے بنا حکم کی تعمیل بجا لائے گا۔" اس نے جان کرشکستہ انداز اپنایا۔

"اب الگ ہونے کا کوئی تصور بھی نہیں ہے۔۔ آپ نے ہمیں معتبر کر دیا۔" وہ اس کی آنکھوں سے نکلتے سحر کے آگے زیادہ دیر تک مزاحمت نہ کر سکی، مسکرا کر اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

آرہ سے مل کر اس کی روح کو عجیب اطمینان حاصل ہوا۔ ایک سرشاری کے احساس کے ساتھ کہ

آگے کے راستے مزید روشن دکھائی دینے لگے۔

آرزہ کو بھی احساس ہوا کہ زیان کا محبت بھرا چھوٹا سا عمل کیسے اس کے اندر زندگی کی لہر دوڑانے کا باعث بنا۔

"ویسے ایک غلط فہمی اور دور کردوں۔" اس نے شرارت سے کہا تو وہ سوالیہ انداز میں اسے تکنے لگی۔

"یاد ہے آپ کے والد محترم نے نکاح سے قبل آپ کو بٹھا کر میرے حوالے سے آپ کی مرضی جاننا چاہی تھی یا نہیں؟" اس نے پوچھا تو آرزہ کو خیال آیا کہ ایسا کچھ ہوا تو تھا۔

"اس وقت وہ آپ سے ہماری عمر کے "معمولی" سے فرق والی بات ڈسکس کرنا چاہتے تھے۔" اس نے معمولی پر زور دے کر اسے دیکھا۔

"ہاں۔۔مگر......" وہ اسے بولنے دیتا تو کچھ بول پاتی بات کاٹ کر پھر سے شروع ہو گیا۔

"میڈم یاد کریں۔۔آپ نے مشرقی لڑکی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے کیا کہا تھا؟"

"کیا......؟" آرزہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"پاپا۔۔جیسی آپ کی مرضی۔۔ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ بھلا اس کے بعد کوئی بات رہ جاتی تھی۔" زیان نے آرزہ کی نقل اتاری تو اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

زیان کی سچائی بتانے پر اس کے سارے شکوے شکایت اور غلط فہمیاں دور ہو گئیں، وہ دونوں وہیں زمین پر بیٹھ کر یوں باتوں میں مگن ہو گئے جیسے درمیان میں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اچانک زیان کی نگاہوں نے کچھ ایسا دیکھا کہ وہ تیزی سے آرزہ کو دھکیلتا ہوا اس کے سامنے آ گیا، فضا میں دھماکا سا ہوا اور گولی اس کے بازو کو چھوتی ہوئی پاس والے درخت میں دھنس گئی۔ آرزہ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ لمحہ بھر کو ساکت سی رہ گئی۔

زیان۔۔آپ ٹھیک تو ہیں۔" بازو سے بہتے خون کو دیکھ کر اس نے متوحش ہو کر زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔

"آئی ایم اوکے۔۔جان...... پریشان مت ہو۔" وہ تکلیف کے باوجود مسکرایا۔

"صاحب...... بی بی......چلیں۔" لمحوں میں کرم علی کے درجنوں گارڈز نہ جانے کہاں سے نکل کر آئے اور ان دونوں کو اپنے حصار میں لے لیا۔

"کوئی ان کو جلدی سے ہاسپٹل پہنچائے۔" آرزہ کو اس کی فکر لگی ہوئی تھی مڑ کر ڈرائیور کو ہدایت دی۔

"صاحب جی۔اس گاڑی میں بیٹھیں۔" ایک ملازم نے فوراً ہی اسے تھاما اور دوسری گاڑی میں بٹھا کر قریبی اسپتال لے گیا۔

"ہمیں بھی ان کے ساتھ جانا ہے۔" اس نے بہت کہا مگر گارڈز اسے واپس گھر لے آئے۔

آرزہ کپکپاتی ہوئی۔ "کرم ولاز" پہنچی تو کرم علی کو بہت غصے میں ٹہل ٹہل کر ڈی ایس پی سے فون پر باتوں میں مصروف پایا۔ ان کے بیچ ہونے والی گفتگو سے اسے پتا چلا کہ یہ اس کے چاچا کے پالتو غنڈوں کی شرارت ہے۔، جو موقع سے فرار ہوتے ہوئے پکڑے گئے۔ ان کا مقصد صرف ڈرانا تھا تاکہ کرم علی پر دباؤ ڈالا جا سکے مگر نشانہ چوک گیا اور گولی زیان کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ فضا کرم نے بے تابی سے بیٹی کو تھام کر گلے لگا لیا۔

"پاپا...... وہ زیان......" اس نے روتے ہوئے باپ کی طرف منہ کر کے فریاد کی۔

"بیٹا۔۔فکر نہ کریں۔ ہم ابھی زندہ ہیں۔" انہوں نے فون کی لائن کاٹ کر اسے تسلی دی۔

"پاپا۔ اگر زیان کو کچھ ہو گیا تو ہم خود کو کبھی معاف نہیں کر پائیں گے۔" وہ روتی ہوئی ایک ہی بات کی گردان کیے جا رہی تھی۔

"وہ ٹھیک ہیں۔ ہماری ڈاکٹر اللہ رکھا سے بات ہو چکی ہے، معمولی سا زخم ہے، تھوڑی دیر میں ڈریسنگ کروا کر واپس بھیج دیں گے۔ ویسے ہم نے ان کا ٹکٹ کروا دیا ہے۔ صبح وہ واپس شہر چلے

جائیں گے۔ اب ہم رخصتی کرنے میں مزید دیر نہیں لگائیں گے۔" کرم علی کے فیصلہ کن لہجے پر اس نے سر جھکا دیا۔

اس وقت آئرہ کو باپ کی دور اندیشی پر یقین اور اپنی سوچ پر شرمندگی ہوئی۔ کوئی لالچ بھی کسی کو اپنی جان خطرے میں ڈالنے پر مجبور نہیں کر سکتا، عشق میں عقل کا گزر نہیں۔ ہاں بس محبت ہی ایک ایسا جذبہ ہے جو بے خطر ہو کر آتش نمرود میں بھی کود پڑنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

☆☆☆

خوشبوؤں سے مہکتا بیڈ روم، فرش پر بچھا دبیز قالین میں آئرہ کے نرم و نازک پاؤں جیسے دھنس سے گئے۔ زیان کے ہاتھ کا زخم مندمل ہو چکا تھا۔ وہ مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھامے حجلہ عروسی میں داخل ہوئی تو بھرپور نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ بیڈ پر گلابی مخملی چادر سرہانے رکھے نرم نرم سے تکیے۔ جس پر گلاب کے پھول بچھے ہوئے تھے، زیان نے بڑی احتیاط سے اسے لا کر بستر پر بٹھا دیا جیسے وہ کانچ کی مورتی ہو۔

"یہ ہمارا نیا گھر ہے۔ پسند آیا تمہیں؟" زیان کی سرگوشی پر بھی وہ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

دونوں کے بیچ خاموشی کی چادر تن گئی۔ اس نے سوچا تھا کہ جب آئرہ کو رخصت کرا کر لائے گا تو اپنے جذبوں کا اظہار ایسے کرے گا، ویسے کرے گا مگر وہ سب کچھ بھلائے، چپ چاپ بیٹھے اسے یوں تکتا رہا جیسے کسی کو اس کی زندگی کی کھوئی ہوئی خوشی مل گئی ہو۔

آئرہ کا جھکے جھکے جب سر دکھنے لگا تو شرم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے خود ہی گھونگٹ اٹھایا۔ اشاروں میں بھاری بھرکم شرارے اور زیورات سے فراغت پانے کی اجازت طلب کی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اقرار میں سر ہلانا پڑا۔

زیان عالم بیڈ پر دراز اسے تک رہا تھا اور وہ ظالم لباس تبدیل کرنے کے بعد آئینے کے سامنے بیٹھی بڑے آرام سے ایک ایک کر کے جڑاؤ زیورات اُتارتے ہوئے اس کے صبر کا امتحان لینے پر تلی ہوئی تھی۔ آئرہ نے گھنے بالوں کی چٹیا کھولی اور انگلیوں سے انہیں سلجھانا شروع کر دیا

زیان نے آئینے میں اس کے عکس کو بہت توجہ سے دیکھا۔ وہ بہت ہی دلکش لگ رہی تھی۔

"تم...... مزید حسین ہو گئی ہو یا میری آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی ہے؟" وہ چپکے سے اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور مدھ بھرے لہجے میں جھک کر سرگوشی کی۔

"زیان۔۔۔ پلیز۔" اس نے اپنا عکس دیکھتے ہوئے شرمائے شرمائے لہجے میں التجا کی۔

"آئینے میں کیا دیکھتی ہو؟ جھانک کر ہماری آنکھوں میں دیکھو صرف اور صرف تمہیں اپنی ہی شبیہ دکھائی دے گی۔" زیان نے آئرہ کا رخ موڑا اور چہرہ مقابل لا کر پیار سے دعوت دی۔

"آپ بھی نا......" اس کی نگاہیں جھک گئیں، دھکا دے کر شوہر کو پیچھے کیا اور شرما کر مہندی لگے ہاتھوں سے گھنے بالوں کا جوڑا بنانے لگی۔

بیڈ کے کنارے پر بیٹھنے کے بعد زیان نے آنکھ کے خفیف سے اشارے سے اُسے اپنے پاس بلانا چاہا تو وہ کسی معمول کی طرح کھنچتی چلی آئی۔ زیان کی محبت اور تعریفوں سے ایسا نشہ چڑھا، جو آنکھوں کی پتلیوں میں پھیلتا چلا گیا۔ حسین ساعتیں دبے پاؤں گزرتی چلی جا رہی تھیں، اچانک اسے کچھ خیال آیا۔

"ہماری منہ دکھائی؟" اس نے مطالبہ کیا۔

"او یس...... منہ دکھائی تو رہ ہی گئی۔" زیان نے زور سے کہا اور آئرہ کا ہاتھ تھام کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہوا؟" وہ گھبرا گئی۔

"چلو۔ منہ دکھائی نہیں چاہیے کیا؟" زیان بولتے ہوئے ساتھ اسے گھسیٹتا ہوا باہر کی طرف چل دیا، وہ حیرت سے ساتھ کھنچی چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆

UUNOVELS.COM

"اچھا۔ مسز زیان جب تک میں نہ بولوں آنکھیں نہ کھولنا۔" اس نے روم سے متصل اسٹور کا دروازہ کھولتے ہوئے ہدایت دی۔

"ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟" وہ پر تجسس لہجے میں مسلسل پوچھ رہی تھی۔

"چلیں..... اندر جا کر دیکھیں تو۔" اس کے جھجکنے پر زیان نے کمر میں ہاتھ ڈال کر کمرے میں قدم رکھا اور جٹ جٹ کر کے لائٹس آن کر دیں۔

"اوہ..... مائی..... گاڈ۔" ایک دم سے ہونے والے اجالے نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔

"یہ..... سب آپ نے ہمارے لیے کیا ہے۔" وہ بھول گئی کہ کہاں کھڑی ہے۔ بس دوڑ دوڑ کر اسٹور میں سجی چیزوں کو شوق سے چھو چھو کر دیکھتی رہی۔

"جی..... جان زیان..... کیسی لگی منہ دکھائی۔ سب سے الگ سب سے منفرد۔ آپ کی طرح نا؟" وہ اترایا۔

زیان نے اسٹور کو چھوٹے سے اسٹوڈیو کی شکل میں ڈھال دیا تھا، وہاں مصوری کے سارے لوازمات موجود تھے، مختلف اقسام کے رنگ، ہر طرح کے برشز ایزل اور اس کا چوڑا سا کینوس، ایک بڑا سا اسٹول آرہ کی آنکھیں خوشی سے نم ہو گئیں، وہ بہت مسرور دکھائی دے رہی تھی۔

"پتا ہے تمہیں دیکھتے ہی میرے دل نے کہا یہ لڑکی آرٹسٹ بننے کے لیے پیدا ہوئی ہے اور یقین کرو۔ مستقبل میں تمہارے ہر خواب کی تعبیر حاصل کرنے میں بندہ ناچیز ہر طرح سے مدد کرے گا۔" اس کی سرگوشی پر تو بے ساختہ سر اٹھا کر اسے تکنے لگی، کہاں سے ڈھیر سارے آنسو آنکھوں میں آ سمائے۔

"خوش ہو نا؟" اس نے آرہ کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پیار سے پوچھا تو وہ اس کے سینے میں منہ چھپا کر سر ہلاتی چلی گئی۔

جس وقت پہلی ملاقات میں آرہ نے زیان سے اپنے خوابوں کا ذکر کیا تھا تو اسی لمحے اس نے اپنے آپ سے عہد کر لیا کہ اگر قسمت نے یاوری کی تو وہ اس معصوم سی لڑکی کو ہر فکر سے آزاد کر کے ایک اسٹوڈیو بنوا کر دے گا تاکہ وہ صرف اور صرف اپنی تخلیقی صلاحیت پر توجہ دے سکے۔ اسے یقین تھا کہ وہ بہت شہرت پائے گی اور بڑے بڑے شاہکار ان نرم و نازک ہاتھوں سے ہی بنائے جائیں گے۔

☆☆☆

زیان فرصت سے اخبار کو نہ صرف بغور دیکھ رہا تھا بلکہ زیرک نگاہوں سے مطالعہ بھی کر رہا تھا، اچانک آرہ اندر داخل ہوئی اور مسکرا کر پوچھا۔

"چائے پئیں گے کیا؟"

"ہاں۔ یار آفس میں بہت کام تھا، سر میں درد ہو رہا ہے۔" اس نے ماتھے کو ہاتھ سے دباتے ہوئے اقرار میں گردن ہلائی۔

ذرا سی دیر بعد دو مگ چائے کے ساتھ آرہ حاضر ہو گئی۔ اس کے قریب ہی کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں مزے سے چائے پینے لگے۔

"ایک بات پوچھیں؟" آرہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ تم پر کوئی پابندی تو نہیں۔"

"ممی..... ہمارے یہاں کبھی بھی نہیں آئیں۔ کیا وہ ہمیں پسند نہیں کرتی ہیں؟"

"ہاں۔ میں بلانا تو چاہتا ہوں..... مگر وہ آنا نہیں چاہتیں۔"

"دور ہو جانے سے رشتے ختم نہیں ہو جاتے۔ ہم انہیں ایک بار پھر بلائیں گے۔" اس کے پرخلوص انداز پر زیان کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھری۔

"آرہ۔ ممی مجھے ماں جیسی کبھی نہیں لگیں کبھی نہیں۔ مگر میں نے انہیں ہمیشہ اپنی ماں سمجھ کر عزت دی۔" اس کے دل کا غبار پہلی بار کسی سامنے نکلنے کو بے تاب ہوا۔ "پتا ہے جب میں پیدا ہوا تو امی کا انتقال ہو گیا۔ پاپا نے دادی کے مجبور کرنے پر نور جہاں آنٹی سے شادی کر لی۔ میں بے ہوش

سنبھالا تو انہیں ہی ماں جانا میرے پاس کوئی اور تھا ہی نہیں مگر وہ میری ممی بھی نہ بن سکی، میں جتنا ان کے لیے ہمکتا، وہ مجھ سے پیار تو کیا اتنی انسیت بھی نہیں رکھتی تھیں۔ انہیں ہمیشہ اپنی فکر رہتی تھی عقل کی بڑھیاں چڑھتے ہوئے انہوں نے مجھے ازبر کروا دیا کہ اس ماں کے ساتھ لفظ سوتیلی جڑا ہوا ہے۔" زیان کے دکھ پر وہ رو دی۔

"چلیں چھوڑیں ---- ہم کوئی اور بات کرتے ہیں۔" اس نے بات بدلنا چاہی مگر وہ جانے کس کیفیت میں مبتلا تھا بولتا چلا گیا۔

"پاپا کی اپنی مصروفیات تھیں اور ممی کی اپنی، نقصان صرف میرا ہوا۔ ایک ایسا وقت آیا کہ میرا دل کرتا تھا کہ میں ہر چیز کو تہس نہس کر ڈالوں مار ڈالوں خود کو۔" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بولا۔

"زیان ---- پلیز ایسے نہیں بولیں۔" آئرہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے محبوب شوہر کو کن الفاظ میں تسلی دے۔

"میں بہت اکیلا تھا آئرہ ---- بہت اکیلا۔" وہ بچوں کی طرح سہمے لہجے میں بولا تو آئرہ نے بے ساختہ زیان کے مضبوط ہاتھ پر اپنا نرم و نازک ہاتھ رکھ دیا۔

"وہ مجھے ایک ٹائم بھوکا رکھتیں تو بھی چلتا مگر جب سب کے سامنے دن میں کئی بار ذلیل کرتی تو ---- ذلت سہنی مشکل ہو جاتی تھی۔" آئرہ کو اس کا دکھ اپنے اندر اترتا ہوا محسوس ہوا۔ "ممی نے پاپا کی زندگی بھی دوزخ بنا کر رکھ دی، اس سے گھر کے معاملات اور پیچیدہ ہو گئے، تو میں اسی لیے ان کی زندگی سے دور چلا آیا۔ وہ اونچا لمبا بھرپور مردانہ ٹانگیں پھیلا کر آئرہ کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

"خوش تو میں اب بھی نہیں ہوں ---- ان سب سے دور ہو کر۔ یوں لگتا ہے جیسے۔ میرے وجود کا ایک حصہ جیسے گم ہو گیا ہے۔" اس نے بولتے بولتے آنکھیں موند لیں۔

"ویسے افراح اور میراب بھائی کا آنا جانا نہ ہو تو ہم تو سسرال والوں کے لیے ترس جائیں۔" اس نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

"ہاں ---- مگر ---- ممی ---- تو نہیں آتی نا۔ کبھی کبھی اکیلا پن سا محسوس ہوتا ہے۔" اس نے سرد آہ اپنے اندر کھینچی۔

"آپ اکیلے تو نہیں ہم ہیں نا۔ آپ کے ساتھ۔" آئرہ نے پیار سے اس کے کانوں میں سرگوشی کی تو سکون اطمینان اور آسودگی زیان کے اندر اترتی چلی گئی۔ بیوی کا ہاتھ اس کے بالوں میں تھا ایک ٹھنڈک اور تازگی کا روح پرور احساس زیان عالم کے جسم و جاں میں سرایت کرنے لگا

"اس زندگی کا شکریہ۔ جس میں تم ہو۔" وہ اپنی فطرت کے حساب سے پرسکون انداز میں گویا ہوا۔

"ہم اپنے اور آپ کے بیچ کوئی تکلف بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ چاہے تھینکس ہو یا سوری۔" وہ بہت قریب ہوتے ہوئے بولی۔

"نئی نئی شادی کے وقت ---- گلابی جذبے دونوں پر حاوی ہونے لگے۔ اس کی کلفتیں راحتوں میں ڈھل گئیں۔

"میں سوچ رہی تھی کے کھانے کے بعد ممی کی طرف چلتے ہیں ---- ان کا تو اب تک مجھ سے ڈھنگ سے تعارف بھی نہیں ہوا ہے۔" آئرہ اسے جتنے پر تل گئی تھی۔

"ابھی نہیں۔ آہستہ آہستہ معاملات ٹھیک ہو جائیں تو پہلے ہم ان کو اپنے نئے گھر پر بلائیں گے جس کا سودا پچھلے ہفتے کیا ہے۔" اس نے فیصلہ سنایا۔

"اچھا ---- چلیں ٹھیک ہے۔ اب اٹھیں کر چل کر کھانا کھاتے ہیں۔" آئرہ نے کچھ سوچ کر ہاتھ بڑھایا۔

"ہونہہ۔ او کے۔" اس نے بغور دیکھا تو عام سے گھریلو حلیے میں بھی وہ دل میں اتر جانے کی حد تک اچھی لگ رہی تھی۔

"ایک منٹ۔ سنو تو ----" زیان نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بلایا تو آئرہ نے کچن کی جانب

دوڑ لگانے میں عافیت جانی۔زیان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا اٹھ کر اس کے پیچھے چل دیا۔کچن میں کھانا گرم کرتی ہوئی آئرہ نے دل میں عہد کیا کہ وہ ان فاصلوں کو کم کر کے،زیان کے وجود کو مکمل کرے گی۔

☆☆☆

شہباز عالم ذہنی طور پر اس دن سے پریشان تھے، جب بیٹا اور بہو نے پہلی بار بڑی التجائیہ انداز میں ان سے کچھ مانگا مگر وہ چاہتے ہوئے بھی نورجہاں بیگم کو بچوں کے نئے گھر میں چلنے کے لیے منا نہیں پائے۔نیا گھر سیٹ ہو گیا تو۔کچھ سوچ کر آئرہ نے ایک چھوٹی سی فیملی گیدرنگ رکھی اور اپنی ساس کو بڑی محبت سے خود کال کر کے نئے گھر آنے کی دعوت دی۔اس وقت تو نورجہاں نے نخرے کرتے ہوئے بہو کو ٹال دیا اور میاں کے پوچھنے پر بھی اس معاملے پر کئی بار سنایا کہ وہ زیان کے گھر نہیں جانے والی ہیں۔

شہباز عالم کو جب کوئی راہ سجھائی نہیں دی تو وہ افسردہ دل سے کرتا شلوار اور واسکٹ پہن کر اکیلے ہی جانے کو تیار ہو گئے۔نورجہاں منہ پر دوپٹا رکھے بیڈ پر لیٹے ہوئے چپکے چپکے شوہر کی تیاریاں دیکھ رہی تھیں جب برداشت نہ ہوا تو اٹھ کر بیٹھ گئیں اور شروع ہو گئیں۔

"آئے میاں۔میرے بغیر کیسے خوشی خوشی جا رہے ہو نا۔ذرا نہیں سوچا کہ میں اکیلی گھر پر بیٹھ کر کیا کروں گی۔"

"چلو نا۔تمہیں تو سب نے اتنی محبت سے بلایا ہے۔"شہباز نے بھی موقع سے مسکہ لگایا۔

"ذرا کی ذرا رکو،میں کپڑے بدل کر ساتھ چلتی ہوں۔"وہ ہر بار نا قابل یقین ہو جاتی تھیں،یا شاید تنہا تنہا رہ کر تھکنے لگی تھیں۔

جب پورا ایک گھنٹہ گزر گیا اور نورجہاں کی تیاری مکمل ہو کر نہیں دی تو شہباز عالم نے کوفت بھرے انداز میں سانس بھری اور تیسری بار بند دروازے کی طرف دیکھا وہ جانتے تھے کہ انہیں جانے کی جس قدر بے قراری ہے،نورجہاں اتنا ہی سستی دکھا رہی تھیں۔

ویسے بھی اس وقت وہ زیان کے نیا گھر خریدنے پر بہت خوش تھے کچھ بول کر بلاوجہ کی چخ چخ سے ماحول خراب کرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔

"کرم علی بھائی نے کتنی منتیں کی کہ وہ آئرہ کو شہر میں بڑا سا بنگلہ خرید کر دے دیتے ہیں مگر اس لڑکے نے ہاں کر ہی نہیں دیا۔"نورجہاں واش روم سے چینج کر کے بڑبڑاتے ہوئے باہر نکلیں۔جب سے انہیں زیان کے سسرال والوں کی امارت کا پتا چلا تھا،وہ شہباز عالم کے پیچھے پڑی رہتی تھیں کہ ان سے جائیداد میں حصہ مانگا جائے۔

"ہاں تو میرا بیٹا خود دار ہے۔وہ کیوں کسی کی جائیداد پر نظر رکھے۔"ایک بار پھر ان کی بات پر شہباز عالم نے اطمینان سے جواب دیا۔

"کسی کی کیوں۔سسر کی اتنی بڑی جائیداد ہے مگر زیان میاں ماچس کی ڈبیا جتنا گھر خرید کر خوشیاں منا رہے ہیں۔"کانوں میں بڑے بڑے نقلی آویزے پہنتے ہوئے نورجہاں بڑبڑائیں۔

"ایسی متنازع جائیداد جس کے پیچھے کتنے لوگوں کا خون بہا اور اب بھی کوٹ کچہری کے چکر لگائے جا رہے ہیں۔اس سے میرے بچے دور ہی رہیں تو اچھا ہے۔"شہباز عالم نے بالوں میں دوبارہ کنگھا پھیرتے ہوئے متانت سے کہا۔

"اچھا۔جب ہی میں کہوں کہ ایسے کیسے ہم جیسے مڈل کلاس گھرانے میں ان رئیسوں کو لڑکی بیاہنے کی سوجھی۔بیٹی کو لڑائی جھگڑوں سے دور بھیجنا تھا۔"وہ آئینے میں دیکھ کر تیز گلابی لپ اسٹک لگاتے ہوئے مڑ کر شوہر کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

"صرف ایک یہ ہی وجہ نہیں۔وہ ہماری نیک نامی اور شرافت کے بھی معترف ہیں۔پھر زیان میں کس چیز کی کمی ہے۔"

''بس کردو میاں۔ کچھ تم نے نیک نامی کمالی۔ کچھ بیٹے کو سکھادیا۔ مگر یاد رکھو اس سے پیٹ نہیں بھرتا'' وہ ہاتھ میں تھاما کنگھا لہراتے ہوئے بولیں او رکس کراو نچا ساجوڑا بنایا۔

''عزت سے گزر گئی۔ کسی چیز کی کمی نہیں۔ پھر بھی تمہارے شکوے شکایت ختم نہیں ہوتے۔'' وہ بلاوجہ کی بحث سے تھک کر بولے۔

''ہاں ہاں۔ میں ہی بری ہوں۔ جو اچھی تھیں وہ تو اوپر جا چکی ہیں۔'' نور جہاں نے سینہ کوبی شروع کردی جس سے وہ ہمیشہ کی طرح گھبرا اٹھے اور ہاتھ تھام کر بیوی کو منانے میں لگ گئے۔

☆☆☆

چکن کی گلابی شرٹ اور گلابی شلوار پر سفید دوپٹا جس کا بارڈر ملٹی کلر کا تھا پہنے، لمبے سیاہ سلکی بال پشت پر پھیلائے وہ بریانی کو دم دیتے ہوئے بہت مصروف دکھائی دی۔ ساتھ ہی ساتھ دوسرے انتظامات بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ اوون میں رکھا چکن روسٹ ہو چکا تھا۔ اس نے چھری لگا کر چیک کیا۔ پہلی بار اس کی ساس یہاں آ رہی تھیں، وہ ہر طرح سے اپنا اطمینان کر لینا چاہتی تھی کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

زیان کچن کے دروازے پر کھڑا مسکراتی نگاہوں سے آئرہ کی مصروفیت کو انجوائے کر رہا تھا۔

''ایک تو پہلے ہی اتنے سارے مسائل ہیں۔ اب جو ہم نے یہ مکان خریدا ہے۔ دیکھنا ممی جی بالکل خوش نہیں ہوں گی۔'' سلاد بناتے بناتے اس نے مڑ کر شوہر کی طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھا۔

''ہاں تو کیا ہوا۔ تمہاری ساس ہیں دو چار باتیں بول بھی جائیں تو برداشت کر لینا۔'' زیان نے کھیرا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا

''پتا نہیں ممی کو ہمیشہ ایسا کیوں لگتا ہے کہ ہم آپ کو نچا دکھانا چاہتے ہیں۔''

''اصل میں ان کو ہماری خود مختاری نہیں بھاتی۔ وہ بہو کو بیٹے کے زیر دست دیکھ کر خوش ہونے والی خاتون ہیں۔'' آئرہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

''ایک بات بتاؤ۔ تم کہیں خود تو نہیں پچھتا رہی ہو کہ کیسے نکمے آدمی سے پالا پڑا ہے۔'' وہ ہنسا۔

''شٹ اپ زیان۔ آپ خود اتنی بڑی کمپنی میں اعلا عہدے پر فائز ہیں۔'' اس نے غصہ دکھایا۔

''ہاں تو کیا ہوا جان۔ اگر کوئی مجھے بیوی کا غلام سمجھتا ہے تو سمجھے اس میں برائی کیا ہے۔'' اس کی حس ظرافت پھڑکی۔

''پلیز۔ زیان سیریس ہو جائیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ ہم آپ پر مکمل طور پر حاوی ہیں اور آپ اب ہم پر انحصار کرنے لگے ہیں۔'' اس نے سرد آہ بھری کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ زیان جیسے مرد کے ساتھ گزارا کرنے کے لیے کتنی برداشت سے کام لینا پڑتا ہے۔

''تم کن چکروں میں پڑ گئی ہو؟ اور وہ تو تم سے ملتی نہیں پھر تمہیں کیسے خبر کہ وہ کیا سوچتی ہیں؟''

''اصل میں پڑوسن آنٹی کی بہن ممی جی کی پڑوسن ہیں، وہ ان سے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑتی ہیں اور آنٹی ہر بات ہم تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔'' اس نے دھیرے سے اعتراف کیا۔

''اوف...... یہ خواتین اگر اپنا پیٹ ہلکا نہ کریں تو شاید ان کا بلڈ پریشر شوٹ کر جائے، بی پی نارمل کرنے کے لیے دل کا بوجھ ہلکا کرنا ضروری ہو جاتا ہے نا؟'' اس نے مذاق اڑاتے ہوئے بے خیالی میں ہری مرچ منہ میں رکھ لی پھر سی سی کرنے لگا۔

''زیان ہمیں لگتا ہے کہ ممی یہ ہی سمجھتی ہیں کہ ہم نے آپ کو دبا کر رکھا ہے۔ شاید ہمارا عمر میں آپ سے بڑا ہونا بھی انہیں چبھتا ہے۔''

''اچھا تو کیا تمہاری ممی پاپا کو بھی میرا عمر میں چھوٹا ہونا کاٹتا ہے۔'' اس نے برابر میں کھڑے ہو کر جھک کر الٹا سوال کیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔ بلکہ آپ ہم سے زیادہ مجبور ہیں۔ ہمیں تو یاد ہے کہ آپ کی عمر کا سن کر جب ہم خوف زدہ ہو گئے اور انکار کر دیا تو سب کے ساتھ آپ نے ہمیں کتنے مزے سے سمجھا کر رخصتی کے لیے منایا تھا۔'' اس نے یاد دلایا۔

"وقت نے ثابت کیا نہ کہ میں ٹھیک اور تم غلط تھیں۔" وہ مسکرایا۔

"ہم تو پریشان تھے کہ یہ سب کیسے ہوگا، دنیا کیا کہے گی مگر اس وقت آپ کو ہم پر کتنا یقین تھا۔ ہماری خوشیوں کے حوالے سے آپ کس قدر پر اعتماد تھے۔" اس نے ماضی کے جھروکوں میں جھانکا۔

"جی جناب۔ کیوں کہ ہماری محبت سچی ہے۔" اس نے آرزو کی انگلیوں کو چومنا چاہا مگر اس نے دھکا دے کر پیچھا کیا۔

"اچھا ــــ سنو ــــ ممی کی باتوں کو دل سے نہ لگاؤ۔ اور باقی سسرال والوں کے بارے میں سوچو۔ افراح تم پر جان لٹاتی ہے۔ پاپا تمہارے ساتھ بیٹھ کر کرکٹ میچز انجوائے کرنا چاہتے ہیں۔ میراب کا منہ بھابھی بھابھی کہتے نہیں تھکتا۔ ہفتے میں ایک بار وہ تمہارے ہاتھ کی کافی نہیں پی لے تو اس کو اپنی زندگی بے کار لگتی ہے اور یہ خاکسار جس کی نگاہوں سے آرزہ اوجھل ہو جائے تو سانس رکنے لگتی ہے۔ اب اگر ممی کچھ کھری کھوٹی سنا دیں۔ تو دل سے نکال دینا؟" اس کے پیار سے دلاسا دینے پر وہ پرسکون ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

"اچھا ــــ اچھا ــــ سنو ــــ تو بیگم۔ ہم بچوں کی خوشیوں میں جا رہے ہیں۔ تمہیں جو کچھ کہنا سنی کرنی ہے، یہیں کر لو مگر پلیز وہاں جا کر کوئی ڈرامہ نہ کرنا۔"

"کیا ــــ میں کوئی ایکٹر ہوں۔ ڈرامے باز ہوں۔ جاؤ میاں! اکیلے چلے جاؤ اب مجھے نہیں جانا۔" وہ پھر ناراض ہو گئیں۔

"اچھا بابا۔ سوری۔ اب وہاں جا کر کچھ نہ بولنا۔" انہوں نے کان پکڑے تب نور جہاں کا منہ پھولا رہا۔

"کیوں نہ بولوں۔ خود تو جاب کرتا ہے۔ بیوی کو بھی کام پر لگا دیا۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ رنگ کرتی پھرتی ہے۔ سنا ہے زیان سے زیادہ تو اس کی کمائی ہے۔" وہ بلبلائیں۔

"توبہ ہے۔ مشہور آرٹسٹ ہے۔ رنگ نہیں کرتی۔ تصویریں بناتی ہے۔ مجسمہ سازی میں ماہر ہے۔ آرٹ کی کلاسز لیتی ہے، بچوں کو رنگوں سے کھیلنا سکھاتی ہے، اپنا چھوٹا سا اسٹوڈیو ہے۔ "دی آرٹ" کے نام سے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں صفائی دینی پڑی۔

مجھے تو لگتا ہے مکان بھی آرزہ نے اپنے پیسوں سے لے کر اپنے نام کرا لیا ہوگا۔ تم ذرا پتا تو کرنا زیان سے۔" وہ پرتجسس لہجے میں بولیں۔

"ہاں تو کیا ہوا۔ دونوں کا پیسہ الگ تھوڑی ہے اور پھر مکان کسی کے نام بھی ہو یہ ہمارا مسئلہ نہیں۔ بس اللہ میرے بچوں کو رہنا نصیب کرے۔ آخر میں نے بھی تو تمہارے نام یہ مکان کیا تھا نا؟" شہباز صاحب نے یاد دلایا تو وہ چپ ہو گئیں۔

"ہونہہ۔ اب چلنا بھی ہے یا میں کپڑے بدل کر لیٹ جاؤں۔" وہ میاں کے ایسے جواب پر تنک گئیں

"ارے چلو نا۔" شہباز عالم نے جوتا پیروں میں پہنا اور باہر کی جانب قدم بڑھایا پھر کچھ سوچ کر پلٹے۔

"اب کیا ہے؟" نور جہاں نے چونک کر شوہر سے پوچھا۔

"ارے بھئی وہ جو میں ماربل کے گل دان لایا تھا وہ کہاں ہیں؟"

"بہو کو گفٹ کرنا ہے۔ کیا ــــ ارے چھوڑو۔ بلاوجہ اتنا وزن اٹھا کر چلیں گے دیکھنا۔ اس نے تو ــــ اسٹور میں رکھوا دینا ہے۔" وہ انکاری ہوئیں۔

"اچھا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو؟" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائے۔

"سارا گھر تو آرزہ نے اپنے حساب سے ڈیکوریٹ کیا ہوگا۔ وہاں بھلا ہمارے گفٹ کی کیا اہمیت ہوگی؟" وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔

''تحفہ کی قیمت نہیں دینے والے کا خلوص دیکھا جاتا ہے۔ اب چلو۔'' ان کے بولنے وہ باہر کے دروازے کی طرف چل دیں۔

☆☆☆

وہ گھر کو لے کر بھی ایسا ہی سمجھیں گی۔ کہ ہم نے اپنی مرضی چلائی ہے۔ حالاں کہ...... یہ ہم دونوں کا خواب تھا جو آج سچ ہو گیا ہے۔'' وہ سلاد کے لیے ٹماٹر کے پھول بناتے ہوئے بولی۔

''جان...... پلیز۔ اب چھوڑ دو۔'' اس نے چھیڑا۔

''کیا چھوڑیں؟''

''ان ٹماٹر کی جان...... اور کتنے پھول بناؤ گی۔'' وہ بے خیالی میں ٹماٹر کے پھول بنائے چلی جا رہی تھی۔

زیان۔ آپ ہمیں سیریس کیوں نہیں لے رہے۔ ہیں؟'' اسے غصہ آنے لگا۔

''بابا اور کتنا سیریس لوں۔۔ پہلے بیوی بنایا۔ اس کے بعد محبوبہ کا درجہ دے دیا۔ اب تو بس انتظار ہے کہ میرے چنو یا منو کی ماں کے عہدے پر فائز ہو جاؤ۔ وہ شرارت پر تلا ہوا تھا۔

''شٹ اپ...... زیان۔'' وہ شرم سے سرخ ہو گئی، چھری اٹھا کر فضا میں لہرائی۔

''او کے...... او کے۔ ریلیکس......'' اس نے بڑھ کر بیوی کے ہاتھ سے چھری چھینی اور کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر منہ اپنی جانب موڑا۔

''چلو۔ زور کی سانس لو...... اور پرسکون ہو جاؤ۔'' زیان نے پیار بھری سرگوشی کی۔

''مجھے پتا ہے کہ تم ممی کے آنے پر تھوڑی ٹینشن میں آ گئی ہو۔ مگر فکر نہ کرو شادی کے کئی سال گزرنے کے بعد تم ان کی باتوں کی عادی ہو جاؤ گی ہم سب کی طرح۔''

''زیان۔ ہم نے ان کے ساتھ اتنا وقت ہی کہاں گزارا ہے۔'' آئرہ کی آنکھ بھر آئی۔

''اچھا۔ میرے ساتھ جتنا وقت گزارا ہے بندہ ناچیز سے کوئی شکایت ہوئی کیا؟'' اس نے بڑی ادا سے پوچھا تو آئرہ نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

''اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے بیچ میں ہے، صرف ایک لفظ ہے جو شادی شدہ زندگی پر محیط ہے۔'' اس نے بڑے اسٹائل سے کہا۔

''کون سا لفظ زیان؟'' اس نے پلکوں کی جھالر اٹھائی۔

''محبت...... محبت...... صرف...... محبت۔'' اس کے مخمور لہجے پر آئرہ کا دل ڈولنے لگا۔

وہ آنکھیں بند کیے پرفسوں لمحات میں کھوئی ہوئی تھی اچانک ایک سوچ ذہن پر بجلی کی طرح لہرائی

''آپ نے ڈرائیور بھیج دیا نا۔'' اس نے پٹ سے آنکھیں کھول کر پوچھا۔

''کون سا ڈرائیور؟'' وہ ابھی تک بے خود تھا۔

''اوہ مائی گاڈ۔ یاد ہے نامی نے کہا تھا کہ اگر زیان ڈرائیور بھیجے گا تب ہی میں آؤں گی۔'' آئرہ نے اسے پیچھے دھکیلا اور یاد دلایا۔۔

''او۔ میں تو بھول ہی گیا۔ وہ صابر کہاں ہے؟ زیان نے چونک کر بیوی کو دیکھا۔

''صابر تو بازار سے روٹیاں لینے گیا ہوا ہے۔'' اسے یاد آیا۔

''گاڑی بھی اپنے ساتھ لے کر گیا ہو گا۔'' زیان نے بیوی کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ کچھ لمحے سوچنے کے بعد اس نے فون نکالا اور کال ملانے لگا۔ شکر ہے میراب نے فوراً ہی فون اٹھا لیا اور اس کی بات سننے لگا۔

☆☆☆

''دیکھا...... ابھی تک نہیں آئی نا۔ وہ سمجھتی کیا ہے گاڑی صرف اس کے پاس ہے۔'' نور جہاں بیگم نے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔

''آتی ہو گی گاڑی...... پتا ہے نا آج کل کتنا ٹریفک جام رہتا ہے۔'' شہباز نے تسلی دی۔

''یقیناً وہ دونوں میاں بیوی ہمیں نیچا دکھانے کے لیے یہ سب کر رہے ہوں گے۔''

''ایک تو تم ہر بات پر اتنا منفی کیوں سوچنے لگتی ہو۔''

''ہاں تو کب سے یہاں کھڑے ہیں...... مگر ان کو کیا پڑی ہے جو وقت پر ڈرائیور کو بھیج دیتے۔'' وہ بھنا کر بولیں اور پرس سے دھوپ کی عینک نکال کر آنکھوں پر چڑھائی۔

''ایسا کرتے ہیں...... اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔'' شہباز نے مشورہ دیا۔

''نہیں...... اب تو میں یہیں کھڑے ہو کر ان کا انتظار کروں گی۔ ویسے بھی اللہ کا شکر ہے ہم ان کے ساتھ نہیں رہتے ورنہ ہماری دو کوڑی کی عزت نہ ہوتی۔''

''پھر وہ ہی باتیں۔'' شہباز عالم نے سمجھانا چاہا۔

''بیٹے سے بڑی عمر کی لڑکی سے شادی کروادی۔ دیکھا نا زیان کو اتنا دبا کر رکھتی ہے، گاڑی بھی ٹائم پر نہ بھیجی۔'' نور جہاں نے ہاتھ اٹھا کر شوہر کو چپ کراتے ہوئے ایک اور بات نکالی۔

''ویسے۔ تم مجھ سے دس سال چھوٹی ہو تا...... تو پھر کون سا تیر مار لیا؟'' ان کا انداز طنزیہ ہوا۔

''ہاں۔ تو کیا کرتی۔ گلی میں کھیلا کرتی تھی جب اماں باوا نے پکڑ کر آپ کے ساتھ شادی کروادی۔'' ان کا جھوٹ بھی ایسا جو سامنے والے پر مکمل طور پر عیاں تھا۔

''اچھا مگر جب ہماری شادی ہوئی تو غالباً تم پچیس سال کی تھیں۔ اس کے باوجود تمہیں کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ ایک نمبر کی پھوہڑ عورت تھیں۔ کھانا پکانا تو دور کی بات ایک انڈا ابالنا بھی نہیں آتا وہ تو اللہ اماں مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے انہوں نے تمہیں سب کچھ سکھا دیا۔'' شہباز نے فوراً ہی بھانڈا پھوڑا۔

''ہاں تو اماں نے جلدی جلدی کر کے ایک دوہاجو آدمی سے بیاہ دیا تھا میں کرتی بھی تو کیا؟'' وہ منہ بگاڑ کر بولیں۔

''یہ ہی تو میں سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ زیان کی ماں کے مقابلے میں تم خود سے کچھ نہیں کر پاتی تھیں۔ بازار جانا ہے، بچوں کا اسکول، گھر کی ذمہ داریوں میں تم مجھ پر بہت زیادہ انحصار کرتی تھی۔ ڈاکٹر کے پاس جانا ہے، گھر کے بلز بھرنے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اب بتاؤ تمہارا مجھ سے عمر میں کم ہونے کے باوجود کیا فائدہ؟'' وہ ہنستے ہوئے یاد دلاتے چلے گئے۔

''آپ کو تو زیان کی ماں کو یاد کرنے کا بہانہ چاہیے۔'' نور جہاں نے منہ بنا کر شوہر کی طرف دیکھا۔

ویسے بھی بہو عمر میں اتنی بھی بڑی نہیں جتنا ڈھنڈورا تم نے پورے خاندان میں دور دور تک پیٹ ڈالا ہے۔'' شہباز اصل بات پر آئے اور ان کی سرزنش بھی کی۔

''ہاں...... مگر...... وہ......'' نور جہاں لاجواب ہو کر خاموش ہوگئیں۔

''میں تو کہتا ہوں میاں بیوی کے مزاج میں ہم آہنگی ہو تو باقی شکل وصورت، عمر وغیرہ ثانوی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔'' ان کی بات میں وزن تھا۔

''اچھا۔ اب بات کا رخ نہ موڑیں۔ اس نے جہیز بھی تو نہیں لیا۔'' نور جہاں نے ایک اور بات نکالی۔

''ہاں تو کیا ہوا۔ یہ زیان کا فیصلہ تھا۔ وہ اس طرح کے ظالم رسم و رواج کے ہمیشہ سے خلاف ہے ورنہ کیا کرم کے پاس دولت کی کمی تھی۔'' انہوں نے فخر سے بتایا۔

''ارے دنیا دیکھ رکھی ہے۔ بہو نے ہی یہ چلتر بازیاں کی ہوں گی نکاح تو ہو چکا تھا۔ ساری پٹیاں اسی کی پڑھائی ہوئی ہوں گی۔ آج کل یہ موبائل بھی تو عذاب ہے وقت سے پہلے ہی آگاہی دے دیتا ہے۔'' وہ میں نہ مانوں کی تفسیر بنی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

''ایک بات تو تم کو ماننی پڑے گی آئرہ نے زیان کی زندگی سنوار دی۔ اس جیسے اڑیل کو نکیل ڈال

دی۔“ شہباز نے سمجھانا چاہا۔

”ہونہہ۔ آپ کو تو بس اپنی لاڈلی بہو کے سوا دنیا میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔“ وہ سڑ گئیں۔

”ہاں تو کیا کمی ہے اس میں؟“ شہباز کے لہجے میں پیار تھا۔

”کمی نہیں زیادتی ہے۔ بڑی ہے زیان سے۔“ طعنہ دیا۔

”تو کیا صرف اس معمولی سی بات پر میں اتنی اچھی لڑکی کو ٹھکرا دیتا۔ جب کہ کرم علی نے مجھے یہ بات پہلی دفعہ میں ہی بتادی تھی۔“ وہ مسکرائے۔

”کتنی اچھی لڑکی بھئی۔“ وہ ہاتھ پہ ہاتھ مار کر ٹھٹھا اڑانے لگیں۔

”میرا بیٹا جو بچپن سے محرومیوں کا شکار رہا۔ اب اس میں کتنی مثبت تبدیلیاں آگئی ہیں، ہنسنے بولنے لگا ہے۔۔ اتنی اچھی لڑکی ہے وہ۔“ شہباز کا طنز ان کے دل پر جا لگا۔

”یہ بھی میرا ہی قصور تھا نا۔ ہاں بھئی سوتیلی ماں جو ٹھہری۔“ رونے والا منہ بن گیا۔

”دیکھو...... دونوں نے مل کر ایک سال میں ہی اپنا گھر بنا لیا۔ تم چاہے بہو کو کریڈٹ نہ دو مگر زیان کی زندگی سنور گئی ہے۔“ وہ اپنی بات پر قائم تھے۔

”وہ جو لوگ باتیں بناتے ہیں کہ ایسی بے جوڑ شادی کی۔ اس کا کیا؟“ نور جہاں نے لفاظی سے کام لیا۔

”لوگ تو ہماری جوڑی پر بھی فقرے کستے تھے تو کیا سب کو سچ مان لیں۔“ شہباز کے کہنے پر نور جہاں خفیف سی ہو گئیں۔

شہباز عالم ہمیشہ سے شہزادوں جیسی آن بان والے اور قدرے کالی رنگت اور موٹے نقوش والی نور جہاں، ساتھ چلتی ہوئی ان کی کنیز لگا کرتی تھیں۔

ابھی بحث مزید کوئی اور رخ اختیار کرتی کہ گاڑی کا ہارن تواتر سے بجنا شروع ہوا۔ انہوں نے نگاہیں اٹھائیں تو افراح اور میراب کو گاڑی میں بیٹھے دیکھا۔ وہ زیان کے گھر جانے کے لیے نکلے ہی تھے کہ اس کا فون آگیا کہ ممی اور پاپا کو لیتے آؤ۔ میراب نے منہ بناتے ہوئے گاڑی موڑ دی اور سسرال پر حاضری لگائی۔

☆☆☆

”ممی...... پاپا...... آئیے نا۔“ ڈور بیل بجنے پر آئرہ نے بڑی گرم جوشی سے دروازہ کھولا اور ساس کے ساتھ بغل گیر ہو گئی۔

”محترمہ...... ہم بھی تو کھڑے ہیں راہوں میں۔“ افراح نے اپنے حساب سے گنگناتے ہوئے بھابی کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

زیان کی معیت میں وہ سب ہال میں داخل ہوئے۔

”واہ۔ بھئی گھر تو بہت خوب صورت ہے۔“ میراب نے گھوم پھر کر جائزہ لینے کے بعد تعریفوں کے پل باندھنا شروع کر دیے۔

”شکریہ بھائی۔“ آئرہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تو زیان نے پیار بھری نگاہوں سے بیوی کو دیکھا۔

”ہاں۔ بس ٹھیک ہی ہے۔ میراب کی تو عادت ہے ایسے ہی ہر چیز کی تعریفیں شروع کر دیتا ہے۔“ نور جہاں کو بہو کی خوشی ایک آنکھ نہیں بھائی فوراً ہی ٹوکا۔ ہال میں ایک دم سے ناگوار سی خاموشی پھیل گئی۔

”میں کھانا لگاتی ہوں۔“ آئرہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”چلو۔ میں بھی تمہاری مدد کرواتا ہوں۔“ زیان ایک دم کھڑا ہوا تو نور جہاں نے طنزیہ انداز میں شوہر کو اشارہ کیا۔

”اٹس او کے۔ آپ بیٹھ کر سب کو کمپنی دیں ہم کر لیں گے۔“ آئرہ ساس کی کیفیت کو سمجھ گئی شوہر کو منع کر دیا۔

”ٹھہریے بھابی میں بھی آپ کی ہیلپ کرنے چلتی ہوں۔“ ماں کے اشاروں کو نظر انداز کرتے ہوئے افراح اس کے پیچھے چل دی۔

☆☆☆

کھانا بہت مزیدار تھا۔ سب نے خوب ڈٹ کر کھایا اور تعریفیں بھی کی مگر نور جہاں نے یہاں بھی بہو کو بہت ٹف ٹائم دیا۔ اور نکتہ چینی جاری رکھی۔

کھانے کے بعد زیان بھی آرہ کے ساتھ مل کر میز کا پھیلاوا سمیٹنے لگا تو نور جہاں سے برداشت نہیں ہوا۔

''زیان۔ تم تو کافی ٹرینڈ ہو گئے ہو۔'' ان کے طنز پر آرہ سپید پڑ گئی۔

''کیا کروں ممی۔ شروع سے پاپا کو ایسا کرتے دیکھا ہے تو مجھے سیکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔'' اس نے پلٹ کر جواب دیا۔

''بھائی۔ شکر ہے کہ آپ پاپا پر گئے ہیں۔ جب ہی تو اتنے سمجھ دار ہیں۔ ممی پر جاتے تو......'' افراح کو بھی ماں کے تیور برے لگے تو بھائی کی مدد کو آگے بڑھی۔

''تو...... کیا؟'' نور جہاں نے غصیلی نظروں سے بیٹی کو گھورا۔

''گرین ٹی چلے گی یا چائے؟'' آرہ نے فوراً ہی ماحول میں تبدیلی کی خاطر پوچھا۔

''چائے۔'' سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

''ارے میں تو بھول ہی گیا۔ بیٹا ذرا گاڑی سے ہمارا گفٹ تو نکال لاؤ۔'' شہباز صاحب کو یاد آیا تو میراب سے کہا تو وہ گاڑی کی چابی گھماتا ہوا باہر کی جانب بڑھ گیا۔ اور واپسی میں ایک بڑا سا باکس اس کے ہاتھ میں تھا۔

''بیٹا۔ یہ ہم دونوں کی طرف سے چھوٹا سا گفٹ۔'' شہباز نے قیمتی فلاور واز آرہ کی طرف بڑھایا تو اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

''تھینک یو پاپا۔'' اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا جلدی سے باکس کھولنے لگی۔

''بیٹا...... پتا نہیں تمہیں پسند بھی آئے گا یا نہیں؟'' وہ لجاحت سے بولے۔

''ایسا کیوں سوچ رہے ہیں پاپا۔'' زیان نے حیرت سے باپ کو دیکھا۔

''اگر پسند نہ آئے تو اسٹور میں رکھوا دینا۔'' شہباز نے بیوی کو دیکھتے ہوئے متانت سے کہا۔

''واؤ...... زبردست کچھ چیزیں ہمیشہ دل کے قریب ہوتی ہیں...... جیسے آپ کا تحفہ...... دیکھیں ہم نے ٹی وی لاؤنج کا یہ کارنر خالی رکھا تھا۔ آپ کے گفٹ کو سجانے کے لیے۔ اب ہم انہیں یہاں سجائیں گے۔'' آرہ نے بڑی محبت سے ریپر اتارنے کے بعد گل دان کو انگلیوں سے چھوا اور سراہا۔

''بیٹا۔ تمہارا گھر ماشاءاللہ بہت اچھا ہے۔ کس نے خریدا۔'' عادت کے برخلاف وہ بولے۔

''پاپا۔ یہ گھر زیان نے اپنی کمائی سے خریدا ہے۔'' آرہ نے شوہر کی طرف فخریہ نگاہوں سے دیکھ کر بتایا تو وہ ہنس دیا۔

''واہ۔ ہمارا بیٹا کب سے اتنا ذمہ دار ہو گیا۔''

''زبردست بھائی۔'' سب نے تالیاں بجا کر اسے مبارک باد پیش کی۔

''بس پاپا۔ آرہ نے سب کچھ سکھا دیا، اوپر والے کے بعد یہ میری خوش گوار زندگی کی نقاش ٹھہری ہے۔'' اس کے اعتراف پر وہ خود کو بڑا معتبر سمجھنے لگی۔

''پاپا۔ ممی۔ گھر تو لے لیا ہے مگر مکمل اس وقت ہوگا۔ جب آپ دونوں یہاں ہمارے ساتھ آ کر رہنے لگیں۔'' آرہ نے نور جہاں کے پیروں کے پاس بیٹھ کر ان کا ہاتھ تھام کر بڑی لجاحت سے کہا۔ وہ گم صم سی ہو گئیں۔

''ممی۔ یہ چابی ہم نے آپ کے لیے بنوائی ہے۔ آپ کے بیٹے کے گھر پر ہم سے زیادہ آپ کا حق ہے۔'' آرہ نے سنہری چھلے میں پڑی چابیوں کا گچھا ساس کو تھما دیا۔

نور جہاں کو پہلی بار اپنی آنکھیں گیلی ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ ان کے سخت سینے کو چیر کر اندر سے جیسے ماتا کے سوتے پھوٹ پڑے وہ آرہ کو خود سے لپٹا کر رو دیں۔

زیان ترسی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا نور جہاں نے ہاتھ بڑھا کر اسے بھی اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

☆☆

بقیہ سروے

والی ساری کہانیاں زندگی کے قریب تر ہوتی ہیں۔ اس لیے افسانوں یا ناولوں کے کردار بھی ہمارے اردگرد بکھرے کرداروں سے کافی مشابہت رکھتے ہیں۔ اس لیے کہانیوں کے کئی کردار ایسے ہیں۔ جس پر کبھی کبھی اپنا گمان بھی ہونے لگتا ہے۔ مثلاً دادا پوتی اور دہ میں صحیفہ کی مردعادات مجھے اپنی زندگی کا ایک دور یاد دلاتی ہیں ہے یا پھر "ساگر کنارے" کی ماحور جیسی کٹھن حالات کا سامنا اور مقابلہ کرنے والی اور اس طرح بہت سے ایسے کردار بھی ہیں۔ جو ہماری پیاری مصنفات خوب صورتی اور سلیقے سے انہیں تخلیق کرتی ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ بندہ اسی کردار میں ڈھل جائے۔ راحت جبین اور فاخرہ جبیں کی ہیروئن یا قانتہ رابعہ کی نیک اور سادہ سی ہیروئن ہو۔ خوبیوں اور حیرت انگیز صلاحیتوں سے مزین ایسے کردار دل کو ایسے چھوتے ہیں کہ خود کو ان میں ڈھلنے کو دل کرتا ہے یہ جیسے کردار آپ کے اردگرد آپ کی روح کے بھی قریب ہوں اور اس کا کریڈیٹ جاتا ہے۔ ہماری رائٹرز کو ہو" اللہ کرے زور قلم اور زیادہ"۔

2۔ کرن شعاع اور خواتین جب سے پڑھنا شروع کیا۔ جب شعور کی منزل بہت زور پر تھی۔ چھوٹی پھوپھو پڑھتی۔ میں نے کتنے ڈائجسٹ چارپائی کے نیچے چھپ کر پڑھے۔ کیونکہ دور بچپن میں مجھ پر پابندی تھی۔ مگر میری وہ حالت کہ گرمنہ کو ایسی لگی کہ چھٹتی ہی نہیں۔ مجھے جنون تھا پڑھنے کا۔ میں نے پڑھا چھپ کے بھی پڑھا اور ہلکی روشنی میں بھی پڑھا۔ اور لوگ باتھ روم سنگر ہوتے ہیں۔ میں باتھ روم ریڈر تھی (ہاہاہا) پڑھنے سے مجھے فائدہ ہوا۔ میں نے کہانی پڑھ کر ہمیشہ مثبت اثر لیا۔ خاص واقعہ جو میری یادداشت میں ابھی تک محفوظ ہے۔ وہ کچھ یوں ہے کہ میری کزن نے بیوٹیشن کا کورس کیا تھا۔ اور وہ میرے بالوں کی کٹنگ کر رہی تھی۔ یاد رہے میرا ہمیشہ سے شولڈر کٹ رہا ہے۔ اب میں کرن میں گم تھی۔ رخ چوہدری کا کوئی شوخ و شنگ سا ناولٹ تھا۔ وہ پوچھتی اور بال کاٹ دوں میں بغیر شیشہ دیکھے "ہاں ہوں" کرتی رہی ناولٹ ختم ہونے تک میرے بال بھی ختم ہو چکے تھے۔ "بوائے کٹ" کے ساتھ میں بوائے لگ رہی تھی۔ "اف جو گھر میں آؤ بھگت ہوئی"۔ میرے کانوں میں بڑی بڑی بالیاں تھیں۔ جو اس وقت فیشن تھا۔ وہ بھی امی نے کھینچ کر اتاریں گنجے سر کے ساتھ یہ اچھی نہیں۔ (اف اتنی بے عزتی مگر کرن سے عشق آج بھی ویسا ہی ہے)

3۔ کرن میں لکھنے والی ساری بہنیں مجھے پسند ہیں۔ ایک عجیب سی انسیت ہیں۔ ایک فیملی ممبرز جیسی لگتی ہیں۔ خاص کر فائزہ بھٹی جو زبردست اور برجستہ تبصرہ کرتی ہے۔ "ریحانہ ان کے الفاظ اور ان کے صلاحیت دونوں پسند ہیں خاص کر ان کا گاؤں بار یہ اچھی لگتی ہے۔ تبسم بشیر سسٹرز اچھا لکھتی ہیں۔ "آج کل اقرا سرور اچھا لکھ رہی ہی ہے تبصرہ۔" میرا پیغام ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر خوش رہو۔ سلامت رہو۔ اور ہنستی رہو۔ اور یوں ہی کرن کی رونق بڑھاتی رہو۔ ان شاءاللہ کرن کی ایک شام میں کبھی تو لیں گے سب اپنے ایورڈ لینے (ہاہاہا)

اقرا امتیاز......سرگودھا

1۔ مصباح علی سید کا ناول "مہجور نشمین" میں کاش روائبہ جیسی معصوم ہوتی۔ فرح بخاری کا ناول "گل کہسار" میں کاش گل آویز جیسی بہادر ہوتی۔ ام طیفور کا ناول "ساگر کنارے" میں کاش موسن جیسا ظرف ہوتا۔

2۔ کرن میں نے 2014 میں پڑھنا شروع کیا لیکن باقاعدگی سے 2015 میں شروع کیا ہمارے گھر میں شروع سے ہی ڈائجسٹ پڑھے جاتے تھے۔ میری پھوپھو جب ہم گاؤں میں تھے اس وقت سب سے چھپ کر اپنی دوستوں کو پیسے دیتی اور رسالہ منگواتی۔ پھوپھو کی شادی کے بعد میری بہن اور کزن صائمہ مشتاق نے پھوپھو کی سیٹ سنبھالی۔ کرن رسالہ سے میرا پہلا تعارف صائمہ مشتاق نے ہی کرایا۔ میٹرک سے پہلے تو صائمہ اپنے رسالوں کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتی تھی گر کوئی غلطی سے اس کے رسالے کو ہاتھ لگا دیتا تو یہ رسالہ ہی پھاڑ دیتی۔ شکر ہے مجھے کسی نے کوئی روک ٹوک نہیں کی کہ کیوں یہ رسالے پڑھتی ہو۔ ایک دو دفعہ تو میرے ابو نے مجھے خود بازار سے رسالے منگوا کر دیے اور میری دادی اماں جب بھی بازار

جاتیں میری لیے ضرور رسالہ لے کر آتیں اب ہمارے گھر میں جب بھی کوئی نیا رسالہ آتا ہے۔ میری چھوٹی سسٹر اس نے انٹرویو پڑھنا ہوتا ہے اور میری دوسری سسٹر نے مسکراتی کرنیں اور اچھی باتیں پڑھنی ہوتی ہیں۔

3۔ خواہش ہے کہ میں ان کے گھر جاؤں، خاص طور پر فائزہ بھٹی، مجھے اس لڑکی سے ملنے کا اتنا شوق ہے۔ میں فائزہ بھٹی کے گھر چوکی جا کر اس کا گاؤں دیکھنا چاہتی ہوں کہ اتنی اچھی اور پیاری لڑکی چوکی کے کس علاقے میں رہتی ہے۔ دوسرے نمبر پر شاہ شہزادی، ماریہ نذیر اور تبسم بشیر مجھے ان سے بھی ملنے کا بہت شوق ہے۔ تبسم بشیر میرا بڑا دل کرتا ہے کہ تمہارے گھر آؤں اور تمہاری والدہ کی عیادت کروں۔ ان سے باتیں کروں، فائزہ بھٹی اور تبسم بشیر کو سالگرہ مبارک ہو۔ فائزہ بھٹی ایڈوانس سالگرہ۔

کرن کی تمام فرینڈز کے نام

گلاب سے خوشبو کو تنہا کون کرے
پلکوں سے آنسوؤں کو جدا کون کرے
اے خدا میری دوستوں کو سلامت رکھنا
ورنہ ہمارے لیے دل سے دعا کون کرے گا

فائزہ بھٹی...... چوکی

1۔ شاید آپ لوگ میری بات پر یقین نہ کریں مگر مجھے ابھی تک کسی بھی رسالے کی ہیروئن میں اپنا عکس نظر نہیں آیا۔ پتا نہیں کیوں۔ مگر مجھے کبھی نہیں لگا کہ یہ میری جیسی ہے یا میں اس کے جیسی ہوں۔ ویسے بھی میں اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ کسی کی خوش بختی یا بدبختی کسی دوسرے کے لیے ویسی نہیں ہوتی۔ ہر ایک پر ہر چیز کا اثر مختلف صورت میں ہوتا ہے۔ بعض اوقات دل کو بہلانے میں کہتی رہتی ہوں۔ دنیا میں ہزاروں فائزہ ہوں گی۔ مگر فائزہ بھٹی ایک ہی ہے۔ خود کو اتنی تو رعایت دینی بنتی ہے نا۔

لوگوں کو اپنے بچپن میں شہزادے شہزادیوں کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں ہمیں جاسوسی شعاع خواتین کی سنائی گئی ہیں۔ اصل میں ابو چاچو ماموں، بھائی، کزن، جاسوسی ناولز پڑھا کرتے تھے۔ باجی شازیہ کالج کے زمانے میں خواتین کے رسالے پڑھا کرتی تھی، مگر ابو سے چھپ کر...... باجی نازیہ نے تو کبھی پڑھے ہی نہیں۔ عالیہ نے بھی خوب پڑھے خواتین رسالے جاسوسی ناولز، باجی شازیہ ہمیں خواتین رسالوں کی کہانی سناتی۔ عالیہ ہمیں جاسوسی کہانیوں کی دنیا میں لے جاتی...... سعدیہ نے بھی خوب پڑھے...... جب کبھی کسی نے بازار جانا ہوتا پرانے رسالے منگواتیں نئے منگواتے ڈرتی تھیں (وہ ساری چھپ کر پڑھتی تھیں) پھر آئی میری باری مجھے تو اللہ نے اس معاملے میں خوب نوازا ان سے قصے کہانیاں سنتے ایک آدھ چھپ کر پڑھتے جب میں میٹرک میں آئی موجیں لگ گئیں۔ ہماری کلاس میں بہت لڑکیاں رسالے پڑھا کرتی تھیں۔ گروپس کی شکل میں بیٹھ کر پڑھنا دوسروں کو سنانا۔ جس کو ڈر ہوتا کہ اس کے بیگ کی گھر میں تلاشی لی جائے گی وہ رسالہ دوسرے کے بیگ میں ٹھونس دیتی۔ ایسے میں بہت ڈائجسٹ گھر لے کر آئی۔ اس وقت گھر میں عالیہ اور سعدیہ پڑھتیں دوسرے دن واپس کرتیں۔ ہماری کلاس کبھی گراؤنڈ میں کھیلنے نہیں گئی تھی۔ یہی کچھ ہوتا تھا۔ ہماری ٹیچر کو پتا تھا۔ یہ رسالے پڑھتی ہیں مگر وہ کہا کرتی تھیں مجھے رزلٹ میں کمی بیشی نہیں چاہیے۔ ٹیچر کی اس خواہش کا ہم بہت احترام کرتے تھے۔ میں نے اسکول میں تفریح ٹائم کہانی پڑھتی چھٹی ٹائم تانگے پر لڑکیوں اور بچوں کو سناتی۔ اس وقت میں بہترین قصہ گو تھی جسے سارے تانگے پر بیٹھتے ہی احترام کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ دوسرے گاؤں سے اپنے گھر تک آنے تک میں ایک کہانی تمام تر جزئیات کے ساتھ ان کو سناتی تھی۔ جب بھی بچوں نے شور کرنا تانگے والے ماموں نے کہنا کہانی سناؤ۔ میٹرک کے بعد باقاعدہ سب کے سامنے ڈائجسٹ منگوانے شروع کیے بازار جانا تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نبیلہ عزیز اور نایاب جیلانی کی کہانی ڈھونڈتی۔ پھر نایاب جیلانی کے زرجان ع... نے ہمیں باندھ لیا۔ اور نبیلہ عزیز کہ دل آور شاہ نے پھر جب سے دل آور شاہ ہمارا ہم سفر ہوا۔ تب سے ہم مسلسل سفر میں ہیں۔ حالانکہ دل آور شاہ کی ہم سفری سال ڈیڑھ تک رہی۔ اس مسلسل سفر میں ہم نے بہت سوں کی ہم سفری کو انجوائے کیا۔ بہت سوں نے سیٹ بدلنے پر بھی مجبور کیا۔ مگر ہم نے سفر نہیں چھوڑا۔

3۔ یہ تو کھلی زیادتی ہے کہ کسی ایک سے کہوں میں تو ساری قاری بہنوں کی محفل جماؤں گی۔ ایک وقت تھا مجھے کرن کی تین قارئین لبیقہ انا، ظل ہما، امبر گل سے ملنے کا شوق تھا۔ کچھ پوچھنا بھی کچھ کہنا بھی تھا۔ اب وہ نہیں ہیں تو بات کیوں کروں۔ آج کی کرن قارئین سے بھی مجھے کچھ کہنا ہے بات کرنی ہے۔ کچھ پوچھنا بھی تو ہے مگر ایک سے نہیں ساریوں سے...... جب آپ نے ایک کی جگہ ساروں کا لکھا۔ اس وقت ہی کچھ پوچھوں گی بھی۔ بتاؤں گی بھی۔ انتظار کروں گی۔ مگر بات تب ہی کروں گی۔

ناہید اسمعیل...... کراچی

1۔ بے شمار کہانیاں ایسی ہیں جن میں اپنا آپ نظر آیا۔ ایسے کردار جو محنتی، مخلص اور شوخ و شرارتی بھی ہوں یا ایسی ہیروئنیں جو خاصی سلیقہ مند اور سگھڑ ہوں۔ لوگ ہمیں ایسا کہتے تھے۔ گو اب شوخی اور شرارتی پن تو حوادث زمانہ نے تقریباً ختم ہی کر دیا ہے پھر بھی کبھی کبھی پرانی عادتیں جاگ سی جاتی ہیں لیکن اب اس کے لیے ضروری یہ ہوتا ہے کہ مقابل طنز و مزاح اور شرارت کو اس کے اصل معنوں میں سمجھنے والا بھی ہو کیونکہ موجودہ دور میں تو لگتا ہے کہ سننے اور سمجھنے کے لیے کسی کے پاس وقت ہی نہیں۔ سوال کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ کس کردار کے جیسا ہونے کی خواہش ہے تو جناب کسی بھی رائٹر کا ایسا کردار جو اپنی ذات کو پس پشت ڈال کر دوسروں کی بھلائی کے لیے کام کر رہا ہو تو بس پھر دل چاہتا ہے کہ کاش یہ ہم ہوتے۔ کہانی میں تو رائٹر کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ قلم کی معمولی جنبش سے کردار کی راہ میں حائل بڑی سے بڑی رکاوٹ دور کر سکتی ہیں۔ جبکہ حقیقی زندگی میں ہم بہت سی معاشرتی پابندیوں میں جکڑے تو کبھی بہت سے دوسرے مسائل میں گرفتار، محدود سے دائرہ کار میں رہ کر ہی کچھ کر پاتے ہیں۔ خواہش رکھنے کے باوجود بھی کہانی کے کردار جیسا نہیں بن پاتے۔

۲۔ روک ٹوک کا تو ہمارے گھر میں کبھی تصور ہی نہیں رہا۔ کیونکہ امی ابو خود رسالے لا کر دیا کرتے تھے اور ہمارا گھر خاندان بھر میں اس حوالے سے کافی مشہور بلکہ یوں کہیں کہ بدنام تھا۔ کیونکہ ایک ہمارے والدین کے علاوہ خاندان میں سب کی سوچ یہی تھی کہ لڑکیاں ڈائجسٹ پڑھنے سے بے شرم ہو جاتی ہیں لیکن ساتھ ہی وہ ہم بہنوں کے سلیقے اور نفاست پسندی کے قائل بھی تھے امی نے صرف ابتدائی تعلیم ہی حاصل کی تھی سو ابو انہیں

کتابیں پڑھ کر سناتے تھے جن میں تاریخی ناول زیادہ ہوتے تھے۔ کرن ڈائجسٹ سے بھی پہلے ہمارا تعارف کرن کتاب سے ہوا۔ پاکستان میں یہ واحد ڈائجسٹ تھا جس کے ساتھ الگ سے بے حد منفرد کتابچہ نما یہ کرن کتاب بھی ملا کرتی تھی جو ڈائجسٹ کی خاص انفرادیت ہوا کرتی تھی "تھی" اس لیے کہ آپ لوگوں نے یہ انفرادیت نجانے کیوں ختم کر دی مفید موضوعات کی وجہ سے ہم بچپن ہی سے اس کی مدد لینے کے عادی ہو گئے تھے اور جو مددگار ہوتا ہے اس کا مقام بھی خاص اور الگ ہوتا ہے۔ سو ہمارے گھر میں کرن کتاب کا الگ شیلف ہوا کرتا تھا اور پھر حسب ضرورت کبھی کچن کے سلیب پر کبھی ننٹنگ کرتے ہوئے گود میں تو کبھی کشیدہ کاری اور سلائی کرتے ہوئے سامنے حتیٰ کہ رمضان المبارک کی طاق راتوں میں مطلوبہ صفحہ کھول کے سامنے رکھنا بے حد آسان تھا لیکن اب ڈائجسٹ کے ساتھ دشوار ہوتا ہے ویسے بھی ڈائجسٹ کے سلسلے کرن کتاب میں آنے لگے ہیں تو وہ پہلے جیسا مزا نہیں رہا۔ تو ہم بتا رہے تھے کہ پہلی بار آٹھ یا نو سال کی عمر میں اسکول سے واپس آتے ہوئے کرن کتاب بک اسٹال پر دیکھی جو ننٹنگ سپلیمنٹ تھی اور کلر فل ٹائٹل کی وجہ سے فوراً توجہ کا مرکز بنی دکان دار انکل نے بتایا کہ بیٹا یہ ڈائجسٹ کے ساتھ ملتی ہے۔ امی نے دلوادی کیونکہ ہم نے کبھی بازار میں کسی بھی چیز کے لیے ضد نہیں کی تھی۔ ویسے بھی خواتین ڈائجسٹ بڑی بہن پڑھتی تھیں سو اس طرح کرن سے پہلا تعارف ہوا۔ آگے کی تفصیل شاید قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث نہ ہو کہ پھر ہم نے گھر پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی امی سے دوسری فرمائش یہ کی کہ ہمیں اون چاہیے امی بھی وہ ہماری ہی ہیں سو فوراً ایک پرانا سوئٹر ادھیڑ کر گولا بنا کے ہمارے حوالے کیا اور اور ہم نے اس ننٹنگ سپلیمنٹ سے بہت سارے ڈیزائن بنائے اور سب کو خوب ہی حیران کیا۔ ظاہر ہے کہ آٹھ سال کی عمر میں جب ہم رات اور دن کو بھلا کر ننٹنگ کرتے نظر آئیں گے تو لوگوں کی حیرانی تو بنتی ہے نا۔ ایک پرانا واقعہ ہے کہ امی نے ہم تینوں بہنوں سے کہا کہ برتن دھو کر چاول ابال لینا ہم خالہ سے مل کر آتے ہیں برتن تو ساتھ خیریت کے دھو لیے ہم نے۔ چاول بھی چولہے پر چڑھا دیے اور جی چولہا بھی جلا دیا پھر سوچا کہ جب تک چاول ابلتے ہیں ایک کہانی تو پڑھی جا سکتی ہے پھر کیا تھا ہم تینوں نے ڈائجسٹ اٹھایا اور ایسے باجماعت ڈائجسٹ میں گم ہوئے کہ ہوش ہی نہیں رہا درمیان میں محسوس ہوا کہ کہیں سے جلنے کی بو آ رہی ہے لیکن تینوں میں سے کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی پھر اور تیز آنے لگی تب ذرا سا چونک کر ہم نے بہن سے کہا کہ "یہ برابر والے بھی عجیب ہیں روز ہی کچھ نہ کچھ جلاتے رہتے ہیں، بڑی بہن بولیں چھوڑو ان کی عادت ہوگئی ہے۔ چھوٹی بولی پھر بھی بندہ اب اتنا بھی بے ہوش نہ ہو۔" یہ مکالمے کر کے تینوں پھر مگن ہوئے۔ خیر افسانے کا اینڈ اور امی کی واپسی ساتھ ساتھ ہوئے اور ظلم یہ کہ تینوں کی یادداشت بھی امی کے واپس آئی اچھل کے تینوں نے بڑبڑاتے ہوئے امی سے پہلے پہنچنے کی کوشش کی جا کے دیکھتے ہیں تو کچن دھواں دھوں، پتیلی اور برتن کالی اور امی کا منہ سرخا سرخ۔ بس پھر، پہلے باجماعت مطالعہ تھا اب باجماعت بے عزتی کہ اللہ اللہ۔ حالیہ واقعہ ہے کہ آفس جانے کے لیے بس میں بیٹھے ایک اسٹاپ کے بعد اسٹال نظر آ گیا بے دھیانی ملاحظہ ہو کہ وہیں اتر گئے اترتے ہی یاد آیا کہ ارے جانا تو آفس تھا چلو اب اتر ہی گئے تو ڈائجسٹ لے لیں، ڈائجسٹ لیا پانچ سو کا نوٹ انہیں پکڑایا اور ورق گردانی کرتے آگے بڑھ گئے کچھ ہی دور گئے تھے کہ لگا جیسے کوئی پیچھا کر رہا ہے، ہم اور تیز قدم ہوئے اتنے میں کوئی بھاگتے قدموں سے سامنے آ کر پھولی سانسوں سے بولا۔ "ارے باجی بقایا پیسے تو لے لیں اف بہت تیز چلتی ہیں آپ۔" یعنی کہ شرمندگی سی شرمندگی تھی۔

۳۔ بہت ساری بہنیں ہیں جن سے ملنے کا دل چاہتا ہے کوثر خالد صاحبہ، تبسم بشیر ان کی امی کے لیے بہت دعائیں کرتی ہوں۔ فائزہ بھٹی، ریحانہ چوہدری، ام انعام، ثمینہ اکرم، ہاجرہ عمران اور وہ ساری بہنیں جو دور دراز جگہوں سے خط لکھتی ہیں۔ سنبل ملک اعوان جو کم ہی شریک محفل ہوتی ہیں اور جو کام وہ کر رہی ہیں ان کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔ پیغام تو بس دعاؤں اور محبتوں کا ہے جہاں تک پہنچے۔

☆☆

شعاع عیُس



شرک

☆ یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے (سورہ لقمان۔13)۔

☆ بلاشبہ اللہ اس بات کو معاف نہیں کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے، البتہ اس کے علاوہ گناہ، جس کے لیے چاہے گا معاف فرمادے گا اور جو اللہ کے ساتھ شرک کا ارتکاب کرتا ہے تو یقیناً اس نے ایک بہت بڑا گناہ (بہتان) باندھا (سورہ النساء۔48)۔

☆ بلاشبہ جو اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے تو یقیناً اللہ نے اس پر جنت حرام کردی ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظاموں (مشرکوں) کے لیے کوئی مددگار نہیں ہوگا (سورہ المائدہ۔72)

☆ اور اگر ان سے شرک کا ارتکاب ہوجاتا تو ان کے سارے عمل اکارت جاتے (سورہ الانعام......88)۔

احادیث

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

☆ "تم مجھے میری حد سے اس طرح نہ بڑھانا جیسے عیسائیوں نے ابن مریم (حضرت عیسیٰ) کو بڑھادیا۔ پس میں تو صرف اس کا بندہ ہوں، تو تم مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہنا۔" (صحیح بخاری، احادیث الانبیاء)

☆ تم قبروں کی طرف نماز نہ پڑھو اور نہ ان پر بیٹھو۔ (صحیح مسلم)

☆ خبردار! تم سے پہلے جو لوگ تھے، وہ اپنے انبیاء اور صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنالیتے تھے۔ سنو! تم قبروں کو سجدہ گاہیں نہ بنانا۔ میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں۔ (صحیح مسلم۔ المساجد)

☆ حدیث شریف میں ہے......

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور قبروں کے اوپر مسجدیں بنانے والوں اور ان پر چراغ جلانے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔
(سنن ابی داؤد۔ الایمان والنذور۔ باب فی زیارۃ النسا القبور، ح: ۳۲۳۶)

سنہرے الفاظ

☆ سچ کہہ دینے سے ذہن کو خلفشار سے نجات مل جاتی ہے۔

☆ غم کتنا ہی سنگین ہو، نیند سے پہلے تک ہوتا ہے۔

☆ جو شخص ناممکن کے پیچھے بھاگتا ہے، وہ ممکن سے بھی جاتا ہے۔

☆ رات کو بھوکا سوجانا صبح قرض دار جاگنے سے بہتر ہے۔

☆ ہر جملہ خوب صورت ہے، اگر وہ ہماری امیدوں کے مطابق ہو۔

ارم کمال......فیصل آباد

خلفاء راشدین

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے علم و تقویٰ کی دولت حاصل کرنے کے لیے بہت سی جماعتیں حاضر ہوئیں۔ ان میں ایک باوجاہت شخص بھی موجود تھا، جس نے سر پر سفید عمامہ باندھا ہوا تھا۔ اس نے سوال کیا۔

"اے امیر المومنین! ہم آپ رضی اللہ عنہ کو خطبہ میں یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ "اے اللہ! ہماری بھی اس طرح اصلاح فرما جس طرح آپ نے خلفاء راشدین کی اصلاح فرمائی۔ ذرا بتایئے وہ کون تھے؟"

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ارشاد فرمایا۔

"وہ دونوں میرے حبیب ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہم ہیں۔ جو ہدایت کے امام اور اسلام کے شیخ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کی اقتداء کی جاتی ہے۔ جو شخص ان کی اقتداء کرے گا، محفوظ رہے گا اور جو ان کے نقش پا کی پیروی کرے گا اسے صراط مستقیم کی ہدایت حاصل ہوگی اور جو شخص ان کو مضبوطی سے تھام لے، وہ اللہ کے گروہ میں ہے۔

(تاریخ الخلفاء)

دعا مصطفیٰ......میرپور میرس

دیس دیس کی کہاوتیں

☆ منہ کا دہانہ تمام مصیبتوں کا سرچشمہ ہے۔ (چینی کہاوت)

☆ حقیقی معنوں میں صرف ایک نوکر اچھا کام کرتا ہے وہ ہے مالک۔ (جرمن کہاوت)

☆ جو بات عقل چھپاتی ہے نشہ اسے ظاہر کر دیتا ہے۔ (لاطینی کہاوت)

☆ پیٹ کے ساتھ بحث کرنا فضول ہے کیونکہ اس کے کان نہیں ہوتے۔ (اردنی کہاوت)

☆ نیند آدھی غذا کا کام کرتی ہے۔ (سوڈانی کہاوت)

ماہا بشیر حسین......ڈنگہ

الجھن کا حل

ایک صاحب نے ٹریفک کنٹرولر صاحب کو اپنی درخواست میں لکھا۔

''جناب عالی! میں نے ''ہائی وے کوڈ بک'' کا بغور مطالعہ کیا ہے، اس میں لکھا ہے کہ ڈرائیونگ سے پہلے اطمینان کر لینا چاہیے کہ ہارن بج رہا ہے؟ لیکن ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ رہائشی علاقے میں ہارن نہیں بجانا چاہیے۔ جس کا مطلب ہے کہ میں روانہ ہونے سے پہلے ہارن بجا کر اطمینان نہیں کر سکتا کہ وہ بج رہا ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ میں ایک رہائشی علاقے میں رہ رہا ہوں۔''

''کوڈ بک میں یہ ہدایات بھی درج ہیں کہ ڈرائیونگ سے پہلے اطمینان کر لینا چاہیے کہ بریک اور اسٹیئرنگ صحیح حالت میں ہیں۔ اسپیڈ میٹر کام کر رہا ہے۔ سائلینسر بند نہیں ہے۔ گاڑی شور نہیں کر رہی ہے۔ دھواں نہیں چھوڑ رہی ہے؟ جناب والا! ان تمام باتوں کا اطمینان کرنے کے لیے ڈرائیونگ ضروری ہے جبکہ کتاب میں لکھا ہے کہ ان تمام باتوں کا اطمینان کیے بغیر گاڑی نہ چلائی جائے۔

میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس الجھن کا کیا حل ہے؟ جواب سے جلد از جلد مطلع فرمائیں کیونکہ میں اپنے گیرج میں گاڑی کے اندر ہی بیٹھا ہوا ہوں۔

فقط......ایک قانون پسند شہری۔''

ادیبہ......لاٹھیانوالہ

فخر دہلی اور شیر پنجاب

مولانا محمد بشیر کوٹلوی ایک دفعہ دہلی جلسے میں گئے، وہاں ایک دہلوی مولوی صاحب بھی تھے۔ پوسٹر میں مولانا بشیر کے نام ساتھ شیر پنجاب لکھا تھا اور مولانا دہلوی کے نام کے ساتھ فخر دہلی لکھا گیا تھا۔ دہلوی مولوی نے پوسٹر دیکھ کر مزاحاً فرمایا۔ ''مولانا اگر شیر پنجاب سے ''ی'' اڑ جائے تو باقی کیا رہ جائے گا یعنی ''شر'' باقی رہے گا۔

مولانا بشیر نے جواباً کہا۔ ''مولانا اگر فخر دہلی سے ''ف'' کاٹ دیا جائے تو باقی کیا بچے گا یعنی ''خر'' بچ جائے، جسے گدھا کہتے ہیں۔''

اس لطیفے سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔

ایک شاعر صاحب وہاں بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے متانت سے فرمایا۔

''قبلہ ان حروف ''ی'' اور ''ف'' کو مت اڑائیے۔ اپنے استعمال میں لائیے۔ شیر کی ''ی'' مولانا دہلوی کو دے دیجیے تاکہ ''خر'' کے بیچ لگا کر ''خیر'' بن جائیں گے۔ فخر کی ''ف'' کو آپ ''شر'' کے آگے لگا کر شرف حاصل کر لیں۔

سب اس محفل میں خوب محظوظ ہوئے، شاعر کو ذہانت کی داد دی۔

زرینہ خانم لغاری......مظفر گڑھ

آفت اور تباہی

چرچل سے پوچھا گیا کہ ''آفت'' اور ''تباہی'' میں کیا فرق ہے؟

کہنے لگا کہ ''حضرات وزیراعظم برطانیہ گلڈ اسٹون حادثاتی طور پر ٹیمز میں گر جائیں تو یہ محض ایک ''آفت'' ہے تاہم کوئی بندۂ نیک اسی وقت ٹیمز میں چھلانگ لگا کر معجزاتی طور پر انہیں بچا لے تو یہ ''تباہی'' ۔

اقراء سرور...... ڈی جی خان

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ "عالم" دین کا طبیب ہوتا ہے اور "مال" دین کا مرض۔ اگر طبیب خود مرض میں مبتلا ہو جائے تو دوسروں کا علاج کس طرح کر سکتا ہے۔ (سقراط)

☆ کمزور شخص کبھی معاف نہیں کر سکتا کیونکہ معاف کرنا مضبوط شخص کا وصف ہے۔ (مہاتما گاندھی)

☆ جہاں صرف جہالت ہی خوش رہ سکتی ہے وہاں عقل مند ہونا بے وقوفی ہے۔ (آئن اسٹائن)

☆ جس چیز کو سنوار نہ سکو اسے مت بگاڑو۔ (شیکسپیئر)

☆ جب آئے دن تمہاری رائے بدلتی رہتی ہے تو پھر اپنی رائے پر بھروسا کیوں کرتے ہو۔ (بوعلی سینا)

تبسم بشیر حسین...... ڈنگہ

لڑکی کی اہمیت

ایک بار ایک لڑکی نے مولانا مودودی سے کہا کہ "ایک بات پوچھوں؟"

مولانا نے کہا۔ "بولو بیٹی! کیا بات ہے؟"

لڑکی نے کہا۔ "ہمارے سماج میں لڑکوں کو ہر طرح کی آزادی ہوتی ہے۔ وہ کچھ بھی کریں، کہیں بھی جائیں ان پر کوئی خاص روک ٹوک نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس لڑکیوں کو بات بات پر روکا جاتا ہے۔ یہ مت کرو، یہاں مت جاؤ، گھر جلدی آ جاؤ......"

یہ سن کر مولانا مسکرائے اور کہا۔ "بیٹی! آپ نے کبھی لوہے کی دکان یا گودام کے باہر لوہے کی بنی چیزیں پڑی دیکھی ہیں؟ یہ گودام میں سردی، گرمی، برسات، رات دن اسی طرح پڑی رہتی ہیں۔ اس کے باوجود ان کا کچھ نہیں بگڑتا اور ان کی قیمت پر بھی کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لڑکوں کی کچھ اس طرح کی حیثیت ہے سماج میں۔ اب آپ چلو ایک سنار کی دکان میں ایک بڑی تجوری، اس میں ایک چھوٹی تجوری، اس میں رکھی چھوٹی سندر سی ڈبی میں ریشم پر نزاکت سے رکھا چھپا تا ہیرا کیونکہ جوہری جانتا ہے کہ اگر ہیرے میں ذرا بھی خراش آ گئی تو اس کی قیمت نہیں رہے گی۔ اسلام میں بیٹیوں کی اہمیت بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ پورے گھر کو روشن کرتی ہیں اور اس میں خراش آ جائے تو اس کے گھر والوں کے پاس کچھ نہیں بچتا۔ بس یہی فرق ہے لڑکیوں اور لڑکوں میں۔"

ماہا بشیر حسین...... ڈنگہ

دور حاضر کے اقوال زریں

1۔ دوست وہ جو "کمرہ امتحان" میں کام آئے۔

2۔ صبح کا بھولا شام کو آئے تو کچھ ساتھ ضرور لائے گا۔

3۔ فیس بک کے چہرے...... دکھانے کے اور...... اصل میں اور......

4۔ اچھا وہ مہمان جو اپنا ہاتھ والا پنکھا ساتھ لائے۔

5۔ غصہ آنا مرد کی نشانی ہے۔ غصہ پی جانا شادی شدہ مرد کی نشانی ہے۔

فوزیہ ثمر بٹ...... گجرات

"کرن" کی سالگرہ

کرن کرن سلام آیا
ہر مہینے نیا پیام لایا
افسانے، ناولٹ، ناول لایا
کچن اور آپ سے کرن کا دسترخوان بچھایا
کرن کرن خوشبو محسوس کر کے
مجھے یہ شعر پسند آیا
نامے میرے میں اپنا نام بھی ڈھونڈا
لوگوں کا تبصرہ سن کر قرار آیا
یادوں کے دریچے میں کھو کر
نمبر ون مجھے یہ شعر پسند آیا
پورے ماہنامے سے موتی چنے ہیں
ہر ماہ کا مضمون پسند آیا

مبشرہ، ام مریم...... چیچہ وطنی

بشریٰ محمود



ماریہ نذیر، کی ڈائری میں تحریر

ن۔م راشد کی نظم

میں اسے واقفِ اُلفت نہ کروں!

سوچتا ہوں کہ بہت سادہ و معصوم ہے وہ
میں ابھی اس کو شناسائے محبت نہ کروں
روح کو اس کی اسیرِ غمِ اُلفت نہ کروں
اس کو رسوا نہ کروں، وقفِ مصیبت نہ کروں
سوچتا ہوں کہ ابھی رنج سے آزاد ہے وہ
واقفِ درد نہیں، خوگرِ آلام نہیں
سحرِ عیش میں اس کی اثرِ شام نہیں
زندگی اس کے لیے زہر بھرا جام نہیں
سوچتا ہوں کہ محبت ہے جوانی کی خزاں
اس نے دیکھا نہیں دُنیا میں بہاروں کے سوا
سوچتا ہوں کہ غمِ دل نہ سناؤں اس کو
سامنے اس کے کبھی راز کو عریاں نہ کروں
خود تو وہ آتشِ جذبات میں جل جائے گی
اور دُنیا کو اس انجام میں تڑپائے گی
سوچتا ہوں کہ بہت سادہ و معصوم ہے وہ
میں اسے واقفِ اُلفت نہ کروں

ارم کمال، کی ڈائری میں تحریر

مبارک صدیقی کی غزل

حالتِ حال کے سبب، حالتِ حال ہی گئی
شوق میں کچھ نہیں گیا، شوق کی زندگی گئی

ایک ہی حادثہ تو ہے اور وہ یہ کہ آج تک
بات نہیں کہی گئی، بات نہیں سنی گئی

بعد بھی تیرے جانِ جاں، دل میں رہا عجب سماں
یاد رہی تری یہاں، پھر تری یاد بھی گئی

صحنِ خیالِ یار میں، کی نہ بسر شبِ فراق
جب سے وہ چاندنا گیا، جب سے وہ چاندنی گئی

اس کی امیدِ ناز کا، ہم سے یہ مان تھا کہ آپ
عمر گزار دیجیے، عمر گزار دی گئی

اس کے وصال کے لیے، اپنے کمال کے لیے
حالتِ دل کہ تھی خراب اور خراب کی گئی

مریم یونس، کی ڈائری میں تحریر

کلیم عاجز کی غزل

ظالم تھا وہ اور ظلم کی عادت بھی بہت تھی
مجبور تھے ہم اس سے محبت بھی بہت تھی

اس بُت کے ستم سہہ کر دکھا ہی دیا ہم نے
گو اپنی طبیعت میں بغاوت بھی بہت تھی

واقف ہی نہ تھا رمزِ محبت سے وہ ورنہ
دل کے لیے تھوڑی سی عنایت بھی بہت تھی

یوں ہی نہیں مشہورِ زمانہ میرا قاتل
اس شخص کو اس فن میں مہارت بھی بہت تھی

کیا دورِ غزل تھا کہ لہو دل میں بہت تھا
اور دل کو لہو کرنے کی فرصت بھی بہت تھی

ہر شام کو سناتے تھے حسینوں کو غزل ہم
جب مال بہت تھا تو سخاوت بھی بہت تھی

اقرا مرزا کی ڈائری میں تحریر
فراق گورکھپوری کی غزل

رات بھی، نیند بھی، کہانی بھی
ہائے کیا چیز ہے جوانی بھی!

ایک پیغام زندگانی بھی
عاشقی مرگ ناگہانی بھی

دل کو اپنے بھی غم تھے دنیا میں
کچھ بلائیں تھیں آسمانی بھی

تنگنائے دل ملول میں ہے
بحر ہستی کی بیکرانی بھی

خلق کیا کیا مجھے نہیں کہتی
کچھ سنوں میں تری زبانی بھی

دل بدنام تیرے بارے میں
لوگ کہتے ہیں اک کہانی بھی

وضع کرتے کوئی نئی دنیا
کہ یہ دنیا ہوئی پرانی بھی

دل کو آداب بندگی بھی نہ آئے
کر گئے لوگ حکمرانی بھی

پاس رہنا کسی کا رات کی رات
مہمانی بھی، میزبانی بھی

زندگی عین دید یار فراق
زندگی ہجر کی کہانی بھی

تبسم بشیر حسین، کی ڈائری میں تحریر
امیر مینائی کی غزل

پرسش کو مری کون مرے گھر نہیں آتا
تیور نہیں آتے کہ چکر نہیں آتا

ڈرتا ہے کہیں آپ نہ پڑ جائے بلا میں
کوچے میں ترے فتنۂ محشر نہیں آتا

جو مجھ پہ گزرتی ہے کبھی دیکھ لے ظالم
پھر دیکھوں کہ رونا تجھے کیونکر نہیں آتا

کہتے ہیں یہ اچھی ہے تڑپ دل کی تمہارے
سینے سے تڑپ کر کبھی باہر نہیں آتا

دشمن کو کبھی ہوتی ہے دل پر مرے رقت
پر دل یہ ترا ہے کہ کبھی بھر نہیں آتا

ہم جس کی ہوس میں ہیں امیر آپ سے باہر
وہ پردہ نشیں گھر سے باہر نہیں آتا

مدیرہ کرن

نامے میرے نام

ماریہ نذیر

ٹائٹل بہت دیدہ زیب تھا دلکش رنگوں سے مزین ٹائٹل پہ نظر ٹک سی گئی۔ (اداریہ) لفظ لفظ موتیوں میں تولنے کے قابل ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے پاکستان کے ہر شہری کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ (آمین)۔ (مقابل ہے آئینہ) میں شہلا گل سحر کے جوابات بہت اچھے لگے۔ تینوں شعر لاجواب تھے۔ (میرے ہم نفس میرے ہم نوا) کی قسط بہت اچھی لگی۔ ارسلہ سکندر بھائی کو کہہ رہی ہے۔

کس طرح کسی اور سے محبت کر لوں؟
مجھے خود سے زیادہ کوئی پیارا نہیں لگتا

(ہوائیں رخ بدل گئیں) واہ جی واہ نگہت آپی کمال کر دیا آپ نے تو۔ ہوا کا رخ واقعی بدل گیا ہے جو غزنی کے والد صاحب خزی کے پاس گئے ہیں۔ مجھے لگتا خزی اور سارہ میں سے ایک کی موت ہو جائے گی اور پھر سب اچھا اچھا ہوگا (ساگر کنارے) ام طیفور آپی مجھے بہت دکھ ہوا بہت زیادہ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا بھلا کیسا؟ کہانی تو بہت اچھی تھی مگر آپ ساتھ چھوڑ رہی ہیں تو دکھ ہو رہا ہے بہت۔ میں تب خوش ہوں گی اگر آپ ایسا ہی مزاح سے بھرپور ناول اور لے کر آئیں۔ ڈھیر ساری تعریفیں آپ کے لیے۔ آپی جی تھوڑی سی کمی یہ رہ گئی ہے کہ سالک اور ابرش کو بھی شادی پہ آنا چاہیے تھا۔ (کچھ لمحے ہم پر قرض تھے)۔ دو قسطیں اکٹھی پڑھی ہیں بہت مزے کا ناول تھا۔ جن پہ زیادہ اعتبار ہوتا ہے وہی دھوکا دیتے ہیں۔ عنایت اللہ کی موت کا دکھ ہوا اور مومی کے صبر پہ رشک آیا۔ عالیان کی ثابت قدمی اچھی لگی۔ ارحم کی نوک جھوک مزا دے گئی۔ بہت ساری تعریف سدرہ حیات۔ (آسان) نعیمہ ناز کا سبق آموز افسانہ اچھا تھا۔ جب خود پر بیتی ہے تبھی پتا چلتا ہے۔ انمول کو اب اچھے سے پتا چل گیا ہوگا کہ کمائی کھانا واقعی ہی آسان نہیں ہوتا۔ (صفائی پسند) عندلیب زہرا اچھے موضوع کے ساتھ آتی ہیں۔ سوچ اور دل و دماغ کی صفائی ضروری ہے۔ گھر تو صاف ہو ہی جاتے جلد یا بدیر۔ (نازک آبگینہ ہوں میں) نظیر فاطمہ ناس (اک نئی کہانی) ام ہانی کا افسانہ سبق آموز تھا۔ رابعہ جیسی ساس سب کو ملنی چاہیے جو بہو کے آرام کا خیال رکھتی ہے جواباً بہو بھی اچھا ردعمل دکھائے۔ (پھل فروش) سندس جبیں نے بھی اچھا سبق دیا۔ کسی بھی پیشے کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔ شاباش سندس (نظریں چرانا) زرمین سرھیو کا افسانہ بھی اچھا لگا۔ شادی کے بعد لڑکی اپنے ماں باپ کے گھر مہمان ہوتی ہے شوہر کا گھر اصل گھر ہوتا ہے۔ چاہے جیسا بھی ہو ہر حال میں گزارا کرنا چاہیے ورنہ لوگوں کی زبانیں انسان پکڑ نہیں سکتا۔ (میرے مہربان) ثمینہ مشتاق کا محبت پر مبنی افسانہ اچھا لگا۔ (پھر اسی راہ گزر پر) منعم ملک کا ناول بھی اچھا تھا۔ (بہت ساری تعریف) کرن کرن خوشبو میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ سب بہنوں نے بہت اچھا لکھا۔ کسی ایک کا نام لینا بے ادبی ہوگی۔ (یادوں کے دریچے سے) سب کی غزل اور نظم اچھی لگی۔ ہر کسی کی پسند لاجواب ہے بھئی (نامے میرے نام) ثناء شہزاد شکریے کی کوئی بات نہیں۔ فضہ نور عرصہ بعد آپ کی تشریف آوری ہوئی۔ مریم یونس میرا انتخاب پسند کرنے کا شکریہ۔ ساجدہ جاوید جس طرح آپ نے میرے خط کی تعریف کی ہے سمجھ میں نہیں آرہا آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ دلی مسرت ہوئی آپ کی سطور پڑھ کر۔ بہت شکریہ بہت خوش رہیں آپ اور آپ کا سایہ آپ کے بچوں پر تا عمر رہے۔ آمین۔ سحر وقاص والسلام خوش رہو۔ تبسم بشیر، اقرا سرور، صفیہ رانی آپ سب کا شکریہ اور میرا انتخاب پسند کرنے کا۔ فوزیہ ثمر بٹ اور فائزہ کی کمی محسوس ہوئی ہے۔ ارم کمال آپ کہاں غائب ہیں کرن کتاب رنگا رنگوں سے مزین اعلیٰ دیدہ زیب۔ (مہندی کی رسم) مجھے بہت پسند ہے۔ بھئی بتاؤ دوستو کون کون میری مہندی پہ آئے گا (ہاہاہا)۔ دونوں بہنوں کا باورچی خانہ اچھا لگا۔ دستر خوان مزے مزے کے کھانے تھے۔ بریانی کھاؤں گی میں تو۔ شعر مجھ سمیت سب کے لاجواب "مسکراتی کرنیں" بہت اچھی تھیں۔ (کچھ موتی چنے ہیں) میں میرا نام غائب کر دیا۔ اشفاق احمد کے زاویہ سے اقتباس میں نے بھیجا تھا۔ بہر حال کوئی بات نہیں بھول چوک ہو جاتی ہے۔

ج: ماریہ جی! اپنی بھول کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ آپ سب بہنوں کے مشورے زیر غور ہیں۔ ان شاء اللہ جلد ہی عمل ہوگا۔

اقراء ممتاز...... سرگودھا

ٹائٹل گرل بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ ''مقابل ہے آئینہ'' میں شہلا گل سحر کی سنی جوابات پسند آئے۔ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' ربیکا میں کچھ زیادہ ہی نخرا ہے۔ حمزہ تم ہی اپنی ضد چھوڑ دو۔ جہانداد صاحب ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم نگہت آپی سے ریکویسٹ کریں گے کہ شہرینہ کی شادی تم سے کروا دیں۔ بس اب تم حمزہ کے ساتھ شہرینہ کو دیکھ کر دل چھوٹا نہ کر لینا۔ ''پھر اسی راہ گزر پر'' کیا کمال اسٹوری تھی۔ کہیں ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے تو کہیں آنکھیں نم ہوئیں۔ ایسی مثالی دوستی۔ ''کچھ لمحے ہم پر قرض تھے'' ہیپی اینڈ رہا۔ عالیان کاش یہ ہی اسٹینڈ تم پہلے لے لیتے تو مومی گل کو اتنے مشکلات سے لڑنا نہ پڑتا۔ پہلی قسط بھی زبردست تھی۔ اب بات ہو جائے اپنے فیورٹ ناول ''ساگر کنارے'' کی آخری قسط دھماکے دار تھی۔ اس اسٹوری کو پڑھنے سے پہلے میں نے باقاعدہ اپنے ہاتھوں پر مہندی لگائی۔ میں نے بھی تو ماحور اور مومن کی شادی پر جانا تھا۔ ہاہاہا۔ دادا جی آپ نے مومن کو بالکل ماحور کے اردگرد نہیں پھٹکنے دینا چاہیے تھا۔ شادی سے پہلے کیسی باتیں کر رہا تھا۔ دلہن جیسی بھی ہو مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ ماحور کو دیکھ کر تو پاگل ہی ہو گیا تھا۔ ایسی انوکھی شادی اور انوکھی دلہن پہلی دفعہ دیکھی ہے۔ مومن ایسا شاندار استقبال۔ دل خوش ہو گیا۔ ام طیفور آپی جی بہت بہت مبارک ہو اتنے شاندار ناول پر۔ ''نازک آبگینے ہوں میں'' اپنوں کی بے رخی کی ماری ہوئی شاندانہ۔ مشکل وقت میں اس کے والدین کو اس کا سہارا بنانا چاہیے تھا۔ افسانہ ''میرے مہربان'' شرجیل نے صحیح بہادری دکھائی۔ لگن سچی ہو تو منزل مل ہی جاتی ہے۔ ''نامے میرے نام'' سب بہنوں نے بیسٹ لکھا۔ ماریہ نذیر کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح بیسٹ تھا۔ کرن کا قارئین میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے بہت زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ کیونکہ کرن ڈائجسٹ ایک بیسٹ رسالہ ہے۔ فضہ نور ویلکم جی بڑے دنوں بعد حاضری دی اور شکریہ مجھے یاد رکھنے کے لیے کرن کتاب ہمیشہ کی طرح بیسٹ رہی۔ کرن فروری 2020 کا پورا رسالہ بیسٹ رہا۔ میری طرف سے کرن کے تمام اسٹاف اور قارئین کو کرن کی سالگرہ مبارک ہو۔

ج: اقراء جی! ہماری حوصلہ افزائی کرنے کا بہت شکریہ۔

سحر وقاص...... کریم پارک لاہور

سرورق کی ماڈل پیاری لگی خاص طور پر اس کی تھوڑی پر لگائے گئے تل جو کہ اس پر جچ بھی رہے تھے۔ اس کے بعد ''حمد'' اور ''نعت'' سے مستفید ہوئے اور پھر ڈائریکٹ چھلانگ لگائی ''ساگر کنارے'' پر مجھے تو پہلے ہی لگ رہا تھا کہ مومن اور ماحور کی شادی ہی ہوگی مگر ان کو ہی پردے میں رکھا جائے گا۔ دادا جی تسی جی گریٹ اور سویٹ دادا کے جملے، مومن کا بیزار پھرنا اور ماحور کی بے چینیاں دیکھ کر بڑا مزا آیا اور آخر میں مومن کی دھلائی اور دادا کا کمرے میں پرانے برتن رکھنا کیا آئیڈیا تھا۔ ام طیفور جی اتنا شاندار ناول لکھنے پر بے تحاشا مبارک باد۔ ارے ارے ابرش تمہیں بھی تمہارا سالک مبارک ہو۔ اب ہو جائے سلسلے وار ناول کی اور افسانوں کی۔ ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' یہ کیا ارسلہ بی بی تم عابس کی تصویر پر ہی مر مٹیں بنا ملے، پرکھے، تم سکندر جیسے بندے کو چھوڑ کر پچھتاؤ گی ضرور۔ سکندر میاں ہم دکھ کی اس گھڑی میں تمہارے ساتھ ہیں۔ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' بہت کم صفحات اور آہستہ رفتار۔ حمزہ ابھی تک شہرینہ کو بھول نہیں پایا حالانکہ نکاح تو دونوں کے درمیان محبت پیدا کر دیتا ہے افسانے سارے ہی اچھے تھے ''صفائی پسند'' عندلیب زہرا کہیں آپ نے مجھے تو نہیں دیکھ لیا ایسا لگا میں ہوں۔ مجھے تو گھر میں ''صفائی پسند'' کا خطاب ملا ہوا ہے ''آسان'' نعیمہ ناز نے صحیح کہا کہ کسی کی کمائی کھانا اتنا آسان نہیں ہے۔ ''پھل فروش'' محمد حسین کا خواب اس کے بیٹے کو ہی پورا کرنا ہوگا۔ ''اک نئی کہانی'' ام ہانی نے اچھا سبق دیا اک نئی سوچ دی آج کی لڑکیوں کو جو ساس کو ظالم ہی سمجھتی ہیں ارے بھئی ساس اچھی بھی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ میری ساس کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے بہت اچھی تھیں۔ ''کرن کتاب'' اچھی رہی۔ دسترخوان میں بریانی سے فائدہ اٹھایا۔ دہلی کی بریانی ٹرائی کی اچھی بنی۔ شعر سب ہی اچھے تھے۔ ''کچھ موتی چنے ہیں'' میں اشفاق احمد صاحب کی دعا اور ماہا ملک کی عورت اچھی لگی ایک گزارش ہے۔

ج: سحر وقاص جی! صفحات کی کمی کی وجہ سے خطوں کی ایڈیٹنگ کرنا ہماری مجبوری ہوتی ہے۔ جس کے لیے ہم اپنی قاری بہنوں سے معذرت خواہ ہیں۔ آپ کی فرمائش پوری کرنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔

ثناء شہزاد...... کراچی

ٹائٹل پر موجود ماڈل اچھی لگی مسکراہٹ بہت پیاری تھی۔ فہرست پر نظر ڈالی اچھے اچھے نام نظر آئے۔ پھر پہنچی ''اداریہ'' پر جو ہر بار کی طرح کسی نا کسی نئی خبر کے ساتھ موجود تھا۔ آسیہ مرزا کے ناول ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' پر وہاں جا کر دیکھا تو پتا چلا سکندر کے ساتھ بہت برا ہو چکا ہے ارسلہ ڈائمنڈ رنگ پہن کر تو ہواؤں میں اڑ رہی ہے مگر جب آبص کو دیکھے گی تب کیا ہوگا ویسے مجھے لگ رہا ہے اتنا فرق پڑے گا نہیں اسے آبص کو دیکھ کر۔ نعیمہ ناز نے ''آسان'' افسانہ بہت خوب صورت لکھا۔ میکے مہمانوں کی طرح جانا تو اچھا ہے مگر جب وہاں رہ کر کام کرنے پڑ جائیں تب اپنے شوہر کا گھر یاد آ جاتا ہے۔ منعم ملک کی تحریر ''پھر اسی راہ گزر پر'' بہت پسند آئی۔ شیر دل کے مرنے کا جہاں دکھ ہوا وہاں خوشی بھی ہوئی کہ شاہ میر نے حق دوستی نبھایا عادل کی بے حسی ایک آنکھ نہ بھائی۔ ''صفائی پسند'' میں عندلیب زہرا نے بہت اچھا سبق دیا انسان کا اندر صاف ہونا چاہیے جس میں کسی کے لیے بھی میل نہ ہو۔ نظیر فاطمہ کی کہانی ''نازک آبگینہ ہوں میں'' اپنے نام کی طرح پیاری اور منفرد لگی۔ تھوڑی غلطی شاندانہ کی بھی ہے اسے اپنی ماں کو سب بتا دینا چاہیے تھا بعض اوقات ہم چھوٹی چھوٹی معمولی باتوں کو اہمیت نہیں دیتے اور بعد میں جا کر یہ معمولی باتیں اچھی بھلی زندگی میں طوفان لے آتی ہیں۔ ام ہانی نے ''اک نئی کہانی'' بہت اچھی لکھی۔ کاش سب ساس ایسا سوچنے لگیں تو زندگی کتنی خوش گوار ہو جائے۔ ''ساگر کنارے'' کا اتنا اچھا اختتام کرنے پر ام طیفور کو بہت بہت مبارک ہو ماحور اور مومن کا حسین ملاپ بہت خوب۔ سندس جبیں نے ''پھل فروش'' بھی اچھی لکھی کہانی جو پیشہ اللہ پاک نصیب میں لکھ دے اس کی عزت کرنی چاہیے۔ نگہت عبداللہ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' کا اب بس اینڈ کر دیں بے جا طوالت بور کرنے لگتی ہے۔ نرمین کا ''نظریں چرانا'' بھی بہت پسند آیا۔ ثمین مشتاق نے ''میرے مہربان'' بھی بہت اچھی لکھی۔ اب آتی ہوں اس کہانی کی طرف جس کا ایک مہینے سے انتظار تھا۔ ''کچھ لمحے ہم پر قرض تھے'' سدرہ حیات نے بہت ہی زبردست لکھا۔ لڑکی محبت کر کے بہت کمزور ہو جاتی ہے مگر موی گل محبت کر کے اور مضبوط ہو گئی۔ ''کرن کتاب'' میں میک اپ کرنے کا طریقہ بتایا گیا جو بہت اچھا لگا کیونکہ مجھے میک اپ کرنا نہیں آتا۔

ج: بہت شکریہ۔

فائزہ بھٹی...... پتوکی

ٹائٹل گرل کو پٹھانی بنانے کی سر توڑ کوشش کی گئی تھی۔ جو کہ کسی حد تک کامیاب ٹھہری اور لڑکی اچھی لگ رہی تھی۔ ''مقابل ہے آئینہ'' شہلا گل سحر اچھا لگا تم سے مل کر...... ایک بات تو بتاؤ آپ کا دل تو ہر شخص کے سینے میں رکھ دیں مگر اتنے کارڈیالوجسٹ کہاں سے آئیں گے؟ (تم نے بھی یہ نہیں سوچا ہوگا ہے ناں؟) تم مجھے اداس نہیں دکھتیں مگر میں پھر بھی کہوں گی ''خدا دے تم کو دائمی خوشیاں'' ''میرے ہم نفس'' ارسلہ بعض چمکتی چیزیں سونا نہیں پیتل ہوتی ہیں وہ بھی بلٹ کی صورت۔ اگر لگ جائے تو جان لے کر چھوڑتی ہے۔ سکندر محبت کو اعزاز کی طرح رکھو۔ نیلوفر دوسروں کے کیے پر خود کو الزام دینا کوئی دانشمندی نہیں۔ ''ساگر کنارے'' سالک اب کہیں جا کر اچھے لگے ہو۔ پہلے تو ہم لوگ دل پر آلو رکھ کر ہی سہتے رہے ہیں تمہاری حرکتیں۔ شاہ ویز، مومن کو اتنے چکر دو جتنے سہہ سکو۔ جب اس نے تمہاری باری چکر دیے نا تو تمہاری الٹیاں شروع ہو جانی ہیں۔ (تم کھاتے بھی تو بہت ہو) ماحور تمہاری حرکتوں پر میں نے اتنے قہقہے لگائے ہیں نا کہ طبیعت فریش ہو گئی ہے۔ مومن تراب میدان جنگ میں آخری لمحے فاتح بن جانا کیسا لگتا ہے؟ اور ویسے نا تم جیسا ہرجائی پوری ڈائجسٹوں کی دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ ذرا جو ہماری یاد آئی ہو تمہیں...... ایک ہم تھے دعائیں کرتے نہ تھکتے تھے۔ اور سالک پر ''جل تو جلال تو'' آئی بلا ٹال تو'' پڑھ پڑھ کر جو پھونکیں ماریں وہ الگ۔ احسان فراموش دنیا۔ دادا جی آپ کو میرا فوجیوں والا سیلوٹ'' ''کچھ لمحے ہم پر قرض تھے'' سدرہ حیات اچھی رہی کہانی...... موی گل مجھے تمہارا فیصلہ پسند آیا۔ عالیان محبتوں میں انتظار کی ریت جتنی مرضی آنکھوں میں چبھے مگر اسے آنکھوں کا سنگار بنانا پڑتا ہے۔ پھر وقت ثابت کرتا ہے کہ اگر زخم کھائے ہوں تو رائگاں نہیں جاتے۔ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' حمزہ کچھ دکھ ہمارے خود ساختہ ہوتے ہیں جب تک ہم خود نہ چاہیں اس سے نہیں نکل سکتے۔ شہرینہ مسٹر جہانیاں سے جھوٹ نہ بولنا...... بعض لوگوں کی محبت ہمیں بلند بخت کر دیتی ہے۔ ''پھر اسی راہ گزر پر'' شیر دل صاحب ایک آدھ کاغذ قلم فرشتوں سے ہمارے بھی کچھ

عزیزوں کو لے کر دے دو۔ ہمیں بھی اس آدھی ملاقات کی سخت ضرورت ہے۔ (نام بھیجوں اپنے عزیزوں کے) (کوئی خاص وجہ......؟) ''آسان'' اس دنیا میں کچھ بھی آسان نہیں ہوتا۔ اپنی جان مارنی پڑتی ہے۔ ''صفائی پسند'' کاش کہ ہمارے دلوں کی بھی صفائی ہو سکے۔ ہانیہ جی کیسا لگا نفاست پسند لوگوں سے مل کر؟ طبیعت کچھ زیادہ ہی فریش ہو گئی ہے۔ (ایک آدھ اور چکر لگا لو)۔ ''پھل فروش'' یہ پھلوں کی تو نہیں خوابوں کی دھرتی پر کانچ کے پھول توڑ کر ہاتھ زخمی کرنے کی داستان تھی محمد حسین۔ محمد ذکا خود ہی زخم کھانے کا عادی ہو جائے گا۔ اگر تم نہ بھی مرتے تو اس نے یہی زخم کھانے تھے۔ ''نظریں چرانا'' صائمہ قدرت کی اس کرنی پر میں والدین کو الزام نہیں دوں گی۔ ''میرے مہربان'' شرجیل کا عشق مجھے کوئی اتنا مہربان تو نہیں لگا کہ اس کو میرے مہربان کے درجے تک پہنچا دیا جائے۔ ''نازک آبگینہ ہوں میں'' نظیر فاطمہ اگر اجازت ہو تو اس سے بعد میں لطف اندوز ہو لوں؟ شازیہ چوھدری سے آنسوؤں کے معاملے میں اتفاق نہیں کرتی۔ شفیق الرحمان کی ''بے بی'' مجھے ان کے مشاہدے کی حماقت محسوس ہوئی۔ جس کو انہوں نے حماقتیں کا حصہ بنایا۔ ''مجھے یہ شعر پسند ہے'' تبسم بشیر، ثنا شہزاد، اقصیٰ ناصر نے اچھا لکھا۔ ''یادوں کے دریچے'' ماریہ نذیر، مظہر الحق سے کہنا کمال ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ''نامے میرے نام'' ثنا شہزاد، فضہ نور (ہم نے تمہیں یاد کیا) ماریہ نذیر، مریم یونس، ساجدہ جاوید، جیمنا سحر وقاص بہت بہت شکریہ۔ تبسم بشیر پتا نہیں میں اچھا لکھتی ہوں یا نہیں مگر مجھے لگتا ہے جس معاملے میں شکر بڑھالو اللہ زیادہ نواز نے لگتا ہے زرینہ خانم شکریہ۔ اقرا ارور بہت شکریہ جیتی رہو تمہاری پیدائش کا واقعہ پڑھ کر بے ساختہ ہنسی۔ میری ذات کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ جڑا ہوا ہے۔ ماریہ نذیر بہت لمبی جینے کی دعا دے دی۔ تبسم بشیر روزانہ تمہاری ماں جی کے لیے دعا کرتی ہوں۔ صفیہ رانی میں تمہاری دعا کے پورا ہونے پر تمہیں یاد کروں گی کہ یہ صفیہ رانی کا کمال ہے۔

ج: فائزہ جی! ہمارے خیال میں تو آپ کے اندر ایک اچھی رائیٹر چھپی ہے۔ بہت اچھا تبصرہ مزاح سے بھرپور۔

مبشرہ اسد...... چیچہ وطنی

حمد و نعت سے مستفیض ہو کر ہم نے سارا رسالہ الٹا اور ''نامے میرے نام'' میں دیکھا کہ کون کون سی پیاری لڑکیاں تبصرہ خیال لے کر محفل کی جان بنی ہوئی ہیں۔ ارے یہاں تو محفل بھری پڑی ہے بھئی قاری کا زیادہ حق ہے کرن پر اور خاموش قاری کا اس سے بھی زیادہ اس سے پہلے حق اور حقوق کی جنگ چھڑے فروری کے ستاروں کو دیکھ لیں! فروری کا رسالہ تو کہہ رہا ہے گھبرانا نہیں میں ہر ماہ آتا ہی رہوں گا۔ نگہت عبداللہ کا شمار ہمارے سینئر میں ہوتا ہے اور بہت اچھا لکھتی ہیں بہت ہی اعلا ذوق کی رائٹر ہیں ان کے ناول لکھنے کا انداز ایسا ہے کہ بندہ پندرھویں قسط بھی پڑھ لے تو سمجھ میں آجاتا ہے باقی کردار کیا کر رہے ہیں اور کہانی کیا ہے یہی ان کے ناول کی خوب صورتی ہے۔ افسانے بھی اچھے تھے بلکہ بہت اچھے تھے کیوں کہ ناول سے مشکل افسانہ لکھنا ہوتا ہے۔ بھئی ناول میں آپ کھل کر لکھ سکتے ہیں جبکہ افسانے میں لمبی بات کو مختصر بیان کرنا ہوتا ہے اس لیے میں انہیں زیادہ پسند کرتی ہوں۔ دوسرا قسط وار ناول ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' میں آسیہ مرزا کرداروں سے اچھا انصاف کر رہی ہیں ارسلہ کا کردار کچھ نیگٹو ہے لیکن ایسے کردار ہمارے اردگرد اب تو بہت پھیل چکے ہیں ارسلہ ہی نہیں اب ہر انسان ہی چمکتے سونے کے پیچھے ہے۔ ٹاپ ون پر جو ناول قسط وار جا رہا ہے وہ۔ ''ساگر کنارے'' ام طیفور کا ہے! ناول پڑھنا شروع کر دو تو کوئی بھی کام ہو بندہ پورا پڑھ کر ہی اٹھتا ہے میں جب بھی کرن لیتی ہوں تو مسلسل اس ناول کو پہلے پڑھتی ہوں۔ مستقل سلسلے بھی بہت اچھے ہیں باقی رسالہ ابھی پڑھا نہیں اگلی مرتبہ اظہار خیال کروں گی۔

ج: مبشرہ جی! بہت شکریہ۔

سیدہ تبسم بشیر حسین...... ڈنگہ

کرن کو میری طرف سے سالگرہ مبارک ہو اور میری مبارک باد؟ (بھئی میری بھی سالگرہ 10 مارچ کو ہے۔) ٹائٹل کافی خوب صورت تھا۔ حسب معمول ''اداریہ'' پڑھا ''مقابل ہے آئینہ'' میں شہلا گل سحر کے جوابات پسند آئے۔ بات کرنا چاہوں گی سدرہ حیات کے ناول ''کچھ لمحے ہم پر قرض تھے'' کی بھئی سدرہ آج سے میری موسٹ فیورٹ بن گئیں۔ اتنا زبردست ناول مجھے تو یہ کرن کی طرف سے 2020ء کا تحفہ لگا۔ ''کرن کرن خوشبو'' سے ماریہ نذیر، شکیلہ حسن، رابعہ تاج، ایمن خان اور خوشی نے اچھا لکھا۔ ''یادوں کے دریچے'' سے ماریہ نذیر، اقصیٰ نے خوب صورت لکھا۔ ''نامے میرے نام'' ثنا شہزاد بہن بھی کہا اور شکریہ بھی؟ لگاؤں ایک؟ ماریہ نذیر دعوت کا شکریہ! پر مجھے شاپنگ سے ڈر لگتا ہے۔ سحر وقاص وعلیکم السلام اب ہر ماہ

آنا۔ اقرا سرور مجھ غریب کے پاس صرف دعائیں ہی ہیں۔ اللہ تمہاری ہر مشکل کو دور کریں اور تم ہمیشہ ہنستی مسکراتی پھولوں کی مانند رہو۔ (آمین ثم آمین) دیکھنا ایک دن تم اچھی تبصرہ نگار کی طرح ایک اچھی رائٹر بھی بنو گی (آمین ثم آمین) "بیوٹی باکس" میں آپ نے میک اپ کا طریقہ بتا کر بہت اچھا کیا۔ پر مجھے میک اپ پسند نہیں۔ سردیوں کا بادشاہ "کینو" ماشاء اللہ بہت فائدہ مند ہے۔ تھوڑے بہت تو میں نے بھی کھائے ہیں۔ حورالعین اور ماہ جبین کا کچن خاصا مختصر رہا۔ دسترخوان میں میکرونی کی ریسپی کا شکریہ۔ ماریہ نذیر، ثریا راجپوت، نازیہ مرید، عائشہ ناز، افشاں سمیع، افضیٰ ناصر اور ثمرہ اقرا نے خوب محفل جمائی اپنے اشعار سے۔ ثریا راجپوت اور صدف سمیع کے لطائف پسند آئے۔ "کچھ موتی چنے ہیں" سے سونیا رائے اور رابعہ ناز کے موتی پسند آئے۔

ج: تبسم بشیر جی! سالگرہ مبارک ہمارے پورے ادارے کی طرف سے آپ کے لیے نیک تمنائیں۔

شہلا گل سحر......کوہاٹ

معصوم سے چہرے والی ماڈل سے مزین رسالہ لیٹ ملا۔ فہرست میں "مقابل ہے آئینہ" میں اپنا عکس دیکھ کر آپ لوگوں پہ پیار آیا۔ مہربانی، شکریہ۔ ہم رسالہ ترتیب سے پڑھنے کے بجائے بے ترتیبی سے پڑھتے ہیں۔ یعنی کبھی درمیان سے کبھی آخر سے۔ "ہوائیں رخ بدل گئیں" اختتامی مراحل میں ہے۔ خزینہ کے رویے میں لچک تو نظر آ رہی ہے شہرینہ بھی لگتا ہے کہ جہانداد کے کورٹ میں جائے گی۔ "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" ارسل اندھا دھند اپنی خواہشات کے پیچھے بھاگ رہی ہے رزلٹ بھی اس کا پچھتاوا ہی ہے۔ اف "ساگر کنارے" کی آخری قسط زبردست۔ جیسا سوچا تھا ویسا ہی انجام ہوا۔ مومن سوری لیکن تمہارا استقبال ماحور نے بڑے یونیک طریقے سے کیا۔ "کچھ لمحے ہم پر قرض تھے" میں آخر۔ عالیان نے مومی گل کو پا ہی لیا۔ اور مومی گل آپ کو سلام کہ اتنی مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ نظیر فاطمہ نے بھی ناولٹ اچھا لکھا۔ لڑکیاں واقعی نازک ہوتی ہیں۔ اور ان کی ڈھال اور ان کا فخر ان کے خون کے رشتے ہوتے ہیں۔ "صفائی پسند" واقعی صفائی دل اور سوچ کی ہونی چاہیے۔ ضمیر صاف ہونا چاہیے باقی سب کچھ تو ویسے بھی ہو جاتا ہے "پھل فروش" اچھی کہانی تھی۔ رزق حلال کمانا چاہیے ذریعہ جو بھی ہو۔" کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہوتا ہے" "نظریں چرانا" بس دعا کرنی چاہیے کہ بیٹیوں کے نصیب اچھے ہوں کہ ایک بار لڑکی پھنس جائے تو پھر وہ دو کشتیوں پہ سوار کی طرح ڈولتی رہتی ہے۔ "میرے مہربان" میں شرجیل کی بہادری اچھی لگی۔ اور سنہری کا نام بھی باقی کے سلسلے بھی زبردست تھے۔ کرن نے ہمارے دل کو منور کر دیا۔ کرن کی سالگرہ پہ میری طرف سے ڈھیروں ڈھیر دعائیں اور پیار۔

ج: شہلا جی! کرن کو پسند کرنے کا بہت شکریہ۔

ارم کمال......فیصل آباد

ٹائٹل اسم باسمی رہا۔ "اداریہ" سے سالگرہ نمبر کی خوشخبری سن کر دل جھوم اٹھا۔ "مقابل ہے آئینہ" میں شہلا گل سحر آئیں اور چھا گئیں۔ میں نے بھی چار پانچ مہینے پہلے "مقابل ہے آئینہ" کے لیے شرکت چاہی تھی اس کا کیا کیا کہیں ندیدی ردی کی ٹوکری کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا۔ "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" میں سرپھری ارسل نے سکندر کا دل توڑ کر بہت برا کیا۔ پچھتاوٴ گی ارسل بی بی ابھی تو ڈائمنڈ کی انگوٹھی پہن کر دیوانی ہوئی پڑی ہو، نعیمہ ناز کا "آسان" کنول کے لیے اچھا سبق لایا۔ واقعی ذمہ داریاں نبھانا کوئی آسان کام نہیں، مکمل ناول "پھر اسی راہ گزر پر" دوستی کے لازوال رشتے کو اجاگر کر گئی۔ عندلیب زہرا "صفائی پسند" میں بے حد اندر کی بات باہر لائیں۔ بات ٹھیک ہے پہلے ہمیں اپنے اندر کو صاف اور اجلا رکھنا چاہیے لیکن گھر اور ماحول بھی صاف ستھرے ہوں تو بہت اچھا لگتا ہے "نازک آبگینے ہوں میں" شاندانہ کی فیلنگ سوچ کر بے حد رونا آیا جب اپنے سگے ماں باپ ہی اعتبار نہ کریں تو انسان کے جینے کا مقصد ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ام ہانی کی "اک نئی کہانی" سپر ب رہی لیکن آج کل ہوتا یہ ہے کہ ساس اچھی ہوتی ہیں تو بہو بیگم ہاتھ نہیں ملاتیں اور اگر بہو اچھی ہو تو ساس صاحبہ اکڑ کر رہتی ہے۔ کہیں کہیں دو ہاتھوں کی تالی بجتی ہے۔ اب آتی ہوں شمارے کی سب سے شاندار اور مائنڈ بلوئنگ یعنی "ساگر کنارے" آخری قسط کے بارے میں میرے پاس الفاظ نہیں بار بار پڑھ کر بھی نظروں کی پیاس نہیں بجھ رہی تھی دادا نے مومن تراب کی شادی اتنے اچھے اور روایتی انداز میں ارینج کی کہ سواد ہی آ گیا۔ خصوصاً مہندی اور سہرا

بندی کی تقریب بہت خوب رہی ماحور نے جو مومن کا استقبال کیا ہنس ہنس کر پیٹ میں بل پڑ گئے۔ ام طیفور نے بے حد زبردست اینڈنگ کی ابرش اور سالک کو بھی ملوا دیا دل خوشی سے معمور ہوگیا۔ ام طیفور کو میری طرف سے مبارک باد کے ٹرک بھجوادیں۔ سوہنا ''پھل فروش'' نے دل اور آنکھیں دونوں ہی گیلی کر دیں ''ہوا میں رخ بدل گئیں'' میں شہرینہ کا جہانیان کے ساتھ عجیب سا میچ ہے، دل مانتا نہیں۔ ''کچھ لمحے ہم پر قرض تھے'' میں موی گل کے صبر واستقامت ارحم کی چھیڑ خانیاں عالیان کا دس سالہ جوگ اور پریشے کی معصومیت سب نے بے حد مزا دیا ''میرے مہربان'' میں اگر شرجیل ہمت نہ کرتا تو چار زندگیاں بے رنگ ہو جاتیں اور یہ ہمت اسے اس کی محبت نے عطا کی۔ تمام مستقل سلسلے مجھے جی جان سے پیارے ہیں۔ ''یادوں کے دریچے'' سے عائش جنجوعہ کی نظم موجودہ حالات کے تناظر میں خوب رہی ''نامے میرے نام'' بھی کسی افسانے سے کم نہیں سب بہنوں سے مل کر دل خوشی کی انوکھی لے پر جھومنے لگتا ہے۔ کرن کتاب تو ستاروں میں چاند کی مانند چمکتی ہے۔

ج: ارم جی! ''مقابل ہے آئینہ'' ہمیں آپ کا ملا نہیں دوبارہ ارسال کیجیے۔

حمیرا گل ..... ملتان

اس ماہ کا ٹائٹل بہت پسند آیا۔ سب سے پہلے ''نامے میرے نام'' میں سب دوستوں کا حال احوال جانا۔ اقراء سرور بھانجی کی شادی کی بہت بہت مبارک ہو، اللہ انہیں خوشیوں بھری زندگی دے، آمین۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ کو پیار کرنے والے والد صاحب ملے۔ زرینہ خانم بی بازیئو یار! آپ ایسے کیوں نہیں سوچتیں کہ اللہ نے ایک اور سال دیا ہے، اپنی غلطیوں کو سدھارنے اور خدا کو راضی کرنے کے لیے۔ تبسم بشیر آپ تو میری کوئی بچھڑی ہوئی بہن نکلیں۔ میرا میک اپ بھی لپ اسٹک، کاجل اور نیل پالش تک محدود ہے۔ آپ کا پتوں والا مشورہ اچھا ہے۔ انٹرویوز سارے کے سارے بہت پسند آئے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ نعیمہ ناز ''آسان'' میں بڑی سادگی اور آسانی سے حقیقت پسندانہ تجزیہ کرتی نظر آئیں' ویری نائس۔ نظیر فاطمہ کا ناولٹ ''نازک آبگینہ ہوں میں'' آئیڈیا اگرچہ پرانا تھا مگر بہت اچھے سے لکھا گیا۔ ام ہانی کی ''اک نئی کہانی'' پسند آئی۔ بہت اچھا پیغام لیے ہوئے خوب صورت تحریر۔ سندس جبیں ''پھل فروش'' لے کر آئیں۔ کام بے شک کوئی بھی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا، حلال روزی کمانا ضروری اور اہم ہے مگر لوگ کام کے حساب سے ہی عزت دیتے ہیں۔ اس لیے نوجوان اس طرح سوچتے ہیں۔ نرمین کی ''نظریں چرانا'' بھی اچھی تحریر تھی۔ انسان کو زندگی میں بہت سارے ایسے فیصلے کرنے ہی پڑتے ہیں جن پر دل احتجاج بلند کرتا ہے۔ ''کرن کرن خوشبو'' میں ''گرہ'' بہت پسند آئی اور ''یادوں کے دریچے میں'' اقصیٰ ناصر کا انتخاب دل کو بھا گیا۔ ''اس ماہ کا پھل'' میرا پسندیدہ پھل کینو تھا۔ میرا سب کو مشورہ ہے روز ایک کینو (کم از کم) ضرور کھائیں۔ نفسیاتی اور معاشرتی مسائل میں ''حسد'' پر بات کی گئی جو واقعی آج کل کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ''مجھے یہ شعر پسند ہے'' میں صدف عمران کا انتخاب پسند آیا۔ ''مسکرائی کرنیں'' میں برداشت پڑھ کر بہت ہنسی آئی اور ''فیشن'' بھی اچھا لگا۔

☆ حمیرا گل جی! اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے تو ضرور لکھیں، اپنے ٹیلنٹ کو ضرور آزمانا چاہیے۔

زرینہ خانم لغاری ..... مظفر گڑھ

واہ فروری کا ٹائٹل لاجواب ہے۔ پیاری سی لڑکی، سنگار پٹی لگائے پیاری لگ رہی ہے۔ تھوڑی پر تین تل لگے ہونے کی وجہ سے پختون لڑکی کا پنچ دے رہی ہے۔ ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' نیلے فرصا برلڑکی ہے، اس کے ساتھ اچھا ہی ہوگا۔ ارسلہ دولت کی بیماری، حرص کی بیماری، شاید ذلیل ہو۔ پہلے تو منور شہر کو دیکھ کر اس پر تجلی گر رہے گی۔ ''آسان'' دوسروں کو تنقید کرنا آسان ہوتا ہے، جب خود پر پڑتی ہے تو نانی یاد آجاتی ہے۔ ''صفائی پسند'' واقعی دل صاف ہونا چاہیے، گھر تو صاف ہو جاتے ہیں پھر جب لگا کر ''ساگر کنارے'' پر پہنچے۔ انجام تو اچھا ہوا لیکن کتنے ظالم لوگ تھے، سب دادا سمیت بے چارے ہیرو ہیروئن کو رلا رلا کر مارا۔ انہیں اپنی خوشی کے موقع پر خوش نہیں ہونے دیا۔ ''پھل فروش'' پیاری کہانی تھی، اگر نوکری نہیں ملتی تو جلنے کڑھنے کے بجائے حق حلال طریقے سے روزی کمانی چاہیے، سوہنے پھل فروش نے متاثر کیا۔ خدا کرے ذکاء کو بھی عقل آجائے۔ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' ربیکا صاحبہ ہمیں سخت ناپسند ہے، اسے پھر حمزہ کے گھر پہنچا دیا گیا، بہت برا ہوا۔ حمزہ صرف شہرینہ کو ملنا

چاہیے۔ خزینہ صاحبہ کو سمجھوتا کرلینا چاہیے کیونکہ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ "میرے مہرباں" عام زندگی میں ایسا ہوتا نہیں ہے کہ عین شادی میں محبوب مل جائے۔ لڑکیاں روتی دھوتی رخصت ہوجاتی ہیں۔ ساری زندگی گزار دیتی ہیں، ماں باپ کی لاج رکھتی ہیں۔ "کرن کرن خوشبو" میں دس ہزار زبان پسند آیا، وانی حنیف نے عقل مندی کا ثبوت دیا۔ رلی جناح کی حاضر جوابی نے متاثر کیا۔ "یادوں کے دریچے" میں جھانکا۔ "نامے میرے نام" پیاری بہنوں سے ملاقات کا تحفہ لاجواب ہے۔ میرا نامہ بھی چھپ گیا تو اس کو چار چاند لگ گئے۔ "کرن کتاب" پڑھی، خالدہ جیلانی اتنی مزے دار ترکیبیں کہاں سے سیکھتی ہیں۔ ہم میٹھے کے شوقین ہیں، انڈے کے میسو اور ڈبل روٹی کا میٹھا ضرور ٹرائی کریں گے، ماریہ نذیر کا شعر پسند آیا۔

☆ زرینہ جی! نامے میرے نام کی محفل اب سب بہنوں کے خطوط سے سجتی ہے۔

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران، آمنہ رئیس، حریمہ فاطمہ...... گجرات

سرورق ٹائٹل پسند آیا۔ خاص کر ماڈل کی ماتھا پٹی اچھی لگ رہی تھی۔ "حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبولﷺ" دل وجان کی راحت۔ اداریہ کوزے میں سمندر "مقابل ہے آئینہ" کا دروازہ ناک کیا۔ اندر سے شہلا گل سحر مسکراتی ہوئی ملیں۔ پیاری مسکراہٹ والی شہلا گل کی باتیں بھی سرخ گلابوں جیسی لگیں۔ لاسٹ شعر اچھا لگا۔ کرن کا پہلا ناول "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" چوتھی قسط بھی اچھی رہی۔ ارسلہ بے چاری پر افسوس ہورہا ہے جب اسے پتا چلے گا کہ اس کی خوب صورتی نے آبص کی ماں کو متاثر نہیں کیا بلکہ بیٹے کی معذوری ان کو ایک غریب بہو لانے پر مجبور کررہی ہے۔ مجھے لگتا ہے جب ارسلہ پر آبص کی معذوری ظاہر ہوگی تب رومی کے کزن کی طرف مائل ہوجائے گی۔ "ہوائیں رخ بدل گئیں" مجھے تو یہ بات ہضم نہیں ہورہی کہ جہانداد کی ماں کا شہرینہ کے ساتھ کیا تعلق ہے کیوں وہ پہلی بار شہرینہ کو دیکھ کر روئیں اور پھر شہرینہ کو ملنے کی ضد کرنے لگیں۔ کیا کوئی رشتہ دار ہیں۔ جہانداد نام سے ہی لگتا ہے کہ وڈیرہ ٹائپ بندہ ہوگا۔ بھئی مجھے تو ذرا بھی سوٹ ایبل نہیں لگ رہا۔ شہرینہ کے ساتھ۔ "ساگر کنارے" ایک خوش گوار یاد کے ساتھ بچھڑا، اینڈنگ اچھی لگی۔ دادا نے خوب تڑپایا مومن کو۔ عادل پاشا کا یہی بہت ہے کہ اس نے اپنے کیے کو قبول کیا اور توبہ کا طلب گار ہوا ورنہ فرعونوں کو کہاں یہ سعادت نصیب ہوتی ہے، توبہ کی۔ رانیہ ایک اچھی دوست کی طرح پوری تحریر میں چھائی رہی۔ دوست وہی جو مشکل میں ساتھ دے ورنہ منہ ملاحظہ سلام دعا ہزاروں۔ "کچھ لمحے ہم پر قرض تھے" بیسٹ تحریر تھی۔ حیرت تو مجھے سلیم صاحب پر ہوئی، اتنے مخلص رہے موی کے ساتھ۔ مگر سارے فساد کی جڑ وہی رہے۔ بڑے جگرے ہیں لوگوں کے آج کے دور میں تو دوسرے کا حق کھا کر جھوٹ بول کر دوسروں کی کمائیاں کھا کر ایسے اکڑتے ہیں جیسے ان سا پارسا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ "نازک آبگینہ ہوں میں" چھوٹی تحریر بڑا سبق۔ "کرن کرن خوشبو" عائشہ تاج کا "غیبت" پسند آیا۔ یہ وہ بدفعل ہے جو دوسروں کی زندگیوں کا رخ بدل دیتا ہے۔ "یادوں کے دریچے" اقصیٰ، تبسم بشیر حسین اور ماریہ نذیر کی یادیں لاجواب تھیں۔ منیر نیازی کے ستم نے کلیجے کے کہیں ترپے ادھیڑے۔ "کچھ موتی چنے ہیں" رابعہ عمر تاج، اشفاق احمد کی دعا بہت پسند آئی۔ چلیں جی بات ہوجائے کرن کے موسٹ فیورٹ سلسلہ "نامے میرے نام" کی۔ سر محفل ثناء شہزاد دل خوش اور ملنے کو مچل گیا۔ ثناء دلوں میں بسنے لگی ہو۔ خوش رہو۔ ماریہ نذیر اتنا پرفیکٹ تبصرہ بھئی کیا جادوئی قلم ہے جس سے لکھتی ہو سچی تعریف ہے پلیز کوئی بھی اسے مہنگے والا بٹر نہ سمجھے۔ سچ آکھاں جے جھوٹے بولا تے کالا کان واڈے۔ مینوں نہیں میرے شریکاں نوں، ہاہاہا۔ ہانیہ عمران، آمنہ، حریم فاطمہ کو پیاریاں وہ زیادہ لگتے ہیں۔ فوزیہ ثمر اور ہادی حسین سوتیلے تھے کیا۔ چلو ہماری پیاریاں، شاریاں پارسل کردو فٹافٹ۔ کراچی کی حینا بہن، آپ کی سوچ اچھی ہے پھل سبزیوں کے ساتھ ساتھ پتوں کے فائدے بھی بتائے۔ یار اگر پتوں کے فوائد جدید دور کے انسانوں کو مل گئے تو پھر جانوروں کی خیر نہیں۔ کیونکہ آج کا انسان یاجوج ماجوج ہوگیا ہے جو مل جائے، ہضم۔ اگر انسانوں نے پتے اور گھاس کھانا شروع کردیے تو پھر جانور کیا کھائیں گے، یہ نہ ہو وہ انسانوں کو کھانا شروع کردیں۔ ہونے کو تو کیا کچھ ہوسکتا ہے جناب۔ نہ شیطان کے لیے کچھ چھوڑا ہے وہ بے چارہ خود پریشان ہے کہ میرے سے تو زیادہ انسان شیطان ہوگیا۔ مینوں کھوڈے لائن کردیتا ہے اس انسان نے۔ تبسم بشیر حسین واہ تمہاری ایوارڈ والی بات پورا مہینہ رس گلے جیسی مٹھاس گھولتی رہی۔ جیو ہزاروں سال دل کی خوشی کا سامان ہو۔

تمہارے دل کو بھی خدا شاد رکھے، آمین۔ نہ کوئی کام تے نہ کاج، دل ہون ایوارڈ ایوارڈ کر رہا، ہاہاہا۔ کوئی سن لے دل کی صدا۔ ''نام میرے نام'' مجھے لگ رہا ہے کچھ زیادہ ہی بٹر لگ گیا۔ یہ نہ ہوا گلے ماہ مجھ پر فتویٰ لگ جائے، بٹر فلائی، ہاہاہا۔ اقراء مجھے لگتا ہے صرف میں دکھی پنچھی ہوں مگر نہیں۔ دنیا بھری پڑی ہے اپنے اپنے دکھوں کے ٹوکرے اٹھائے، چہروں کو مسکراہٹوں کے ریپر سے سجائے۔ اللہ پاک آسانیاں فرمائے۔ افسانے اچھے تھے، سبق آموز۔ جو دل کو لگا ''وہ پھل فروش'' تھا۔ محنت اور کوشش کرکے جب کچھ حاصل نہ ہو تو سمجھے یہی نصیب ہے۔ ''صفائی پسند'' بھی اچھا لگا۔ چلو پھوپھو جانی کو کچھ تو سمجھ میں آیا۔ جگنو، چڑیا کی چوں چاں سے ہوتی ہے اور پھر جگنو چڑیا گھر نہ پھیلائیں یہ تو ہو نہیں سکتا۔ ہمارے ہاں یہ ہادی حسین، حریم فاطمہ گھر میں نہ ہوں تو مجھے لگتا ہے میں کسی جیل میں ہوں۔ جہاں خاموشی کا راج ہے۔ ''آسان'' بھی پسند آیا۔ کسی کی کمائی کھانا آسان نہیں ہوتا، واقعی ٹھیک کہا مگر میں نے تو بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے دوسروں کا حق بھی ہضم کر لیتے ہیں۔ حرام چوری کا دودھ دہی سب ہضم کر لیتے ہیں اور پھر دھڑلے سے کہتے ہیں یہ تو ہمارے نصیب کا مل رہا ہے۔ ''کرن کتاب'' کی بات ہو جائے، دن بہ دن نکھار آتا جا رہا ہے۔ جیسے فیئر لولی کی عادی کسی حسینہ کو آتا ہے۔ ہر سلسلہ بامقصد دلچسپ۔ ضرورت زندگی کے لیے لازمی۔ ''کچن اور آپ'' دونوں بہنوں کے محتاط رویے کے جوابات اچھے لگے۔ ''مسکراتی کرنیں'' گڑیا راجپوت کی مسکراہٹ اچھی لگی۔

☆ فوزیہ جی! اللہ آپ کی ہر مشکل، ہر پریشانی دور فرمائے، آمین۔ آپ بہت اچھے دل کی مالک ہیں، اللہ آپ کی ضرور سنے گا، آمین۔

صفیہ مہر......رحیم یار خان

سب سے پہلے تو ٹائٹل گرل مایوں کے لباس میں ماتھا پٹی پہنے جگمگ کرتی دل میں اتر گئی۔ ''مقابل ہے آئینہ'' میں شہلا گل سحر کی سنی مگر نام نیا ہی تھا، مگر جوابات زبردست تھے۔ پھر آسیہ مرزا کے ناول ''میرے ہم نفس، میرے ہم نوا'' تک پہنچے۔ یہ کیا ارسلہ بی بی نے چمکتے انگارے بھر لیے مٹھی میں۔ مگر دستک دیتی محبت سے نگاہیں پھیر لیں۔ نعیمہ ناز کا افسانہ ''آسان'' واہ اباجی آپ نے کنول کو دن میں تارے دکھا دیے۔ امبرین بھابھی کا کہا سچ نکلا کہ کسی کی کمائی کھانا آسان نہیں ہوتا۔ منعم ملک کی ''پھر اسی راہ گزر پر'' کی ابتدائی سطریں پڑھ کر حیرت میں گھر گئی کہ آسمانوں سے خط کیسے لکھا تھا اور پڑھنے والے تک پہنچا کیسے مگر تجسس میں گھر کر جو پڑھا تو پڑھتی گئی، آخر میں بے اختیار کہہ گئے، زبردست۔ منعم ملک کا قلم اکثر ہی زندگی کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ عندلیب زہرا کی ''صفائی پسند'' ہر لڑکی ہانیہ کی طرح اس عمر میں دوسروں کے گھروں سے متاثر ہو جاتی ہے مگر ہانیہ کے ساتھ، برا ہوا مگر اپنے گھر کی قدر آ گئی اسے، دیبا بھابھی کا گھر سنبھالنا بڑا اچھا لگا۔ نظیر فاطمہ ''میں نازک آبگینہ ہو'' بہترین کاوش تھی۔ جس

کا پورا ماہ انتظار تھا، وہ تھی ام طیفور کی "ساگر کنارے" مومن اور دادا کو بڑا مس کریں گے ہر بار۔ ماحور مغل اور مومن آخر کار مل گئے۔ کیا تھا جو نمو، عادل پاشا کو معاف کردیتی کیسا بھی سہی مگر پھر بھی معاف تو کردیتی۔ سندس جبیں "پھل فروش" واقعی عقل اولاد کو تب آتی ہے جب باپ کا سایہ چھن جاتا ہے۔ محمد حسین کا بیٹے کو لکھا خط رلا گیا۔ اس بار عفت عبداللہ نے حمزہ کو شہرینہ کے ساتھ دکھا کر یقیناً غلط کردیا۔ مجھے ربیکا سے ہمدردی ہورہی ہے۔ "نظریں چرانا" زمین سرھیو نے واقعی چھپی حقیقت اجاگر کی کہ بیٹیاں اپنے آباد گھر سے ہی والدین کو خوش رکھتی ہیں۔ چاہے من ان کا مر ہی کیوں نہ جائے۔ سدرہ جی! موی گل کا پورا مہینہ انتظار کرتے رہے، عالیان کی استقامت قابل رشک رہی۔ موی کی زیست کے لیے اسٹرگل قابل تحسین تھی۔ بہرحال دونوں ایک دوجے کو ڈیزرو کرتے تھے۔ "میرے مہربان" ہرامی کی کچھ اسٹوری ہوتی ہے ماضی میں، واقعی مگر ...... سنہری کا ماضی پڑھا بڑا اچھا فیل ہوا۔ "کرن کرن خوشبو" میں سب کی کرنیں ہماری زیست کو ہر بار کی طرح روشن کرگئیں۔ "یادوں کے دریچے" ماریہ نذیر کی ڈائری اور ماہا تبسم کی ڈائری دل کو بھا گئی۔ "نامے میرے نام" ہر بار کی طرح ہر بہن کا خط شوق سے پڑھتی ہوں مگر خاص طور پر شاہ شہزاد، ماریہ نذیر، فائزہ بھٹی اور فوزیہ ثمر کے دلچسپ خط ہوتے ہیں۔ "کرن کتاب" کرن کو چار چاند لگادیتی ہے، بڑی معلوماتی ہے۔

☆ صفہ مہر جی! بڑے عرصے بعد آپ نے شرکت کی۔ آپ کی کمی محسوس ہوتی رہی۔ تبصرہ بھرپور اور بہت اچھا۔ آپ کو ہماری محنت پسند آئی، بہت شکریہ۔

فضہ نور ...... روہڑی

لمبی چوڑی تحریر لکھنے کے بجائے چھوٹی سی شاعری میں سالگرہ کے دن کی مبارک باد قبول کیجیے۔

تمہاری سالگرہ پر یہ دعا ہے میری
کہ ایسا روز مبارک ہزار بار آئے
رفعتیں اور بلندی بھی تجھ پہ ناز کرے
تیری یہ عمر خدا اور بھی دراز کرے
تیری زندگی کی روشنی کو خدا
کسی ظلمت سے آشنا نہ کرے
خدا کرے تمہیں یوں ہی کامیابی مبارک ہو
تمہیں یہ سالگرہ کی خوشی مبارک ہو

سب سے پہلے ٹائٹل پر ماڈل کو بلوچی لباس میں دیکھا، اس کی ہلکی پھلکی مسکان پیاری لگی۔ اداریہ پڑھا، آپ کی باتوں سے سو فیصد متفق۔ "مقابل ہے آئینہ" شہلا گل سحر شبلی کو دیکھا (آئینے میں) بہت ہی صابر و شاکر لگیں۔ "نامے میرے نام" تمام قارئین نظر آئیں پر شمارے کی شان فوزیہ ثمر، فائزہ، اقراء، صائمہ کہاں غائب ہیں آپ سب؟ شاہ شہزاد سے کہنا چاہوں گی کہ آج کے دور میں بھی ایسی بیٹیاں ہیں جن کے گھروں میں ان کی اپنی ذاتیات کے حق سے بھی محروم کررکھا جاتا ہے۔ ماریہ نذیر کا پنجابی تڑکا خط کی شان بڑھا گیا۔ زرینہ خانم اور اقرا سرور کے تبصرے سے محظوظ ہوئے۔ مجھے یاد رکھنے اور میرے خط کو شامل کرنے کا شکریہ۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" زرینہ خانم، افشاں سمیع، شاہ شہزاد اور ماریہ نذیر کے شعر پسند آئے۔ "کرن کتاب" کے فوائد سے فیض یاب ہوئی۔ افسانے میں "صفائی پسند" عندلیب زہرہ کا زیادہ پسند آیا۔ انسان کو ظاہری صفائی کے ساتھ باطنی صفائی بھی کرنی چاہیے۔ دل میں بغض بال کر منہ پر منافقت اچھی نہیں لگتی۔ "آسان" نعیمہ ناز مجھے تو یہ لگا کسی کے گھر کی کمائی کے بجائے گھر کو سنبھالنا زیادہ مشکل ہے۔ باقی افسانے بھی ٹھیک تھے۔ ناولٹ اکلوتا تھا "نازک آبگینہ ہوں میں" نظیر فاطمہ۔ لڑکیوں کی عزت شفاف پانی کی طرح ہوتی ہے اس میں آلودہ پانی کا اک چھینٹا بھی اسے میلا اور بدبودار کردیتا ہے۔ "ہوا میں رخ بدل گئیں" کافی مختصر چند صفحات پر مشتمل حمزہ اور شہرینہ کا دوبارہ ملنا کچھ مناسب نہیں۔ اب شہرینہ کے لیے جہانداد سے بہتر انتخاب اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ مکمل ناول "پھر اسی راہ گزر پر" منعم ملک چاروں دوستوں کو شیر دل نے پھر اسی راہ پر لا کھڑا کردیا۔ عدیل اور میرو کی دوستی نے تو ہمیں بھی رلادیا۔ انا کا خول قیدی کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کردیتا ہے۔

☆ فضہ جی! کرن کو پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ کرن کا فون نمبر 0213-2726617 ہے، آپ اس پر فون کرسکتی ہیں۔

☆☆

فیشل یوگا

دور رکھیے بڑھاپا

خواتین بوٹوکس اور مختلف کریموں کے ذریعے چہرے پر پڑنے والی جھریوں کو روکنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ جھریاں بڑھتی عمر کے ساتھ چہرے پر نظر آئیں۔ کئی لڑکیاں ایسی بھی ہوتی ہیں، جو کم عمر ہونے کے باوجود چہرے پر پڑی جھریوں سے پریشان ہوتی نظر آتی ہیں۔ ان کے چہرے پر جھریاں خشک جلد کی ہونے کی وجہ سے پڑجاتی ہیں۔ ان جھریوں کو ختم کرنے اور چہرے پر قدرتی چمک لانے کے لیے بہت سی ورزشیں بتائی جاتی ہیں، ان کو اب ''فیشل یوگا'' نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ اس میں کچھ خاص قسم کی چہرے کی ورزش کی جاتی ہے تاکہ چہرے کی جلد کو ڈھیلا پڑنے سے محفوظ رکھا جاسکے جو ورزشیں خواتین کو بتائی جاتی ہیں، ان کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے چہرے کی جلد کو اور خلیات کے اندر دوڑنے والے خون کی گردش بہتر ہوتی ہے۔ ساتھ ہی خلیات میں کھنچاؤ آتا ہے، چہرے پر پڑنے والی لائنوں میں بھی کمی آنے لگتی ہے اور بڑھتی عمر کے اثرات چہرے سے نمایاں نہیں ہوپاتے۔ یہ ورزشیں خواتین گھر، آفس کہیں بھی بیٹھ کر باآسانی کرسکتی ہیں۔

وہ خواتین جن کی عمر پینتیس سال سے تجاوز کرگئی ہے اور وہ اپنے چہرے پر آتی تبدیلیوں کی وجہ سے پریشان ہیں۔ انہیں چاہیے کہ فیشل یوگا کو اپنی روٹین میں شامل کرلیں۔ باقاعدگی سے چہرے کی ایکسر سائز کریں۔ اس سے چہرے پر بڑھتی عمر کے اثرات نظر نہیں آئیں گے۔ ساتھ ہی ان ورزشوں سے ذہنی تناؤ بھی کم کیا جاسکتا ہے، ان ورزشوں کو کرنے کی وجہ سے آدھے سر کا درد بھی ختم ہوتا دیکھا گیا ہے۔

☆ سب سے پہلی ورزش یہ ہے کہ آپ اپنے دانتوں کو ہونٹوں کی مدد سے چھپالیں پھر ہونٹوں کو گولائی کے انداز میں موڑیں، جیسے انگریزی لفظ ''O'' بولتے وقت ہونٹوں میں گولائی آجاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد



دانتوں کو ہونٹوں کی مدد سے چھپاتے ہوئے مسکرائیں۔ اس طرح چھ مرتبہ اس ورزش کو دہرائیں، پھر مسکرائیں اور شہادت کی انگلی ٹھوڑی پر رکھتے ہوئے اوپر کی جانب دیکھیں۔ اس عمل کو دو مرتبہ دہرائیں۔

فائدہ: اس ورزش کی وجہ سے ہونٹوں کے گرد موجود لائنوں میں کمی لائی جاسکتی ہے، اس سے رخساروں کے مسلز کو بھی حرکت ملتی ہے۔

☆ دوسری ورزش کے لیے اپنے ہاتھوں کی پہلی اور دوسری انگلی کو بھنوؤں کے دونوں سروں پر اس طرح رکھیں کہ انگریزی لفظ ''وی'' بن جائے۔ کنپٹی کے پاس موجود انگلی پر تھوڑا سا دباؤ دیں۔ اب اوپر کی جانب دیکھیں۔



اس ورزش کو بھی چھ مرتبہ دہرائیں، ہر مرتبہ دس سیکنڈ کے لیے آنکھیں ضرور بند کریں۔

فائدہ: اس ورزش کی مدد سے آنکھوں کے اردگرد موجود لائنوں اور جھریوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔



☆ تیسری ورزش کے لیے اپنے سر کو پیچھے کی جانب لے جائیں۔ دونوں ہاتھوں کو گردن کے نزدیک والی ہڈی پر رکھیں۔ انگلیوں کو ہڈی پر ایک ہی لائن میں رکھیں۔ پھر چہرے کو پیچھے کی جانب لے جائیں، پھر آگے کی جانب لائیں۔ اس ورزش کو دو مرتبہ دہرائیں۔ اس کے بعد ہاتھوں کو گردن کی ہڈی پر ہی رکھیں اور ہونٹوں کو سختی سے بھینچیں۔ اسی انداز میں سر کو پیچھے لے جائیں اور آگے لائیں۔ اس ورزش کو بھی دو مرتبہ آزمائیں۔

فائدہ: اس ورزش کی مدد سے گردن اور ٹھوڑی پر موجود لائنوں کو دور کیا جاسکتا ہے۔

☆ چوتھی ورزش کے لیے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو بھنوؤں سے اوپر کی جانب رکھیں۔ انگلیوں پر زور دیتے



ہوئے اسے کنپٹی کی جانب لے جائیں۔ تین مرتبہ درمیان سے انگلیوں کو دباتے ہوئے کنپٹی کی جانب لائیں۔

فائدہ: اس ورزش سے پیشانی والے حصے کا دوران خون بہتر ہوتا ہے۔ اس سے الاسٹن اور کولاجن بھی حرکت میں آتے ہیں۔ ساتھ ہی ذہنی دباؤ کی وجہ سے پیشانی پر جو لائنیں پڑ جاتی ہیں وہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ دور ہو جاتی ہیں۔

☆ پانچویں ورزش کو آزماتے وقت دانتوں کو بالکل ویسے ہی ہونٹوں پر رکھیں، جس طرح پہلی ورزش کے دوران کیا تھا، بالکل ایسے ہی انگریزی لفظ "O" کے انداز میں ہونٹوں کو لے آئیں۔ اب ایک ایک انگلی کو رخساروں کی ہڈی پر رکھیں اور اوپر کی جانب دیکھیں۔ انگلیوں کے سرے ناک کی طرف ہونے چاہئیں۔ تیس سیکنڈ تک اسی انداز میں چہرے کو رکھیں، تین مرتبہ اس ورزش کو دہرائیں۔

فائدہ: آنکھوں اور رخساروں کے درمیان موجود



لکیریں کم ہوتی ہیں۔ رخساروں کی ہڈی اور مسلز حرکت میں آتے ہیں۔ خون کی روانی بہتر ہوتی ہے۔

☆ چھٹی ورزش میں چٹکی کاٹنے کے انداز میں انگلیوں اور انگوٹھوں کو رخسار سے نیچے والی جگہ پر رکھیں۔ تیس سیکنڈز تک اسی طرح وہاں کی جلد کو کھینچیں، چھ مرتبہ اس ورزش کو دہرائیں۔

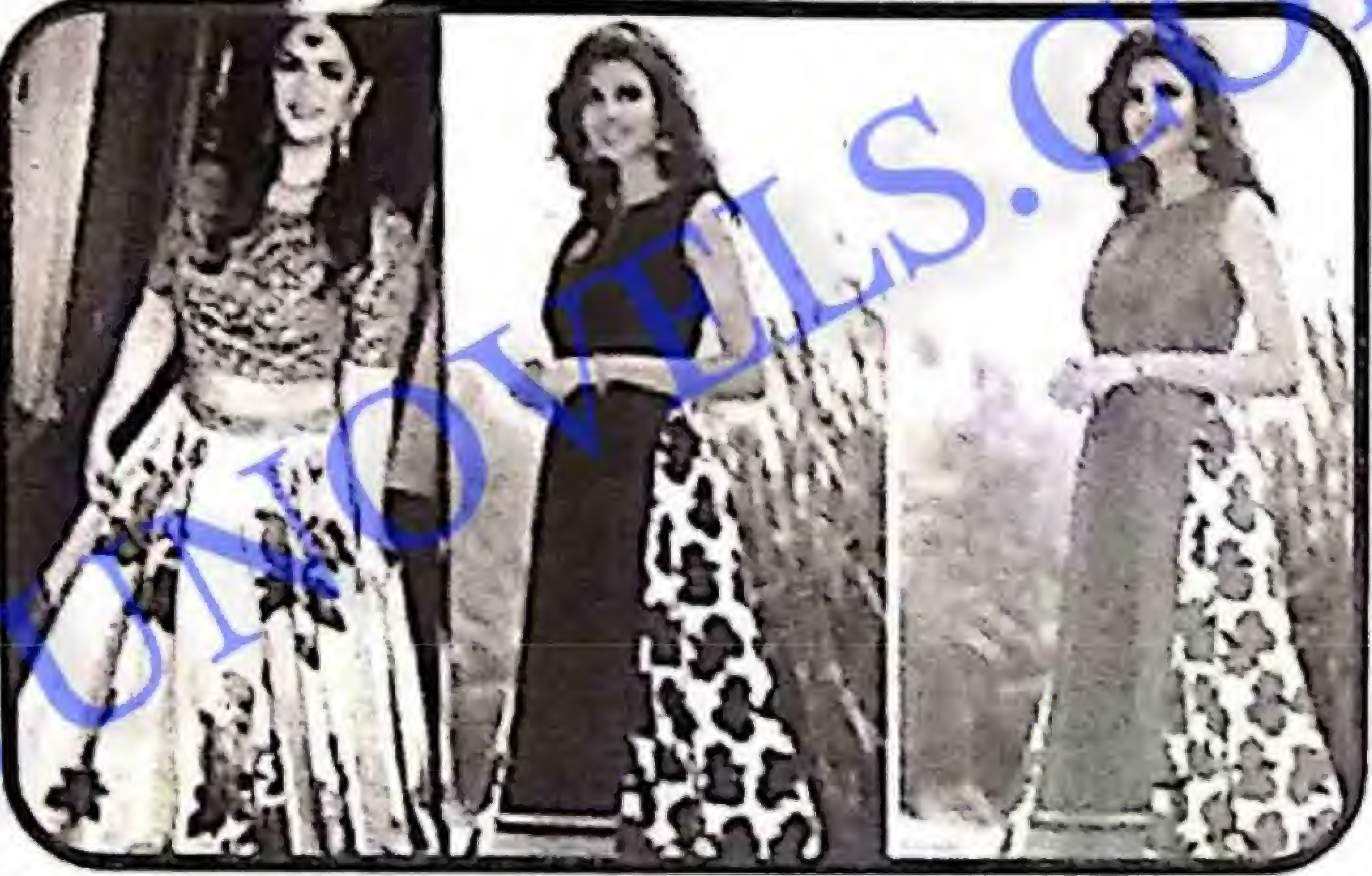
فائدہ: رخسار کے نیچے والی جگہ پر خون کی رفتار بہتر بنانے کے لیے اس ورزش کو بہترین مانا جاتا ہے۔ اس سے قدرتی چمک پیدا ہوتی ہے اور جلد کے اندرونی مسلز کو آکسیجن ملتی ہے، جس سے چہرہ کھلا ہوا ملتا ہے۔

فیشن

پرنٹڈ لہنگا

ایک جدید مشرقی پہناوا

آج کل لہنگے فیشن میں ہیں۔ شادی بیاہ اور مہندی کی تقریبات کے لیے لہنگا ہی موزوں لباس ہے اور نوجوان لڑکیاں تھوڑی سی تراش خراش اور تبدیلی کے ساتھ اسے پہننا پسند کرتی ہیں، ماڈرن لڑکیاں بلاؤز کے ساتھ پہننا چاہتی ہیں اور ڈھائی گز کے دوپٹے کے ساتھ اسے جاذب نظر بنا دیتی ہیں۔ لہنگے کے تصور سے عموماً بھاری کام والے جھکیلے دمکیلے زرق برق لہنگے کا ہی تصور آتا ہے لیکن موسم گرما میں یہ بھاری ملبوسات پہننا لڑکیوں کے لیے نہایت مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے اب مارکیٹ میں "پرنٹڈ لہنگا" متعارف کروایا گیا۔ جو جلدی عوام الناس میں مقبول ہو گیا ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں ایک تو بھاری ملبوسات موسم گرما میں نہیں پہنے جاتے، دوسرے ایک دو دفعہ کے استعمال سے ان ملبوسات پر کیا جانے والا کام خراب ہو جاتا ہے جس سے لڑکیوں کو بہت صدمہ ہوتا ہے کیونکہ ان ملبوسات پر ہزاروں روپے خرچ ہوتے ہیں۔



پرنٹڈ لہنگے جو مارکیٹ میں متعارف کروائے گئے ہیں، انہیں بے حد سراہا جا رہا ہے۔ ان لہنگوں پر مختلف جانور، ہاتھی، پھول بیل بوٹیاں پرنٹ کی گئی ہیں۔ کچھ لہنگوں پر جیومیٹریکل شیپ بناتے ہوئے ڈیزائننگ کی گئی ہے۔

پرنٹڈ لہنگوں میں سب سے زیادہ "فلورل پرنٹس" پسند کیے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ دو سالوں کے دوران بھی پرنٹس سب لہنگوں پر دیکھتے آئے ہیں۔ جب ان لہنگوں پر ڈیجیٹل فلورل پرنٹنگ کی گئی ہوتی ہے تو دیکھنے میں یہی لگتا ہے کہ جیسے اس لہنگے کو پہننے والی لڑکی باغ کا ہی ایک پھول ہو۔ گزشتہ سال سے فلورل لہنگے اسی طرح پسند کیے جا رہے ہیں، تاہم فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے ان فلورل لہنگوں پر بھاری کڑھائی، ریشم زری اور تلے کا کام کیا جا رہا تھا، اب صرف فلورل پرنٹڈ لہنگے بھی متعارف کروائے جا رہے ہیں۔ چاہے ڈیجیٹل پرنٹس ہوں یا بلاک پرنٹس، دونوں ہی طرح کے فلورل پرنٹڈ لہنگے اس وقت مارکیٹ میں با آسانی دستیاب ہیں۔

بلاؤز اور چولی دونوں کے ساتھ پرنٹڈ لہنگے اچھے لگتے ہیں، شرمیلی اور مشرقی لڑکیاں جو بدن عریاں نہیں کرنا چاہتیں لہٰذا وہ قدرے لمبا بلاؤز سلواتی ہیں جبکہ ماڈرن اور فیشن میں اختراع کو پسند کرنے والی لڑکیاں مختصر بلاؤز پہننا پسند کرتی ہیں۔

کالر والی شرٹ کے ساتھ لہنگے کا ایک جدید اسٹائل جس میں کالر والی خوب صورت سی کامدار قمیص کے ساتھ اسے پہنا جاتا ہے۔

جیکٹ نما اپر اور لہنگا یہ بھی ایک جدید انداز ہے، یعنی لہنگے اور چولی کے اوپر ایک لمبا سا اپر پہنا جاتا ہے۔ جیکٹ اور کوٹ نما یہ اپر قیمتی جامہ وار کا بھی ہو سکتا ہے اور

UUNOVELS.COM

پرنٹڈ لہنگوں کو مزید جاذب نظر بنانے کے لیے اس کے بارڈرز الگ سے تیار کیے جارہے ہیں۔ کئی لہنگے مختلف کنٹراسٹ اور کمبی نیشن کے ساتھ متعارف کروائے جارہے ہیں تاکہ ان کی خوب صورتی بڑھ جائے۔ ساتھ ہی ان پرنٹڈ فلورل، جیومیٹریکل یا دیگر موٹفس کے کناروں پر مختلف انداز کی ریشم وغیرہ کی کڑھائی کی جارہی ہے تاکہ اس میں تھوڑی سی چمک دمک آجائے۔ ڈیزائنرز کی یہ بھی کوشش ہے کہ اسے پرنٹ کرتے وقت اس میں سنہری رنگ کو بھی شامل کرلیا جائے تاکہ اس میں شادیوں کی تقریبات کے حوالے سے چمکیلا پن بھی ظاہر ہو۔ پرنٹڈ لہنگے مختلف رنگوں، جیسے لال، کریم، آف وائٹ، میرون، گرے و دیگر رنگوں میں دستیاب ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اگر لہنگا پرنٹڈ ہے تو اس کے ساتھ بلاؤز بھی پرنٹڈ ہوں۔ کئی ڈیزائنرز نے پرنٹڈ لہنگوں کے ساتھ سادے سلک یا جیکارڈ کے بلاؤز متعارف کروائے ہیں، جبکہ کچھ ڈیزائنرز نے شادی بیاہ کی تقریبات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان بلاؤز پر کڑھائی وغیرہ کرائی ہے تاکہ یہ مزید خوب صورت لگیں۔

آج کل لہنگوں پر جو پرنٹنگ کی جارہی ہے، وہ پہلی نظر میں لگتے ہی نہیں ہیں کہ وہ پرنٹڈ ہیں۔ دور سے دیکھنے میں ایسا ہی لگتا ہے کہ جیسے یہ کڑھائی پر مشتمل ہی لہنگے ہیں۔ ان لہنگوں کو پھولے ہوئے پرنسس اسٹائل میں ڈھالنے کے لیے یہ بہت ہے کہ ان کے نیچے ''کین کین'' استعمال کیا جائے۔ یہ دراصل نیٹ سے تیار کیے جاتے ہیں جو مختلف تہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ سفید رنگ میں دستیاب کین کین لہنگے کے نیچے پہنے جاتے ہیں، اس کے اوپر لہنگا پہنا جاتا ہے تاکہ لہنگا پھولا ہوا سا لگے اور شہزادیوں کے پہناوے جیسا لگے۔ اگر کین کین کا استعمال نہ کیا جائے تو لہنگے کی اصل خوب صورتی لوگوں کے سامنے نہیں آسکتی۔



سادہ یا پھول دار بھی۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ پورے لباس کا ایک خوب صورت امتزاج، بہرحال دلکش لگے۔

کچھ لہنگوں کے ساتھ بلاؤز نہیں، جیکٹ انداز کی شرٹ پہنی جاسکتی ہے جو درمیان سے کٹ کی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لمبی جیکٹ اسٹائل شرٹ کے ساتھ وہی پرنٹڈ لہنگا پہنا جاسکتا ہے، ہلکے و گہرے نیلے رنگ کے مختلف شیڈز پر مبنی اس طرح کے پرنٹڈ لہنگے موسم گرما کے دوران پہنے جائیں تو آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتے ہیں۔

زیادہ تر لہنگے کریپ، تفیتا، کین کین اور بلاؤز پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ نیٹ کا دوپٹا بھی شامل ہوتا ہے۔ یہ تمام چیزیں ان پرنٹڈ لہنگوں کے ساتھ فراہم کی جارہی ہیں۔ ڈیزائنرز کی جانب سے ان



صحت

آسٹیوپوروسس

اپنی ہڈیوں کی حفاظت کریں...... اپنا مستقبل بچائیں

انسانی جسم میں ہڈیوں کی ساخت کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ ان کی بدولت نہ صرف جسم متحرک رہتا ہے بلکہ اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور بھاگنے دوڑنے کا سارا انحصار بھی ان ہی پر ہوتا ہے۔ اگر یہ کمزور ہو جائیں یا کسی سبب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائیں تو فرد نہ صرف یہ کہ زندگی کی رعنائیوں سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ معاشرے کے لیے ایک بوجھ بھی بن جاتا ہے۔

آسٹیو پوروسس بھی ایک ایسا ہی خطرناک مرض ہے، جس میں مبتلا فرد محتاجی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آسٹیو کا مطلب "ہڈیاں" اور پوروسس کے معنی "کم زور یا خستہ" ہو جاتا ہے۔



ایک رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں پچاس برس سے زائد عمر کی خواتین کی ایک تہائی اور مردوں کی بیس فی صد تعداد ہڈیوں کی خستگی کا شکار ہے۔ جب کہ ماہرین طب اس بات پر متفق ہیں کہ امراض قلب کے بعد آسٹیو پوروسس صحت کا دوسرا بڑا مسئلہ ہے۔ اصل میں ہڈیوں میں بھی جسم کے باقی حصوں کی طرح کیمیائی عمل جاری رہتا ہے جس کے نتیجے میں ہڈیوں کے پرانے خلیے ٹوٹتے اور کچھ نئے ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ ایک عام فرد کی ہڈیاں تیس سے چالیس برس کے دوران اپنی بھرپور صورت میں توانا رہتی ہیں مگر جوں جوں عمر گزرتی ہے، ہڈیاں گھلنا شروع ہو جاتی ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق ہر تین خواتین میں سے ایک اور ہر پانچ مردوں میں سے ایک زندگی کے کسی بھی حصے میں آسٹیو پوروسس کا شکار ہو سکتا ہے۔ یعنی آسٹیو پوروسس کی شرح مردوں کی نسبت، خواتین میں بلند ہے۔ اس اعتبار سے اسے خواتین کا عارضہ تصور کیا جاتا ہے مگر اس سے بھی انکار نہیں کہ یہ مرض مردوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لیتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں 75 سے 84 برس کی 97 فی صد اور 45 سے 54 برس کی تقریباً 55 فی صد خواتین اس عارضے کا شکار ہیں۔

علامات:۔

آسٹیو پوروسس کی عام علامات میں جسم کی ہڈیاں، جوڑوں میں درد، ہر وقت تھکاوٹ کا احساس، بھوک کی کمی، معمولی سی چوٹ سے ہڈی کا ٹوٹ جانا اور کمر کا جھکاؤ وغیرہ شامل ہیں۔ بد قسمتی سے آسٹیو پوروسس کے زیادہ تر کیسز میں علامات ظاہر نہیں ہوتیں اور مرض اندر ہی اندر اپنی جڑیں مضبوط کرتا رہتا ہے۔ مگر پھر کسی بھی سبب جب کوئی ہڈی ٹوٹ جائے تو مرض تشخیص ہوتا ہے۔ جب کہ حتمی تشخیص کے لیے عموماً بون منرل ڈینسٹی (BMD) ٹیسٹ تجویز کیا جاتا ہے۔

وجوہات:۔

ہماری ہڈیوں کی مضبوطی کے لیے کیلشیم ایک ضروری عنصر ہے۔ کیلشیم کی کمی سے نہ صرف ہڈیاں کمزور ہوتی ہیں۔ بلکہ ہڈیوں سے متعلق کئی طرح کے امراض کا خطرہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ کیا آپ کو پتا ہے کہ کچھ ایسے فوڈ آئٹمز ہیں جن کا اگر زیادہ استعمال کیا جائے تو ہڈیوں کا کیلشیم تباہ ہونے لگتا ہے۔ جن میں چاکلیٹ، بہت زیادہ نمک، میٹھے مشروبات کا استعمال، بہت زیادہ گوشت کا استعمال کرنا۔ چائے یا کافی کی عادت، بریڈ، کیک اور دیگر بیکری فوڈز۔ کولڈ ڈرنکس، اچار، سرد غذائیں، اس کے علاوہ بہت زیادہ

بیٹھنا، بہت زیادہ سائیکل یا موٹر سائیکل چلانا اور بہت عرصے تک ادویات کا استعمال کرنا جسم میں کیلشیم کی کمی کو بڑھاتی ہیں۔

خواتین میں اس مرض کی ابتدا عموماً 45 سے 55 سال کی عمر میں ہوجاتی ہے۔ اصل میں قدرت نے خواتین کو صحت مند رکھنے کے لیے ماہ واری کا فطری نظام رکھا ہے۔ اگر وقت کے ساتھ یا پھر کسی بیماری کی وجہ سے یہ نظام ختم ہوجائے تو اسے طبی اصطلاح میں سن یاس (مینو پاز) کہا جاتا ہے، جس کا اثر ہڈیوں پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مردوں کی نسبت خواتین میں "بون لاس" کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ خصوصاً پہلے بچے کی پیدائش کے بعد۔ یاد رکھیے، جب بون لاس دو فی صد ہو، تو خواتین آسٹیو پوروسس کا شکار ہوجاتی ہیں، لیکن خواتین میں آسٹیو پورسس کی اہم وجہ بیرونی عوامل سے کہیں زیادہ ماہ واری نظام کی بندش ہے کہ جب کوئی خاتون سن یاس کی عمر کو پہنچتی ہے، تو اس کے جسم میں ایسٹروجن نامی ہارمون کی مقدار میں کمی واقع ہونے لگتی ہے اور یہی ہارمون ہڈیوں کی مضبوطی میں اہم کردار ادا کرتا ہے پھر بیش تر خواتین چوں کہ زچگی کے بعد اچھی اور معیاری خوراک استعمال نہیں کرتیں، جب کہ وہ خود نومولود کو دودھ پلا رہی ہوتی ہیں تو جسم میں کیلشیم کی کمی کے سبب یہ مرض لاحق ہوجاتا ہے۔ علاوہ ازیں، مشاہدے میں ہے کہ گردوں کے عوارض میں مبتلا خواتین بھی آسٹیو پوروسس کا جلد شکار ہوجاتی ہیں، جب کہ وہ خواتین جن کا زیادہ تر وقت آلودہ ماحول میں گزرتا ہو، ان میں بھی مرض لاحق ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

ایک تحقیق کے مطابق خواتین کی نصف تعداد ساٹھ برس کی عمر تک پہنچنے سے قبل کم از کم ایک بار آسٹیو پوروسس کے نتیجے میں ہڈی ٹوٹنے کی تکلیف سے گزرتی ہے لہٰذا سن یاس کے علامات ظاہر ہونے کے بعد باقاعدگی سے طبی معائنہ لازمی کروایا جائے تاکہ اس تکلیف دہ عارضے سے محفوظ رہا جاسکے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق سن یاس یا اس کے پانچ برس کے دوران ہڈیوں کی ساخت یعنی بون لاس ڈینسیٹی میں دس فی صد تک کمی واقع ہوسکتی ہے۔

علاج:۔

آسٹیو پوروسس کا کوئی علاج نہیں ہے، احتیاط اور غذا سے مرض کی روک تھام ہوسکتی ہے۔

☆ اگر بچپن یا جوانی میں کیلشیم کی متوازن مقدار حاصل نہ کی جائے تو آسٹیو پوروسس میں مبتلا ہونا یقینی سی بات ہے۔ لڑکیاں موٹاپے کے خوف سے دودھ، پنیر اور دہی کا استعمال نہیں کرتیں۔ ایسی صورت میں معالج کے مشورے سے کیلشیم کی گولیاں استعمال کروائی جائیں۔

☆ روزانہ صرف بیس منٹ سورج کی روشنی میں بیٹھیں تو ہمارے جسم کی وٹامن ڈی تھری کی ضرورت پوری ہوجاتی ہے۔ یہ وٹامن ہڈیوں میں کیلشیم کو جمع کرنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ہماری جلد میں یہ وٹامن پہلے سے موجود ہوتا ہے، جو سورج کی روشنی جسم پر پڑنے سے متحرک ہوجاتا ہے اور ہڈیوں تک کیلشیم کا پہنچانا شروع کردیتا ہے۔

☆ باقاعدہ واک اور ورزش کی عادت اپنائیں۔ اپنے مصروف ترین شیڈول میں روزانہ تیس سے چالیس منٹ ورزش کے لیے وقف کریں۔ اس سے پٹھے اور ہڈیاں مضبوط ہوتی ہیں۔

☆ دودھ اور اس سے بنی ہوئی چیزیں، ہرے پتے والی سبزیاں، مچھلی اپنی غذا میں ضرور شامل کریں۔

☆ حجامہ ضرور آزمائیں۔ جب کسی بیماری کے سبب جوڑوں کی دونوں سطحیں گھس جائیں تو ایسی صورت میں ایک بار حجامہ ضرور آزمائیں۔



نفسیاتی اور معاشرتی مسائل

بچے پھول ہیں......

ان کی حفاظت کیجیے

انسان کو اپنی زندگی میں ان گنت انسانوں سے واسطہ پڑتا ہے، ان میں اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ چاہنے والے بھی ملتے ہیں اور بے سبب دھتکارنے والے بھی، کسی کی چھوٹی سی خوشی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے والے بھی نظر آتے ہیں تو ایسوں کی بھی کمی نہیں جو اپنے چند لمحوں کو رنگین کرنے کے لیے دوسرے کی پوری زندگی کو بے نور کر دیتے ہیں۔ یہ مضمون ایسے ہی لوگوں سے اپنے دامن عفت کو تارتار ہونے سے بچانے کی کچھ سادہ سادہ باتیں اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ ہمیں آئے روز ایسی خبریں پڑھنے کو ملتی، فلاح علاقے میں مسجد کے قاری صاحب نے بچی یا بچے کے ساتھ زیادتی کی...... یا فلاح جگہ بچے کے ساتھ زیادتی کر کے اس کو قتل کر دیا گیا۔

جرم کا سدباب دو طریقوں سے ممکن ہے۔ پہلا یہ کہ جب بچہ عقل و شعور کی اس حد تک نہ پہنچا ہو جہاں وہ اچھے برے میں فرق کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی جسمانی حفاظت کا سامان کرنے کے قابل بنے تو اس مرحلے میں والدین کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اس کو ہراس رویے سے دور رکھیں جو اس کی عفت کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہو۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب بچہ یا بچی خود سمجھ داری کی حد تک پہنچ جائے تو وہ کن طریقوں سے اپنی حفاظت کریں اور والدین اس معاملے میں کیسے مددگار بنیں۔

☆ اگر قرآن کریم ناظرہ پڑھانے کے لیے استاد رکھیں تو ترتیب ایسی بنائیں کہ استاد اور بچہ، بچی دوران سبق آپ کی نظر میں رہیں۔



☆ اپنے بچوں کو سکھائیں کہ ماں باپ اور دادا دادی، نانا نانی کے علاوہ کسی کے گلے نہیں لگنا۔ کسی کی گود میں نہیں جانا۔

☆ یہ بہت ضروری ہے کہ آپ اپنے بچوں کو قریبی عزیزوں اور غیروں میں فرق سکھائیں، اگر سگے چچا کو وہ چاچا یا انکل بلاتے ہیں تو ان ناموں سے ان کو غیر لوگوں کو بلانے کی عادت نہ ڈالیں۔ بچوں کے ذہن چیزوں کی ظاہری صورت پر چلتے ہیں اگر وہ سب کو چاچا کہے گا تو اصلی اور نقلی کی تمیز نہ کر سکے گا جو اصل نقصان کی بہت بڑی وجہ بن سکتا ہے۔ انکل یا آنٹی کے بجائے سر یا مس سکھائیں یا ایسے الفاظ جو ان کی دماغوں کو واضح پیغام دیں کہ یہ غیر لوگ ہیں۔

☆ بچوں کو ابتدا سے ہی یہ چیز واضح طور پر سکھا دینی

چاہیے کہ وہ آپ کی اجازت کے بغیر کسی بھی شخص کے ساتھ کہیں نہ جائیں، اگر کوئی رشتہ دار یا ہمسایہ بھی انہیں اپنے ساتھ چلنے کو کہے تو وہ پہلے آپ سے اجازت لیں۔

☆ بچوں کو اس بات کا مکمل احساس دلایا جائے کہ ان کے جسم اور خاص طور پر ان کے مخصوص اعضا صرف اور صرف ان کی ملکیت ہیں، کسی کو ان کا غلط طرز عمل سے چھونے، سہلانے، چومنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

☆ بعض بچے اڑوس پڑوس کے گھر میں کسی بڑی عمر کے منہ بولے بھائی کے پاس ویڈیو گیمز وغیرہ کھیلنے میں کافی دلچسپی دکھاتے ہیں۔ اس سلسلے کو جس حد تک ممکن ہو، ختم کریں۔ بچوں کو گھر پر سرگرمیاں فراہم کریں۔

☆ چھوٹے بچوں کو دوپہر میں اور خاص کر گرمیوں کی دوپہر میں جبکہ بازار عموماً سنسان ہوتے ہیں، سودا سلف نہ لینے بھیجیں اور بچے کو اس حوالے سے بھی خصوصی ہدایات دیں کہ سودا سلف لیتے ہوئے کبھی بھی دکان کے اندر داخل نہ ہو۔

☆ بچوں کو سکھائیں کہ انہیں ہر ایک پر اعتبار نہیں کرنا۔ کسی سے کوئی چیز لے کر نہیں کھانی، کسی اجنبی سے کوئی کھلونا نہیں لینا اور کوئی کتنی بھی لالچ دے مگر اس کے ساتھ کہیں نہیں جانا۔

☆ آپ کا بچہ اگر کسی رشتہ دار کے ساتھ باہر جانے یا تنہائی میں وقت گزارنے سے گھبراتا ہے یا ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتا ہے تو اسے اس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے پر مجبور نہ کریں بلکہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ آخر وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ ساتھ ہی اس بات کو بھی دیکھیں کہ آپ کا بچہ کسی بڑی عمر کے فرد کے ساتھ انگیجمنٹ تو پسند نہیں کرتا۔

☆ اسکول سے آنے کے بعد بچے سے اس دن کی تفصیلات پوچھیں۔

☆ بچے خاص طور پر بچیاں بلوغت کو پہنچنے لگیں تو آپ جنسی معاملات کے بارے میں انہیں خود سے درست آگہی دیں۔ اگر آپ یہ کام نہیں کریں گے تو پھر اسے یہ سب باتیں دوسروں سے بے ہودہ تشبیہات کے ساتھ ملیں گی۔

☆ اپنے بچوں کو گھروں میں محفوظ رکھیں اور اپنی نگرانی میں رکھیں۔ گھر چھوٹا ہونے یا دو گھڑی خوشی اور سکون کی خاطر ان کو بغیر بالغ نگراں کے سڑک پر نہ نکالیں۔ گلی میں کوئی کزن، محلے دار، رشتے کا یا نام کا چاچا ماما ایسے مواقع سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

☆ بچے کے تمام دوستوں کے گھر کا پتا بھی آپ کو معلوم ہونا چاہیے اور ان کے والدین سے بھی آپ کی جان پہچان ہونی چاہیے۔

☆ بچوں کی تربیت میں جو چیز خاص اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ انہیں بتایا جائے کہ آپ کے منع کرنے کے باوجود اگر کوئی شخص اپنے ساتھ چلنے کے لیے زبردستی کرے یا ڈرائے دھمکائے تو ایسی صورتحال میں آپ نے کیا کرنا ہے، اس حوالے سے بچوں کو چند چیزیں واضح طور پر سمجھا دینی چاہئیں مثلاً آپ وہاں زور زور سے چلانا شروع کر دیں اور اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں ماریں حتیٰ کہ اگر انہیں وہاں سے بھاگنے کے لیے اجنبی شخص کو زخمی بھی کرنا پڑے تو ایسا کرنے سے نہ ڈریں۔ اس کے علاوہ کوئی قابل اعتماد شخص اردگرد موجود بچوں کے ساتھ جاتی ان کی ماں ہو سکتی ہے، اگر کوئی ایسی خاتون نظر آئے تو بچے کو چاہیے کہ ان سے مدد حاصل کرنے کے لیے زور سے چلانا شروع کر دیں۔

اگر خدانا خواستہ آپ اپنے بچے کے رویے میں کسی قسم کی تبدیلیاں دیکھیں تو فوری طور پر اس کی چھان بین اور سدباب کے لیے عملی اقدامات کریں۔ بچے میں رونما ہونے والی تبدیلیاں کچھ یوں ہو سکتی ہیں:

☆ خلاف معمول جسی نوعیت کی چیزوں میں دلچسپی لینا یا ان سے گریز کرنا۔

☆ نیند میں اضطراب کا مظاہرہ کرنا یا ڈراؤنے خواب دیکھنا۔

☆ گمراہ کن یا الجھانے والے انداز اختیار کرنا۔

☆ اداس رہنا یا گھر والوں اور دوستوں وغیرہ سے الگ تھلگ رہنا۔

☆ ایسے جملے کہنا جو جسمانی خدوخال کے متعلق ہوں۔

☆ اسکول جانے سے انکار کرنا یا ہچکچانا۔

☆ باتوں کو خفیہ رکھنا۔

☆ خلاف معمول یا بلاوجہ غصہ کرنا۔

اس کے علاوہ بھی دیگر علامات ہو سکتی ہیں، جس سے پتا چل سکتا ہے کہ بچہ کسی کے زیر اثر ہے یا اس پر کوئی زور زبردستی کر رہا ہے۔

کچن اور آپ

صائمہ مشتاق

س: ''آپ کیا سمجھتی ہیں کہ کھانے کے لیے جیا جاتا ہے یا جینے کے لیے کھایا جاتا ہے؟''

ج: ''جی لوگ زیادہ زیادہ کھانا پینا پسند کرتے ہیں، اس لیے ان کا دماغ ہر وقت کھانے کی طرف لگا رہتا ہے لیکن کچھ لوگ مثلاً میرے جیسے۔ بھوک لگی تو کھانے کی طرف جاتی ہوں، میرے خیال سے جینے کے لیے کھایا جاتا ہے۔''

س: ''گھر کے کام کاج خصوصاً کچن میں آپ کی دلچسپی کس حد تک ہے یا پڑھنے کا شوق آپ کو ان بکھیڑوں سے دور رکھتا ہے؟''

ج: ''شادی سے پہلے تو کچن جانا امی لوگوں کا کام تھا۔ شادی کے بعد ذمہ داریاں اور ہوتی ہیں۔ شادی کے بعد زندگی کی روٹین ٹف ہو جاتی ہے لیکن کچن میں کھانا بنانا اچھا لگتا ہے۔ میں نے ہر چیز کا ٹائم ٹیبل بنا کر رکھا ہوا ہے، اتنے بجے یہ کرنا ہے اور اتنے بجے یہ۔ اس لیے پڑھائی لکھائی بھی ہو جاتی ہے اور اپنا فرض بھی پورا کرتی ہوں۔''

س: ''ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ کھانا مزے دار ہی پکے۔ کبھی کبھی نتائج برعکس بھی ہوتے ہیں۔ ایسے میں کھانے والوں کے تبصرے کیا ہوتے ہیں؟''

ج: ''کھانا جتنا بھی مزے دار کیوں نہ بنالو قمر (میرا دیور) کو پسند ہی نہیں آتا لیکن دوسرے سارے کہتے ہیں، اچھا بنا ہے۔''

س: ''کون سی رائٹرز کو پڑھتے وقت کھانا دھواں ہوا، اس سے متعلق کوئی یادگار لمحہ؟''

ج: ''ایک دفعہ ہمارے گھر مہمان آئے ہوئے تھے تو میں قورمہ بنا رہی تھی۔ میرا ذہن نمرہ احمد کے ناول ''جنت کے پتے'' کی طرف چلا گیا۔ میں ایسا کھوئی کہ پیاز ساری جل گئی لیکن اللہ کا شکر ہے کسی کو پتا نہ چلا اور میں نے جلی پیاز نکال کر جلدی جلدی اور کاٹ کر ڈال دی، کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔''

س: ''عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ''ان'' کے دل میں اترنے کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔ آپ اس خیال سے کہاں تک اتفاق کرتی ہیں، اس سلسلے میں کوئی تجربہ ہو تو مختصراً لکھیں؟''

ج: ''ان کے دل میں پہلے سے کوئی اور بستا ہے۔ کھانے جتنے بھی بنالو جب دل میں اترنے کا راستہ ہی بند ہو تو کیا کیا جائے۔ جو چیز بناؤں کھا لیتے ہیں، کبھی تعریف یا تنقید نہیں کی۔''

س: ''لوگ آپ سے زیادہ تر کس ڈش کی فرمائش کرتے ہیں؟ آپ ہمیں اس ڈش کی ترکیب بتائیں۔''

ج: ''میں اچار گوشت بہت مزے کا بناتی ہوں، ترکیب یہ ہے۔

گوشت آدھا کلو۔ دہی آدھا کلو۔ تیل آدھا کپ۔ ادرک ایک چمچہ۔ لہسن ایک چمچہ۔ پیاز ایک عدد۔ ہری مرچیں آٹھ سے دس عدد۔ میتھرے، سونف، سفید زیرہ، کلونجی اور نمک سب ایک ایک چمچ۔

ترکیب: پیاز کو تیل میں براؤن کرکے اس میں گوشت اور لہسن ادرک ڈال کر بھون لیں۔ یہاں تک کہ گوشت کا پانی خشک ہو جائے (اگر بیف یا مٹن ہے تو تھوڑا سا پانی ڈال کر گوشت آدھا گلا لیں)۔ دہی میں نمک مرچ ڈال کر پھینٹ لیں اور گوشت میں ڈال کر پکنے دیں۔ جب دہی تقریباً بھن جانے کو ہو تو سونف، میتھرے، زیرہ اور ہری مرچیں کاٹ کر ڈال لیں، دس منٹ کے لیے ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔ آپ کا اچار گوشت تیار ہے۔''

س: ''پہلی ڈش کون سی بنائی اور گھر والوں کے کیا تبصرے تھے اس ڈش پر؟''

ج: ''پہلی ڈش میں نے عربی تامیاں بنائی تھی۔ سب کو بہت پسند آئی جب بھی میکے جاؤں تو ضرور بناتی ہوں۔''

س:''کون سی ڈش کو دیکھ کر آپ کے والد، بھائی یا شوہر کو غصہ آجاتا ہے اور پھر ان کا کیا ردعمل ہوتا ہے؟''

ج:''میرے ابوجان کو لوبیا پسند نہیں۔ وہ اگر بنا ہو تو نہیں کھاتے، غصہ ہوتے ہیں۔ میرے شوہر مزمل کو کوئی بھی دال بنانا پسند نہیں۔ وہ روٹی ہی نہیں کھاتے، کہتے ہیں مجھے بھوک نہیں۔''

س:''گھر والوں کی پسند کی کوئی ایسی ڈش جو آپ کو پکانا ناگوار گزرتی ہے؟''

ج:''جی مجھے دودھ والی سویاں پسند نہیں ہیں۔ جب کہتے ہیں بناؤ تو میری جان جاتی ہیں۔''

س:''ایسے کون سے رشتہ دار یا شوہر کے دوست احباب ہیں، جن کی خاطر تواضع کے لیے کچن میں جانا آپ کے لیے سخت ناپسندیدگی کا باعث ہوتا ہے؟''

ج:''نہیں جی۔ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا، میں تو بہت خوش ہوتی ہوں۔''

س:''سسرال میں پہلی چیز کیا بنائی؟''

ج:''کھیر بنائی تھی۔''

س:''آپ کے خاندان کی کوئی اسپیشل ڈش؟''

ج:''ہمارے خاندان کی اسپیشل ڈش پکوان اور میٹھی پیناں ہیں۔''

ثانیہ مشعل اشرف

س:''آپ کیا سمجھتی ہیں کھانے کے لیے جیا جاتا ہے یا جینے کے لیے کھایا جاتا ہے؟''

ج:''ہم تو جی جینے کے لیے ہی کھاتے ہیں۔''

س:''گھر کے کام کاج خصوصاً کچن میں آپ کی دلچسپی کس حد تک ہے یا پڑھنے کا شوق آپ کو ان بکھیڑوں سے دور رکھتا ہے؟''

ج:''پڑھائی کے دوران میں کاموں، خصوصاً کچن کے کاموں سے دور رہی۔ امی ہی کرتی تھیں۔ اب جناب پڑھائی ختم ہوگئی فی الحال تو کچن کا کام شوق سے کرتی ہوں۔''

س:''ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ کھانا مزے دار ہی پکے، کبھی کبھی نتائج برعکس بھی ہوتے ہیں۔ ایسے میں کھانے والوں کے کیا تبصرے ہوتے ہیں؟''

ج:''اللہ کا شکر ہے میں نے جب سے کھانا پکانا شروع کیا ہے، ہمیشہ اچھا ہی بنتا ہے۔ ہاں ایک دوبار مرچیں تیز ہوگئی تھیں تو بس سب نے سی سی کرتے ہوئے کھالیا۔ ہاں جس دن کھانا اچھا بنے تب علی کہتا ہے ''آپی! آج تو کھانا اچھا نہیں لگ رہا۔'' (مجھے تنگ کرنے کے لیے)۔''

س:''کون سی رائٹر کو پڑھتے وقت کھانا دھواں دھواں ہوا۔ اس سے متعلق کوئی یادگار لمحہ؟''

ج:''نہیں جی۔ کھانا تو کبھی نہیں جلایا، بس کسی کہانی کو سوچتے ہوئے رسالہ فریج میں اور پانی کی بوتل بیگ میں ڈال لی تھی اور اب شادی کے بعد تو خیر ایسی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا کرنا۔''

س:''عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ان کے دل میں اترنے کا راستہ معدے سے ہوکر گزرتا ہے۔ آپ اس خیال سے کہاں تک اتفاق کرتی ہیں؟''

ج:''کہا جاتا ہوگا کیونکہ ''ان'' کے دل میں اترنے کے لیے مجھے کسی تردد کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ان جو ہیں، وہ چٹنی اور مکھن بھی بڑے شوق سے کھالیتے ہیں۔''

س:''لوگ آپ سے زیادہ تر کس ڈش کی فرمائش کرتے ہیں؟ آپ ہمیں اس ڈش کی ترکیب بتائیں۔''

ج:''بیسن کا حلوہ۔ میرے بہن بھائی مجھ سے بیسن کے حلوے کی فرمائش کرتے ہیں۔ ''ان'' کو میرے ہاتھ کی چائے بہت پسند ہے۔ سو وہ چائے کی فرمائش کرتے ہیں۔''

س:''پہلی ڈش کون سی بنائی اور گھر والوں کے کیا تبصرے تھے اس ڈش پر؟''

ج:''پہلی ڈش بنائی تھی گڑ والے چاول۔ تب میں بارہ سال کی تھی اور امی کو چاول بہت پسند آئے تھے۔''

س:''ایسے کون سے آپ کے رشتہ دار یا شوہر کے دوست احباب ہیں جن کی خاطر تواضع کے لیے کچن میں جانا آپ کے لیے سخت ناپسندیدگی کا باعث ہوتا ہے؟''

ج:''کوئی نہیں بلکہ ہمارے گھر کوئی آجائے تو ہمیں خوشی ہی بہت ہوتی ہے۔''

س:''آپ کے خاندان کی اسپیشل ڈش؟''

ج:''ہمارے خاندان کی اسپیشل ڈش پلاؤ ہے۔ ہر قسم کا پلاؤ بہت شوق سے کھایا جاتا ہے۔''

کرن کا دستر خوان

خالدہ جیلانی

بگھاری دہی پھلکی

اجزاء

بیسن	ایک کپ
نمک	حسب ذائقہ
اینو	ایک چائے کا چمچہ
دہی	آدھا کلو
زیرہ (کٹا ہوا)	آدھا چائے کا چمچہ
چینی	ایک چائے کا چمچہ
لہسن پسا ہوا	ایک چائے کا چمچہ
پسی ہری مرچیں	ایک چائے کا چمچہ
پودینہ	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب:۔

ایک پیالے میں دہی ڈال کر اس میں نمک، زیرہ، چینی اور ہری مرچیں شامل کر کے اچھی طرح پھینٹ کر رکھ لیں۔

بیسن میں نمک ڈال کر بیٹر بنا لیں۔

بیٹر سے پکوڑیاں تلنے سے قبل اس میں اینو مکس کر کے گرم تیل میں ڈیپ فرائی کریں اور دہی کے مکسچر میں ڈال دیں۔

بگھار کے لیے:۔

اجزاء:۔

تیل	حسب ضرورت
لہسن کے جوئے	تین عدد (چوپ کر لیں)
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
کڑھی پتے	دس عدد
ثابت لال مرچ	چار سے پانچ عدد

ترکیب:۔

تیل گرم کر کے اس میں مرچیں ڈال کر لہسن ڈالیں۔ لہسن کا رنگ براؤن ہونے لگے تو زیرہ اور کڑھی پتے ڈال کر دہی پھلکی پر بگھار لگا دیں۔

گارلک مایو ونگز

اجزاء:۔

ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
لال مرچ کٹی ہوئی	ایک سے دو کھانے کے چمچے
کارن فلور	آدھا کپ
انڈا	ایک عدد
تیل	حسب ضرورت
نمک	حسب ضرورت

ساس کے لیے:۔

مایونیز	ایک کپ
لہسن کٹا ہوا	چار جوئے
نمک	حسب ذائقہ
کالے زیتون	دو سے تین عدد

ترکیب:۔

☆ ونگز کو لہسن ادرک کے پیسٹ، لال مرچ، کارن فلور، انڈے اور نمک کے ساتھ تیس منٹ کے لیے میری نیٹ کر لیں۔ ایک پتیلی میں تیل گرم کر کے اس میں ونگز کو فرائی کر لیں، یہاں تک کہ یہ کرسپی ہو جائیں اور گل جائیں۔

ساس کے لیے:۔

ایک پین لے کر اس میں مایونیز ڈال دیں۔ پھر اس میں نمک، لہسن اور کالے زیتون ڈال کر مکس کر لیں اور چولہا بند کر دیں۔ اب ساس کو ونگز کے اوپر ڈال کر سرو کریں۔



UUNOVELS.COM

بیشا مل میکرونی

اجزاء:-

میکرونی (ابلی ہوئی)	آدھا کلو
فلنگ کے لیے:	
قیمہ (چکن یا مٹن کا)	چار سو گرام
پیاز (چوپ کی ہوئی)	ایک عدد
لہسن کے جوئے	دو عدد (چوپ کیا ہوا)
ٹماٹو پیسٹ	چار کھانے کے چمچے
اوریگانو	ایک چائے کا چمچ
پارسلے (چوپ کیا ہوا)	تین کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
دارچینی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
پسی لال مرچ	چوتھائی چائے کا چمچ
تیل	دو کھانے کے چمچے
بیشامل سوس کے لیے:	
دودھ	تین کپ
مکھن یا مارجرین	پانچ کھانے کے چمچے
میدہ	پانچ کھانے کے چمچے
چکن کیوب	ایک عدد
پسی کالی مرچ	حسب ذائقہ

ترکیب:-

سوس پین میں تیل گرم کرکے پیاز اور لہسن ڈال کر ساتے کریں۔ پیاز نرم ہوجائے تو قیمہ شامل کرکے بھونیں۔ قیمہ کا پانی خشک ہوجائے تو اس میں ٹماٹو پیسٹ، پارسلے، اوریگانو، نمک، دارچینی، لال مرچ شامل کرکے بھونیں۔ (اگر مٹن قیمہ استعمال کررہی ہیں تو آدھا کپ پانی شامل کردیں) ڈھکن ڈھک کر دس منٹ تک پکائیں۔

بیشامل سوس تیار کرنے کے لیے سوس پین میں مکھن یا مارجرین ڈال کر پگھلائیں۔ اس میں میدہ، چکن کیوب اور کالی مرچ شامل کردیں۔ ایک سے دو منٹ تک مزید پکائیں۔ سوس گاڑھی ہوجائے تو آنچ سے اتار لیں۔

سوس کا آدھا حصہ الگ کرکے میکرونی میں اچھی طرح مکس کردیں 13x9 کے سائز کا بیکنگ پین لیں۔ اس میں آدھی میکرونی اچھی طرح پھیلادیں۔ اس کے اوپر تیار شدہ قیمہ کا مکسچر ہموار انداز میں پھیلادیں۔ اس کے اوپر بیشامل سوس پھیلادیں۔ پسی دارچینی چھڑک کر 350 پر تیس سے پینتیس منٹ تک بیک کریں۔ اوپر سے رنگت سنہری ہوجائے تو اوون سے نکال کر پانچ منٹ تک رکھیں، سیٹ ہوجائے تو پیش کریں۔

قیمہ باجرا کٹلس

اجزاء:-

قیمہ	ایک پاؤ
باجرے کا آٹا	ایک کپ
ہری مرچیں	چھ سے آٹھ عدد (باریک پیس لیں)
دھنیا	دو کھانے کے چمچے
زیرہ	ایک چائے کا چمچ
لہسن ادرک	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ضرورت
ہری پیاز	چار باریک کٹی ہوئی
ہلدی	آدھا چائے کا چمچ
تیل	دو کھانے کے چمچے
دہی	دو کھانے کے چمچے
گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچ

ترکیب:-

قیمے میں باجرے کے آٹے اور ہری پیاز کو چھوڑ کر تمام مسالے ڈال کر باریک چوپ کرلیں۔ پھر اس میں باجرے کا آٹا شامل کرکے گوندلیں۔ آخر میں ہری پیاز شامل کرکے چھوٹے چھوٹے کباب بنا کر ڈیپ فرائی کریں۔ ان کو چٹنی، کیچپ کے ساتھ نوش فرمائیں۔

بریڈ گلاب جامن



اجزاء:۔

ڈبل روٹی کے سلائس	چوبیس عدد
دودھ	ایک کپ
کھویا	150 گرام
چینی	ایک کپ
بادام	ایک چوتھائی کپ
گھی	تلنے کے لیے حسب ضرورت

ترکیب:۔

سب سے پہلے کسی پیالے میں کھویا اور خشک میوے کو ملائیں۔ دونوں چیزوں کو ملا کر اچھی طرح یکجان کرلیں، پھر ڈبل روٹی کے سلائس کے کناروں کو کاٹ لیں، ان سلائسز کو دودھ میں ڈالیں اور پھر اسے نچوڑ کر نکالتی جائیں، جب تمام سلائسز کو بھگو کر نکال لیں تو پھر ان سلائسز کو اچھی طرح مکس کرکے آٹے کی طرح گوندھیں۔ جب یہ مکسچر آٹے کی طرح تیار ہوجائے تو اس سے گلاب جامنز کے سائز کی بالز بنائیں۔ بالز کے درمیان کھویا اور میوہ والا مکسچر بھردیں۔ اب بالز کو ہتھیلیوں پر رکھ کر گول شیپ دے دیں۔ اب چینی کو دو کپ پانی ڈال کر شیرا تیار ہونے تک پکائیں۔ کسی فرائنگ پین میں تیل ڈالیں اور اس میں ایک ایک کرکے گلاب جامن کو تل لیں، پھر اسے شیرے میں ڈالتی جائیں۔ تھوڑی دیر تک اسی میں ڈبو کر رکھیں۔ پلیٹ میں نکالیں، اس کے اوپر کٹے ہوئے بادام پستے گارنش کریں۔

چاکلیٹ حلوہ

اجزاء:۔

سوجی	آدھا کپ
کوکو پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
چینی	آدھا کپ
گھی	تین کھانے کے چمچے
الائچی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
گرم پانی	ڈیڑھ کپ سے تھوڑا سا کم
میوے (جس میں بادام، پستے اور کاجو شامل ہوں)	سلائس کٹے ہوئے ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب:۔

سب سے پہلے کسی کڑاہی میں گھی کو گرم کریں۔ چولہا ہلکی آنچ پر رکھیں، جب گھی گرم ہوجائے تو اس میں سوجی ڈالیں، جب سوجی سے خوشبو آنے لگے اور اس کی رنگت بھی تبدیل ہونے لگے تو اس میں کوکو پاؤڈر ڈالیں۔ دونوں چیزوں کو اچھی طرح مکس کریں۔ اب اس میں آہستہ آہستہ پانی ڈالتی جائیں اور مکس کرتی جائیں تاکہ گٹھلیاں نہ بنیں۔ پھر اس میں الائچی پاؤڈر اور چینی ڈالیں، ان دونوں چیزوں کو بھی اچھی طرح مکس کریں۔ جب چینی اچھی طرح حل ہوجائے تو اسے ڈھکن ڈھک کر دو منٹ تک مزید پکائیں۔ ڈھکن کھول کر اسے مکس کریں، جب تمام چیزیں یکجان ہوجائیں اور حلوہ تیار ہوجائے تو تیار حلوے کو ڈش میں نکال لیں۔ کٹے ہوئے بادام، پستے اور کاجو سے گارنش کریں۔



شگفتہ سلیمان

"مجھے یہ شعر پسند ہے"

ماریہ نذیر ——— بھاگٹانوالہ

گلہ فضول تھا عہدِ وفا کے ہوتے ہوئے
سو چپ رہا، ستمِ ناروا کے ہوتے ہوئے
یہ قربتوں میں عجب فاصلے پڑے کہ ہمیں
ہے آشنائی طلب، آشنا کے ہوتے ہوئے

جمیلہ مغل ——— راولپنڈی

گلہ بھی تجھ سے بہت ہے مگر محبت بھی
وہ بات اپنی جگہ ہے یہ بات اپنی جگہ

عاصمہ آصف ——— نوشہرہ ورکاں

شدتِ تشنگی میں بھی غیرتِ مے کشی رہی
اس نے جو پھیر لی نظر میں نے بھی جام رکھ دیا

اقرا سرور ——— ڈی جی خان

ہم کسی در پہ نہ ٹھٹکے نہ کبھی دستک دی
سینکڑوں در تھے مری جاں ترے در سے پہلے
چاند سے آنکھ ملی جی کا اجالا جاگا
ہم کو سو بار ہوئی صبح سحر سے پہلے

ماہا بشیر ——— ڈنگہ

کتنا آسان ہے تائید کی خو کر لینا
کتنا دشوار ہے اپنی کوئی رائے رکھنا

گڑیا راجپوت ——— جاتری شریف

اب دل بھی دکھاؤ تو اذیت نہیں ہوتی
حیرت ہے کسی بات پہ حیرت نہیں ہوتی

ایمن اقبال ——— ڈی جی خان

جب تک تری زلفوں سے پیچ و خم نہیں ہوں گے
ستم دنیا میں بڑھتے ہی رہیں گے، کم نہیں ہوں گے
اگر بڑھتا رہا یونہی یہ سودائے ستم بازی
تم ہی رسوا سرِ بازار ہو گے، ہم نہیں ہوں گے

یاسمین فرید ——— لاہور

پہلے ہم تھے تیرے حواسوں پر
اب کوئی اور ہے دھیان میں کیا

فضہ بلال ——— ڈیفنس

صرف اپنا خیال رکھنا تھا
یہ بھی نہ ہو سکا ہم سے

ثنا شہزاد ——— کراچی

کمال یہ ہے کہ ایک ہی عمر تھی جسے ہم!
نجانے کس کس کے نام کرتے کا سوچتے رہے

آسیہ جاوید ——— علی پور چٹھہ

ہمیں تھی غرض تم سے اور تمہیں بے غرض ہونا تھا
تمہیں ہی لا دوا ہو کر ہمارا مرض ہونا تھا
چلو ہم فرض کرتے ہیں، کہ تم سے پیار کرتے ہیں
مگر اس پیار کو بھی کیا ہم ہی پہ قرض ہونا تھا

سارہ کرن ——— مورو

ہم تو غالب کے مقلد ہیں چاہت میں اے فراز
جس پہ مرتے ہیں اس کو بھی مار کے رکھ دیتے ہیں

خوشی سرانوالی ——— سیالکوٹ

اس کے لہجے سے بس یہ معلوم ہوا
اسے دشوار لگتا ہے ہم سے رابطہ رکھنا

اقرا ممتاز ——— سرگودھا

ہم امن چاہتے ہیں مگر ظلم کے خلاف
گر جنگ لازمی ہے تو پھر جنگ ہی سہی
ظالم کو جو نہ روکے وہ شامل ہے ظلم میں
قاتل کو جو نہ ٹوکے وہ قاتل کے ساتھ ہے

حمیرا اکرم ——— ٹنڈو آدم

کس ڈھٹائی سے وہ دل چھین کے کہتے ہیں
وہ مرا گھر ہے رہے جس میں محبت میری

اقصیٰ ناصر ——— گلستان جوہر

کبھی حیات کا ضامن کبھی وسیلۂ مرگ
نگاہِ یار تیرا بھی کوئی اعتبار نہیں

اقرا، عائشہ ——— کراچی

تم نے جان کے عوض آبرو بیچ دی
ہم نے بھر بھی کیا ہے گوارا تمہیں
تم ظفرمند تو خیر کیا لوٹتے
ہار میں بھی نہ دل سے اتارا تمہیں

زبیدہ خان ——— کراچی

پھر حریفِ بہار ہو بیٹھے
جانے کس کس کو آج رو بیٹھے
تھی، مگر اتنی رائیگاں بھی نہ تھی
آج کچھ زندگی سے کھو بیٹھے

UUNOVELS.COM

مسکراتی کرنیں

ادارہ

ہونہار بروا......

ایک صاحب بستر پر لیٹے لیٹے کسی کام سے بچوں کو آوازیں دے رہے تھے مگر کوئی بچہ ان کی بات نہیں سن رہا تھا۔ بیگم بھی وہیں موجود تھیں۔ لیکن وہ بھی لاپرواہی سے بیٹھی رہیں۔

شوہر کی برداشت سے باہر ہوا تو طنزیہ کہنے لگے۔

''بیگم! مجھے لگتا ہے کہ ہمارے بچے کسی ہوٹل کے بیرے بنیں گے۔ جب بھی انہیں بلاتا ہوں، حاضر ہی نہیں ہوتے۔''

''زبان سنبھال کر بات کرو۔'' بیگم غضب ناک ہوکر بولیں۔ ''یہ دو ٹکے کی نوکریاں تم خود کرنا، میرے بچے سرکاری افسر بنیں گے۔ وہ کسی کی نہیں سنیں گے، خواہ ان کا باپ ہی کیوں نہ ہو۔''

تبسم بشیر......ڈنگہ

وضاحت

ایک صاحب ریلوے کا ٹائم ٹیبل پکڑے ''انکوائری'' کی کھڑکی پر پہنچے اور ایک ٹرین کا نام لے کر بولے۔ ''اس ٹائم ٹیبل میں لکھا ہے کہ یہ ٹرین پانچ بارہ پر آتی ہے۔ اب تو ساڑھے پانچ ہو چکے ہیں لیکن ٹرین اب تک نہیں آئی۔''

''جناب...... پانچ بارہ کا مطلب ہے کہ یہ ٹرین پانچ سے بارہ بجے کے درمیان کسی بھی وقت آسکتی ہے، ابھی بارہ تو نہیں بجے نا......؟'' کاؤنٹر کلرک نے اطمینان سے کہا۔

ماریہ نذیر...... بھاگٹانوالہ

چاندنی رات

نوجوان ماہر نفسیات کی بیوی نے شوہر سے کہا۔

''کیا تم بھی یہی سمجھتے ہو کہ چاندنی رات میں پاگل کا پاگل پن حد سے گزر جاتا ہے۔''

ماہر نفسیات شوہر نے جواب دیا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں اس رائے پر کوئی تبصرہ نہیں کرسکوں گا کیونکہ وہ چاندنی رات ہی تھی، جب میں نے تم سے شادی کی درخواست کی تھی۔''

فائزہ بھٹی......چوکی

سیاسی انٹرویو

''آپ کے سیاسی نظریات کیا ہیں؟''

''میرے سیاسی نظریات وہی ہیں جو میرے لیڈر کے ہیں۔''

''آپ کے لیڈر کے سیاسی نظریات کیا ہیں؟''

''ان کے سیاسی نظریات وہی ہیں جو میرے ہیں۔''

''آپ دونوں کے سیاسی نظریات کیا ہیں؟''

''ہم دونوں کے سیاسی نظریات یکساں ہیں۔''

اقراء سرور......ڈی جی خان

تشویش

ہوٹل کے منیجر نے ایک ویٹر کو بلا کر پوچھا۔

''تمہاری میز نمبر پانچ کا گاہک ایک دم اٹھ کر تیزی سے کیوں باہر چلا گیا؟''

''سر! اس نے کبابوں کا آرڈر دیا تھا......'' ویٹر بتانے لگا۔ ''میں نے اسے بتایا کہ قیمہ ختم ہوگیا ہے، اس لیے کباب تیار نہیں ہیں لیکن اگر کچھ دیر انتظار کرلے تو میں قیمہ بنوا کر کباب تیار کروادوں گا۔ اس نے کہا کہ وہ انتظار کرلے گا۔ میں کچن میں گیا تو وہاں آپ کا موٹا تازہ بلا بیٹھا ہوا تھا۔ میرا پاؤں غلطی سے اس کی دم پر پڑ گیا۔ بلے نے زور سے چیخ ماری۔ یہ چیخ سن کر گاہک تیزی سے اٹھا اور رخصت ہوگیا۔''

عائشہ تاج......شہداد پور

معافی

ایک پٹھان سے کسی نے پوچھا۔ ''اگر کوئی شخص آپ کے ساتھ بدتمیزی کرے تو اسے معاف کردیں گے؟''

پٹھان: ''معاف کرنے والی ذات تو اللہ کی ہے، ہم بس اسے وہاں پہنچادیں گے۔''

دعا مصطفیٰ......میرپورخاص

کچھ موتی چنے ہیں

ادارہ

پاکستانی الو

بس ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ملک میں الو کی تحقیق پر مناسب توجہ نہیں دی گئی ورنہ ہمارے ہاں الوؤں کی کیا کمی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک الو ہے۔ ہر شاخ پر الو بیٹھا ہے اگرچہ میں نے الوؤں پر زیادہ تحقیق نہیں کی۔ البتہ چند حقائق ایسے ہیں جو خود بخود آشکار ہو گئے ہیں مثلاً یہ کہ الوؤں کی بلکہ پاکستانی الوؤں کی چار قسمیں ہیں، پہلے تو ابتدائی قسم کے الو ہوتے ہیں یعنی بڑے الو اور چھوٹے الو۔ پھر بڑے الوؤں میں ایک ذرا چھوٹے ہوتے ہیں اور اس طرح چھوٹے الوؤں میں بھی ذرا چھوٹے الو اور بہت ہی چھوٹے الو۔ ان چار اقسام کے الوؤں میں ایک قدر مشترک پائی جاتی ہے اور وہ ہے الو ہونا۔ ویسے محاورے کے لحاظ سے بڑے الو کا زیادہ استعمال ہوتا ہے مثلاً وہ بڑا الو ہے۔ یاد رہے کہ یہ کبھی نہیں کہا جاتا ہے کہ وہ تو چھوٹا الو ہے۔

(مستنصر حسین تارڑ...... الو ہمارے بھائی ہیں)

ایمن اقبال...... ڈی جی خان

زندگی

ہم زندگی کو نہیں گزارتے بلکہ زندگی ہمیں گزارتی ہے اور اپنی پسندیدہ زندگی کسی کو نہیں ملتی۔ جو چاہتے ہیں وہ نہیں ملتا اگر وہ مل جائے تو اس جیسا خوش نصیب کوئی نہیں۔

(ہالوقدیہ......)

ماریہ نذیر...... بھاگٹانوالہ

راولپنڈی

پنڈی سے ہمیں پیار ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اس کے نام میں نسائیت ہے۔ لاہور اور پشاور بہت مذکر کاٹھ کے شہر ہیں۔ نام کے لحاظ سے کراچی بھی اتنی ہی مونث ہے بلکہ ایک شادی شدہ کیفیت یعنی عروس البلاد کہلاتی ہے۔ لیکن شیوہ ترکانہ دوشیزہ پنڈی کا ہے، وہ اس عروس ہزار داماد کا نہیں۔

(کرنل محمد خان...... بسلامت روی)

رابعہ عمر تاج...... شہداد پور

ایک عام مسلمان

''بابا جی۔ عجیب کشمکش ہے، ایک مولوی کہتا ہے بس اللہ کو مانو...... دوسرا مولوی کہتا ہے اللہ کو بھی مانو...... اللہ کے نبیوں کو بھی مانو۔ نبی ﷺ کے صحابہ کو بھی مانو۔ بابا فرید کو بھی مانو۔ ایک کہتا ہے کہ بس اللہ کو مانو، بات ختم۔ دوسرے مولوی کے پاس اللہ بھی ہے اور ڈھیر سارے بندے بھی...... سمجھ میں نہیں آرہا کیا کروں؟''

بابا جی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ''بیٹا اصحاب کہف کا کتا جنت میں اس لیے جائے گا کیونکہ وہ اللہ پہ بھونکا نہیں تھا۔ اس نے تعظیم کی تھی اور شیطان جو فرشتوں کا استاد تھا جس کی ہزاروں سال کی عبادت اس کے منہ پہ ماردی گئی کیونکہ اس نے اللہ کے بندے کی تعظیم نہیں کی۔ وہ اللہ کو مانتا تھا مگر جس کو اللہ سنوار رہا تھا، اس کو ماننے سے انکار کیا اس نے تعظیم نہیں کی آدم کی۔ اللہ کو تو یہودی بھی مانتے ہیں۔ بس بیٹا! اللہ نے بڑے بڑے گناہ گاروں کو بخشا ہے، وہ گناہ بخش دے گا۔ انکار نہیں بخشے گا۔'' آخری الفاظ بول کر وہ اٹھ کر چلے گئے کہ ''بیٹا انسان گناہ گار ہو مگر کسی کا منکر نہ ہو۔''

زرینہ خانم انصاری...... مظفر گڑھ

ادب اور ڈاکٹر

سوال:

مجھے جس لڑکی سے محبت ہے وہ حسین ہونے کے علاوہ انٹیلیکچوئل بھی ہے۔ میں ''ڈاکٹر'' ہوں۔ اس لیے علم و ادب میں دلچسپی رکھنے کی قطعاً فرصت نہیں۔ ابھی تک پیغام نہیں بھجوایا کیوں کہ میرے خیال میں وہ وولی وگی، ہربرٹ اسپنسر، ابو نواس اور بھرتری ہری کی جانب مائل ہے۔ جب کبھی اس سے ملتا ہوں، یہی نام سننے میں آتے ہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ آپ کے مشورے کا منتظر ہوں؟

جواب:

ہمارے خیال میں آپ کو فوراً پیغام بھیجنا چاہیے، اتنے حضرات کی موجودگی میں ذرا سی دیر خطرناک ہو سکتی ہے۔

شفیع الرحمان

اقراء ممتاز...... سرگودھا

مدیرہ



کہانیاں کس کو اچھی نہیں لگتیں۔ قدیم زمانے سے کہانیاں سُننا انسان کا مشغلہ رہا ہے۔ جب انسان نے لکھنا، پڑھنا نہیں سیکھا تھا، تب بھی مائیں، دادیاں رات کو بچوں کو سونے سے پہلے کہانیاں سناتی تھیں۔ ان کہانیوں کا تعلق خیالی اور فرضی دُنیا سے ہی سہی لیکن یہ اخلاقی تربیت کا حصّہ رہی ہیں، تفریح کا ذریعہ تو ہیں ہی۔

محمود ریاض صاحب نے جب ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی بنیاد رکھی تو ان کے پیش نظر پہلی بات تھی۔ کہ خواتین جو کہانی لکھنے کا، الفاظ کو برتنے کا فن جانتی ہیں۔ ان کی صلاحیتوں کو سامنے لایا جائے۔ ایک ایسا پرچا ترتیب دیا جائے، جو صاف ستھری تفریح کا ذریعہ ہو اور قارئین کی ذہنی اور اخلاقی تربیت بھی کر سکے۔

اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے خواتین ڈائجسٹ کا اجراء کیا جس کی قارئین نے بھرپور پذیرائی کی۔ خواتین ڈائجسٹ کے بعد کرن کا اجراء اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ کرن نے اپنے منفرد اور دلچسپ سلسلوں کی بدولت قارئین کے دلوں میں اپنا مقام بنالیا۔

کرن کو خوبصورت اور منفرد بنانے میں محمود بابر کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ وہ آج ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی شگفتہ تحریریں بھلائی نہیں جاسکتیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

کرن کے ذریعے بے شمار مصنفین کی تخلیقی صلاحیتیں سامنے آئیں اور ان کی تخلیقات نے کرن کو ایک علیحدہ پہچان دی۔ ہم ان تمام مصنفین کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ان میں سے آج بہت سی مصنفین ہمارے درمیان نہیں۔ ان کے لیے دُعاگو ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

ہم اپنی قارئین کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جن کا تعاون اور محبتیں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ ساتھ ہمیشہ قائم رکھے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- کرن کی سالگرہ کے موقع پر قارئین سے سروے "کچھ باتیں دل کی"،
- گلوکار "عامر سلیم" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ "زینب شبیر" کہتی ہیں "میری بھی سُنیے"،
- "آواز کی دُنیا سے" اس ماہ مہمان ہیں "طیب حسین صدیقی"،
- "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" آسیہ مرزا کا سلسلے وار ناول،
- نگہت عبداللہ کا سلسلے وار ناول "ہوائیں رُخ بدل گئیں"،
- "کنارِ خواب جُو" فرح بخاری کا مکمل ناول، ، میمونہ صدف کا مکمل ناول "زندگی یہ سفر میں ہے"،
- "پیکرِ وفا"، صدف آصف کا مکمل ناول، ، ایمل رضا کا ناولٹ "مہوا کا پیڑ"،
- "اے دلِ بے خبر"، صدف ریحان گیلانی کا ناولٹ،
- نعیمہ ناز، عطیہ خالد، عنید لبیب زہرا، ذرقا سکندر اور عنبرین ابدال کے افسانے اور مستقل سلسلے، کرن کتاب، معلوماتی مضامین اور مزے دار ریسپیز کے ساتھ۔



تیری رحمت کے اک اشارے پر
لے کے آئے بھنور کنارے پر

لائقِ بندگی تری ہستی
جھکنا لازم ترے دروازے پر

کھیت، صحرا، پہاڑ اور دریا
آنکھ حیران ہر نظارے پر

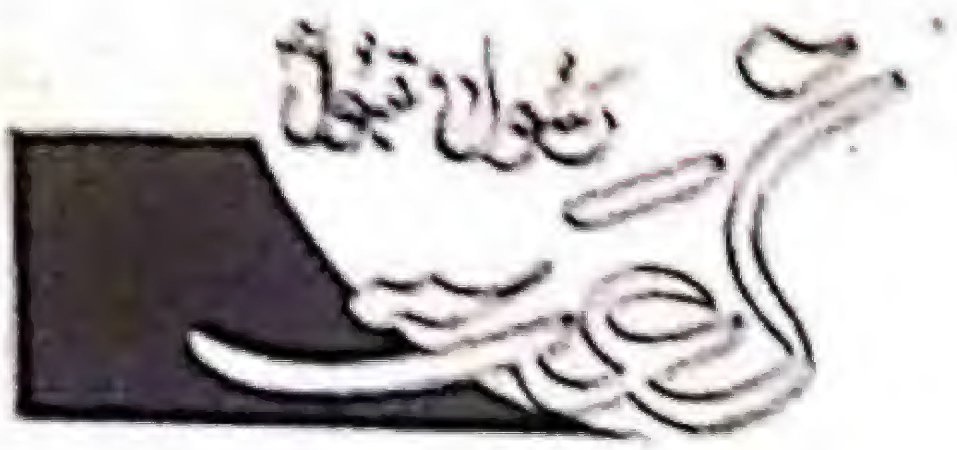
طائرِ فکر دھیان سے اڑنا
جل نہ جائیں کہیں تمہارے پر

ہے دُنیا متاعِ بے وقت
اس کی بنیاد ہے خسارے پر

لب پہ تھا کُلُّ مَنْ علیھا فان
تھی نظر ٹوٹتے تارے پر

تیری رحمت ہے بس مری امید
لُطف اعزاز غم کے مارے پر

خالد اعزاز



ہر اک زبان پہ درود و سلام آتا ہے
خدا کے بعد محمدؐ کا نام آتا ہے

فلک کے چاند ستارے رویے تم بھی دیکھو آج
زمیں سے عرش پہ خیر الانام آتا ہے

چمک اٹھتا ہے ہر اک ذرہ کہکشاں بن کر
پڑھانے نفل فلک پر امام آتا ہے

حضورِ پاک کی شفقت کا فیض ہے اتنا
کہ ان سے ملنے ہر اک خاص و عام آتا ہے

چلا ہے آج ہر اک فرد جانبِ سرور
وہ جن کے پاس خدا کا پیام آتا ہے

اثر یہ رب کا کرم ہے کہ رنج و راحت میں
رسولِ پاک کا بس لب پہ نام آتا ہے

اثر اکبر آبادی

سالگرہ نمبر

کچھ باتیں دل کی

ادارہ



زندگی کو غم اور خوشی کا نام بھی کہتے، انسان کو اس دنیا میں آتے ہی مختلف النوع احساسات اور حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسے اپنی زندگی میں جہاں بے شمار خوشیاں اور مسرتیں ملتی ہیں وہیں مشکل حالات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ ایسے میں اسے اپنی رہنمائی کے لیے ایک مخلص دوست کی ضرورت ہوتی ہے۔ ''کرن'' بھی ہماری قارئین بہنوں کے لیے ایک دوست کی مانند ہے۔ ہے جو ضمیر کو روشنی بخشنے والا قندیل، علم و آگہی کا خزینہ، تنہائی کی جاں گسل طوالت کا بہترین رفیق، زندگی کی ناہموار راہوں میں دل نواز ہم سفر اور اضطراب و بے چینی کا معالج ہے۔

کرن کی سالگرہ کے موقع پر حسب روایت ہم نے قارئین سے کچھ دلچسپ سوالات کیے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں قارئین نے کیا جوابات دیے ہیں۔

سوالات:

1۔ کرن کی کہانیوں کا کوئی ایسا کردار جس میں آپ کو اپنا عکس نظر آیا یا آپ کی خواہش ہے کہ آپ اس جیسی ہوتیں۔

2۔ کرن کب سے پڑھنا شروع کیا، پہلا تعارف کیسے ہوا؟ کیا کسی نے روک ٹوک کی؟ کوئی خاص واقعہ پیش آیا ہو تو تحریر کیجیے۔

3۔ کرن کی کس قاری بہن سے آپ ملنے کی خواہش مند ہیں اور ان کے نام کوئی خاص پیغام دینا چاہیں گی۔

ثناء شہزاد......کراچی

1۔ کہانیوں کے مثبت سب ہی کردار ہماری رائٹرز اتنے پیارے لکھتی ہیں کہ دل کرتا ہے، ہم ان جیسی بن سکیں اور اس وقت ذہن میں مصباح علی سید کے ناول مجبور نشیمن کی ہیروئین روائیہ آرہی ہے۔ وہ معصوم سی لڑکی مجھے بہت اچھی اور اپنے جیسی لگی۔ مصباح کی ہیروئن میں مجھے اپنی جھلک اس لیے دکھائی دیتی ہے۔ وہ لڑ جھگڑ کر اپنا حق نہیں مانگتی بلکہ خاموش جنگ لڑتی ہے۔ اس کا عزم چھپ کر بھی بہت مضبوط ہوتا ہے جو کوئی مشکل بھی توڑ نہیں سکتی بلآخر ان کی جیت ہوجاتی ہے، مطلب یہ ان کی ہیروئن کے پیغام سے لگتا ہے۔ جیت کے لیے ہتھیار سے زیادہ عزم اور برداشت ہونا ضروری ہے۔ ''فصیل دل'' کی ماستوشہ بھی ایسی مضبوط تھی۔

2۔ مجھے کرن پڑھتے ہوئے پندرہ سال ہوگئے۔ میں آٹھویں کلاس میں تھی تب سے کرن میرے زیر مطالعہ ہے۔ کرن پڑھنے کا مشورہ مجھے میری ایک کزن نے دیا تھا۔ میں بچپن میں بہت چپ چپ رہتی تھی۔ ہر وقت خاموش نانی کے یہاں جاتی تھی وہاں بھی کسی سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی تب میری ماموں کی بیٹی نے مجھ سے کہا کہ ثناء تم کرن ڈائجسٹ پڑھا کرو بس اسی وقت سے کرن اور میں پکے دوست بن گئے اور اب تو میں اتنا بولتی ہوں کہ کسی اور کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیتی۔ میری

ان کا کزن کا نام نائلہ ہے وہ خود بھی ڈائجسٹوں کی اور کہانیوں کی دیوانی ہیں اور اب ان کی شادی ہوگئی ہے۔ مگر اب بھی وہ کرن کے لیے وقت نکال ہی لیتی ہیں کیونکہ کرن ہے ہی ایسا کہ اس کے بغیر رہا نہیں جاتا اور سب سے اچھی بات یہ کہ ہمارے گھر میں کسی نے کوئی روک ٹوک نہیں کی، ڈائجسٹ پڑھنے پر۔ ضروری نہیں ہوتا کہ ڈائجسٹ میں ہر کہانی میں عشق محبت ہی دکھائی جائے بہت ساری کہانیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں بہت گہرے سبق موجود ہوتے ہیں۔ ان کہانیوں کے ذریعے ہمیں آگاہی ملتی ہے ہماری سوچ وسیع ہوتی ہے نئی نئی راہیں سجھائی دیتی ہیں مشکل حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کس طرح کیا جاتا ہے یہ سیکھنے کو ملتا ہے اور بھی بہت کچھ ہم گھر بیٹھے ان کہانیوں سے سیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ہم پہلے جوائنٹ فیملی میں رہتے تھے ساری کزنز مل کر ڈائجسٹ پڑھتی تھیں اور ہر کہانی پر رائے دی جاتی تھی تبصرے کیے جاتے تھے۔ اپنے ساتھ ساتھ میں نے تایا چچا کی بیٹیوں کو بھی ڈائجسٹ کا چسکا لگا دیا ہے۔ آپ لوگ یقین نہیں کریں گے کرن سے میری محبت کا عالم یہ ہے کہ میرے پاس 1999 سے لے کر اب تک کے تمام ڈائجسٹ موجود ہیں گھر میں بھائی غصہ کرتے ہیں کہ پڑھ کر بیچ دیا کرو مگر میرا دل ہی نہیں چاہتا کہ ان کو خود سے جدا کرنے کو ایک بار بارشوں میں میری کچھ ڈائجسٹ خراب ہوگئیں، میں اتنا روئی تھی اور کھانا تک نہیں کھایا تھا۔ ان بے جان کتابوں کے خراب ہونے کا بہت دکھ ہوا تھا مجھے مگر وہ بھی میں نے پھینکیں نہیں سنبھال کے رکھ لیں۔ یہ ہے میری کرن سے محبت۔

3۔ آپ کا تیسرا سوال ہے کہ کرن کی کس قاری بہن سے میں ملنا چاہتی ہوں تو اس کا جواب دینے کے لیے مجھے زیادہ سوچنا نہیں پڑے گا مجھے کرن کی ہر قاری بہن اچھی لگتی ہے اور میں ان سب سے ملنے کی خواہش مند ہوں مگر کراچی کی تو بہت کم ہیں سب اتنی دور رہتی ہیں کہ میں چاہتے ہوئے بھی کسی سے نہیں مل سکتی فوزیہ ثمر، فائزہ بھٹی، اقرا ممتاز، ماریہ نذیر، تبسم بشیر، ثمینہ اکرم، زرینہ خانم لغاری، فضہ نور، صائمہ مشتاق، سونیا، رابعہ عمر، شازیہ، خوشی



، اقرا سرور، افشاں سمیع، اقصیٰ ناصر، نمرہ اور بہت ساری ہیں جن کے لیے ہر نماز میں دعا کرتی ہوں اللہ پاک سب بہنوں کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دے جو بھی بہن جس پریشانی میں مبتلا ہے اللہ پاک اسے اس مشکل اور پریشانی سے نکال دے ان کے گھروں میں ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوں غم کا کہیں کوئی گزر نہ ہو۔ جو اپنے گھروں کی ہو چکی ہیں وہ شاد و آباد رہیں، جو ابھی تک کنواری ہیں اللہ پاک ان کے نصیب بھی جلد سے جلد کھول دے آمین۔

ان کے علاوہ میں کرن کی تمام رائٹرز سے بھی ملنا چاہتی ہوں۔ مصباح کی تو میں دیوانی ہوں انہیں دیکھنے کی ان سے ملنے کی بہت خواہش ہے۔

ارم کمال......فیصل آباد

1۔ کرن کی بیشتر کہانیاں ہماری زندگی کے آس پاس ہی چلتی پھرتی، روتی اور مسکراتی نظر آتی ہیں اور ان کہانیوں میں کبھی کبھار اپنا عکس بھی محسوس ہوتا ہے مثلاً اگر ہیروئن غصہ پینے والی ہوگی تو میں بھی ایسی ہوں۔ اگر کوئی لڑائی جھگڑے سے بچنے کے لیے اپنی غلطی نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی غلطی مان لے تو یہ بھی میرا عکس ہے لیکن کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کی طبیعت کے الٹ ہوتی ہیں لیکن

پھر بھی آپ کو پسند ہوتی ہیں۔ اب ''ساگر کنارے'' کی ماحور مجھے بہت انسپائر کرتی ہے جو اپنی ہر فیلنگز کا برملا اظہار کرتی ہے چاہے غصہ ہو یا پیار۔ مجھے بھی ماحور بننے کی خواہش ہے جس میں حالات سے ڈر ڈر کر بیٹھنے کے بجائے مصیبتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کرنا اور اکیلے میں بیٹھ کر اپنے آنسو خود ہی پونچھنا اور خود کو خود ہی حوصلہ دینا ہو۔

2۔ کرن پڑھنے کا آغاز سویٹ سکسٹین سے ہوا۔ پہلا تعارف میری بیسٹ فرینڈ دردانہ نے کروایا۔ جب میٹرک کے بعد فراغت تھی اور امی کی روک ٹوک تو اس طرح تھی کہ پہلے وہ خود پڑھتی تھیں اس کے بعد مجھے اجازت ملتی تھی کہ ٹھیک ہے پڑھ لو، لیکن ایک گھنٹے سے زیادہ اگر امی مجھے کرن پڑھتے دیکھتیں تو پھر امی کو غصہ آنا شروع ہوجاتا تھا۔ اس لیے اس زمانے میں میں بایولوجی کی کتاب میں کرن سیٹ کرکے رکھتی لیتی تھی۔ کیونکہ بایولوجی کی کتاب کافی موٹی تازہ تھی تو کرن اس میں آرام سے سیٹ ہوجاتا تھا۔ اس طرح کئی دفعہ دو تین گھنٹے بھی گزر جاتے امی آتے جاتے دیکھتیں لیکن مطمئن رہتیں کہ بچی میری پڑھ رہی ہے، ایک دو دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ امی پھل کاٹ کر لائیں کہ اتنی دیر سے پڑھ رہی ہو کچھ کھالو نہیں تو چکر آنے لگیں گے اور میں دل ہی دل میں ہنستی رہتی اور خوب مزے کرتی۔ لیکن ایک دفعہ میرے بھائی کی نظر پڑ گئی اور وہ بولا اچھا یہ پڑھائیاں ہوتی ہیں، آنے دو امی کو ابھی تمہاری دھلائی کرواتا ہوں۔ مت پوچھیں، کتنی منتوں اور ساری پاکٹ منی دے کر اس کا منہ بند کروایا۔ پھر اس کے بعد بھی اکثر وہ مجھے بلیک میل کرتا رہا۔ اب وہ وقت یاد آتا ہے تو بے اختیار ہنسی آنے لگتی ہے، کیا سنہرا دور تھا۔ اب تو کرن زندگی میں ایسے شامل ہے جیسے دل میں دھڑکن۔

3۔ کرن کی ساری قارئین بہنیں میرا دل اور جان ہیں اور ان سب کے دکھ سکھ مجھے اپنے ہی دکھ سکھ لگتے ہیں ویسے تو میں سب سے ملنا اپنے لیے ایک اعزاز سمجھوں گی سب سے پہلے ثمینہ اکرم، آپ کے خط مجھے بہت انسپائر کرتے ہیں آپ نے جس بھرپور استقامت سے اپنے بیٹے کا دکھ برداشت کیا، یہ خاص وصف ہے جو خدا تعالیٰ اپنے انہی بندوں کو ودیعت کرتا ہے جنہیں وہ اپنے بہت قریب کرنا چاہتا ہے، میری ڈھیر ساری دعائیں آپ کے لیے ہمیشہ خوش رہیں اور صحت وتندرستی والی لمبی زندگی پائیں (آمین)

ماریہ نذیر، آپ تو کرن کی شان ہو آپ کے خط ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک بھر دیتے ہیں۔ آپ کا تبصرہ خوب جاندار اور شاندار ہوتا ہے۔ ہمیشہ خوش رہو اور خوش رکھو جانو (آمین)

تبسم بشیر حسین آپ کے خط اور مراسلات تو کرن کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں ہمیشہ ''نامے ہمارے نام'' میں سب سے پہلے آپ کا نام ڈھونڈتی ہوں۔ آپ کے تبصرے بہت ہی پراثر ہوتے ہیں۔ مراسلات میں بھی آپ سرفہرست رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی امی کو صحت وتندرستی والی لمبی عمر دے اور ان کا سایہ آپ کے سر پر قائم رکھے (آمین) اللہ تعالیٰ آپ پر ہمیشہ اپنا خاص فضل کرے اور آپ ہمیشہ خوشیوں کے جھولے میں جھولا جھولیں۔

فائزہ بھٹی، جب سے ''مقابل ہے آئینہ'' میں آپ کے جوابات پڑھے ہیں تو آپ کی فین ہوگئی ہوں دل چاہتا ہے کہ آپ سے آمنے سامنے بھرپور ملاقات ہو خدا آپ کو ہمیشہ پھولوں کی طرح مسکراتا اور بہاروں کی طرح گنگناتا ہوا رکھے۔

ماریہ نذیر...... بھاگٹانوالہ

1۔ کرن کی کہانیاں ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہوتی ہیں۔ بہت سی کہانیاں پڑھی ہیں لیکن اپنا کردار کسی میں نظر نہیں آیا۔ شاید کسی نہ کسی کہانی میں میرا کردار بھی موجود ہو، مجھ جیسی بھی ہو ہیروئن مگر شاید میں نے ہی غور نہیں کیا۔ ویسے کم عقلی کی حد ہے ناں؟؟ پڑھتے وقت دھیان رکھنا چاہیے تھا کہ میں بھی ہوں ان میں کہ نہیں؟؟ (ہاہاہا) اور خواہش یہ ہے کہ میں ''ساگر کنارے'' کی ماحور جیسی ہوتی کوئی

مجھے بھی مومن مل جائے (ہاہاہا) اتنا خوب صورت محبت کرنے والے بندہ۔ یا ''شام رنگ سیاہ'' کی دانیا جیسی ہوتی یا ڈاکٹر بجستہ جیسی ہوتی یا پھر شہرینہ جیسی۔ اتنا سمجھ لیں کہ کہانی میں جو لڑکی سب سے زیادہ پڑھی لکھی ہو گی اس جیسی بننے کی خواہش ہے۔ ان شاء اللہ PHD کروں گی میں۔ سب بولو (آمین)

2۔ کرن پڑھنا شروع کیا مصباح کی وجہ سے، ان کا ناول تھا ''اسم یاراں'' جس میں لڑکی ایئر ہوسٹس ہوتی ہے۔ جون یا شاید جولائی 2017 سے کسی اور ڈائجسٹ میں کسی لڑکی نے ان کے ناول کا ذکر کیا تھا اور شعاع یا خواتین میں فہرست دیکھی تھی کرن کے اس ناول کی تب سے کرن منگوانا شروع کیا اور افسوس ہوا کہ اتنے سال سے کیوں نہیں پڑھا اس ڈائجسٹ کو باقی سب ڈائجسٹ باقاعدگی سے 2003 سے پڑھنے شروع کیے تھے۔ کرن سے دو سال پرانا ساتھ ہے مگر بھرپور ساتھ ہے۔ روک ٹوک کسی نے نہیں کی۔ بھائی کو پڑھنا پسند نہیں ہے اور ان سے چوری چھپے پڑھتے ہیں۔ امی کچھ نہیں کہتیں اور ابو جی ہیں ہی نہیں۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں اعلا مقام دے (آمین) وہ بہت نرم طبیعت کے مالک تھے ہوتے بھی تو ڈائجسٹ پڑھنے سے کبھی منع نہ کرتے۔ اور کوئی خاص واقعہ تو ہوا ہی نہیں۔ اگر ہوتا تو ضرور بتاتے بھئی۔

3۔ ارے کیا سوال پوچھا یار، مزا ہی آ گیا قسم سے کرن کی کسی اک قاری بہن سے تو ملنے کا دل نہیں ہے۔ ''کرن'' کی ہر قاری بہن میرے دل میں بستی ہے۔ کسی اک کا نام لیا تو زیادتی ہوں گی ناں؟ کیونکہ میں تو سب قاری بہنوں کی برابر عزت کرتی ہوں اور برابر محبت کرتی ہوں۔ تبسم بشیر، ماہا بشیر، ارم کمال، سونیا رائے، عائشہ ناز چ، رابعہ عمر تارچ، شکیلہ حسن، ثناء شہزاد، اقراء سرور، اقراء ممتاز، صائمہ مشتاق (صائمہ تمہیں تو بھاگتا میں مل ہی لوں گی) صدف سمیع، اقصیٰ ناصر، اقراء، نمرہ، گڑیا راجپوت، فائزہ بھٹی، فوزیہ ثمر بٹ، ننھی حریم، آمنہ اور ہانیہ، عابش جنجوعہ، صدف عمران، نادیہ یاسر، خوشی سرانوالی زرینہ خانم، مریم یونس، فضہ نور، بحر وقاص، ساجدہ جاوید سندیلو، جیبنا، ایمن خان، افشاں سمیع، صفیہ رانی، آسیہ جاوید، روشی نور، آسیہ منیر، اسما شریف، حمیرا گل، نمرہ عاقب آپ سب بہت اچھی ہیں اور بہت اچھا لکھتی ہیں۔ سب سے ملنا چاہوں گی۔ آپ سب میری شادی میں آنا (ہاہاہا) اور سب کی سب اپنے خط میں مجھے آٹوگراف دینا۔ وہ رسالہ میں سنبھال کے رکھوں گی اچھا ہے ناں؟؟ سب کے لیے یہی پیغام دینا چاہوں گی کہ خوش رہیں دوسروں کو خوش رکھیں۔ جہاں بھی جائیں اور جس سے بھی ملیں ہمیشہ اچھے اخلاق سے پیش آئیں تاکہ تمہارے جانے کے بعد لوگ دوسروں کو سمجھانے کے لیے تمہاری مثال دیں۔ صندل کے اس درخت کی طرح رہیں جو اپنے اوپر لگنے والے کلہاڑے کو بھی خوشبودار بنا دیتا ہے۔ برداشت کرنا اور نظر انداز کرنا سیکھیں او کے جی! بتایئے گا کیسا لگا روے؟؟

سیدہ تبسم بشیر حسین ...... ڈنگہ

1۔ سوچنے دیں ...... نہیں آج تک کوئی ایسا کردار تخلیق نہیں ہوا جس میں مجھے میرا عکس نظر آیا ہو۔ عکس تو دور کی بات ہے کسی بھی کردار کی کوئی عادت بھی ملتی جلتی نہ دکھی۔ ہاں البتہ یہ خواہش ضرور تھی کہ میں ''نمرہ احمد'' کے کرداروں جیسی ہوتی۔ پر اب میرا خیال ہے کہ میں بیسٹ ہوں جیسا بھی مجھے میرے اللہ نے بنایا ہے۔ (تھینک یو اللہ جی)

2۔ میں نے کرن مئی 2015 سے پڑھنا شروع کیا پہلے میں تھری کلاس سے صرف سسپنس اور خوفناک ڈائجسٹ ہی پڑھتی تھی۔ تعارف یوں ہوا کہ میں نے امی کو خوفناک ڈائجسٹ لینے بھیجا تو وہ ختم ہو چکا تھا امی اپنے پسند سے ''کرن'' لے آئیں وہ دن اور آج کا دن امی ''کرن'' خود لا کر دیتی ہیں باقی رسالوں سے چڑتی ہیں پر ''کرن'' ان کا پسندیدہ ہے۔ کسی خاص نے نہیں پر اللہ جنت نصیب کریں میرے مرحوم بھائی (مرحوم لکھتے ہوئے دل دکھتا ہے) محمد یوسف ہمیشہ رسالے دیکھ کر چڑتا تھا منع نہیں کرتا بس کہتا تھا ایک وقت پر پڑھا کرو امی نے کبھی منع نہیں کیا۔ خاص واقعہ میرے پاس ''کرن'' کی پہلی ملاقات کا ہی ہے جب امی خوفناک کے بدلے کرن لائیں

تو پہلے تو میں بہت چڑی پھر سوچا کہ پڑھ کر دیکھتی جو سو جنابِ پڑھنا شروع کی فائزہ افتخار کی "شاید" کی پہلی قسط ۔امی نے ہانڈی چڑھائی اور کہا دھیان رکھو میں ذرا پڑوس ہو آؤں میں تو پوری طرح سے "کرن" میں غرق تھی بس سر ہلا دیا۔ ابھی پہلی دفعہ اتنی مزے کی چیز جو پڑھنے کو ملی تھی۔ اچھا تو جب تک امی آئیں میں قسط ختم کر چکی تھی دروازہ کھولا تو امی نے پوچھا یہ ہانڈی کس کی جل رہی امی کچن کی طرف دوڑیں اور میں پیچھے پیچھے۔ بس پھر مت پوچھیے بس چراغوں میں روشنی نہ رہی تھی۔ یہ تھا کرن کی محبت میں میرا حال اور کچھ محبت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ میری اور کرن کی سالگرہ ایک ہی ماہ میں ہے سو دونوں کا کیک ساتھ کٹتا ہے آئی لو یو کرن سوچ!

3۔ میں جب 2015 میں کرن پڑھتی تھی تو ثنا شہزاد اور فوزیہ ثمر کی بڑی فین تھی کیونکہ تب میں شرکت نہیں کرتی تھی تو سب سے پہلے انہی دونوں کی نگارشات اور تبصرے پڑھتی۔ ثنا شہزاد کا تو میں نے باقاعدہ خاکہ ذہن میں بن لیا تھا۔ ایک معصوم اور حساس دل کی لڑکی جس نے زندگی میں بہت کچھ کھویا پر صبر سے کام لیا۔ فوزیہ ثمر کا خاکہ کچھ یوں تھا کہ انہیں بچوں اور اپنی فیملی سے بڑا پیار ہے۔ اب ثناء شہزاد، فوزیہ ثمر کے ساتھ ساتھ فائزہ بھٹی، اقرا سرور، ماریہ نذیر، زرینہ خانم، اقرا ممتاز، نور چوہدری، ریحانہ چوہدری، ام انعام اور ناہید اسمٰعیل سے ملنے کی بڑی خواہش ہے کاش زندگی رہتے میں اپنی ان بہنوں سے مل سکوں۔ پیغام یہی ہے کہ چاہے زندگی میں کیسے بھی حالات آئیں قلم سے رشتہ مت توڑیے گا ہم جیسی لڑکیوں کے لیے قلم آکسیجن کا کام کرتا ہے۔ میں آپ سب کو ہمیشہ پڑھنا چاہتی ہوں۔ اچھا جی بہت وقت لے لیا آپ سب کا اللہ حافظ فی امان اللہ۔

جا تو رہے ہیں تیری محفل سے
پر واپس آنے کا ارادہ رکھتے ہیں

سیدہ ماہا بشیر حسین......ڈنگہ

1۔ نہیں، مجھے کسی کردار میں اپنا عکس نظر نہیں آیا بھئی میرے جیسا اس دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔ جب کوئی کردار اتنا پسند ہی نہیں آیا تو خواہش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

2۔ صحیح طرح سے یاد نہیں ہے پہلے میں صرف سلسلے پڑھتی تھی یا کوئی کہانیاں اچھی لگیں تو پڑھتی ابھی دو سال پہلے ٹھیک سے پڑھنا شروع کیا ہے۔ پہلا تعارف تبسم کی وجہ سے ہوا۔ "ردائے وفا" کی قسط میں لازمی پڑھتی وہ کرن میں شائع ہونے والی بیسٹ اسٹوری تھی۔ اور "میرے حصے کی زمین اور آسمان" والی بھی۔ بھائی کے علاوہ چاچو وغیرہ نے بھی روک ٹوک کی تھی پر امی کا ساتھ ہو تو کوئی کیا اکھاڑ لے گا؟ یادگار واقعہ یہ ہے کہ جس دن کرن آیا اس دن تبسم مجھ سے انجان بن کر اسے پڑھتی رہی میں بہت روئی پر اسے فکر کہاں! آج تک یہی ہوتا ہے (میں ناراض ہوں سیدہ)

3۔ میں "اقراء سرور اور ماریہ نذیر" سے ملنا چاہوں گی اور پیغام یہی ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ رسالے پڑھنے سے لڑکیاں بگڑ جاتی ہیں سو آپ سب ڈائجسٹ ضرور پڑھیں ان سے اچھی اچھی باتیں سیکھیں اور ثابت کریں کہ یہ ہمیں بگاڑنے کا نہیں بلکہ سوارنے کا کام کر رہے ہے۔ او کے جی بائے بائے میری طرف سے کرن سے جڑے تمام قارئین کو کرن کی سالگرہ مبارک ہو۔

فوزیہ ثمر بٹ......گجرات

آپ کے دوسرے سوال کا جواب میں پہلے لکھوں گی اور پہلے سوال کا جواب دوسرے نمبر پر دوں گی۔

2۔ کرن کب سے پڑھنا شروع کیا۔ تو جناب طالب علمی کے زمانے میں ہی کرن سے سلام دعا ہوئی۔ میری دوست صفیہ تبریز اور میں بریک ٹائم کتاب میں رکھ کر پڑھا کرتے تھے۔ اس ٹائم کہانیوں کی کوئی سمجھ بوجھ نہیں تھی۔ بس یہ شوق کہ ہم ڈائجسٹ پڑھتے ہیں جیسے بڑی فخریہ بات ہے۔ شازیہ کی ایک دوست ہوتی تھی پوی یہ دونوں پیسے جمع کر کے ڈائجسٹ خریدتی تھیں اور ہم مفت میں پڑھتے تھے۔

پہلا تعارف بھی یہی شازیہ (بہن) کی دوست ہی بنی تھی۔ کیا وقت تھا کہ گھر کے کام نبٹا کے رسالہ چند گھنٹوں میں ختم کر لیا جاتا تھا اور نئے کا انتظار شروع۔ پہلے صرف پڑھنے کا شوق تھا پھر ایک بار شازیہ کہنے لگی کہ فوزی تم بھی

انتخاب یا کہانیوں کے بارے میں لکھ کر بھیجا کروں۔ اس وقت میرا جواب تھا۔ کوئی گلاں کر عقل دی۔ مینوں کہڑی عقل یہ تو بہت پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگوں کا کام ہے۔ کہنے لگی کوشش تو کر کے دیکھو۔ پھر جناب ڈھرکتے دل کے ساتھ پہلا خط لکھا۔ کرن والوں نے حوصلہ افزائی کی ،میرا خط شائع ہوا ڈھیروں خوشی ہوئی تھی۔ امی جی ابو جی بھائی سب کو پڑھایا دیکھو کرن میں میرا خط لگا ہے۔ ابو جی کہتے ہیں جعلی ہوگئی ہو۔ پھر اچھا لگا تو ہر ماہ خط لکھنا ضروری ہوگیا۔ جب خط شائع ہوجاتا ہے تو دل خوشیوں کے جھولے جھولتا ہے اور جب کبھی خط نہیں ہوتا تب دل کو ڈھیروں تسلیاں ......اچھا نہیں لگا ہوگا۔ خط لیٹ ملا ہوگا۔ لگتا ہے ڈاکیا پوسٹ باکس سے نکالنا بھول گیا۔ خیر خوشی غمی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ کرن کے ساتھ تیرہ چودہ برس گزار لیے ہیں۔ ہمیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں جناب پورے خاندان میں صرف ہم دونوں بلکہ ہمارا گھر ہی مطالعہ کا شوقین تھا۔ ابو جی بھی پڑھتے تھے اور امی جی کو کرن کے سلسلے اچھے لگتے تھے۔ شروع شروع میں کبھی کبھار جب کام کی وجہ سے ڈانٹ پڑتی تب امی جی کہتیں اگلے مہینے ڈائجسٹ نہیں آئے گا۔ شکر ہے کہ دھمکی بس دھمکی رہتی۔ گھر کے سودے کے ساتھ کرن لازمی آتا پہلے تو پچیس روپے کا آتا تھا پھر وقت کے ساتھ ساتھ کرن جی نے ہماری جیب بھاری کرنی شروع کردی۔ جو دل و جان سے منظور کی کہ کرن سے دوری منظور نہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ نشئی اپنا نشہ پورا کرلیتا ہے جیسے بھی کرے۔ خود کو اتنا اچھا کرلیں کہ یہ نہ کہے کہ یہ ڈائجسٹ پڑھتی ہیں۔ خدانا خواستہ ڈائجسٹ پڑھنا کوئی معاشرتی برائی نہیں۔ نہ کسی کی برائی کریں۔ اگر کوئی برا کرتا ہے تو اپنے آپ کو مضبوط رکھیں کہ ڈائجسٹ پڑھنا بری بات نہیں۔ فضول گوئی سے بہتر یہی کہ مطالعہ کو دوست بنائے رکھیں کہ اچھی نصیحت کوئی نہیں کرتا۔ کوئی خاص واقعہ کبھی پیش نہیں آیا حالات کیسے بھی رہے۔ کرن سے دوستی برقرار رکھی کہ نہ تو عادت ہے محلے میں فضول گھروں میں آنے جانے کی نہ ہی کہیں آنا جانا ہوتا ہے۔ تو بس گھر میں واحد تفریح کرن ڈائجسٹ اور شعاع ہیں۔ شعاع والوں کا بھی بہت شکریہ کہ لکھیں کو تو حوصلہ افزائی کر دیتے ہیں۔

1۔ آپ کے پہلے سوال کس کردار میں اپنا عکس دیکھا اب تو ہر خواہش دم توڑ چکی ہے۔ پھر بھی آپ کے سوال کا جواب یہی ہے ہر تحریر کی وہ لڑکی جو اپنے گھر والوں کے لیے اپنی خوشیاں ختم کر دیتی ہے۔ بہت دور نہیں جاتی حالیہ دو ناول ''ساگر کنارے''، ''شام رنگ سیاہ''، دونوں ہیروئن میری فیورٹ ہیں ان میں اپنا عکس نظر آتا ہے۔

3۔ کرن نے بہت اچھے دوست دیے کہ جن کی باتیں دکھ سکھ میں حوصلہ دیتی ہیں کہ اس مشکل وقت ہم اکیلے نہیں کوئی ہے جو اپنی دعاؤں میں ہمیں بھی یاد رکھتا ہے۔ یا یہ کہ کرن کے ذریعے سے ہم بھی کسی کے روز وشب میں جی رہے ہیں۔ شروع میں جب کرن پڑھنا اور اس میں لکھنا شروع کیا تھا۔ تب کنول شاہین، امبر گل تھیں میں سوچتی تھی شاید یہ بھی ہماری طرح زندگی بسر کررہی ہوں۔ میری تو حسرت ہی رہی کہ مجھے کوئی زندگی میں رائٹر مل جائے یا پھر گجرات کی کوئی قاری بہن مل جائے یا کاش کوئی کہے ہمیں بڑی خواہش ہے کہ فوزیہ ثمر بٹ سے ملاقات ہوجائے ہائے خوش فہمیاں۔

امبر گل، انیقہ انا کہاں بزی ہو لوٹ آؤ، نسبت زہرا جو شاید باہر پڑھنے گئی ہیں ان سے ملنے کا شوق ہے اور میری پیاری رائٹر بنت سحر کاش کہ بنت سحر میں بھی تمہاری کوٹھری (گاؤں کے لوگوں کا کچن) میں بیٹھ کر کھانا کھاؤں اور تم سے ملوں اور پوچھوں لکھنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ عائشہ ٹنڈو خاں، کوثر خالد، شاہ شہزاد، نفضہ، ماریہ نذیر، تبسم بشیر، ان سب سے ملوں اور پوچھوں اتنا اچھا کیسے لکھ لیتی ہو۔ اپنی رائٹرز سے ملوں کہ وہ معاشرے کی کہانی، کیسے لفظوں میں اتارتی ہیں کہ پرائے دکھ پڑھتے آنکھیں سمندر ہوجاتی ہیں۔ دل بوجھل کہ اپنے غم ہلکے لگتے ہیں۔ خاص پیغام ان سب کے نام یہی ہیں کہ ابھی تو زندگی ہاتھ میں ہے۔ نکالو تھوڑا ٹائم، آؤ چائے پیتے ہیں۔ اپنی آپ بیتی شیئر کرتے ہیں۔ ویسے تو کرن ہے ہی رابطہ کا ذریعہ جو ہمارا غمگسار بھی ہے ہماری دوستیوں کا موجد بھی۔ خاص پیغام یہی ہے بہنوں کہ کرن ہمارا اچھا دوست، ماں جیسی ممتا، باپ جیسی شفقت والا ہے۔ یہی جس نے زندگی کے ہر موڑ

پر کسی سچے ساتھی کی طرح ساتھ دیا کہ ہماری تربیت کرنے والا بھی کرن ہے۔

صفیہ مہر......رحیم یار خان

1۔ مجھے تنزیلہ ریاض کے ناول غم ہے یا خوشی ہے تو، کی الحراب عرف سونیا کا کردار اپنے جیسا لگا۔ یا یوں سمجھ لیں کہ میں اس جیسا بننا چاہتی تھی میری بھی ایسی خواہش تھی جیسی سونیا کی تھی۔ بس اسے زندگی نے پلیٹ فارم دیا، کچھ کر دکھانے کا، مجھے یہ میسر نہ ہو پایا۔ سونیا کی اسٹرگل، اور اپنے بل بوتے پر اپنے ہنر کی پہچان دنیا کے ہر کونے پر پہنچائی مجھے اپنے جیسی ہی لگی۔ اس کی عادتیں، اس کا اعتماد اور بیداری، شب نم کی سحر کی زارا کی مضبوطی اور اس کا خود کو نمایاں رکھنا، اپنی ذات کا بھروسا اس کی ماں سے محبت کی شدت بالکل میرے جیسی لگی۔

2۔ میں نے کرن دسمبر 2009 سے پڑھنا شروع کیا، کزن کے گھر گئی وہیں سے لے آئی۔ اس میں سعدیہ راجپوت کا ناول آتش عشق کی تیسری قسط چل رہی تھی۔ میں اس ناول کی عاشق ہوگئی اور پھر باقاعدہ جنوری 2010 سے خود لینا شروع کر دیا۔ روک ٹوک تو ہوئی۔ گھر میں بھائی لے کر آتا تھا خواتین اور شعاع، کرن کا کہا تو چیخ پڑا۔ تین تین رسالے لوگی! اب میں معصومیت سے بولی بھائی میں گھر میں بیٹھ کر تھک جاتی ہوں۔ پلیز پیسے بھی میں خود دوں گی تم بس لا دو، تو پھر اسے مجھ پر ترس آگیا۔

خاص واقعہ یہ کہ ایک بار بھائی کے کپڑے استری کرنے تھے۔ میں کر نہ سکی۔ اس نے مانگا میں رسالہ پڑھ رہی تھی۔ میں بولی استری والے کپڑے ختم ہیں۔ ابھی کر دیتی ہوں۔ پھر کیا تھا وہ غصے سے بھڑک اٹھا۔ رسالہ اٹھا کر صحن میں پھینک دیا بولا آئندہ کوئی کام نہ ہوا تو دوسری بار چو کہہ (چولہے) کی آگ میں ڈال دوں گا۔ پھر آج تک میری مجال ہے کہ میں کوئی کام ٹائم سے پہلے نہ کر لوں تب تک رسالوں کی عمر بڑھتی ہے، نہیں تو یہ بھائی کے ہاتھوں شہید ہو جاتے ہیں۔ انہیں بچانے کے لیے کوئی کام نہیں چھوڑتی (ہاہاہا)

3۔ سچ پوچھیں تو کرن پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے سب قارئین بہنیں، ہم مل کر بیٹھ کر ایک دوسرے کو گویا سب مستقل سلسلے سنا رہی ہوں۔ کوئی کہتی ہے رکو میرا پسندیدہ شعر سنو، کوئی کہتی ہے میرے پسندیدہ اقوال یہ ہیں۔ کوئی بہن نصیحت کرتی ہے کوئی لطیفے سنا کر ہنساتی ہے۔ سب مل جل کر ایک دوسرے کو دنیا کے ہر جھنجٹ سے کچھ وقت کے لیے کرن میں لے جاتی ہیں ہم کو یہ قارئین بہنیں۔ مگر پھر بھی مجھے۔ فائزہ جی سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا کہ پوچھوں، بہن ایسے خوش و خرم دنیا میں کیسے رہتی ہو لیکن اس باران کی بہن کی ٹریجڈی کا پڑھ کر لگا وہ بھی دکھی ہیں اس لیے تو کرن میں آکر شادر رہتی ہیں۔ فائزہ جی پھر بھی خوش رہنے والا نسخہ ضرور بتایے گا۔

دوسری بہن فوزیہ ثمر سے ملنے کو دل کرتا ہے، فوزیہ جی آپ نے اپنی بہن کی سادگی کا بتایا انہیں یہ پیغام دینا ہے کہ بہن خدا انہیں اور تمہیں خوش رکھے۔ خود ہی وہ سمجھدار ہو جائیں گی مگر پلیز سادگی ویسے ہی رہنے دیجیے گا کہ سادگی، اچھائی اور نیکی سب انسان کی آخرت سنوارتی ہیں۔ آپ کی ماں کا سنا بڑا دکھ ہوا۔ خدا آپ کو ہمت دے۔ کوثر خالد کے لیے یہ پیغام کہ پلیز ہمارے لیے دعا کیجیے گا۔ آپ سے ملنے کی بڑی خواہش ہے آپ نے ایک بار کہا تھا میں بھی مہر ہوں۔ مجھے یاد ہے۔ شمع کی طرح ہمیں بھی بیٹی سمجھ لیں حسین سسٹرز سے ملنا چاہتی ہوں۔ کیسے تبسم اور ماہا اپنی ہر محرومیوں کو ہنس کر جی رہی ہیں۔ تبسم جی۔ ماں واقعی قیمتی رشتہ ہے خدا کرے آپ خوش رہیں اور ماں کا سایہ آپ پر تاقیامت تنا رہے۔ سنبل اعوان کی باتیں بڑا اثر پاتی ہیں ان سے ملنے اور انہیں تسلی دینے کو بڑا جی چاہتا ہے خدا سے ان کی خوشیاں مانگتی ہوں، لیکن سنبل جی آپ معاف کر دیں سب کو پھر دیکھیں گی کہ کہیں خوشی اندر سے فیل ہوگی آپ کو۔ خون کے رشتے واپس آجاتے ہیں چاہے واپسی میں کتنے سال لگ جائیں۔

ان سب قارئین کو میرا اسلام اور میری نیک خواہش قبول ہو۔

شہلا گل سحر صالح......کوہاٹ

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ کرن میں شائع ہونے

بقیہ صفحہ نمبر 225

عامر سلیم سے ملاقات

شاہین رشید

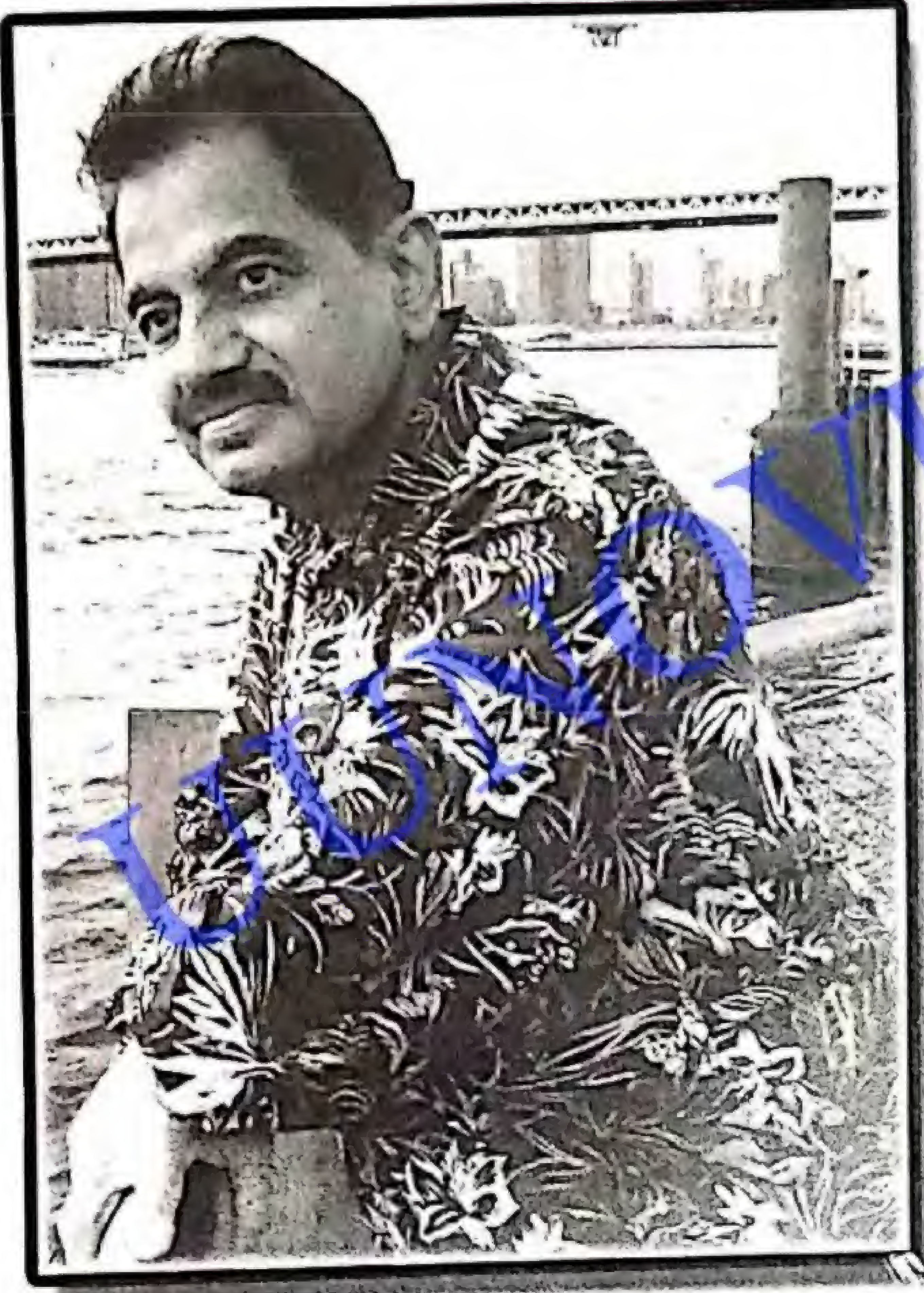
ماضی کی طرف جھانک کر دیکھیں تو ہمارے ملک میں بہترین گلوکاروں کا راج رہا ہے کیونکہ ان کی آوازوں میں ایک عجیب سی کشش اور میلوڈی ہوتی تھی، ان کے گائے ہوئے گانے دل میں اتر جاتے تھے۔ ماضی کے ایسے ہی ایک گلوکار عامر سلیم سے آپ کی ملاقات کرواتے ہیں۔

❁ ''کیسے ہیں آپ؟''

☆ ''الحمدللہ۔''

❁ ''کیا مصروفیات ہیں آج کل آپ کی؟''

☆ ''کوئی خاص نہیں بس شوز کی حد تک ہی مصروفیات ہیں اور شوز بھی بہت ہی کم ہو رہے ہیں۔ کراچی کی تو کوئی لائف ہی نہیں رہی۔ یہاں تو بہت ہی کم شوز ہوتے ہیں۔ بس باہر جو ہو جائیں تو ہو جائیں یہاں اپنے ملک میں تو بس انتظار ہی رہتا ہے۔''



❁ ''آپ نے ایک بار بتایا تھا کہ آپ بچوں کے اسکولوں میں میوزک کی کلاس بھی لیتے ہیں؟''

☆ ''جی بچوں کے اسکولوں میں ورک شاپ کرتا ہوں۔ ان کو گٹار سکھاتا ہوں...... اس کے علاوہ میں نے اپنے گانوں کے چھوٹے چھوٹے ''ری مکس'' کیے ہیں ان کے چھوٹے چھوٹے ویڈیوز آن لائن پہ ڈالتا ہوں اور لوگوں سے اِن ٹچ رہنے کے لیے میں نے فیس بک پہ اپنا ایک اکاؤنٹ بھی بنایا ہوا ہے۔ جس پہ میرے سارے فینز اکٹھے ہوتے ہیں جس پہ میں اپنی ساری ویڈیوز ''اپ لوڈ'' کرتا ہوں تو لوگ لائیک کرتے ہیں۔ سراہتے ہیں اور میں گٹار پہ لائیو گانے بھی سناتا ہوں...... بس اس کے علاوہ کوئی خاص مصروفیت نہیں ہے۔''

❁ ''شوز نہ ہونے کی کیا وجوہات ہو سکتی ہیں آپ کے خیال میں؟''

☆ ''میرے خیال سے مہنگائی کہہ لیں یا ملک کی صورت حال کہہ لیں کہ لوگ پریشان ہیں۔ ان کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تو صرف عام آدمی ہی نہیں۔ آرٹسٹ بھی بہت پریشان ہیں...... اب یہ حالات کب تک رہیں گے۔ کوئی نہیں جانتا بس دعا ہی کر سکتے ہیں کہ ملک کے حالات بہتر ہوں۔ مہنگائی کم ہو، کراچی کی خوشیاں رونقین لوٹ کر آ جائیں...... اور ہم دنیا کو ترقی کرتے دیکھتے ہیں تو بہت رشک آتا ہے اور دعا کرتے ہیں کہ کاش پاکستان بھی ہماری زندگی میں کچھ ترقی کر لے۔ جس کی امید کم ہے۔''



✤ ”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ...... چلیں تو پھر اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں؟“

☆ ”ابتدائی زندگی تو آپ سب کے سامنے ہی ہے۔ کس طرح آیا، کس طرح آگے بڑھا...... کس نے ساتھ دیا کس نے رد کیا وغیرہ وغیرہ۔“

✤ ”بے شک...... آپ کی جدوجہد کی کہانی سب کو ہی پتا ہے۔ مگر پھر بھی ہماری نوجوان نسل بھی آپ کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی ہے؟“

☆ ”ایسا ہے تو پھر لکھ دیں کہ میں ملتان میں پیدا ہوا اور وہیں سے اپنی زندگی کی شروعات کیں...... ابتدائی تعلیم سے لے کر ایم اے تک کی ساری تعلیمی مدارج ملتان میں ہی طے کیے اور گلوکاری کا آغاز بھی ملتان سے ہی کیا۔“

✤ ”بہن بھائی کتنے ہیں۔ بچپن کیسا گزرا۔ پڑھائی میں کیسے تھے؟“

☆ ”ہم چار بہن بھائی ہیں۔ پڑھائی میں زیادہ دل نہیں لگتا تھا۔ مگر میں ذہین بہت تھا اس لیے زیادہ نہ پڑھنے کے باوجود بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتا تھا...... اور میں نے بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی سے پنجابی زبان میں، ایم اے کیا...... آپ نے پوچھا کہ بچپن کیسے گزرا۔ تو بچپن ملتان کی گلی کوچوں میں دوستوں کے ساتھ شرارتیں کرتے اور زندگی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرتے گزرا۔ اور سب ہی دوست شرارتوں میں ماسٹرز تھے مگر میں نمبر ون شمار ہوتا تھا اور انہی شرارتوں کی وجہ سے کبھی ڈانٹ تو کبھی مار بھی پڑتی تھی...... اور میرے خیال میں بچپن میں سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے اور سب کا بچپن ایسے ہی گزرتا ہے۔“

✤ ”اور بچپن میں کیا مشاغل تھے آپ کے؟“

☆ ”بچپن میں اسکیچنگ کا بہت شوق تھا۔ اور گانے کا بہت شوق تھا اور اکثر دوستوں کی فرمائش پہ انہیں گانے سناتا رہتا تھا۔ پھر جب کالج اور یونیورسٹی آیا تب بھی ایسا ہی تھا کلاس روم کے باہر فارغ اوقات میں دوستوں کی محفل میں گانے گاتا تھا۔ گٹار بجانے کا بھی بہت شوق تھا تو پیسے جمع کر کے ایک گٹار خریدا۔“

✤ ”گٹار بجانا آتا تھا...... اور اتنا دوستوں میں گانے گاتے تھے کبھی خیال نہیں آیا کہ باقاعدہ سیکھوں اس چیز کو یا اپنی آواز کو کیش کراؤں؟“

☆ ”گٹار بجانا نہیں آتا تھا لیکن میں نے کتابوں میں پڑھ پڑھ کر گٹار بجانا سیکھا اور جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میں نے پیسے جمع کر کے گٹار خریدا۔ تو آپ کو بتاؤں کہ میں نے ایک ہوٹل میں دو تین ماہ جاب کی اور سیلری کے جو پیسے جمع ہوئے اس سے گٹار خرید لیا...... اور جہاں تک آواز کو کیش کرانے کی بات ہے تو ہم چند دوستوں نے ایک بینڈ بھی بنایا تھا ”امیجز“ کے نام سے اور ہم اکثر کہیں نہ کہیں جا کر شوز کیا کرتے تھے اور لوگ ہمارے بینڈ کو پسند کیا کرتے تھے اور ہمیں مشورہ دیا کرتے تھے کہ آپ باقاعدہ طور پر اس فیلڈ میں کیوں نہیں آجاتے...... اور لوگوں کی باتیں دل کو لگتی تھیں...... اور پھر یہ شوق پروان چڑھتا گیا کہ ہمیں باقاعدہ اس فیلڈ میں آنا چاہیے۔“

"پھر...... آگے کی منزل کیسے طے پائی؟"

☆ "پھر آگے کی منزل کچھ یوں طے پائی کہ سوچ لیا کہ اس فیلڈ میں قسمت کو آزمالینا چاہیے۔ اس زمانے میں ٹی وی اسٹیشن میں تھا، سب نے کہا کہ آپ کراچی جائیں...... پھر اتفاق یہ ہوا کہ ایک کمپنی کی طرف سے مجھے کراچی جانے کا اتفاق ہوا اور مجھے ٹریننگ کے لیے بلایا گیا تھا...... یہاں آکر ایک بڑی شخصیت سے ملاقات ہوگئی۔ میں خوش ہوگیا کہ یہ نوکری دلوادیں گے تو روزگار کا بندوبست بھی ہوجائے گا اور میں اپنی گلوکاری کو بھی آگے بڑھا سکوں گا۔ مگر قسمت میری کہ ان صاحب نے مجھے نوکری تو کیا دلوانی تھی مجھے ٹریننگ سے ہی نکال دیا اور یہ بات میرے لیے کسی صدمے سے کم نہیں تھی...... کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔"

"پھر واپس ملتان گئے ہوں گے؟"

☆ "یہی فیصلہ کرنا تو مشکل ہورہا تھا کہ ملتان جاؤں گا تو گھر والوں کو اور اپنے دوستوں کو کیا منہ دکھاؤں گی...... بہت دھکے کھانے کے بعد اور بہت جدوجہد کے بعد ایک فارماسوٹیکل کمپنی میں انٹرویو دینے گیا، جہاں پہلے سے ہی ڈھائی تین سو افراد انٹرویو کے لیے آئے ہوئے تھے۔ مگر، میرا نصیب اچھا تھا کہ مجھے جاب مل گئی۔ ملازمت ملی تو کرائے کا گھر بھی لے لیا اور زندگی میں کچھ سکون بھی آگیا...... اور آپ کو بتاؤں کہ گلوکاری کی فیلڈ میں میرا کوئی استاد نہیں رہا۔ میں نے خود ہی سیکھا جو کچھ بھی سیکھا۔"

"پھر گلوکاری کا کیا ہوا؟"

☆ "گلوکاری چلتی رہی۔ ملازمت مل جانے کے بعد رات کے وقت میں لوکل بینڈز کے ساتھ مل کر گانے گاتا تھا اور سب مجھے کہتے تھے کہ اپنی البم بنواؤ اس زمانے میں البم بنوانے کا بہت زیادہ رجحان تھا۔ میرا بھی دل تھا کہ میرا البم آئے...... مگر میرے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں البم بنوا سکتا۔ ایک ایک گانا ریکارڈ کراتا...... اور پیسے جمع کرتا رہتا...... آخر کار کامیاب ہوا اور تین سال کی جدوجہد کے بعد میں اپنا البم لانے میں کامیاب ہوہی گیا۔"

"کس کمپنی نے البم بنایا...... نام کیا تھا البم کا؟"

☆ "اس زمانے میں ایک ہی کمپنی بہت مشہور



تھی۔ "شالیمار ریکارڈنگ کمپنی" میں ان کے پاس گیا، اپنے گانے سنائے تو انہیں پسند آئے اور انہوں نے کانٹریکٹ سائن کروایا...... اور "اجنبی" کے نام سے میرا پہلا البم مارکیٹ میں آیا۔

❖"ریسپانس کیا ملا اور کونسا گانا ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوا؟"

☆"بہت اچھا ریسپانس ملا تھا...... اور اس زمانے میں پی ٹی وی کے علاوہ شالیمار ریکارڈنگ کمپنی" کا ہی ایک چینل "ایس ٹی این" تھا اس میں میرا ایک گانا "وہ تاروں بھری باتیں، وہ پیار بھری باتیں" نشر ہوا تو جیسے راتوں رات میں شہرت کی بلندیوں پہ جا پہنچا۔ یہ گانا میرے لیے ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوا...... اور لوگوں نے مجھے پہچاننا شروع کیا اور سب کی زبان پہ میرا ہی گیت تھا۔"

❖"کیسا لگ رہا تھا یہ سب کچھ؟"

☆"لفظوں بیان نہیں کر سکتا کہ کیسا لگ رہا تھا مجھے اپنی محنت کا پھل مل رہا تھا ظاہر ہے مجھے خوشی تو ہوئی تھی۔ اور اپنے رب کا بھی بہت مشکور تھا کہ اس نے میری سن لی تھی اور مجھے اور میری آواز کو کامیاب کیا تھا اور پہلا البم منظر عام پہ آتے ہی میرا شمار اس دور کے مقبول ترین گلوکاروں میں ہونے لگا۔"

❖"اب تک کتنے البمز آ چکے ہیں اور سب کے کیا رزلٹ رہے؟"

☆"اب تک میرے چھ البمز ریلیز ہو چکے ہیں...... ان میں "اجنبی، اجنبی والیم 2، اسٹیں اپنے آپ، مسافر، دل دا کوارٹر، بے وفا" اور "Tresures Pop Vo15"۔"

❖"اب جبکہ الیکٹرونک میڈیا کا زمانہ ہے...... اب نظر نہیں آتے۔ کیوں؟"

☆"میں ہمیشہ خاموش رہ کر اپنا کام کرتا ہوں...... اور ویسے بھی آج کا میڈیا کافی بدل گیا ہے۔ اب سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل میڈیا کا دور ہے۔ ہمارے دور میں پرنٹ میڈیا کا دور تھا ایک انٹرویو شائع ہوتا تھا کہ سب کو علم ہو جاتا تھا۔ اخبارات و رسائل اور ڈائجسٹ پڑھے جاتے تھے...... اب پرنٹ میڈیا کا دور ختم ہوتا جا رہا ہے...... اور چینلز پہ اب گانوں کا کوئی پروگرام نہیں آتا...... لہذا یوٹیوب ہی پہ ہی اِن رہنا پڑتا ہے۔ تو میں بھی اب سوشل میڈیا پہ ہی اپنے گانے اپ لوڈ کرتا ہوں...... اور اللہ کا شکر ہے کہ مقبول بھی ہو جاتے ہیں۔"

❖"اس فیلڈ میں آنے کے لیے کیا صرف آواز کا اچھا ہونا ضروری ہے...... اور آج کل جو میوزک چل رہا ہے آپ کے خیال میں بہتر ہے یا بہترین ہے؟"

☆"نہیں صرف آواز کا اچھا ہونا ضروری نہیں ہے۔ قابلیت، محنت اور قسمت کا اچھا ہونا بھی بہت ضروری ہے اور میوزک کے بارے میں معلومات کا ہونا بھی بہت ضروری ہے...... یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی دور کا موازنہ کسی دوسرے دور سے نہیں کرنا چاہیے...... کیونکہ ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ ہمارے وقت میں بھی کام بہترین بھی ہوتا تھا اور برا بھی ہوتا تھا اور آج کے دور میں بھی ایسا ہی ہے...... کام اچھا بھی ہوتا ہے۔ بہتر بھی بہترین بھی اور برا بھی۔"

❖"آج کے کن گلوکاروں سے بہت متاثر ہیں آپ؟"

☆"مجھے آج کے دور کے راحت فتح علی عاطف اسلم اور علی ظفر بہت متاثر کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے نہ صرف ملک میں نام کمایا بلکہ ملک سے باہر بھی پاکستان کا نام روشن کیا۔ میری نظر میں تو یہ ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں۔"

❖"اور آپ بھی ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ (آمین)...... اس فیلڈ میں دوستی اور مروت میں بہت سے کام کرنے پڑتے ہیں۔ آپ کے ساتھ ایسا کچھ ہوا؟"

☆"جی...... جی بالکل بہت سے کام مروت

میں اور دوستی میں کرنے پڑتے ہیں اور میں ان باتوں کا برا نہیں مناتا..... کیونکہ آپ کسی قابل ہوتے ہو تو اللہ آپ کو خدمت کا موقع دیتا ہے ..... تو میں تو دوسروں کے کام کر کے دوسروں کے کام آ کے بہت خوشی محسوس کرتا ہوں۔"

☆"کوئی ایسا کام جو دوستی میں کیا اور فائدہ بھی ہوا؟"

☆"ہاں مجھے یاد ہے کہ مشہور و معروف پروگرام "ہم سب امید سے ہیں" کا ٹائٹل سونگ گانے کے لیے شہزاد نواز نے کہا تھا اور میں نے اس کی دوستی میں گایا بھی تھا ـــ اس کا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ پروگرام بہت ہٹ گیا اور سونگ بھی بہت مقبول ہوا۔"

☆"بہت سے فنکاروں کا میں نے عروج و زوال دیکھا ہے آخر عمر میں ان کی غربت بھی دیکھی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

☆"اس میں قصور قسمت کا تو ہوتا ہی ہے، مگر فنکاروں کا بھی ہوتا ہے۔ جو عروج کے وقت یہ سمجھ یا سوچ لیتے ہیں کہ ہمیشہ ایسا ہی وقت رہے گا اور ایسے ہی وہ مقبول و معروف رہیں گے۔ جبکہ ایسا نہیں ہوتا ہے نئے لوگوں کو بھی اپنی جگہ بنانی ہوتی ہے اور پھر لوگوں کی پسند ناپسند بھی بدلتی رہتی ہے۔ لہٰذا یہ بات فنکاروں کو سوچنی چاہیے ـــ ویسے بھی بچت کے سنہری اصولوں کو بھی نہیں بھولنا چاہیے۔ آج بچائیں گے تو کل کام آئے گا۔ اگر اس فلسفے کو لوگ سمجھ جائیں تو کبھی بھی فیوچر میں پریشانی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔"

☆"آپ نے ایسا کیا؟"

☆"بالکل کیا تھوڑی غلطیاں بھی ہوئیں۔ مگر پھر اللہ کا کرم ہو گیا اور سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر اتنا مہربان ہوگا کہ مجھے عزت و شہرت اور دولت سے نوازے گا۔ میں تو اپنے اللہ کا بہت احسان مند ہوں۔"

☆"اب تو نہیں، لیکن جب بہت عروج تھا، ملک سے باہر شوز کرنے جاتے تھے تو ذاتی زندگی متاثر



ہوتی تھی ـــ گھر میں بیگم سے لڑائی جھگڑے ہوتے تھے؟"

☆"بالکل ہوئی تھی اور ہوتی ہے ـــ میں جب بھی شوز کے لیے ملک سے باہر جاتا تھا تو ذاتی زندگی بہت متاثر ہوتی تھی ـــ جھگڑے بھی ہوتے تھے مگر پھر گھر والوں کو جلدی احساس ہو گیا کہ یہ سب انہی کے لیے کر رہا ہوں اس لیے جلدی کمپرومائز کر لیا ـــ اور زندگی سہل ہوگئی۔"

☆"اب فیوچر میں اپنے آپ کو کہاں دیکھتے ہیں؟"

☆"میں پلان نہیں بناتا ـــ لیکن میں ملک سے باہر جانا چاہتا ہوں۔ اپنے ملک کے حالات اچھے نہیں ہیں، یہاں انسان کا کوئی فیوچر نہیں ہے اس لیے اب یہاں دل بھی نہیں لگتا ـــ دعا ہے کہ اللہ ہمارے ملک کو سلامت تا قیامت رکھے۔ مگر اب یہاں نہ گزارا ہوتا ہے نہ ہی دل لگتا ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے عامر سلیم صاحب سے اجازت چاہی۔

☆☆

زینب شبیر

شاہین رشید



1 ”نام؟“
”زینب شبیر۔“
2 ”پیار کا نام؟“
”ماما۔“
3 ”پیدائش؟“
”26 جون 1998ء۔“
4 ”مادری زبان؟“
”اردو۔“
5 ”فیملی؟“
”ہم چار بہنیں اور والدین ...... بہنوں میں میرا نمبر تیسرا ہے۔“
6 ”تعلیمی ڈگریاں؟“
”ایک ہی ہے.....گریجویٹ ہوں۔“
7 ”شوبز میں آمد لک یا......؟“
”اپنے لک سے آئی ہوں۔ بچپن سے خواہش تھی کہ اس فیلڈ میں آؤں۔ گھر والوں نے بھی سپورٹ کیا......تو بس آ گئی۔“
8 ”ایک بری عادت جس سے چھٹکارا پا چکی ہوں؟“
”بات کو چھپانے کی ......اب بات کو چھپاتی نہیں ہوں کیونکہ اس سے بہت نقصان ہوتا ہے۔“
9 ”دکھی ہو جاتی ہوں؟“
”اپنی نانی کے بارے میں سوچ کر، ان کی خواہش تھی کہ وہ مجھے ڈراموں میں کام کرتا ہوا دیکھیں ......مگر ایسا نہ ہو سکا۔ انہیں دنیا سے جانے کی بہت جلدی تھی۔“
10 ”صبح سویرے اٹھتی ہوں؟“
”بالکل بھی نہیں ......کام ہو، کہیں جانا ہو یا شوٹ ہو تو جلدی اٹھ جاتی ہوں ورنہ، آرام سے دو تین بجے تک سوتی رہتی ہوں۔“
11 ”اٹھتے ہی طلب ہوتی ہے؟“
”گرم گرم چائے کی ...... تب ہی تو آنکھ کھلتی ہے ورنہ سوئی رہتی ہوں اور چائے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے بھوک کم ہو جاتی ہے ......اور کم کھانے سے بندہ اسمارٹ رہتا ہے۔“
12 ”مستقل رہنے کے لیے پسندیدہ ملک؟“
”انگلینڈ۔“
13 ”شادی کے لیے میری سوچ؟“
”شادی سنت ہے اور بہت سی برائیوں سے

روکتی ہے اور پھر زندگی میں ایک لائف پارٹنر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے شادی کے لیے میرا فلسفہ یہ ہے کہ اچھا لائف پارٹنر مل جائے تو ضرور کریں۔"

14 "ایک خواب جو اکثر دیکھتی ہوں؟"
"کہ میں کسی ایک عجیب و غریب جگہ پہ ہوں اور وہاں سے بھاگنے کے لیے کسی ٹرک پہ چڑھ جاتی ہوں مگر میرا گھر آتا ہی نہیں ہے۔ راستہ لمبا ہوتا جاتا ہے۔"

15 "میرے ہاتھ میں موبائل آیا جب؟"
"جب میں پندرہ سال کی ہوئی ...... اس سے پہلے کسی نے ہاتھ نہیں لگانے دیا۔"

16 "رونے کے لیے بہترین جگہ؟"
"سب سے بہترین جگہ واش روم ہے۔ جہاں خوب آنسو بہاتی ہوں ...... دل کی بھڑاس نکالتی ہوں۔"

17 "بہترین طریقہ علاج؟"
"ڈاکٹر ...... حکیم اور ہومیو پیتھک پہ اعتبار نہیں، نہ ہی کبھی علاج کروانے کا سوچا ہے۔"

18 "فیوچر پلاننگ؟"
"ابھی اتنی بڑی نہیں ہوئی اور نہ ہی اس قابل ہوئی ہوں کہ فیوچر پلان کر سکوں۔ جو آج ہے وہ ہی سب کچھ ہے۔ کل کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

19 "برے لگتے ہیں وہ لوگ؟"
"جو ڈبل چہروں کے ساتھ ہمارے درمیان موجود ہوتے ہیں اور ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔"

20 "سزا پائی؟"
"لوگوں پر بھروسا کر کے، غلط فیصلہ کر کے اور لوگوں کو اپنا سمجھ کر۔"

21 "میرا آن ایئر ڈرامہ؟"
"آج کل تو ملال یار آن ایئر ہے۔ باقی انڈر پروڈکشن ہیں۔"



22 "رول جو کرنا چاہتی ہوں؟"
"ایک بہت ہی ضدی لڑکی کا رول کرنا چاہتی ہوں۔ جو نہ صرف ضدی ہو بلکہ تھوڑی سی مینٹل بھی ہو ...... دیکھیں کہ کب ملتا ہے ایسا رول۔"

23 "کس طرح کے رول کرنے سے انکار کر دوں گی؟"
"ابھی تو نہیں ایسا سوچا ...... ابھی تو ہر طرح کے رول کرنا چاہوں گی سوائے اس رول کے کہ جو ہماری روایت اور ثقافت یا گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر نہ دیکھنے کے قابل ہو۔"

24 "سانولے رنگ اور نارمل شکل و صورت سے ترقی کی جا سکتی ہے؟"
"بالکل کی جا سکتی ہے۔ بس آپ میں ٹیلنٹ ہونا چاہیے۔ ٹیلنٹ سے لڑکی بہت حسین ہو جاتی ہے۔"

25 "میری پسندیدہ سیلبریٹی؟"
"صبا قمر۔"

26 "جب ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں تو؟"

"تو میرا خیال ہے کہ زندگی تقسیم ہو جاتی ہے اور انسان پھر اپنا آپ بھول جاتا ہے، اپنا خیال رکھنا بھی بھول جاتا ہے جو کہ غلط بات ہے۔"

27 "اپنے آپ کو کتنا ٹائم دیتی ہوں؟"
"بہت ٹائم دیتی ہوں۔ کیونکہ میرا تعلق شوبز سے ہے اور مجھے اچھا نظر آنا چاہیے۔ اپنا خیال رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔ اس لیے اپنے آپ کو زیادہ ٹائم دیتی ہوں۔"

28 "غصے میں بے ساختہ منہ سے نکلتا ہے؟"
"عجیب پاگل انسان ہیں یا ہو......"

29 "کیا بہت شوق سے پیتی ہوں؟"
"کولڈ ڈرنک...... یوں سمجھیں کہ رہ نہیں سکتی اس کے بغیر اور ہاں چائے بھی بہت شوق سے پیتی ہوں۔ نیند سے اٹھتے ہی چائے کی خواہش ہوتی ہے۔"

30 "گھر میں کھانے کے لیے بہترین جگہ؟"
"میرا اپنا بیڈ...... مزا آجاتا ہے کھانا کھانے کا۔"

31 "غصے میں ردعمل؟"
"میرا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے۔"

32 "میں بچت کرتی ہوں؟"
"بچت...... سب خرچ ہو جاتا ہے۔ بچت نہیں کر پاتی میں۔"

33 "اپنی شادی میں کون سی رسم نہیں کروں گی؟"
"منگنی کی...... بس بات پکی ہو اور نکاح ہو جائے۔"

34 "پسندیدہ اینکر پرسن؟"
"اقرار الحسن اور وسیم بادامی۔"

35 "ڈانٹ پڑتی ہے؟"
"اصل میں مجھے دوسروں کی مدد کرنے کی بہت بری عادت ہے اور جب تھوڑی بہت نیکی کر کے اچھا رسپانس نہ ملے تو پھر مجھے ڈانٹ پڑتی ہے کہ ایسا کیوں کرتی ہو...... اور یہی سننے کو ملتا ہے کہ اپنے کام سے کام رکھا کرو۔"

36 "میں کیا بہت اچھا پکا لیتی ہوں؟"
"کچن میں زیادہ نہیں جاتی...... ٹائم ہی نہیں ملتا، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں سب کچھ پکا لیتی ہوں۔ خاص طور پر ہر قسم کے اسنیک، پاستا، آملیٹ، وائٹ کڑاہی وغیرہ وغیرہ۔"

37 "ایک پسندیدہ کھانا جو ہر وقت کھا سکتی ہوں؟"
"پیزا اور چیز کی بنی ہوئی کوئی بھی ڈش (پنیر)۔"

38 "جب میرا ڈرامہ آن ایئر آتا ہے تو؟"
"تو بہت زیادہ ایکسائٹمنٹ ہوتی ہے اور سوچتی ہوں کہ کیا یہ میں ہوں؟ بہت اچھا لگتا ہے یہ سوچ کر کہ مجھے کتنے لوگ دیکھ رہے ہوں گے۔"

39 "کوئی ایسا موقع جب میں بہت خوش تھی؟"
"میں تو جب سے اس فیلڈ میں آئی ہوں۔ بہت خوش ہوں اور اس وقت تو خوشی کی انتہا نہیں تھی جب پہلی بار میرے ہاتھ میں میری پہلی کمائی آئی تھی۔ خوشی سے پاگل ہو رہی تھی اور جو کما کے لائی تھی وہ میں نے اپنی "ماما" کے ہاتھ میں رکھ دیے تھے۔ اور اس وقت ان کی خوشی بھی دیکھنے کے قابل تھی۔"

40 "وقت نے کیا سکھایا؟"
"وقت بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔ اچھے برے کی پہچان، سکھا دیتا ہے اور وقت سے یہ بھی سیکھا کہ وہ کبھی ایک جیسا نہیں رہتا ہے برے وقت کے بعد اچھا وقت ضرور آتا ہے۔"

41 "عشق ہوا؟ یا محبت ہوئی؟"
"مجھے عشق اور محبت دونوں ہوئے بس فرق یہ ہے کہ عشق ایک بار ہوتا ہے اور محبت بار بار ہوتی ہے۔"

42 "سیرلیس نہیں ہوتی؟"

UUNOVELS.COM



”جب بیمار ہوتی ہوں، اگر کچھ ہلکا پھلکا ہو تو، مگر میری ماما فوراً پریشان ہوجاتی ہیں۔ اور دوائیاں لالا کر دیں گی۔ ڈاکٹر کے پاس چلو وغیرہ وغیرہ۔“

43 ”ٹی وی پہ پسندیدہ پروگرام؟“

”مجھے کارٹون پروگرامز بہت پسند ہیں اور ٹام اینڈ جیری تو میرے پسندیدہ کریکٹر ہیں۔“

44 ”اگر کسی پروگرام کو ہوسٹ کرنا پڑے تو؟“

”تو نہیں کر پاؤں گی۔ کیونکہ مجھے زیادہ بولنے کی عادت نہیں ہے اور میں بہت حیران ہوتی ہوں ان خواتین و حضرات پہ جو بولتے زیادہ ہیں کہ کیسے اتنا بول لیتے ہیں۔“

45 ”باہر کھانا کھانے کا پروگرام ہو تو کہاں جاتی ہیں؟“

”ہمارے شہر میں بہت اچھی اچھی فوڈ اسٹریٹ ہیں۔ جیسے دھوراجی کی، بزنس روڈ کی، عائشہ منزل، دو دریا وغیرہ تو بس جہاں گھر والے جانا پسند کریں گے چلی جاؤں گی۔“

46 ”کیا سوچ کر اداس ہوجاتی ہوں اور کیا سوچ کر خوش ہوجاتی ہوں؟“

”اپنے ماضی کو سوچ کر بہت اداس ہوجاتی ہوں۔ کیونکہ میرا ماضی بہت ڈیپریسنگ گزرا ہے۔ اور یہ سوچ کر خوش ہوجاتی ہوں کہ شکر ہے مشکل وقت گزر گیا اور اب میں بہت خوش ہوں۔“

47 ”دن کی روٹین میں سب سے پیاری کیا چیز ہے؟“

”نیند...... اور جب جاگ رہی ہوتی ہوں تو پھر کام کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔“

48 ”پسندیدہ فنکارہ؟“

”بہت ہیں...... مگر صبا قمر بہت زیادہ پسند ہے۔“

49 ”آج کی فکر زیادہ ہوتی ہے یا کل کی؟“

”آج کی......“

50 ”شاپنگ کے وقت میری پہلی ترجیح؟“

”میری ماں پہلے ان کے لیے شاپنگ کرتی ہوں پھر اپنے لیے۔“

☆☆

آواز کی دنیا سے

طیب حسین صدیقی

شاہین رشید

آواز کا خوب صورت ہونا کافی نہیں ہوتا۔ بولنے کا انداز لب و لہجہ اور شستہ اور شائستہ اردو بھی لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے...... اور میرے خیال میں بلکہ یقیناً یہی وہ خوبیاں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے، کوئی ریڈیو کی دنیا میں...... جسے ہم آواز کی دنیا بھی کہتے ہیں، کامیاب ہوتا ہے۔ بے جان مائیک کے آگے اس انداز میں بات کرنا جیسے سب سامنے ہی بیٹھے ہیں ایک کامیاب آر جے کی نشانی ہے۔ آواز کی دنیا سے اس بار ملیے طیب حسین صدیقی سے۔

٭ ''کیسے مزاج ہیں؟''

☆ ''الحمد للہ۔''

٭ ''تو پھر بتایئے کچھ اپنے بارے میں؟''

☆ ''مجھے طیب حسین کہتے ہیں، میں شہر فیصل آباد کا رہنے والا ہوں یہیں میں نے جنم لیا اور اسی شہر میں میری تعلیم و تربیت ہوئی۔ میرے والد کا نام ''خالد صدیقی'' ہے جو معروف شخصیت ہیں۔ بینکر ہیں اور حال ہی میں وائس پریذیڈنٹ کے طور پر ریٹائر ہوئے ہیں۔ وہ حبیب بینک میں جاب کرتے تھے۔ میری والدہ ہاؤس وائف ہیں اور گھر کی ذمہ داریاں انہیں مصروف رکھتی ہیں۔ میری مادری زبان اردو ہے اور میرے آباؤ اجداد کا تعلق لکھنو سے ہے کچھ آباؤ اجداد ''حیدرآباد دکن'' میں بھی رہے اور میری تربیت کچھ اس انداز میں ہوئی کہ زبان و بیان پہ بہت توجہ دی گئی۔ اردو زبان کے لیے کافی سختی رہی یہی وجہ ہے کہ میری اردو کافی اچھی ہے میری تین بہنیں ہیں اور میں ہوں اور میں گھر میں بڑا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میری بہنیں مجھ سے چھوٹی ہیں اور الحمد للہ تینوں بہنیں شادی شدہ ہیں۔ اور ہم چاروں نے ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی ہے۔ میں نے اردو ادب میں ماسٹرز کیا ہے اور اس وقت میری عمر 33 سال ہے۔ 31 دسمبر کو اپنی سالگرہ مناتا ہوں۔ ''کیپری کورن'' ہوں اور اس ستارے کی ساری خوبیاں مجھ میں پائی جاتی ہیں۔''

٭ ''ریڈیو میں آنے کا شوق کب سے تھا؟''

☆ ''ریڈیو جوائن کرنے کا جنون اس وقت سے تھا جب شہر فیصل آباد میں ایم ایف کی براڈ کاسٹنگ شروع ہوئی۔ ایف ایم 101 سے شروعات ہوئی...... اور جب میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا تو ایف ایم 101 کو بہت شوق سے سنتا تھا اور تب سے مجھے بھی شوق ہوا کہ FM-101 کو جوائن کیا جائے...... آپ کو یقین نہیں آئے گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ بارہ برس کی ناکامی کے بعد اور اتنے سخت تجربات کے بعد فائنلی میرا انتخاب ہوا 2016ء میں اور میرا انتخاب ہوا ریڈیو پاکستان میں بہ حیثیت ڈرامہ آرٹسٹ کے اور پھر وہیں سے سیکھتے سیکھتے FM میں قدم رکھا اور تقریباً ڈیڑھ سال FM-101 میں کام کیا۔ اس کے بعد FM-94 میں میں نے سوئچ کیا اور اب تک وہیں پر کام کر رہا ہوں۔''

٭ ''ریڈیو پہ متعارف کس نے کرایا۔ کس کے توسط سے آئے تھے آپ؟''

☆ ''ریڈیو پہ کسی کے توسط سے نہیں آیا...... البتہ سب کو سنتا بہت تھا اور اگر آپ میں ٹیلنٹ ہو، پوٹینشیل ہو تو آپ اسی کو اپنے طور پر پالش کرتے ہو اور آپ اگر سمجھتے ہیں کہ آپ میں اتنا ٹیلنٹ ہے کہ آپ ریڈیو کر سکتے ہیں تو پھر یقیناً آپ کو آپ کی منزل مل جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ریڈیو ایک ایسی فیلڈ ہے جس میں صرف آپ کو آپ کا ٹیلنٹ

ہی لا سکتا ہے۔ کوئی انسان نہیں۔"

﴾ "بہ حیثیت ڈرامہ آرٹسٹ کے آپ نے شروعات کی، پھر FM تک کیسے آئے؟"

☆ "جی...... میں نے ڈرامہ آرٹسٹ سے اپنے کام کا آغاز کیا تھا اور اس کے بعد میں FM کا حصہ بنا اور ساتھ ہی ساتھ میں نے FM ریڈیو شوز کے لیے ٹریننگ لینا شروع کر دی ...... اور سب سے پہلے میں نے گڈ مارننگ شوز کیے، پھر "چٹ چیٹ" ایوننگ شوز کیے، پھر اسپورٹس بیس شوز کیے اور پھر آخر میں میں نے اپنی دلچسپی کے مطابق غزل یعنی پوئٹری بیس پروگرام کا آغاز کیا اور آج تک یہ پروگرام کر رہا ہوں۔ صدائے فیصل آباد کے نام سے۔ لوگ جانتے ہیں مجھے میری آواز سے۔"

﴾ "وائس اوور کیا آپ نے؟"

☆ "میں آج کل FM-94 دھمال میں ہوں اور یہاں میں وائس اوور کرتا ہوں۔ کمرشلز کی اور ڈاکومینٹریز کی اور کافی کمرشلز ہیں جن میں میری آواز ہوتی ہے، شہر فیصل آباد اور بیرون فیصل آباد کے کمرشلز میں۔"

﴾ "یہ ٹھیک ہے کہ آپ کی وجہ شہرت ریڈیو ہے مگر ٹی وی کو کیوں نظر انداز کیا؟"

☆ "اس کی وجہ یہ ہے کہ فیصل آباد میں ریڈیو اسٹیشن تو بہت ہیں مگر ٹی وی چینل بہت کم ہیں...... زیادہ تر نیوز چینل ہیں۔ جیسے "سٹی 41" "92 نیوز" ان کے لیے آفرز لاہور سے ہوئیں مجھے...... مگر روزگار کے سلسلے کے معاملات تھے تو میں لاہور نہیں شفٹ ہو سکتا تھا۔ اور پھر کوئی بہت ہینڈسم آفر بھی نہیں تھی۔ اگر بہت اچھی آفر ہوئی اور بہ حیثیت تجزیہ نگار کے تو ضرور کروں گا۔ اداکاری میں مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔"

﴾ "آپ نے کہا کہ کچھ روزگار کے معاملات تھے تو بتانا پسند کریں گے کہ بائے پروفیشن آپ کیا ہیں؟"

☆ "جی...... بائے پروفیشن میں لیکچرار ہوں



اور گزشتہ تیرہ سال سے تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوں اور بڑے برانڈز کے کالجوں میں پڑھا چکا ہوں...... اور گزشتہ 5 سال سے جس ادارے سے وابستہ ہوں وہاں ہیڈ آف دا ڈیپارٹمنٹ آف اردو سبجیکٹ کے اپنے فرائض انجام دے رہا ہوں اور صبح سے شام تک کلاسز لیتا ہوں اور پڑھاتا ہوں بچوں کو۔"

﴾ "ریڈیو میں ایسی کیا کشش ہے کہ جو ریڈیو جوائن کر لیتا ہے وہ اسے پھر چھوڑتا نہیں ہے؟"

☆ "بہت اچھا سوال پوچھا آپ نے۔ ریڈیو اصل میں تاثرات کی دنیا ہے ٹی وی پہ ہم ایکسپریشن شو کر دیتے ہیں۔ اداکاری تھوڑا سا سہارا بن جاتی ہے...... جبکہ ریڈیو کے مائیک کے آگے جب ہم بولتے ہیں تو اپنے لہجے سے اور بات چیت سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بناتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ریڈیو ہی وہ بیس ہے، وہ پلیٹ فارم ہے جہاں سے ٹی وی کے لیے کام کیا جا سکتا ہے...... "پطرس بخاری" ہوں "اشفاق احمد" صاحب ہوں۔ وہ تلقین شاہ کا کردار ہو، بہت سے

لوگ ہیں جو ریڈیو سے ٹی وی کی طرف آئے جیسے فردوس جمال صاحب، توقیر ناصر، قوی خان، عابد علی مرحوم، قاضی واجد مرحوم وغیرہ۔ تو ٹی وی کے بہت سے نامور فنکار، رائٹرز ریڈیو سے ہی ٹی وی کی طرف آئے۔ ریڈیو کا نشہ ساری زندگی برقرار رہتا ہے اور ریڈیو ایک اکیڈمی ہے جس سے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے خاص طور پر تلفظ اور بولنے کا فن، آواز کا اتار چڑھاؤ یہ سب باتیں ریڈیو سے ہی آتی ہیں ریڈیو کے بارے میں جو ڈیفنیشن ہمارے استاد نے سکھائی وہ یہ تھی کہ۔ ''ریڈیو از ناٹ اباؤٹ واٹ یو اسپیک۔ ریڈیو، از آل اباؤٹ واٹ ناٹ ٹو اسپیک یعنی ریڈیو پہ جو نہیں بولا جاتا وہی ریڈیو ہے۔''

⬥''اپنے پروگرام میں آپ لائیو کالز لیتے ہیں؟ اور کس طرح کا ذوق رکھنے والے سامعین آپ کا پروگرام سنتے ہیں؟''

☆''لائیو کالز میں ذرا کم ہی لیتا ہوں اور میرے سننے والوں میں زیادہ تر وہ لوگ ہوتے ہیں جو شعری ذوق رکھتے ہیں غزل سننے کا شوق رکھتے ہیں اور لطافت والی باتیں ہوتی ہیں اور میرے پروگرام میں سب ہی عمر کے لوگ ہوتے ہیں۔ لڑکیاں بھی، خواتین بھی۔ مرد حضرات اور نوجوان بھی...... اور بہت لوگ تو ریڈیو پہ ملنے بھی آتے ہیں۔ اللہ پاک کا بڑا کرم ہے کہ اس نے اتنی عزت دی ہوئی ہے۔ لوگ آتے ہیں پھولوں کے تحفے دے کر جاتے ہیں۔ اور اپنی لکھی ہوئی شاعری دیتے ہیں پڑھنے کے لیے۔''

⬥''کتنے سال ہو گئے ریڈیو سے وابستہ ہوئے؟''

☆''ویسے تو کافی سال ہو گئے ہیں مگر بہ حیثیت آر جے کے مجھے تقریباً 5 سال ہو گئے ہیں۔ دو چینلز سے کام کر چکا ہوں اور دونوں پہ ہی غزلیات پہ ہی پروگرام ہوئے اور اب یہی میری پہچان ہے۔''

⬥''آپ کے خیال میں اس وقت کون سا FM بہترین ہے۔ آپ کے FM کے علاوہ؟''

☆''یہ تو آپ کو سامعین ہی بتا سکتے ہیں۔ لیکن میں تو اپنے ہی FM کی بات کروں گا کہ یہ بہت سنا جاتا ہے کیونکہ مجھے لوگوں کا فیڈ بیک ملتا رہتا ہے۔ ''دھمال ایف ایم 94 بہت سنا جاتا ہے اور اس چینل نے بہت اچھی اچھی آوازیں پروڈیوس کی ہیں۔ مثلاً ''احسن سید، رانا اعجاز، احمد شیخ، عامر حسین، مقصود وفا'' بہت بڑا نام ہے اور اس چینل سے میں بھی کام کر رہا ہوں...... تو سننے والوں کا گراف کافی بہتر ہے...... اور میرا پروگرام پوری دنیا میں سنا جاتا ہے اور پوری دنیا سے مجھے فیڈ بیک ملتا رہتا ہے۔''

⬥''آپ کا موڈ خراب ہو، طبیعت خراب ہو، یا دل نہ چاہ رہا ہو تو پھر آپ پروگرام کس طرح کرتے ہیں؟''

☆''سوال بہت اہم ہے...... اور جواب اس کا یہ ہے کہ گزشتہ پانچ سالوں میں صرف تین بار ایسا ہوا کہ میں پروگرام نہیں کر سکا، ایک بار اس لیے کہ میرا آپریشن ہوا تھا اور ایک بار میرا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور موڈ خراب ہو تب بھی جانا پڑتا ہے، کیونکہ لاکھوں لوگ میرا انتظار کر رہے ہوتے ہیں اور انتظار کروانا اچھی بات نہیں ہے اور مجھے خود بھی احساس ہے کہ کتنی مشکل سے میں نے اس جاب کو حاصل کیا ہے یا اپنے شوق و جنون کی تکمیل کی ہے اور شوق اگر روزگار بن جائے تو پھر کام کرنے میں اور بھی زیادہ مزا آنے لگتا ہے...... تو ریڈیو اسٹیشن آتے ہی سب ٹینشن، طبیعت موڈ ٹھیک ہو جاتا ہے اور پھر میرا اور میرے سامع کا رشتہ شروع ہو جاتا ہے۔''

⬥''آپ کا پروگرام کب کب ہوتا ہے اور آپریشن کا ذکر کر رہے تھے تو کس چیز کا آپریشن ہوا تھا؟''

☆''میرا ایک پروگرام ہوتا ہے اتوار کو رات 9 بجے سے بارہ بجے تک اور ایک پروگرام ہوتا ہے منگل کو رات 9 بجے سے بارہ بجے تک اور آپریشن میرے دانتوں کا ہوا تھا اور تیسری بار ''عمرہ کی سعادت'' کے لیے گیا تھا تب۔''

⬥''ایک آر جے کے لیے تعلیم کتنی ضروری

ہے؟ یا صرف بولنے کا فن آنا چاہیے؟"

☆"میرے خیال میں تعلیم ہی سب سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ تعلیم ہی ہمیں اٹھنا بیٹھنا اور بولنا بلکہ مینرز سکھاتی ہے اور ایک آر جے کے لیے گریجویٹ ہونا بہت ضروری ہے اور نہ صرف ریڈیو بلکہ دنیا کی کسی بھی فیلڈ میں ہم تعلیم کے بغیر نہیں آسکتے اور نہ ہی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔"

◈"مزاج کے کیسے ہیں۔ کچھ جی سوال بھی ہو جائیں؟"

☆"مزاج آپ نے پوچھا تو میں غصے کا تیز ہوں۔ غلط بات پہ غصہ آتا ہے، ظاہر ہے سب کو غلط بات پہ ہی غصہ آتا ہے۔ صحیح بات پر کس کو آتا ہے...... مجھ میں غصے کی شدت زیادہ پائی جاتی ہے ہر بات پر غصہ نہیں کرتا، بس چیزوں کو مین ٹین کرنے کے حوالے سے یا ڈسپلین کے حوالے سے غصہ آجاتا ہے۔ بس میں یہ کہتا ہوں کہ اگر کوئی میری چیزوں کو اٹھائے تو واپس اسی جگہ پہ رکھ بھی دے۔"

◈"شادی ہوئی؟"

☆"جی الحمد للہ شادی شدہ ہوں اور میری شادی میرے گھر والوں کی پسند سے ہوئی اور میری پسند بھی شامل تھی۔ ماشاء اللہ سے میرا ایک بیٹا بھی ہے اور بڑی کامیاب زندگی گزر رہی ہے اور میں نے اپنے تعارف میں یہ نہیں بتایا کہ ہمارا تعلق شیخ فیملی سے ہے میرے والد شیخ ہیں اور میری والدہ "خان" یعنی پٹھان فیملی سے تعلق رکھتی ہیں۔ بہت سے قریبی لوگ مجھے شیخ طیب کے حوالے سے جانتے ہیں۔"

◈"کھانے پینے کے شوقین ہیں آپ؟"

☆"کھانے پینے کے شوقین سب ہی ہوتے ہیں اور میں نے اپنے کیریئر کا آغاز ایک ملٹی نیشنل ریسٹورنٹ میں بہ حیثیت ایک کک اور شیف کیا اور دونوں شعبوں میں کام کیا ...... کھانے میں مجھے چائنیز فوڈ بہت پسند ہے۔ تیز مسالے مجھے پسند نہیں۔ اٹالین خود میں با آسانی بنا لیتا ہوں ...... ہوم ڈلیوری فوڈ سے میں فائدہ نہیں اٹھاتا ...... میرا کہنا یہ ہے بلکہ میں تو کرتا ہی یہ ہوں کہ اگر میرا کچھ کھانے کا دل کر رہا ہے تو پھر اپنی پسندیدہ جگہ پہ چلا جاتا ہوں۔"

◈"گیمز سے لگاؤ ہے؟"

☆"گیمز سے مجھے کافی لگاؤ رہا ہے اور HBL کی طرف سے کرکٹ کھیلی ہے اور بہت اچھی کرکٹ کھیلتا رہا ہوں میں اور جب بینک کی جاب چھوڑی تو ڈیپارٹمنٹ سے کرکٹ کھیلنا بھی چھوڑ دی اور پھر تدریس کے شعبے سے وابستہ ہو گیا۔"

◈"زندگی کو کس انداز میں دیکھتے ہیں؟"

☆"زندگی تو ایک گورکھ دھندہ ہے۔ جیسا کہ مشہور بھی ہے۔ زندگی گزارنے اور بسر کرنے میں بڑا فرق ہے اور گورکھ دھندے کو سلجھانا ہی ایک فن ہے جو سلجھا لیتا ہے وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور اس جگہ پر یا اس سطح پہ پہنچ جاتا ہے جہاں وہ پہنچنے کی خواہش کرتا ہے۔"

◈"ملکی حالات کے بارے میں کیا کہیں گے؟"

☆"میں نے تو پاکستان میں جب سے آنکھ کھولی ہے ملکی حالات گڑبڑ ہی دیکھے ہیں...... لیکن موجودہ حکومت سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں اور قرآن کریم میں اس کے لیے بڑا واضح پیغام ہے کہ مایوسی کفر ہے۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا...... امید ہے کہ پانچ سالوں میں بہت اچھا ہو جائے گا۔"

◈"میوزک سے آپ کا لگاؤ؟"

☆"مجھے میوزک کا بہت زیادہ کریز ہے۔ شاعری میں خود بھی کرتا ہوں اور شاعر حضرات کو پڑھا بھی ہے میں نے اور شاعر حضرات سے میری بڑی اچھی دوستی بھی ہے۔ مثلاً تہذیب عافی، انور مسعود صاحب، ڈاکٹر اطہر فراق ہیں، دانش نقوی صاحب، جہاں زیب ساحر، علی زریون ہیں مبشر سعید ہیں وہ لکن مجھے پسند ہے۔"

چلیں جی بہت باتیں ہو گئیں اب اجازت چاہیں گے۔ وقت دینے کا بہت شکریہ۔